قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ایک کہانی یوں ہے کہ ایک شادی ہال کے باہر ایک بھکاری جیسا بچہ کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر مینیجر نے نوکر سے کہا۔ ''اسے ایک تھپڑ مار کر بھگاؤ۔'' لیکن جیسے ہی نوکر لڑکے کی طرف بڑھا۔ مینیجر نے کہا۔ ''ایسا کرو اسے ایک روٹی بھی دے دینا۔'' نوکر نے ایک تمانچہ مارا پھر ایک روٹی دے کر کہا۔ ''چل بھاگ۔'' لڑکے نے مینیجر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صاحب جی ایک تھپڑ اور مار لیجیے۔ اس کے بدلے میں کچھ سالن بھی دے دیں۔'' کہنے کو یہ ایک کہانی ہے لیکن اطراف پر نظر ڈالیں تو ایسا ہی کچھ نظر آئے گا۔ روٹی پر سالن کے لیے سب تمانچے کھانے پر تیار ہیں۔ حمیت جو سب کی سوگئی ہے۔ ورنہ اطراف میں جو ظلم کا بازار گرم ہے کوئی تو آواز اٹھاتا لیکن ہم خاموش ہیں اور کرپشن بڑھتا جا رہا ہے اس وقت فانی بدایونی کا شعر شدت سے یاد آ رہا ہے۔

نیرنگِ زمانہ رنگِ دنیا دیکھا
تدبیر نے جو کنویں جھنکائے جھانکے
کیا کہیے ہم نے کیا کیا دیکھا
تقدیر نے جو ہمیں دکھایا دیکھا

معراج رسول

جلد 26 ❖ شمارہ 11 ❖ نومبر 2016ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد عفان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی بابش	0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہائی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

مجاھد سیاست

25 دسمبر 1889ء کی رات اترپردیش کے ضلع مرزاپور کے قصبہ چنار میں شیخ محمد زمان کے ہاں اس نے آنکھ کھولی۔ اس کا نام خلیق الزماں تجویز ہوا۔ شیخ محمد زمان نائب تحصیلدار تھے۔ لکھنو میں آباؤاجداد کے مکانات تھے۔ اس لیے کچھ ہوش سنبھالتے ہی وہ والدین کے ساتھ لکھنو چلا آیا۔ اس وقت لکھنو نوابوں کا شہر کہلاتا تھا۔ نمود و نمائش، کا گڑھ تھا۔ اسی وجہ سے وہ شہر جو عالم میں انتخاب تھا دھیرے دھیرے زوال کی جانب بڑھتا جارہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مسلمانوں پر زوال آرہا ہے۔ یہی نہیں مسلمانوں کی زبان کہلانے والی اردو پر بھی زوال آرہا تھا۔ ایسے وقت میں دسمبر 1904ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت مسٹر موریسن نے کی۔ ڈپٹی نذیر احمد اور الطاف حسین حالی جیسی قد آور شخصیتوں نے بھی شمولیت اختیار کی۔ راجا صاحب محمود آباد راجا محمد علی خان نے ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم بطور چندا دیا۔ اس کانفرنس میں شیخ محمد زمان کے بیٹے نے رضا کار کی حیثیت سے بہت کام کیا اور ہندی کو اردو پر تھوپنے کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کی۔ ان دنوں لکھنو سے "اودھ اخبار" اور "اودھ پنچ" نکلا کرتے تھے۔ اس نے ان دونوں جریدے کے لیے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ لکھنو تو تھا ہی اردو پرور۔ میر، سودا، انشاء، ناسخ، آتش اور صبا جیسے شاعروں کو دہلی سے اپنی جانب کھینچا تھا۔ مثنوی کی صنف کو اسی شہر نے جنم دیا تھا۔ افسانہ نویسی کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی تھی۔ فسانہ آزاد اور طلسم ہوشربا جیسی کتابیں اسی زرخیز زمین کی تخلیق ہیں۔ اردو کا پہلا ڈراما امانت بھی یہیں تخلیق ہوا لیکن اسی لکھنو میں اردو کا مستقبل تاریک کر کے ہندی کو آگے لانے کی کوشش ہورہی تھی۔ اسی لکھنو میں وہ 1903ء میں جوبلی اسکول میں دسویں کا طالب علم تھا پھر اس نے میٹرک کا امتحان دیا اور علی گڑھ کالج چلا گیا۔ اسے ویسٹرن کورٹ میں کمرا نمبر 47 دیا گیا۔ یہاں آیا تو اپنے کھیل کی بنیاد پر کالج کی ٹیم کا کپتان بن گیا۔ اسے سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر وہ مسلمانوں کی زبوں حالی پر کڑھتا ضرور تھا۔ 1909ء میں اس نے مولانا شوکت علی مولانا محمد علی سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا سیدھا اثر ذہن پر پڑا۔ 1910ء میں لیبیا جو اس وقت طرابلس کہلاتا تھا اس پر اطالیہ نے حملہ کردیا۔ اس وقت خلیق نے دیگر طلباء کے ساتھ مل کر علی گڑھ مسجد میں احتجاجی جلسوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ کلکتے سے "الہلال" اور "زمیندار" اخبار شائع ہوا کرتے تھے۔ ان اخباروں نے اسے خوب کوریج دی۔ ان دنوں علی گڑھ کالج کے اسٹاف میں انگریزوں کی خاصی تعداد تھی۔ کالج کے طلباء میں ان کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ یہ اس سلسلے میں راجا صاحب محمود آباد کے ہاں باقاعدگی سے جانے لگے تاکہ انگریزوں کے خلاف ایجی ٹیشن کو خطرہ لاحق نہ ہو۔ اسی دوران خبر ملی کہ بلقان نے ترکی پر حملہ کردیا ہے۔ خلیق نے طلباء کے ساتھ مل کر چندہ مہم کا آغاز کردیا۔ مولانا محمد علی نے اپنے اخبار "کامریڈ" میں اپیل کی کہ تمام مسلمان دل کھول کر چندہ دیں تاکہ ایک وفد ترکی بھیجا جاسکے۔ اس وفد میں خلیق بھی شامل رہا۔ وہاں سے واپس آکر علی گڑھ میں دوبارہ سے داخلہ لے لیا اور بی اے کیا۔ 1914ء میں جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ دسمبر میں مولانا محمد علی اور شوکت علی ملنے آئے اور مشورہ دیا کہ پشاور جاکر قبائلیوں کو ترکی کے حق میں صف آرا کریں۔ یہ قبائلیوں کو قائل کرنے نکل پڑے۔ پھر افغانستان گئے اور عرب ممالک میں وفد بھیجے تاکہ انگریزوں کے خلاف مؤثر انداز میں پروپیگنڈا مہم چلائی جائے۔ اپریل 1916ء میں اس نے ایل ایل بی کرلیا۔ راجا صاحب محمود آباد نے پیشکش کی کہ وہ ان کے سیکریٹری بن جائیں۔ مسلم لیگ کا 1918 میں دہلی سیشن ہوا تو اس نے راجا صاحب محمود آباد کے اشارے پر تقریر کردی کہ مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ضروری ہے کہ ایک الگ ملک بنے۔ کنونشن میں مسلمانوں کے تقریباً تمام بڑے لیڈر موجود تھے۔ کئی ایک نے مخالفت کردی۔ خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد نے۔ لیکن حکیم اجمل خان نے بھرپور انداز میں اس کا دفاع کیا۔ 1921ء میں اسے سیاست کی وجہ سے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ ابھی تک مسلم لیگ مشرقی ہند کی جماعت تھی لیکن جب 1906 میں جنم لینے والی مسلم لیگ کمزور پڑنے لگی تو 1934ء میں قائداعظم کو صدارت کی پیشکش کر کے دوبارہ سے ہندوستان بلوالیا گیا جس کی وجہ سے مسلم لیگ میں نئی جان آگئی۔ الیکشن کا وقت آیا تو رفیع الدین قدوائی نے اپنے امیدوار مسلم لیگ کے مقابلے پر کھڑے کردیے۔ یہ خود جاکر رفیع الدین قدوائی سے ملے کہ مسلمانوں کو تقسیم نہ کرو لیکن نہ یہ مانے اور نہ دیوبند کے حضرت مولانا حسین احمد مدنی۔ مسلمانوں کو تقسیم کرنے کے لیے فتوے پر فتوے آنے لگے لیکن یہ اپنے دوستوں کے ساتھ شب و روز محنت کرتے رہے۔ اخراجات راجا محمود آباد اٹھا رہے تھے۔ نتیجہ حوصلہ افزا نکلا چھتیس میں سے انتیس سیٹیں مسلم لیگ کو مل گئیں۔ 12 اکتوبر 1938 کو مولانا آزاد نے اسے خط لکھا کہ کچھ ہوش کرو اور کلکتے جاکر گاندھی جی سے ملو۔ دراصل آزاد کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتا کرا کر مسلمانوں کو کانگریس میں کھینچنا چاہتے تھے۔ اس نے خط راجا صاحب محمود آباد کو پیش کردیا جسے پڑھ کر وہ خوب ہنسے کہ اب مسلمان بے وقوف نہیں بننے والے۔ وقت گزرتا رہا۔ 22 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ سیشن میں قرارداد پاکستان منظم ہوئی اور وائسرائے کو پیش کردی گئی پھر پاکستان بھی بن گیا۔ 6 جنوری 1947ء کو سردار پٹیل نے لکھنو کے ایک بڑے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ "پاکستان بنانے والا اسی شہر کا باشندہ تھا۔ بھگوان کی دیا سے وہ یہاں سے چلا گیا۔ ہم بہت خوش ہیں۔" اتنے نفرت بھرے انداز میں جس شخص کا پٹیل نے ذکر کیا۔ جس کا ذکر خاص چل رہا ہے اسے ہم چودھری خلیق الزماں کے نام سے پہچانتے ہیں جس نے 14 اگست 1947ء کو آزادی کی رات اسمبلی ہال میں جواہر لعل نہرو، راجندر پرشاد، رادھا کشن کے سامنے پاکستان کی جانب سے تقریر کی تھی جو 31 مارچ 1953 سے 29 مئی 1954 تک ایسٹ پاکستان کے گورنر رہے۔ سیاست کا سرگرم کارکن رہے اور 18 مئی 1973ء کو کراچی میں انتقال کرگئے۔

☆☆☆

شہرِ خیال

☆انور عباس شاہ نے بھکر سے لکھا ہے۔ ”کچی اور کھری باتیں پڑھنے کے بعد ہم ”شہرِ خیال“ میں پہنچے۔ وہاں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ بھکر والے ایک مرتبہ پھر چھا گئے۔ عبدالجبار رومی انصاری اپنے دلچسپ خط کے ساتھ کرسیِ صدارت پر تھے۔ طاہرہ گلزار باجی ایک دفعہ پھر نہ تو ”شہرِ خیال“ کی زینت بنیں اور نہ ہی بلیک لسٹ میں شامل تھیں۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس صاحبہ طویل غیر حاضری کے بعد محفل کی زینت بنیں۔ وجہ غیر حاضری پرچے کا صحیح وقت پر نہ ملنا بتاتی حالانکہ اپنے آخری خطوط میں انہوں نے وجہ نفیس صاحب کی بیماری کا بتایا تھا پھر ایک دم غائب ہوگئیں۔ اس طرح مجھ سمیت اکثر قارئین نفیس صاحب کی صحت کے بارے میں پریشان ہو کر دعائیں کرنے لگے۔ ایک تو ان کی طویل غیر حاضری دوسری اوپر سے نفیس صاحب کی بیماری کی وجہ سے طرح طرح کے اندیشے جنم لینے لگے۔ اب جب کہ ڈاکٹر صاحبہ اتنے عرصے کے بعد آگئی ہیں تو نفیس صاحب کا ذکر تک نہ کیا فقط یہ کہہ دیا کہ پرچا وقت پر نہیں ملتا یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ پرچا تو ہمیں بھی وقت پر نہیں ملتا اور اس کی ایف آئی آر ہم سرگزشت میں درج بھی کرا چکے ہیں۔ شوکت رحمٰن خٹک کا خط پڑھ کر دل بہت افسردہ ہوا۔ ایک تو اس میں جناب شاہد جہانگیر شاہد کا ذکر دوسرا ان کے دونوں پاؤں والی معذوری خداوند کریم آیندہ کے لیے ان پر اپنی رحمتوں کی برسات عطا فرمائے، (آمین)۔ ”دھوکا“ ایک پُراسرار تحریر تھی۔ قطب الدین کون تھا، کہاں سے آیا تھا اس کی خلش تو ہمیں بھی رہے گی۔ میرے خیال میں قدرت کو ارسلان کا وہ جذبہ پسند آگیا جب اس نے ایک بے سہارا عورت اور بچیوں کا وہ فلیٹ لینے سے انکار کردیا تھا جو اس کو الاٹ ہوچکا تھا۔ درویش صفت انسان اور اس دور کی عظیم شخصیت عبدالستار ایدھی کے بارے میں مضمون ”دل دردمند“ نے ہمیں متاثر کیا۔ اس ہمدرد شخصیت کی خدمات سے ہم پہلے ہی سے باخبر تھے۔ یہ مضمون پڑھ کر ہماری معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔ ”لاکھوں میں ایک“ معروف فنکارہ شمیم آراء کے بارے میں ایک پُرمغز مضمون تھا۔ ”شمشال سے تورتنو“ ہر دفعہ دلچسپ انداز میں پیش ہوتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے سارا وہی منظر گھوم جاتا ہے جو تحریر میں شامل ہوتا ہے۔ لگتا ہے ہم خود ندیم اقبال کے ساتھ ساتھ موجود ہوں۔ اتنا دلچسپ مضمون پیش کرنے پر ندیم اقبال کو بہت بہت مبارک باد اور تھینکس۔ ”خود غرض“ ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتی ہوئی ایک بے مثال تحریر تھی۔ سعدیہ نے ارشد کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ یہ اس کی خود غرضی تھی۔ ”سراب“ اب ہر دفعہ ایک نیا رخ لے کر آتی ہے۔ اس لیے اسے ہم بہت ہی شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کی اگلی قسط کا ہمیں شدت سے انتظار رہتا ہے۔ ”ولپیٹ کے بچے“ ایک پُراسرار تحریر تھی جو کہ اپنے اندر بے حد دلچسپی سموئے ہوئے تھی۔ اس قسم کی اور قلم نگری جیسی تحریروں ہی سے تو سرگزشت کا معیار بلند ہے۔ ”یہ چاند تارے“ بھی بے حد دلچسپ اور معلومات سے بھرپور مضمون تھا۔ اس سے چاند تاروں سے متعلق ہمارے علم میں خاصا اضافہ ہوا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔“

☆مرزا طاہر الدین بیگ میرپور خاص سے لکھتے ہیں۔ ”میں نے بھی پہچان لیا تھا۔ ایدھی صاحب کو دو حل میرے بالکل درست تھے مگر میرا نام کہیں نہیں تھا۔ ایدھی صاحب کو میرپور خاص کے اور بھی خواتین و حضرات نے شناخت کیا ہوگا مگر میرپور خاص سے کسی کا بھی نام نہیں ہے کیا شہر میرپور خاص میں سب نااہل ہیں؟ (حل اتنی بڑی تعداد میں آتا ہے کہ مسلسل کمپیوٹر اندراج کرتا رہتا ہے جو حل بعد میں آئے اسے کس طرح شامل کیا جائے؟)

☆نزابت افشاں رقمطراز ہیں مہورہ فتح جنگ سے۔ ”ماہِ اکتوبر کا شمارہ یوں تو یکم اکتوبر کو مل گیا تھا مگر اس بار کچھ پرانے رسالے بھی مل گئے یوں خوشی دوگنا ہوگئی۔ تمام رسائل کو پڑھنے میں دیر ہوئی اس لیے خط میں یک گئی سرگزشت میں اس بار ساغر صدیقی سے ملاقات ہوئی۔ آہ ان کے ساتھ بہت برا ہوا۔ میں نے کلیاتِ ساغر کا مطالعہ کیا ہے۔ اداریہ ہمارے معاشرے کی بگڑی ہوئی صورت کا عکاس تھا۔ ”شہرِ خیال“ میں عبدالجبار رومی کا تبصرہ پسند کرنے پر شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بھی جاندار ہے۔ رانا محمد شاہد بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ احمد خان توحیدی، اویس

شیخ اور سید مسرت حسین رضوی بھی خاص انداز میں حاضر رہتے۔ مسز طاہرہ گلزار آپی نے اس بار بھی اپنی نوازشات سے محروم رکھا۔ اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ کہانیوں میں فیض رساں، دل دردمند، جہدِ مسلسل، تشنہ لب، جھولا پسند آئیں۔ ''کلہاڑی'' بہت اچھی لگی۔ ''المیہ'' ایک بہت ہی دکھ بھرا المیہ ہے۔ اسلام سے قبل قریشِ مکہ اپنی بچیوں کو زندہ دفناتے تھے۔ میرے نزدیک اہلِ مغرب کا یہ عمل اُن سے بھی گھناؤنا جرم ہے۔ استاد جی شاندار تھی۔ آج کل کے طلباء طالبات کو یہ ضرور پڑھنی چاہیے کیونکہ موجودہ نسل کچھ زیادہ ہی بے لگام ہو گئی ہے۔ ''چال'' واقعی چال تھی۔ بہرحال اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے انہیں چاچا دینو کی قبر کھودنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس گناہ سے بچ جاتے تو بہت اچھا تھا۔ ''دھوکا'' بھی اچھی اور بامعنی کہانی تھی۔ شک اور وہم رشتے ختم کرتا ہے۔ صائمہ اقبال سے گزارش ہے کہ وہ کسی بھی ماہ کی شخصیات پر لکھتے ہوئے ان کا حق ادا کیا کریں۔ اس بار بھی اکتوبر کی کئی اہم شخصیات شامل نہیں تھیں۔ خصوصاً ڈاکٹر جاوید اقبال جو کہ 5 اکتوبر 1924ء کو پیدا ہوئے اور گزشتہ برس 3 اکتوبر 2015ء کو 91 سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ اقبال کے چشم و چراغ کا ذکر کرنا ضروری تھا۔'' (کچھ شخصیات کو آئندہ سال کے لیے رکھا جاتا ہے۔ دو سال سے یہ سلسلہ چل رہا ہے اور ذکر مکرر بھی کم ہوا)۔

☆ عبدالحکیم کا تبصرہ کراچی سے۔ ''اداریے کا نیا رنگ بے مثال ہے۔ مختصر لیکن دلکش اور فکر انگیز! یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں نہیں، بے حسی اور بے ضمیر سماج کے گھناؤنے جسم پر اصلاح کے تازیانے ہیں۔ جن کا ہر ضرب انہیں خبردار کرتی ہے کہ بند کرو یہ سب! اب بھی وقت ہے۔ سنبھل جاؤ سدھر جاؤ۔ آپ نے اپنی رحم دلی اور انسان دوستی کے تناظر میں اس کہانی کو دیکھا ہے لیکن اس مادر پدر آزاد معاشرے کے پٹھوؤں نے اس طرح کی کہانیوں کو لہولہان کرکے اس کا اختتام ہی بدل ڈالا ہے۔ (آپ کی کہانی بہت اچھی ہے لیکن اس کا اختتام اتنا تلخ ہے کہ ہم شائع نہیں کرسکتے)۔ سرگزشت کے تمام مستقل سلسلے ایک سے بڑھ کے ایک ہیں۔ ان پر تبصرہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ میری نظروں نے سچ بیانیوں کو بھی اس طرح دیکھا۔ ''دھوکا'' ارسلان، ''المیہ'' دانیہ صدیقی، ''خودغرض'' سعدیہ، ''کلہاڑی'' ظفر عابدی، ''بے چارہ''، ''چھپن چھپری''، ''جھولا'' ارشد علی ارشد اور جناب انور فرہاد تو میرے فیورٹ رائٹر ہیں۔ میں ان کی تحریروں کا شیدائی ہوں۔ اس بار انہوں نے ماضی کی عظیم فنکارہ شمیم آراء کی دل سوز سرگزشت بیان کی ہے جو اپنی نانی کی لالچ کی بھینٹ چڑھ گئی۔ بڑی محنت اور جانفشانی سے چیدہ چیدہ معلومات فراہم کی ہیں جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ عبدالغفار فردوس صاحب کے ایکسیڈنٹ کا پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کو جلد از جلد صحت یاب کردے، آمین۔ جناب شوکت رحمٰن صاحب کی روداد آنکھیں نم کر گئیں۔ اللہ آپ کو صبر اور حوصلہ عطا کرے، آمین۔''

☆ عبدالجبار رومی انصاری کی تشریف آوری لاہور سے۔ ''پچھلی دفعہ بڑی شدت سے میری خواہش تھی کہ کاش میرا تبصرہ پہلے نمبر پر آجائے اور...... اور پھر اتنی جلدی یہ خواہش پوری بھی ہو گئی جب اکتوبر کا شمارہ سامنے آیا اور جلدی سے ''معبر خیال'' کی محفل میں پہنچا اور پہلے نمبر پر ہی اپنا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا شکریہ سرگزشت۔ خیر مبارک رانا محمد شاہ اور اویس شیخ بہت خوب صورت لکھا ہے۔ ویسے رانا محمد شاہد صاحب آپ بھی کوئی تحریر لے کے آئیں۔ احمد خان تو حیدی، بہت اچھا ہے تبصرہ۔ لڑکیوں کے بارے میں میرے خیال سے تو کوئی اسٹوری ہی ترتیب دے ڈالیں۔ کیونکہ ریٹائرمنٹ کے بعد اب تو فری ٹائم ہے نا۔ مسرت حسین رضوی اور اعجاز حسین سٹھار کی بھرپور آمد اچھی لگی۔ روبینہ نفیس انصاری بھی مسلسل پکار پر آخر حاضر ہو ہی گئیں۔ اچھی بات ہے لیکن تبصرہ مختصر ہی دکھا...... رشوت ستانی کسی ناسور کی طرح پھیلتی جارہی ہے اور جنہوں نے اس کا سدباب کرنا ہے وہی اس میں پور پور ڈوبے ہوئے ہیں تو اس کے ٹھیک ہونے کی توقع کس سے رکھیں۔ ''کوئی ہم نوا نہ تھا وہ تھا شاعری میں امیر۔ فٹ پاتھ پہ جان دے دی وہ تھا شعلہ تو فقیر۔'' یک صفحی سرگزشت میں ساغر صدیقی پر تحریر زبردست تھی۔ فیض رساں مفتی محمد شفیع پر تحریر و تحقیق بہت ہی حیران کن اور انمول تھی۔ بے شک آپ نے پاکستان کے بننے کے لیے اور اس کے بعد تک گراں قدر خدمات انجام دی ہیں جو ناقابلِ فراموش ہیں اور ڈاکٹر ساجد امجد دارالعلوم دیوبند کی شخصیات کی سرگزشت مسلسل لائے ہیں۔ پاکستان کے ''دل دردمند'' عبدالستار ایدھی پر ابنِ کبیر کی تحریر اچھی تھی۔ ولیپٹ کے بچے حقیقت ہوں یا مفروضہ ان کی پراسراریت اپنی جگہ ہے، کہانی دلچسپ رہی۔ کراچی کا سر بلند کرنے والی حمیرا اجمل کی جہدِ مسلسل بھی اپنی مثال آپ ہے جو اپنی محنت و عظمت کے بل پر دنیا میں اپنا نام پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ''جو کشمیر میں پاکستان کا جھنڈا لہرائے گا میں اس سے میں شادی کروں گی'' تیکی بائی شمیم آراء بھی اپنے عہد کی عظیم اداکارہ تھیں جنہیں شادیاں تو راس نہ آئیں لیکن آخر وقت میں اس کے بیٹے نے اپنی عظیم ماں کو ضرور سنبھال لیا۔ ''صلیب'' ایک بار پھر اپنے عروج پر ہے۔ غزہ کے دیوانو اٹھو، آرینا جیسی ماؤں کے دلوں میں ٹیس اٹھتی ہے تو وہ اپنے جگر گوشوں کو بھی فلسطین کے لیے وقف کر دیتی ہیں مگر فلسطین کو آزاد کروانے کے لیے صلاح الدین ایوبی کی روح کو بیدار ہونا ابھی باقی ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' عجیب ہی نظامِ زندگی ہے۔ ہلکا سا دھواں اٹھا اور فائر الارم بج اٹھے۔ سیکیورٹی گارڈ کی ڈیوٹی ندیم صاحب کے لیے چیلنج بن گئی لیکن ہیں تو پاکستانی کسی دیسی طریقے سے اس چیلنج سے بھی نمٹ لیں گے۔ معلوماتی تحریر ''یہ چاند تارے'' بھی دلچسپ رہی اگر مریخ پر درجہ حرارت منفی 140 اور مثبت 20 ڈگری ہے تو سائنسدان اس پر زندگی کیسے تلاش کرنے میں لگے ہیں؟ باقی اسرارِ کائنات تو عجوبات سے بھری ہوئی ہے۔ تشنہ لب حبیبہ نے عثمان کو چھوڑ کر کاشف کی اسیر ہونا چاہا تو ذلیل و خوار ہو گئی۔ نادان لڑکی اپنی خوب صورت زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی اور اب بچوں کو پڑھا کر فریدہ کے روپ میں کفارہ ادا کرنے لگی ہے۔ ابارشن شدہ نوزائیدہ بچوں کے ساتھ روح فرسا واقعات دل دہلا دیتے ہیں۔ اور انہیں بچانے کے لیے تنظیم سازی اچھا اقدام تھا جیسے ہمارے پاکستان میں ایدھی سینٹروں میں جھولا موجود ہے ایسے نوزائیدہ کے لیے دانیہ صدیقی نے المیہ میں

بہت نازک موضوع پر تحریر دی ہے۔"

☆ سیف اللہ کی آمد ملک وال سے۔ "معاشرے میں رشوت ستانی کی جو تصویر پرچے کی پہلی کہانی میں معراج رسول صاحب نے دکھائی ہے اس سے واضح تصویر اور کیا ہوگی۔ شعلہ نوا فقیر یعنی ساغر صدیقی صاحب سے ملاقات ہوگئی اور ان کے حالات زندگی یادداشت میں تازہ ہوگئے۔ کیا عظیم شاعر تھے ساغر صاحب۔ مفتی شفیع صاحب کی سوانح پڑھنے کو ملی، علم میں اضافہ ہوا۔ ساجد امجد صاحب کا شکریہ۔ اختر شہاب صاحب کا مضمون "ولپیٹ کے بچے" ابراہیم جمالی کی "یہ چاند تارے" معلوماتی تحریریں ہیں، اچھی لگیں۔ اعجاز احمد راحیل کا مضمون "جہد مسلسل" سبق دے رہا ہے کہ مستقل مزاجی سے محنت کرتے رہنا ہی زندگی کی خوب صورتی ہے۔ انور فرہاد آفاقی صاحب کی کمی پوری کر رہے ہیں۔ اللہ انہیں ہمت اور حوصلہ دے۔ صائمہ اقبال صاحبہ کی تحریر "متبرک شخصیات" میں نئے نئے لوگوں کی وجہ شہرت کا پتا چلا۔ "شمشال سے ٹورنٹو" تک کی تعریف اور کیا کی جائے۔ تحریر خود بتا رہی ہے کہ سفرنامہ اچھا جارہا ہے۔ سلمیٰ اعوان صاحبہ کی تحریر "ٹیس" جذبات بہت بھلی لگی۔ ایدھی صاحب کی وفات کے بعد ٹی وی اور اخبارات میں ان کے متعلق بہت کچھ دیکھنے اور سننے کو ملا مگر پرچے میں ابن کبیر صاحب کی تحریر "دردمند دل" میں ایسی ایسی باتیں پڑھنے کو ملیں جن کا پہلے علم نہ تھا۔ پوری تحریر ابن کبیر صاحب کی محنت کا پتا دے رہی ہے۔ پوری تحریر پڑھنے کے بعد جہاں ایدھی صاحب انتہائی بلندیوں پر نظر آئے وہیں اپنے آپ کو انتہائی پستیوں میں دیکھ رہا ہوں اور آج میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اللہ کی عطا کی ہوئی زندگی رائگاں گزار دی۔ اپنی زندگی پر نگاہ ڈالی ہے تو پتا چلا ہے کہ میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس پر میں فخر کرسکوں۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری کی آمد کراچی سے۔ "آپا طاہرہ گلزار غائب ہیں۔ اللہ خیر کرے آپا سلامت رہیں۔ واہ جی روبینہ نفیس انصاری کی عرصہ بعد مختصر آمد۔ آتی رہا کریں۔ سلمیٰ میر نے اچھی پکڑ کی میں بھی اگست کے شمارے میں شائع شدہ ایک شعر پر کہنا چاہوں گی کہ اصل شعر ہے خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے' میں موصوفہ نے خنجر کی جگہ چھریاں چلا کر گویا پڑھنے والوں کے دل پر چھریاں چلادی ہیں (بالکل صحیح ہے)۔ عبدالغفار فردوس، اللہ آپ کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے (آمین)۔ انکل نے اداریہ میں ایک بار پھر کہانی سنائی۔ ایک معمول کی کہانی جو ہمارے اردگرد ہر گزرتے لمحے دہرائی جاتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ رشوت لینے اور رشوت دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے جہنم کی آگ خرید کر جنت کا سودا کیا جاتا ہے۔ عبدالستار کی ماں کی اعلیٰ تربیت نے اسے انسان سے فرشتہ بنادیا۔ ایدھی صاحب پر بہت کچھ لکھا گیا۔ میڈیا نے انہیں خوب سراہا۔ لوگوں کے دلوں میں وہ دعاؤں کی صورت بستا رہا مگر ان کو خراج پیش کرنے کا جو انداز ابن کبیر نے اپنایا وہ سب سے منفرد رہا۔ سلمیٰ اعوان کی "لہو رنگ" تحریر دل کو لہولہان کرگئی۔ فلسطین کے عوام پر ہونے والے مظالم پر کشمیر کا منظر نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہاں بھی فلسطین کی تاریخ ہی دہرائی جارہی ہے۔ ظلم و جبر سہتے سہتے کشمیریوں پر آج بھارت نے مظالم کی انتہا کردی ہے۔ فلسطینیوں نے تو صلاح الدین ایوبی سے شکوہ کردیا۔ کشمیر کے بیٹوں کی آہ کون سنے گا؟ ماؤں کی لہو برساتی آنکھیں شکوہ کناں ہیں۔ "فلمی الف لیلہ" کی یادیں اس دفعہ انور فرہاد نے تازہ کردیں۔ افسوس کہ اس سانولی سلونی اداکارہ کو ہم نے ان کی موت کے بعد جانا۔ تھوڑی بہت معلومات تھی کچھ کچھ گیت بھی سن رکھے تھے مگر اتنی زیادہ تاریخ پہلی دفعہ ملی۔ اعجاز احمد راحیل نے "جہد مسلسل" میں نایاب شاہکار سے متعارف کروایا۔ ہمت اور لگن بلند ہو تو قطرہ قطرہ دریا بنتے دیر نہیں لگتی۔ "تشنہ لب" پڑھ کر حبیبہ کی بے بسی پر بے تحاشا ترس آیا۔ گھر سے ملنے والی آزادی انڈین فلموں کی بے ہودگی یا پھر کچے خوابوں کے پیچھے بھاگنے کی خواہش ان سب میں آپ کی بربادی کا ذمے دار کون ہے۔ یہ آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ بس خدا پاک حوا کی بیٹیوں کو ایسے راستوں پر بھٹکنے سے بچائے۔ "المیہ" نے کرب میں ڈال دیا۔ یہ کیسا ظلم ہے، کیسا قانون ہے یہ کیسی مسیحائی ہے لعنت ہے۔ جہاں کے مسیحا اپنے ہاتھوں سے جیتے جاگتے بچوں کو موت کی جھولی میں ڈال دیں۔ "شمشال سے ٹورنٹو" میں سرجی اور شہباز کی نوک جھوک نے بہت لطف دیا۔ بے چارے سرجی آپ کو سحری اور افطاری میں مزے کراتے رہے اور آپ دونوں مل کر انہیں ستاتے رہے۔ واہ بھئی واہ مزہ آگیا اس دفعہ کی قسط پڑھ کر۔"

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے (پورے دس فل اسکیپ پر، یہی باتیں مختصر الفاظ میں ہوتیں تو زیادہ بہتر تھیں۔ جو جملہ ایک بار لکھ دیا جائے اسے دوبارہ لکھنے سے ہی طوالت بڑھتی ہے، خیر آئیے خط کی طرف) وہ لکھتی ہیں۔ "اس بار حیرت انگیز طور پر اپنا فیورٹ سونٹ سا محبوب سرگزشت 29 ستمبر کو ملا۔ معیاری اور لاجواب ہے۔ دوسرا مہینا جارہا ہے کہ میرا خط "شہر خیال" میں تو کیا بلیک لسٹ میں بھی جگہ نہیں پاتا۔ جب کہ شہر خیال کے کافی دوستوں نے میری غیر موجودگی کو محسوس کیا ہے ان کا شکریہ (خط وقت پر موصول نہیں ہوا تھا)۔ میں نے اپریل کے مہینے میں اپنی سچ بیانی بھیج دی ہے۔ (ابھی لکھنے سے زیادہ پڑھنے پر توجہ دیں کہ الفاظ کس طرح سجائے جاتے ہیں) اس بار بھی معراج رسول انکل کی کہانی ہمارے معاشرے کے منہ پر طمانچہ ہے۔ معراج انکل کے الفاظ ہیرے، موتی کی طرح صفحہ قرطاس پر بکھرتے ہیں لیکن افسوس چننے والے بہت کم اور بہت کمزور ہیں۔ انکل! یہ کہانی کہیں اور کی نہیں بلکہ اسی ملک کی ہے۔ پاکستان کے قیام کے ساتھ اس کی بھی شروعات ہوئیں اس وقت کی کرپشن ایک روپے، پانچ روپے اور پچاس روپے تھی۔ اب 69 سال گزرنے کے بعد دس ہزار، پچاس ہزار اور پانچ لاکھ تک ہوگئی ہے۔ یہ تو معمولی پوسٹ کے لیے رشوت ہے۔ شرم آتی ہے اب اور غصہ بھی آتا ہے۔ جب یہ سنتی ہوں کہ یہ ملک اسلام کے نام پر مسلمانوں کے لیے بنا۔ پرسوں ایک وکیل سے بات چیت ہو رہی تھی کالج میں۔ اس کی بیٹی کے داخلے کے لیے ایک کلرک اکیس ہزار رشوت مانگ رہا تھا۔ اب آپ بتائیے جس بندے کی تنخواہ پچاس ہزار ہو کیا وہ یہ رشوت دے سکتا ہے؟ یک جی میں "شعلہ نوا فقیر" اتنے اچھے شاعر ساغر صدیقی کے بارے میں پڑھا۔

بہت کچھ جاننے کے ساتھ ساتھ مزہ بھی خوب آیا۔ میں اس ایک صفحے کے بارے میں اپنے کالج کے اسٹوڈنٹس کو ضرور بتاتی ہوں تاکہ ان کو اردو ادب کے بارے میں اچھی معلومات حاصل ہوں۔ سرگزشت کا اردو ادب کو پھیلانا ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ معراج رسول انکل کو اور ادارے والوں کو دونوں جہانوں کا اجر عطا کرے۔ جاسوسی، سسپنس، سرگزشت اور پاکیزہ تا قیامت جگمگاتے رہیں، (آمین)۔ چلتے ہیں اب اپنی محفل "شہر خیال" میں کہ کس کس نے ہمیں یاد کیا۔ "شہر خیال" کے دروازے پر ٹوٹے دل کے ساتھ دستک دی۔ جب دروازہ کھل گیا تو سامنے اپنے اتنے اچھے اور نفیس خیالات کے مالک دوست عبدالجبار رومی انصاری کا خوب صورت اور جگمگاتا چہرہ نظر آیا تو اپنا دکھ وقتی طور پر بھول گئی۔ مبارکاں مبارکاں۔ ہمیشہ کی طرح بہت ہی شاندار، جامع، معیاری اور تفصیلی تبصرہ، ویلڈن رومی۔ رانا محمد شاہد بھائی بھی اپنی مخصوص طرز تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ بھائی مجھے خود جاوید میانداد، وقار یونس، عامر سہیل اور شعیب ملک بہت پسند ہیں۔ سیف اللہ ملک وال والے بھائی بھی بہت جامع، معیاری لیکن مختصر تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ نزاہت افشاں ڈیئر بہت بہت شکریہ مجھے یاد رکھنے کا۔ آپ کا مختصر تبصرہ بھی پسند آیا۔ احمد خان توحیدی بھائی گھر لوٹنے پر مبارک باد۔ توحیدی بھائی مجھے نیک، صالح، سچا اور محبت کرنے والا دکھ سکھ سمجھنے والا انسان چاہیے جو صرف میرا ہو، مرد نہیں جو ہر جگہ آنکھیں سینکے۔ ایسے ساتھی سے اکیلا پن ہزار درجے بہتر ہے۔ توحیدی بھائی میں تو شروع سے آپ، جاوید کا دوانی اور سعید چاند بھائی کے تبصرے بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آفتاب احمد نصیر بھائی بھی اپنے شاندار تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ اویس شیخ خوبصورت اور جامع تبصرہ کے ساتھ حاضر تھے۔ اویس بھائی! میں ہر مہینے وقت پر تبصرہ رجسٹری کرتی ہوں۔ میں سدرہ بہن سے زیادہ مستقل مزاج ہوں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ کاش بطور ایک قوم کے ہم حسد، رشک اور ٹینس دینے سے دور رہیں، (آمین)۔ سید مسرت حسین رضوی کا تبصرہ بہت ہی جامع اور تفصیلی تھا۔ قیصر خان آف بھکر بھی بہت شاندار اور جامع تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ انور عباس شاہ کا حسب عادت خوب صورت تبصرہ تھا۔ مجھے یاد رکھنے کا شکریہ۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس بار ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری نے محفل میں انٹری ماری۔ میری دعا ہے اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ ویلکم محمد عامر ساحل یہ محفل آپ کی اور ہم سب کی مشترکہ ہے ہم سب ایک خاندان کی طرح ہیں اور معراج انکل ہمارے بزرگ ہیں، اللہ ان کو جلد صحت یاب کرے، (آمین) اعجاز حسین سحار اور خالد کبیر کی محفل میں واپسی پر ویلکم۔ تبصرہ بہت جاندار رہا۔ سدرہ بانو کا بھی حسب معمول جامع اور معیاری تبصرہ تھا۔ سدرہ ڈیئر ہمیں اتنا Miss کرنے کا شکریہ۔ آخر میں شوکت رحمٰن خٹک اتنے عرصے بعد حاضر تھے۔ بہت اچھا لگا لیکن ساتھ ہی شاہد جہانگیر شاہد کی یاد بھی دلا دی۔ شاہد صاحب بہت اچھے اور نفیس انسان تھے۔ اللہ ان کو، نواب انکل، کاشف زبیر اور مختار آزاد کو جنت الفردوس عطا فرمائے، (آمین)۔ سائنسی تحریر "چاند تارے" ابراہیم جمالی کی بہت جامع لیکن مختصر تھی۔ صائمہ اقبال نے اس بار اکتوبر کی تمام شخصیات بہت اچھی لکھی۔ "سراب" کی یہ قسط بھی ایکشن میں رہی۔ مرشد ایک بار پھر شہباز کے دوستوں کے پیچھے رہ کر ایک بار پھر حسب عادت پھر اغوا۔ اور اپنے رب کے فضل سے ایک بار پھر آزاد لیکن اس بار پھر نیکی کرنے بڑھا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ کہیں وہ مشکل بن جائے کہ خود بندہ چاہے کہ "آنچل مجھے مار"۔ باقی تحریر لاجواب ہے۔ "تشنہ لب" میں یہ ہرگز نہیں کہتی کہ حبیبہ نے ٹھیک کیا لیکن مجھے ان شوہروں کی سمجھ نہیں آتی کہ دوسروں کے حقوق کو فرض اولین سمجھتے ہیں لیکن بیوی کے لیے بے حس ہو جاتے ہیں۔"

☆ محمد احمد رضا انصاری کی آمد کوٹ ادو سے۔ چند مہینوں بعد دوبارہ حاضر خدمت ہوں۔ اس مہینے کا سرگزشت جلدی مل گیا۔ سوچا اس دفعہ خط لکھ ہی لوں۔ ستمبر کا شمارہ تو باوجود ہزاروں کوششوں کے پڑھنے میں ناکام رہے۔ نیوز ایجنسی پر خریدنے گئے تو پتا چلا کہ سرگزشت تو آ کر ختم بھی ہو چکا ہے۔ صدمے سے ہماری جو حالت ہوئی بس نہ پوچھیے۔ پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ ہم سرگزشت نہ پڑھ سکے (ایجنسی والوں سے کہیں کہ وہ زیادہ تعداد میں منگوائیں) مگر اس بار ہم چوکس ہو کر بیٹھ گئے تھے جیسے ہی میگزین آیا ہم نے فوراً لے لیا۔ اداریے میں معراج انکل کچھ مہینوں سے دلچسپ کہانیاں سنا رہے ہیں۔ ہر کہانی میں سبق ہی سبق ہوتا ہے (سرگزشت کی ہر چیز منفرد ہوتی ہے اسی لیے اداریہ بھی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے) اس بار کہانی کا موضوع رشوت تھا۔ واقعی پورے ملک میں یہ ناسور پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کا فوراً سدباب ہونا چاہیے۔ "شعلہ نوا فقیر" میں ساغر صدیقی کے حالات زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ "شہر خیال" میں محترم عبدالجبار رومی انصاری کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ بہت دلچسپ اور بہترین خط تھا دیگر قارئین کے تبصرے بھی خوب تھے۔ اس ماہ کا سرگزشت دکھی تحریروں سے مزین تھا۔ اکثر تحریریں پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ ناصح کرالیہ، جھولا، بے چارہ سرفہرست تھیں۔ محترم طارق عزیز کی تحریر "چال" پڑھ کر تھوڑی سی ہنسی بھی آئی۔ اپنی غلطی چھپانے کے لیے قبر سے مردہ نکال کر نہر میں رکھ دیا۔ "دھوکا" ایک پُراسرار تحریر تھی۔ حیرت انگیز، خود غرض کچھ خاص نہ تھیں۔ "تشنہ لب" اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ ایک نصیحت آموز کہانی تھی۔ "شمشال سے ٹورنٹو" میں اس کی ایک قسط نہیں پڑھ سکا۔ بہت دلچسپ سفرنامہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہم بھی ان کے ساتھ ہی اس سرد جہنم میں پہنچ چکے ہیں۔ ہاہاہا (جو قسط مس ہوئی ہے بتا دیں اگر پرچہ موجود ہوگا تو بھیج دیا جائے گا)۔ کترنیں بھی معلومات سے بھرپور تھیں۔ مجھے اسلامی ملکوں کے بارے میں جاننے کا بہت شوق ہے، خاص کر وہ ممالک جو یورپ اور روس سے آزاد ہوئے ہیں۔ کیا اس موضوع پر کوئی مضمون دینا پسند کریں گے؟ (کئی مضامین آ چکے ہیں)۔ "بیت بازی" بھی خوب تھی۔ درشہوار عابدی، اطہر حسین، عبدالجبار انصاری اور سید محمد حسین کے شعر ٹاپ پر تھے۔ "علمی آزمائش" میں سیکڑوں لوگ صحیح جواب دیتے ہیں مگر انعام صرف پانچ لوگوں کو ملتا ہے کیوں؟ کم از کم دس لوگوں کو تو انعام دیا کریں ناں! (پانچ لوگوں پر ہی ہر ماہ ایک بڑی رقم سرکولیشن سیکشن والے لے جاتے ہیں پرچہ بھیجنے کے نام پر)

☆ قیصر خان کی تحریر بکھر سے۔ ''اداریے میں پولیس کی کارکردگی کو صحیح لفظوں میں بتایا گیا ہے۔ پولیس کا نظام تبدیل ہونا چاہیے۔ دوسرے ممالک میں پولیس نجات دہندہ ہوتی ہے مگر یہاں مصیبت۔ بندہ اگر پولیس سے مدد مانگ بیٹھے تو......! ایک تھی میں ساغر صدیقی کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا۔ اتنا قابل آدمی غربت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ''شہرِ خیال'' میں رومی صاحب تو شادی کے بعد قسمت والے بن گئے ہیں۔ مطلب ہمیں بھی شادی کر لینی چاہیے۔ محمد شاہد نے عامر سہیل، سعید انور کے بارے میں لکھا نہیں بلکہ توجہ مبذول کرائی۔ توحیدی صاحب آپ کو بھولنے والے دوست نہیں ہیں۔ اشرفی صاحب حاضر تھے خوب صورت تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ بھکر سے ضیاء صاحب اور شاہ جی حاضر تھے، خوشی ہوئی۔ اویس شیخ، سید مسرت رضوی، حاجی اعجاز خالد کبیر، شوکت رحمٰن خٹک کے تبصرے اچھے لگے۔ کافی عرصے بعد ہماری بھکر کی آپا جان ڈاکٹر روبینہ نفیس حاضر تھیں۔ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ انہی کی وجہ سے شہرِ خیال میں داخلہ لیا تھا۔ عبدالغفار صاحب کے ایکسیڈنٹ کا پڑھ کر افسوس ہوا، اللہ ان کو صحت دے، (آمین) محمد عامر ساحل حاضر تھے۔ عامر جی دو سال تک ناراض رہے ہم لوگوں سے، اب سلامت رہو، ملتے رہو۔ شاہد جہانگیر شاہد ہمیں چھوڑ گئے ہیں جو سب کو یاد رکھنے والے نیک انسان تھے۔ مرنا ہر کسی کو ہے۔ عامر دوست آئندہ ضرور حاضری دیں۔ ملاقات بھی کرتے ہیں بہت جلد۔ سیف اللہ نے بھی دوستی کی طرف توجہ دلائی۔ غیر حاضر دوستوں میں آپا طاہرہ گلزار صاحبہ، ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ، جونانی صاحب، معظم علی، خالد ملتان والے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے جادوئی الفاظ کے ساتھ بہت باعمل عالم کو پڑھنے کا موقع ملا۔ ابن کبیر صاحب نے انمول مضمون لکھا ہے، دل باغ باغ ہو گیا۔ حمیرا بجل کی محنت اور لگن کے بارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی کہ انسانیت زندہ ہے۔ انور فرہاد واقعی لاکھوں میں ایک کا خوب صورت مضمون لائے۔ انور فرہاد صاحب ایک اداکارہ نیلی تھی۔ ان کے بارے میں بھی لکھیں۔ زندہ لوگوں کے بارے میں ضرور لکھیں تاکہ ہمیں معلوم ہو وہ اسٹار اب کیسے جی رہے ہیں جو کبھی لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔ سلمیٰ اعوان، شفقت محمود، ابراہیم جمالی کے مضامین اچھے لگے۔ ندیم اقبال صاحب پھر موتی پروئے ہوئے تھے۔ بہت خوب صورت طریقے سے سفرنامہ لکھ رہے ہیں۔ منظر امام حاضر نہیں تھے۔ شخصیات کو صحیح پڑھنے کا موقع مل رہا ہے۔ صائمہ اقبال صاحبہ آپ سلامت اور خوش رہیں۔''

☆ سید مسرت حسین رضوی کا کراچی سے خط۔ ''معراج رسول صاحب کی کہانی میں جو بیان کیا گیا وہ آپ کو ہر جگہ ملے گا کیونکہ کسی نے دو تجزیہ نگاروں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ آپ یہ بتائیں پاکستان کس طرح ترقی کر سکتا ہے چنانچہ ایک ماہ کی جدوجہد و معلومات کے بعد مگر پھر یہ بات سامنے آئی کہ اگر آپ دو کام ختم کر دیں تو پاکستان ایک مثالی پاکستان بن سکتا ہے اور وہ یہ کہ پہلے نمبر پر رشوت اور دوسرے نمبر پر جھوٹ کو ختم کر دیں۔ لہٰذا معراج رسول صاحب یہ دونوں کام ختم نہیں ہو سکتے تو پھر یہ ناسور کیسے ختم ہوگا؟ ''شعلہ نوا فقیر'' اچھی لگی۔ ''شہرِ خیال'' میں عبدالجبار رومی انصاری کو میرا تبصرہ پسند آیا، پڑھ کر اچھا لگا۔ نزاہت افشاں، اویس شیخ صاحب کی پسندیدگی کا بھی شکریہ۔ شوکت رحمٰن خٹک کی بیماری کا پڑھ کر اور دونوں ٹانگوں کے کٹ جانے کا بہت زیادہ دکھ ہوا، اللہ ان کو صحت دے، (آمین)۔ ''سراب'' بھی منزل کی طرف رواں نظر آتی ہے اس کہانی کو سنبھال لیا گیا ہے، بہت خوشی ہوئی۔ ''دل دردمند'' عبدالستار ایدھی کی زندگی پر لکھے مضمون نے یاد دلا دی مرحوم کی۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ بڑے ہی ہمت والے انسان تھے۔ ''لاکھوں میں ایک'' شمیم آراء کا مضمون دلچسپ رہا۔ اس اداکارہ کے مطابق پہلے بھی کافی بیان و کہانیاں آتی رہی ہیں۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' سفرنامہ اچھا جا رہا ہے۔ معلوماتی دلچسپ روداد ہے۔ ''اکتوبر کی شخصیات'' میں معروف لوگوں کے بارے میں حالات جاننے کا موقع ملتا ہے۔ اچھی کاوش ہے۔ ''تشنہ لب'' زویا اعجاز لاہور کی سچ بیانی نئی نسل کی ان بگڑی لڑکیوں کے لیے سبق آموز ہے جو اپنی شان میں قصیدہ گوئی چاہتی ہیں۔ تعریف و توصیف بھی آزاد خیال کی حامل لڑکیوں کو ایسے ہی قدرت کی طرف سے ٹھوکر لگتی ہے۔ پھر وہ نہ دین کی نہ دنیا کی رہتی ہیں۔ کہانی پسند آئی انداز بیاں بھی خوب تھا۔ استاد جی شمیم غوری کی سچ بیانی بہت زیادہ پسند آئی۔ ایسے کردار پہلے ہوتے تھے۔ بلبل ہزار داستان کی بلڈنگ آج بھی موجود ہے لیکن وہ حیثیت نہیں ہے بلکہ تجارت پیشہ افراد کا گڑھ بن چکی ہے۔ نگار سینما کے آگے کے تمام مکانات و بلڈنگوں کے نیچے دکانیں ہیں جن میں سامان تجارت موجود ہیں اور فروخت ہوتی ہیں۔ کہانی نے متاثر کیا۔ ''المیہ'' دانیہ صدیقی کی تحریر کردہ سچ بیانی متاثر کن تھی مگر افسوس کہ ہر ایک اس طرح کے اقدامات نہیں کر سکتا۔ ''کلہاڑی'' ظفر عابدی کی کہانی مزاحیہ انداز کی اچھی لگی۔ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ اپنی پسند کسی اور کے حوالے کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے اور پھر دھچکا برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ''بے چارہ'' چھپن چھری کی تحریر مقام عبرت ہے ان وڈیروں کے لیے جو انا پرست ہوتے ہیں۔ کہانی اچھی لگی۔ بچھڑ جانے والی یا اغوا ہونے والے بچیوں کا ایسا ہی المیہ ہوتا ہے۔ ''دھوکا'' ارسلان کراچی کی سچ بیانی پڑھی۔ ان کا بیان اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ ان کے ساتھ کوئی دھوکا یا فریب نہیں ہوا بلکہ ان کی مسلسل مدد ہی کی گئی۔ البتہ ارسلان نے قطب الدین کو پہچاننے میں غلطی کر دی۔ دراصل قطب الدین قوم اجنا سے تھے اور ارسلان کا ہر کام ان کے لیے چٹکی بجانے کا کام تھا۔ چونکہ وہ یعنی قطب الدین جن تھے اس لیے کوئی مشکل نہ تھا۔ ارسلان نے قارئین سے پوچھا ہے اس لیے ان کی خلش کو ختم کرنے کے خیال سے اظہار کر دیا۔ ''چال'' طارق عزیز جان سرکاری محکموں میں اپنی کوتاہی چھپانے کے لیے جلد بازی میں ایسے ہی الٹے سیدھے اقدام کر لیے جاتے ہیں جو بعد میں معلوم ہوتا ہے کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ ''خودغرض'' سعدیہ کا تحریر کردہ واقعہ درست ہے۔ ایسے ہی سوچ و بچار میں ٹائم نکل جاتا ہے پھر پچھتانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

☆ اویس شیخ کا اظہاریہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ''اداریہ میں آپ وطن عزیز کی لاریب حقیقت کو سامنے لائے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس تم ظریفی کا کھیل جعلی کلیموں سے شروع ہوا۔ پاناما لیکس سے لے کر یہاں تک جاری و ساری ہے۔ ورلڈ میں بطور اسٹیٹ ہم کرپشن اور رشوت

ستانی کا سمبل بن چکے ہیں۔ ”شعلۂ نوا فقیر“ پڑھی۔ اگر ٹیلنٹ اور تربیت کا شعور ہوتا تو درویش شاعر دربدر کی ٹھوکریں کھا کر یہ کہنے پر کبھی مجبور نہ ہوتے۔ ”نہ جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں۔ ”شمیم خیال“ میں سب سے پہلے انکل شوکت رحمٰن خٹک کو میرا محبت بھرا اسلام۔ آپ کی تندرستی اور ہمت کے لیے دعا گو ہوں۔ شاہد جہانگیر کو کھو دیا آپ کو ہرگز کھونا نہیں چاہتے۔ رومی صاحب نے بہترین نامے کے ساتھ لفظ مکس کی انٹروڈکشن کروائی۔ اچھے خطوط نگاری کی یہی نشانی ہے۔ آفتاب، رضوی، سدرہ اور توحیدی کے خطوط پسند آئے۔ قیصر خان نے بھی کافی اچھا لکھا۔ غلام حسین کے سوال مسلمانوں کی نا اتفاقی پر آپ نے لکھا کہ یہ ہماری کمزوری ہے۔ میں اسے یکسر مسترد کرتا ہوں۔ کمزوری نہیں بلکہ اپنے اپنے مفادات عزیز ہیں۔ دشمن اسی مفاد کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ آپ مجھے بتائیں گجرات کے بڑھک باز قصاب کو مسلمانوں کے روحانی مرکز سے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا گیا؟ یہی بدبو دار ذہنیت کا مالک جب دبئی جاتا ہے تو وہاں اس کے لیے مندر کی تعمیر کا سوینئر طشتری میں رکھ کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ ترکی اسرائیل میں اپنا سفارت خانہ کھول رہا ہے۔ شام کو تباہ کرنے میں ”اپنے بھائی“ شریک ہیں۔ اس پر کچھ سمجھنے کی ضرورت ہے؟ محفل سے غیر حاضر دوست عمران جونانی، بڑی بہن طاہرہ گلزار، مے عزیز، صائمہ نور اور شگفتہ مشتاق ہم آپ کو بھولے نہیں۔ ”فیض رساں“ کی زاہدانہ زیست کے قابل رشک واقعات پڑھے۔ اقبال کا شعر نگاہوں میں گھوما وہ چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم۔ پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم۔ ”دل دردمند“ پڑھی۔ دنیا کو اب شاید ہی ایسا ایدھی ملے۔ ”جہد مسلسل“ عورت کو کم اصل، کمتر اور کم عقل خیال کرنے والے فرسودہ ذہن کے حاملین کے منہ پر طمانچہ ہے۔ ”نغمہ نگار“ کے مشہور تین گیتوں کو نیٹ پر ڈاؤن لوڈ کر کے سنا۔ گیت میں کمال کی سینس اور اخلاقیات سے لبریز جملے دل کو چھو گئے۔ فلم نگری کے متعلق جو خاکہ تھا وہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ چونکہ بچپن سے ہی فلم اور موسیقی سے دل اچاٹ تھا اب پتا چلا اچھی موسیقی بھی انسان کی نفسیات پر اچھے اثرات مرتب کرتی ہے۔ ”ٹیس“ اس بار سلمٰی اعوان مسلمانوں کی دکھتی رگ کا حصہ لے آئیں۔ جولائی 2014ء کی خوفناک جنگ کے مناظر آنکھوں کے سامنے آگئے۔ ان نہتوں پر قیامت ٹوٹی تھی۔ اب کشمیر قیامت صغریٰ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ کی اسٹیج پکچر میں آپ ہیں، یہ جان کر اور پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ویسے آپ بھی ماشاء اللہ ہینڈسم ہیں۔ ”یہ چاند تارے“ معلوماتی اور سوغاتی تحریر تھی کیونکہ سائنس میں خصوصاً فزکس بہت پسند ہے۔ ”اکتوبر کی شخصیات“ میں طارق علی اور جلال الدین اکبر کے تذکرے بہت پسند آئے۔ سچ بیانیوں میں ”تشنہ لب“ پڑھی۔ ”تمہارا ناپاک وجود بالکل برداشت نہیں۔ یہ غلاظت بھری زندگی تمہیں مبارک ہو۔“ شوہر کے یہ الفاظ ضرور عرش بریں سے ٹکرا کر قبول ہوئے ہوں گے۔ دل کی بے ضرر تمنا اور حسن کی آدھی ادھوری پیاس کو بجھانے کے لیے حبیبہ نے جو راستہ اپنایا اس کا بھیانک اور ذہنوں کو جھنجوڑ دینے والا عبرت ناک انجام اپنے پیچھے بہت سے سوالات چھوڑ گیا۔ ”جھولا“ میں ایدھی صاحب کو خراج عقیدت بھی تھا اور معاشرے میں بے راہ روی کا شکار نوجوان نسل کے لیے پیغام کہ خدارا اپنی خواہشات کی خاطر رسوائی کے ڈر سے ننھی جانوں کا گلا مت کاٹو۔ ”استاد جی“ پڑھی۔ واقعی حیرت انگیز بیانی تھی لیکن پھر حرف آخر ان کا انجام وہی ہوا جو اس طرح کے کاموں میں ہوتا ہے۔ ”المیہ“ پڑھی۔ روز محشر ایک کربلا حسن و حسین کی ہوگی اور دوسری کربلا ان کروڑوں ننھے معصوموں کی ہوگی جہاں یہ فریاد کریں گے، اے خدا کیسا قانون تھا جہاں انسانیت مسیحاؤں کے سامنے کلبلا کر، سسک کر اور تڑپ تڑپ کر جان دیتی رہی۔ ”کلابازی“ پڑھی۔ انسان کے دل میں چھپی حسرتوں اور خواہشوں کو خدا ایسے وسائل سے پورا کرتا ہے جہاں وہم و گمان تک نہیں ہوتا۔ انسان دنگ رہ جاتا ہے اور سمجھنے کی سعی نہیں کر پاتا۔ وہم و گمان سے ناآشنائی اسے ہی تو کہتے ہیں۔ ”دھوکا“ قطب الدین کا کردار الہ دین کا چراغ سے کم نہیں تھا۔ میں جب بھی سرگزشت میں ایسی اسٹوریز پڑھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ واقعی ایسا کچھ ہوتا بھی ہے یا یہ زیب داستان ہوتی ہے۔ ”چال“ پڑھی۔ اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی گھٹیا کوشش اور وہ بھی اس حد تک واہ رے پاکستانی! دو نمبری ہم پر شروع اور ہم پر ہی ختم! خس کم جہاں پاک۔ ”خود غرض“ میں ارشد خود غرض نہیں تھا۔ ارشد کے متعلق لفاظتی نوک جھوک بھی انتہائی شرمناک تھی۔ اس نے اپنے ساتھ جو سلوک دیکھا اس نے بھی ویسا ہی کیا۔ انتہائی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ رہا خالہ بھانجے کا پیار وہ ازل سے ہی اس طرح کا ہے۔“

☆ نجمی رحمٰن برٹ لیٹ امریکا سے لکھتی ہیں۔ ”ستمبر کا شمارہ 19 ستمبر کو ملا۔ حسب معمول رنگا رنگ تحریروں سے سجا ہوا سید عبداللہ کی بہت شہرت سنی ہے اللہ کا نیک بندہ اور داستان یاری زندگی پیچ و خم کی داستان۔ سلمٰی اعوان، دردناک کہانی لے کر آئی ہیں۔ تاریخ پاک وطن اختتام کو پہنچی۔ وزیروں نے کیا گل کھلائے۔ پاکستان کی جڑوں میں ہزاروں شہیدوں کا خون رچا ہے سب بھول گئے۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ دلچسپ جا رہا ہے لیکن مجھے بھی ذرا مختلف تجربے ہوئے۔ ویلڈن لکھتے رہیں۔ ”ہم زندہ ہیں“ واقعی حیران کن ہے۔ ہم لوگ کئی کرداروں کو سچ مچ کا سمجھ رہے تھے۔ ”ستمبر کی شخصیات“ میں پہلا نام ہمارے قائداعظم کا ہے۔ ان جیسا کوئی اور پاکستان کو نہ ملا۔ باقی سب کے متعلق معلومات ملیں۔ زہرا سہگل کی کہانی دلچسپ ہے۔ اپریل فول کی تاریخ حقیقت ہے مگر مسلم ایک دوسرے کو کیوں فول بناتے ہیں۔ سمندر میں دیوین کی ہمت خوب رہی۔ ”بیت بازی“ میں ہادیہ ایمان، سارہ عتیق کے شعر بہت اچھے لگے۔ سچ بیانیوں میں جوا دوری گنڈ۔ شیرو، دیوانگی، 5 فیصد، سکورا اچھی کہانیاں ہیں۔ احساس برتری میں باپ کا اتنا قصور نہیں۔ انہوں نے تو بیٹی کے لیے اچھا ہی سوچا۔ یہ کہانیاں بنانے والا تو خالق تقدیر ہے۔ کیا لاجواب کہانیاں بناتا ہے کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ یہی تو ملا، تقدیر، مہلت، بہت ہی خوب صورت تحریر ہے۔ اظفر علی دولت دلوں کے نازک جذبوں پر سیاہی پھیر دیتی ہے۔ پیار جہاں سے ملے حاصل کر لو یہ دنیا ہے یہاں سب کچھ ممکن ہے۔“

☆ اعجاز حسین سٹھار کانور پور تھل سے تبصرہ۔ ”محکمہ ڈاک کی زیادتی کا میں نے بھی کئی بار رونا رویا۔ اب روبینہ نفیس انصاری نے شکوہ کیا ہے

تو زخم تازہ ہو گئے ہیں۔ کتنے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ محض تبصرہ جلد مکمل کر کے بھیجنے کی وجہ سے ایمرجنسی حالات میں مطالعہ کرتے ہیں۔ کئی کہانیاں چھوڑ دیں جو پڑھتے ہیں ان سے بھی لطف حاصل نہیں کر سکتے۔ کئی بار ڈاکیا سے احتجاج کیا تو وہ یہ کہہ کر جان چھڑا لیتا ہے کہ عملہ کم ہے۔ دفتر میں بھی کام کرنا پڑتا ہے یوں ہم اپنا سامنہ لے کر جاتے ہیں۔ اس بار بھکر والوں کی حاضری تسلی بخش ہے۔ قیصر خان، مجی کلاں، بھائی بشیر چوکی بھاگٹ والے کی کیسٹ ہی تنفے کی صورت بھیج دیں۔ ''دل دردمند'' میں ایدھی مرحوم کو کیا سراہیں ان کی نیکیاں ستاروں کی تعداد سے زیادہ ہیں اور وہ زندگی میں ہی جنت کا ٹکٹ حاصل کر چکے تھے۔ ''جہد مسلسل'' میں حمیرا اجمل نے بچپن کے کھیل، بے فکری اور خوشیاں چھوڑ کر ایسا راستہ اختیار کیا کہ حیرانی میں سوچ بھی بانجھ ہو گئی۔ ''لاکھوں میں ایک'' میں شمیم آرا کی ذاتی زندگی پر کم اور فلمی کیریئر پر زیادہ لکھا گیا ہے اس لیے حسب خواہش چسکا پورا نہیں ہوا۔ پھر مختلف ادوار کی فلمی و ذاتی تصویروں کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ ''اکتوبر کی شخصیات میں صبیحہ خانم کو دلچسپی سے پڑھا۔ باقی بس گزارا تھا۔ ''شمشال سے ٹورنتو'' نئی دلچسپیوں سے مزین ہے۔ ''سراب'' کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ سچ بیانیوں کی پہلی کہانی ہی بڑی دردناک ہے لیکن ''تشنہ لب'' کی حبیبہ نے اپنی راہوں میں خود کانٹے بچھائے انہیں اب رونے دھونے کا حق حاصل نہیں رہا۔ اسے کتنی آسانیاں حاصل تھیں وہ محض میٹرک پاس تھی لیکن ایک کامیاب ڈاکٹر کی بیوی تھی۔ آخراس کی اپنی ذمے داریاں تھیں پھر انسانی ہمدردی کا جذبہ ہر ایک میں کہاں ہوتا ہے۔ ''جھولا'' پڑھ کر چند لمحات کے لیے احساس ذمے داری جاگا لیکن پھر دنیاداری کی بے حسی نے اوپر مٹی ڈال دی۔ بات کو بڑھا چڑھا کر دوسروں کو سنانا، دل آزاری اور الزام تراشی میں مہارت رکھتے ہیں لیکن مجبور کی مدد کرنا، مظلوم کو انصاف دلانا اور مصیبت میں پھنسے شخص کے بے بسی سے بہتے آنسو اپنے دامن سے پونچھنا ہمارا منشور ہی نہیں جو انسان ایسے اوصاف رکھتا ہے وہ موجودہ زمانے کی چال کو دیکھتے ہوئے فرشتہ کہلانے کے لائق ہے۔ ''استاد جی'' معلومات سے بھرنے خزانے کے ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ ادب، آداب، رکھ رکھاؤ، نشست و برخاست، اٹھنا بیٹھنا اور گھر آنے والے سے برتاؤ کی منظر کشی نے حیران کر دیا۔ ''المیہ'' کے واقعات جیسے آگے بڑھتے گئے دل پر گویا آرا چلتا رہا۔ یہ سب اس زمین پر ہو رہا ہے یہ تو مہذب اور قانون کی پاسداری کا دعویٰ کرنے والوں کا حال ہے۔ ''کلہاڑی'' میں خورشید نے واقعی اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔ ایسا عجیب اتفاق کہ انسان کی زندگی بدل بلکہ تباہ ہو جائے۔ امجد کی لاٹری نکل آئی ہے کسی نے انجانے یا بدقسمتی میں جنت ٹھکرا دی اور اسے اندر داخل ہونے کا کھلا راستہ مل گیا۔''

☆ م۔ انور نے باڑی چم ہوتی مردان سے لکھا ہے۔ ''جاپانی کہاوت ہے کہ کسی کے سامنے اس کی تعریف گالی کے مترادف ہے۔ اسی لیے ہر دفعہ تعریفوں کے پل باندھنا اوچھا لگتا ہے۔ سورج تو سب کے سامنے ہے۔ اس کی ضوفشانی ذکر کی محتاج نہیں۔ محترم مختار آزاد کی رحلت پر دل ملول ہے۔ مرحوم اچھے کہانی کار اور بہترین مترجم تھے اللہ جوار رحمت میں جگہ دے۔ پہلی نظر ''شہر خیال'' کے باسیوں پر پڑتی ہے جو سب اچھے اور سلجھے ذہن کے مالک محسوس ہوتے ہیں۔ کسی کا نام لکھ کر دل آزاری نہیں کرنا چاہتا لیکن فلک شیر ملک، سدرہ بانو ناگوری، عبدالجبار رومی، اعجاز احمد سحار، وحید ریاست بھٹی اور خصوصاً طاہرہ گلزار صاحبہ کا نام نہ لینا ظلم ہوگا۔ ویسے شہر خیال میں لکھنے والے مستقبل کے ادیب تو ہی تو ہیں۔ محترم انور فرہاد صاحب کی صحت کے لیے دعا گو ہوں۔''

☆ سعید احمد چاند نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''ستمبر 2016ء کا شمارہ ملا۔ سرورق کو داد دیتے ہوئے آگے بڑھے۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ پڑھا مگر ہم مسلمانوں کو خدا جانے کب عقل آئے گی۔ پھر یک صفحی سرگزشت میں ادبی درویش سے ملاقات ہوئی۔ پھر ''شہر خیال'' کا رخ کیا۔ ہم نے اپنا نام ڈھونڈنے کے صفحات پلٹے۔ لیٹ کمرز پر بھی نظر ڈالی مگر وہاں بھی نہیں تھا۔ خیر اسے نظر انداز کرتے ہوئے ہم ''شہر خیال'' میں آئے۔ ندیم اقبال یو ایس اے کا مشکور ہوں کہ انہیں یاد آیا۔ میں بھی بھولو پہلوان کو پنجاب کا سمجھتا رہا۔ شکریہ مشکور پٹھان۔ ہم بھی مرتجس کے نام سے ناواقف تھے۔ اب واقفیت ہو گئی شکریہ۔ شاہد جہانگیر میں ان کے غم میں برابر کا شریک ہوں اللہ ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ ندیم اقبال کا ''شمشال سے ٹورنتو'' کا سفرنامہ خاصا دلچسپ ہے۔ جن کے تبصرے پسند آئے ان میں مجی رحمن، قیصر خان، م انور، فلک شیر ملک، رانا محمد شاہد، اولیش شیخ، نزہت افشاں مہورہ، انور عباس شاہ، سلیم رشید، سدرہ بانو، سید مسرت حسین رضوی، آفتاب احمد نصیر اشرفی، عبدالجبار رومی انصاری، سیف اللہ، اعجاز احمد سحار، محمد انعام ہیں۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔''

☆ انور اعجاز خان یکہ توت خان پشاور سے رقمطراز ہیں۔ ''تقریباً دو سال کے بعد ''شہر خیال'' میں داخل ہونے کی اجازت طلب کر رہا ہوں۔ دیار غیر میں جیسا بھی آرام و سکون ہو دل اپنے وطن کی یاد میں دھڑکتا رہتا ہے۔ وطن کی یاد کے ساتھ ساتھ سرگزشت کی یاد بھی برقرار ہے۔ اس یاد کو برقرار اور حالات سے خبردار رہنے کے لیے روزانہ صبح نیٹ پر چیدہ چیدہ پاکستانی اخباروں کو پڑھتا رہا۔ لیکن نیٹ پر سرگزشت کا پرانا پرچہ دستیاب ہوتا ہے اور آرام سے ہاتھ میں اٹھا کر پڑھنے کا لطف کہاں، اس لیے چند ایک دفعہ سرسری طور پر دیکھ کر چھوڑ دیا۔ مانچسٹر کے Wilmslow Road کے پاکستانی نیوز ایجنٹ کے پاس سرگزشت مل جاتا ہے۔ اپنے پاکستان میں دوستوں سے کہہ رکھا ہے کہ سب شمارے محفوظ رکھیں۔ خلوص عمل، جہد مسلسل اور خدمت خلق کا دوسرا نام مولانا عبدالستار ایدھی مرحوم کی سرگزشت آنکھوں کو چھو اور دل میں سما گئی۔ خدمت خلق اور جذبۂ جنوں کی ایک اور مثال عزیزہ حمیرا اجمل کی سرگزشت پڑھ کر حیرت ہوئی۔ ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی؟ گدڑی کا لعل اسے ہی کہتے ہیں۔ ''یہ چاند تارے'' میں محترم ابراہیم جمالی الطاف شیخ نے کائنات کی پہنائیوں وسعتوں میں سے چند حقیر ذروں کا تعارف کرایا جو بہت دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ محترمہ صائمہ اقبال نے ''اکتوبر کی شخصیات'' کے سلسلہ اکبر اعظم میں لکھا ہے کہ اس کی سلطنت بنگال سے افغانستان

تک اور کشمیر سے دکن تک پھیل گئی۔ غرض ہے کہ اس دور میں افغانستان کا وجود نہ تھا۔ اکبر کی حکومت کابل اور قندھار کے نواح تک تھی موجودہ افغانستان کے شمالی اور مغربی علاقے احمد شاہ ابدالی کی جرأت اور ہمت سے ہمسایہ ریاستوں سے حاصل کیے گئے۔ اکثر علاقے زبان، قوم نسل کے حساب سے تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان اور خراسان کا حصہ ہیں۔ اسی طرح دکن بھی شاہ جہان کے عہد میں مغل سلطنت کا حصہ بنا۔ اس سے پہلے یہ علاقہ پانچ مختلف ریاستوں بہمنی، عادل شاہی، قطب شاہی تھا۔''

☆ آرٹسٹ محمد عامر ساحل کی ڈیرہ اسماعیل خان سے آمد۔ ''بھائی عبدالغفار فردوس ایبٹ آباد والے کے ایکسیڈنٹ کے بارے میں جان کر دکھ ہوا۔ اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ کہانیوں میں ''فیض رساں'' اچھی تھی۔ ''دل دردمند'' میں محسن انسانیت مولانا عبدالستار ایدھی کے بارے میں اتنا تفصیل کے ساتھ پڑھ کر بہت اچھا لگا اور افسوس کہ اس جیسا فقیر اب ہم میں موجود نہیں۔ ''جہد مسلسل'' میں ایک کمسن طالبہ کی اتنی کم عمری میں لگن اور جذبہ دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بہت ہی دلچسپ قسط تھی۔ ندیم اقبال بھائی اللہ تعالیٰ آپ کے قلم میں مزید روانی عطا کرے۔ ''یہ چاند تارے'' اچھی تحریر تھی۔''

☆ فقیر غلام حسین ضیاء، بھکر سے لکھتے ہیں۔ ''آپ امت مسلمہ کو بیدار کرنے کی سعی و کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس ناچیز کی طرف سے عاجزانہ کوشش ہے گر قبول ہو۔ رفتہ زہر عزوشرف کراماتی شعبدہ بازی کے قصے کہانیاں ہر جگہ مشہور ہیں۔ لوگ ایسی کہانیاں بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں۔ ایسے فن کار کے پاس کہیں بھی جاؤ ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے نظر آتے ہیں لیکن ہر جگہ بار بار ایک ہی سوال ابھرتا ہے اور ہر قلب کو مضطرب کرتا ہے کہ ایسا کیوں اور کیسے ہو جاتا ہے۔ واقعات ایسے ہیں کہ انکار ممکن نہیں لیکن اطمینان بھی نہیں ہوتا کہ یہ کیسے وقوع پذیر ہوتے ہیں اور ان واقعات سے کوئی ملک، کوئی صوبہ اور کوئی علاقہ خالی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں پیروں فقیروں کے آستانے ہیں وہاں اکثر و بیشتر دکانداری کے مراکز ہیں۔ ان کی اپنی ٹریڈ یونینیں ہیں اور بڑے پُراسرار اور معصوم طریقے سے روپیہ کماتے ہیں اور معتقدین کی جیب صاف کرتے ہیں۔''

☆ روبینہ نفیس انصاری کا مکتوب بھکر سے۔ ''سب کو السلام علیکم! کیسے ہیں آپ سب۔ اس بار سرگزشت دیر سے ملا۔ اشتہارات سے بے وفائی کرتے ہوئے پہنچے ''شہر خیال'' میں۔ کافی نئے نام نظر آئے اور پرانے نہ جانے کہاں غائب ہیں۔ نزاہت افشاں آپ نے یاد کیا میں آ گئی۔ میں بھی ملکی حالات کی طرح اونچ نیچ کا شکار رہی ہوں اور حالات ہیں کہ ٹھیک ہونے کا نام نہیں لیتے۔ اب میں آ گئی ہوں تو غائب رہنے والوں کو بھی آنے پر مجبور کرنے کی حتی کوشش کروں گی۔ اس بار شہر خیال میں بھکر والے چھائے رہے۔ آج کل پاک بھارت تعلقات کشیدہ ہیں۔ میری دعا ہے کہ جلد ٹھیک ہو جائیں (بی بی! کوئی ہم پر جھوٹے الزام لگائے تو کیا ہم خاموش رہ جائیں؟) ہم مسلمان جنگ وجدل کو پسند نہیں کرتے (مگر جب تھوپی جائے تو ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں) کہانیوں میں ارشد علی ارشد کی ''جھولا'' بہت پسند آئی۔ ''خودغرض'' بھی اچھی لگی۔ آج تو تقریباً ہر انسان مطلب پرست ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب مسلمانوں کو امان میں رکھے۔ ''شعلۂ نوا فقیر'' ایک صفحے میں مکمل شخصیت بھر دی۔ ''فیض رساں'' اور ''دل دردمند'' تعریف کے قابل ہے۔ ''جہد مسلسل'' اور ''لاکھوں میں ایک'' عورتوں کی جدوجہد کی لازوال داستان ہے۔ جو مشعل رہی ہے۔ ''نیس'' میں سلمٰی اعوان نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' تو غضب ڈھا رہی ہے۔ سچ بتائیں یہ ندیم اقبال صاحب ہی لکھ رہے ہیں یا مستنصر حسین تارڑ۔ کیونکہ بالکل تارڑ صاحب کا انداز ہے کہ ذرا بھی بوریت نہیں ہو رہی۔ کمال کی تحریر ہے (یہی تو مصنف کا کمال ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مصنف کی اصل فیلڈ فوٹوگرافی ہے۔ یہ ان کی پہلی تحریر ہے جس کا ایک حصہ ''نانگا پربت کا عقاب'' تھا)۔ ''اکتوبر کی شخصیات'' بھی اچھی لگی۔ ''تشنہ لب'' اور ''استاد جی'' بھی پسند آئی۔ ''المیہ'' نے بھی جھنجوڑ دیا۔ ''خودغرض'' پسند نہیں آئی۔ ''کلہاڑی'' بھی صرف مسکرانے کے کام آئی۔''

☆ ندیم اقبال کا ای میل مشی گن امریکا سے۔ ''عبدالجبار رومی لاہور، رانا محمد شاہد، بورے والا، آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی، سید مسرت حسین رضوی، کراچی، قیصر خان، بھکر، انور عباس شاہ، بھکر، روبینہ نفیس انصاری، بھکر، آرٹسٹ محمد عامر ساحل، ڈیرہ اسماعیل خان، اعجاز حسین سحار، نور پور تھل، سدرہ بانو ناگوری، کراچی کا میں تہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کے خطوط مجھے مہمیز کر رہے ہیں۔ میں ''شہر خیال'' بڑی توجہ سے پڑھتا ہوں۔ دراصل قارئین کی آرا کو ہی مشعل راہ سمجھتا ہوں۔ آپ سب مع سیف اللہ، ملک وال، نزاہت افشاں، طاہرہ گلزار کے علاوہ بھی بہت سے قارئین جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے ان سب کا مشکور ہوں۔ میں نے پہلی بار لکھا۔ سرگزشت نے صفحات مہیا کیے اور آپ سب نے پسندیدگی کی سند دی۔ اسی لیے میں لکھتا جا رہا ہوں۔ جب بھی آپ کو کوئی غلطی نظر آئے فوراً آگاہ کریں۔ اب آتے ہیں اکتوبر کے شمارے پر میں نے ساغر صدیقی کو بارہا پڑھا۔ ان کے کئی اشعار جو فی البدیہہ تھے مجھے آج بھی یاد ہیں لیکن ان کی زندگی اس طرح گزری پہلی بار علم ہوا۔ ''فیض رساں'' تو پسند آئی ہی لیکن ''دل دردمند'' نے دل لوٹ لیا۔ کمال کی تحریر ہے۔ ''جہد مسلسل'' بھی اچھی رہی۔ ''نیس'' میں سلمٰی اعوان صاحبہ نے کمال کر دکھایا ہے۔ دل ہلا کر رکھ دیا۔ کہانیوں میں ارشد علی ارشد کے ''جھولا'' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ''تشنہ لب'' از زویا اعجاز بھی اچھی تھی۔ ''چال'' از طارق عزیز بھی حکومتی ارکان کا آئینہ تھا۔ ''بے چارہ'' اور ''دھوکا'' بھی اچھی لگی۔''

دیر سے موصول خطوط: آفتاب احمد نصیر اشرفی، کراچی۔ احمد جاوید، لاہور۔ ملک ممتاز، جہانیاں۔ عباس بٹ، فیصل آباد۔ ناصر چیمہ، دبئی یو اے ای۔ افضال شاہ، جھنگ۔ فیروز الدین، ساہیوال۔

اشکِ رواں

ڈاکٹر ساجد امجد

اس کے اطراف تنہائیوں کا میلہ تھا، دکھوں کا ساگر تھا مگر وہ زندگی کے جبر کا سینہ چیر کر زندگی گزارنے کا فن جانتا تھا۔ وہ اردو ادب کا بے لوث خدمت گار تھا لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ اس کی خدمت کا صلہ نہیں مل رہا ہے تو اس نے ہندی ادب کے دامن میں پناہ لے لی لیکن پھر بھی اسے وہ وقار نہ ملا جس کا وہ حقدار تھا۔ تب اس نے اپنی شہرت، ناموری اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کو سمیٹا، اسناد و ایوارڈ کو گٹھڑی بند کیا۔ مشاعروں، سیمیناروں سے قطع تعلق کیا اور دال چاول آٹا تیل بیچنے کے لیے دکان کھول لی۔ جب اخبارات میں یہ خبر آئی تو شرم سے پانی پانی ہو کر حکومتی ارکان دکان بند کرنے کی استدعا کرنے دروازے پر آ پہنچے۔

اردو کے ایک بڑے ادیب کا زندگی نامہ

مادھورام کا نشہ جب بہت گہرا ہو جاتا تھا تو وہ اپنے بیٹوں کو ایک ساتھ بٹھا کر اپنے خاندان کی کہانی اس عقیدت سے سنایا کرتا تھا جیسے رامائن پڑھ رہا ہو۔

"ہم کوئی معمولی خاندان کے نہیں ہیں۔ ہم برہمن ہیں، برہمن اور وہ بھی سارسوت برہمن جو سب سے اونچی شاخ ہے۔ ہمارا شجرۂ نسب ان اسلاف سے شروع ہوتا ہے جو صدیوں قبل پنجاب کے بلگام نام کے ایک گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ برہمن تھے اس لیے پروہت کے طور پر اپنی روزی روٹی کا مسئلہ حل کرتے تھے۔ میرے دادا کو ایک دن نہ جانے کیا سوجھی کہ برسوں سے چلی آ رہی اس روایت کو توڑ بیٹھے۔ گاؤں کی اچھی بھلی زندگی کو چھوڑا اور شہر میں آ بسے۔ پٹواری ہو گئے۔ پھر تو خوب پیسوں میں کھیلے۔ جالندھر کے کلووانی محلے میں اپنا مکان بنوا لیا۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ میرے باپ پنڈت مول راج کا نمبر تیسرا تھا۔ انہوں نے بھی باپ کا پیشہ اپنایا اور کپورتھلہ ریاست میں پٹواری ہو گئے۔ یہ سب سنی سنائی سنا رہا ہوں۔" مادھورام کہتا، جماہیاں لیتے ہوئے بچوں کی طرف گھور کر دیکھتا۔ قریب رکھے گلاس سے کچی شراب کے چند گھونٹ پیتا اور پھر کہانی کو آگے بڑھاتا۔ "میرے بڑوں نے مجھے بتایا کہ میں صرف تین سال کا تھا کہ کپورتھلہ میں سخت طاعون پھیل گیا اور اس وبا کے ہاتھوں تقریباً پورا کنبہ صاف ہو گیا۔ صرف میرا باپ، میرا پاگل چچا اور میں بچ گئے۔ میری ماں بھی مر گئی۔ میری دیکھ بھال کون کرتا۔ مجھے دادی کے پاس جالندھر بھیج دیا گیا۔ بوڑھی دادی مجھے کیا سنبھالتیں۔ دنیا کہتی ہے میں اسی لیے بگڑ گیا۔ پہلے شرارتیں ہوئیں پھر بری صحبتوں میں پڑ گیا۔ مارا باندھی اسکول جاتا رہا لیکن شراب کی لت اسی وقت سے پڑ گئی جب مجھے سدھارنے کے تمام حربے بے کار چلے گئے تو تمہاری ماں سے میری شادی کرا دی گئی۔ تمہاری ماں واشتی دیوی سے میری شادی ہوئی تو اس وقت میں نے آٹھویں پاس کی تھی۔ پھر تم سب پیدا ہو گئے اور میری زندگی اجیرن کر دی۔ جاؤ اب دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔"

محفل برخواست ہوتے ہی بچے چڑیوں کی طرح اڑ جاتے۔

یہ کوئی ایک دن کا نہیں روز کا معمول تھا۔ بچے ان

کہانیوں کو سن کر اکتا چکے تھے۔

اس ماحول میں بچے عجیب کشمکش کا شکار ہو گئے تھے۔ ماں کے خیالات کچھ اور تھے باپ کی نصیحتیں کچھ اور۔ باپ کی دہشت پورے خاندان پر تھی۔

☆......☆

وانتی دیوی نے شرابی شوہر کے ساتھ سیل بھرے تقریباً کھنڈر مکان میں آٹھ بچوں کو جنم دیا۔

14 دسمبر 1910ء کو وانتی دیوی نے جب دوسرے بیٹے کو جنم دیا تھا اور اس کا نام اندر نارائن رکھا گیا تھا تو یہ نام باپ کو پسند نہ آیا اور وہ اوپندر ناتھ ہو گیا۔

وانتی دیوی اس دوسرے بیٹے کو جالندھر لے کر آ گئی۔ وہ نو سال کا تھا کہ اس کا نام کلووائی محلے کے پاس سائیں داس اینگلو سنسکرت اسکول میں تیسری جماعت میں لکھوا دیا گیا۔

باپ کی ظالمانہ مارپٹائی سے نجات ملی تو اوپندر ناتھ کے ذہن نے انگڑائی لی۔ اس نے گھر کے گھٹے ہوئے ماحول سے نجات حاصل کرنے کے لیے پنجابی میں تک بندیاں شروع کر دیں۔ وہ ان تک بندیوں کو دوستوں کی محفلوں میں بیٹھ کر سناتا تو بچے اسے کسی دیوتا سے کم درجہ دینے پر تیار نہ ہوتے۔ وہ پانچویں جماعت میں تھا جب آریہ بھجن پشپانجلی نام کے بھجنوں کی کتاب کی نقل میں اس نے بھجن بنائے۔ سال دو سال ان ہی بھجنوں کی طرز پر وہ آریہ سماجی گیت بناتے رہے۔ پھر پنجابی بستیوں کی طرف مڑ گیا۔ کچھ دنوں بعد اس کو خود ہی احساس ہوا کہ اسے کسی سے اصلاح لینی چاہیے۔

جالندھر میں پنجابی شاعری نچلے طبقے میں مقبول عام تھی۔ اساتذہ بھی نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک استاد رحمت تھا جو بھیڑوں بازار کا مشہور رنگ ریز تھا۔ استاد امیر جوڑا بازار میں حقے کے "نیچے" باندھتا تھا۔ استاد دیزیر کوئلہ فروش تھا۔ استاد شوکت بس کنڈیکٹر تھا۔ ان استادوں کے چیلے چانٹے شہر کے آوارہ لونڈے تھے۔ وہ شوق شوق میں استاد رحمت کے پاس پہنچ گیا۔ استاد رحمت نے اس کا تخلص شناور رکھ دیا۔ اب وہ اوپندر ناتھ شناور ہو گیا اور باقاعدہ پنجابی شاعر بن گیا۔ جالندھر میں ہولی کے موقع پر پنجابی مشاعرہ ہوا۔ اس نے بھی کلام پیش کیا اور بطور انعام چاندی کا تمغا جیتا۔

وہ ذات کا برہمن اوپر سے اسٹیشن ماسٹر کا بیٹا۔ اسے ان لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اچھا نہیں لگا۔ شہر کے پڑھے لکھے اعلیٰ طبقے کی زبان اردو تھی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اردو میں شاعری کیا کرے گا۔ پنجابی زبان ویسے بھی اپنی حدود میں مقید ہو چکی تھی۔ پہلی جماعت سے اردو پڑھائی جاتی تھی۔ پانچویں سے انگریزی۔ پنجابی کا کوئی رسالہ نہ تھا۔ ویسے بھی اردو کا ہر طرف بول بالا تھا۔ وہ آٹھویں کلاس میں تھا کہ اردو میں شاعری شروع کر دی۔ ایک استاد کی پھر ضرورت پیش آئی۔ اس وقت جالندھر میں استاد محمد علی آذر کا طوطی بول رہا تھا جو دبستان داغ سے وابستہ تھے۔ انہی دنوں اس نے اپنے ایک شاعر دوست کشمیری لال اشک کی بے وقت موت سے متاثر ہو کر اپنا تخلص "شناور" سے بدل کر "اشک" رکھ لیا لیکن یہ استادی شاگردی بھی زیادہ دن نہ چل سکی۔ محمد علی آذر نہایت شوقین مزاج واقع ہوئے تھے۔ خوب صورت لڑکوں کی غزلیں تو فوراً دیکھ لیتے اور اسے ٹرخاتے رہتے تھے۔ استاد کو دکھائے بغیر مشاعرے میں پڑھنے کی ہمت نہیں تھی لہٰذا منہ تکتا رہ جاتا۔ اس کا ایک استاد بھائی تھا اختر۔ وہ خوب صورت تھا۔ پڑھتا بھی خوب تھا۔ اچھا لکھنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اکثر اشک ہی اسے لکھ کر دیتا۔ استاد اس کی غزلیں تو فوراً دیکھ لیتے۔ اشک کی غزلیں ہفتہ ہفتہ بھر پڑی رہتیں۔ اس وقت اسے شاعری کا ایسا جنون تھا کہ دن میں دو دو غزلیں ہو جاتیں اور جب یہ غزلیں اصلاح کے بغیر پڑی رہتیں تو اسے بڑی تکلیف ہوتی۔ استاد آذر ڈرائنگ ٹیچر تھے اور اسکول سے بہت دور ایک بستی میں رہتے تھے۔ اسکول سے پیدل تین چار میل چل کر بستی کے اڈے پہنچتے اور وہاں سے تانگے میں اپنے گھر تک جاتے۔ اشک نے معمول بنا لیا تھا کہ اپنے اسکول کی چھٹی ہوتے ہی سیدھا گھر آتا اور بستہ پٹک کر بھاگتا ہوا اس راستے میں جا کھڑا ہوتا جہاں سے آذر صاحب کو گزرنا ہوتا تھا۔ اس کا اسکول گھر سے کافی دور تھا۔ اسکول سے گھر آتا پھر آذر صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے گزرنے کے راستے تک پہنچتا۔ اسی طرح واپس آتا۔ اسے پانچ چھ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ اتنی محنت کے باوجود جب معلوم ہوتا کہ استاد نے غزلیں نہیں دیکھیں تو اس کی سخت دل شکنی ہوتی۔

ایک بار جب وہ کئی دن تک اس راستے کی خاک چھانتا رہا اور پانچویں چھٹے دن اسے پتا چلا کہ اس کی غزلیں ان سے کہیں گم ہو گئی ہیں تو اسے سخت غصہ آیا۔

"اختر کی غزلیں تو آپ سے کبھی گم نہیں ہوتیں۔"

اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔
''یہ تو محض اتفاق ہے کہ گم ہونے والی غزلیں تمہاری تھیں۔ یہ اختر کی بھی ہو سکتی تھیں۔''
''آپ ہمیشہ میرے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ میری غزلیں مہینوں آپ کے پاس پڑی رہتی ہیں۔''
''اب آپ مجھے سکھائیں گے کہ کون سی غزل مجھے پہلے دیکھنی ہے۔''
''جب آپ میری غزل دیکھتے ہی نہیں تو میں آپ کو کیوں دکھاؤں۔ اوپر سے آپ نے میری غزلیں گم ہی کردیں۔''
''غلطی تمہاری ہے تمہیں ان غزلوں کی نقل اپنے پاس رکھنی چاہیے تھی۔''
''مجھے ان غزلوں کی پروا نہیں۔ میں تو بس آپ کے رویے کی شکایت آپ سے کررہا تھا۔''
''اگر آپ کو مجھ سے شکایت ہے تو کوئی اور استاد تلاش کرلیجیے۔'' انہوں نے کہا اور تانگے والے کو ایک آنہ کرایہ دے کر اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس کی فطرت میں انانیت بہت تھی۔ استاد کے اس جواب سے اس کے دل کو بڑی ٹھیس پہنچی۔ اس وقت اس کی حالت شکست خوردہ کھلاڑی کی طرح تھی یا ایک ایسے مسافر کی طرح جو راستہ بھول گیا ہو۔ اس نے دیکھا قریب ہی ایک جھگی نما ہوٹل ہے جس میں کچھ لوگ بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہورہے ہیں۔ وہ بھی لکڑی کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ ہوٹل کے ملازم نے چائے کا گلاس اس کے سامنے لاکر رکھ دیا۔ چائے کے گلاس سے اٹھنے والی بھاپ کو دیکھ کر وہ سوچنے لگا کہ اس کے دل سے بھی اس وقت ایسا ہی دھواں اٹھ رہا ہوگا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر یہ سوچنے لگا کہ اسے اب کیا کرنا ہوگا۔ اس کے کانوں میں استاد کے الفاظ گونج رہے تھے۔
''اگر آپ کو مجھ سے شکایت ہے تو کوئی اور استاد تلاش کرلیجیے۔'' وہ چائے پیتا رہا اور مختلف ناموں پر غور کرتا رہا۔ اس نے کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہی چائے کا گلاس ختم کرلیا۔ پھر اسی مایوسی کی حالت میں گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچنے کے بعد بھی وہ خیالات کی انہی غلام گردشوں میں گھوم رہا تھا کہ اس کی نظر ایک ناول پر پڑی جو اس کے بڑے بھائی سریندر ناتھ شرما کے بستر کے سرہانے رکھی ہوئی تھی۔ اس کے بھائی کرائے پر ناول لاکر پڑھا کرتے تھے۔ اس نے لاشعوری طور پر ناول اٹھایا اور پڑھنا شروع کردیا۔ اس وقت فرصت بھی تھی اور دل بہلانے کے لیے کسی شغل کی ضرورت بھی۔ وہ اس ناول کو پڑھتا چلا گیا۔ ناول اتنا دلچسپ تھا کہ رکھنے کو جی ہی نہ چاہا۔ ناول ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ سریندر ناتھ اس کے سرہانے کھڑے ہوگئے۔
''کوی جی کیا ہورہا ہے؟''
''یہ ناول یہاں رکھا تھا سوچا پڑھ ڈالوں۔''
''مجھے تعجب اس لیے ہوا کہ تمہاری دنیا تو شاعری تھی یہ اچانک نثر کو منہ کیوں لگالیا۔''
''ناول تو بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ آئندہ جو ناول آپ لایا کریں گے انہیں اب میں بھی پڑھا کروں گا۔''
''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے کرایہ تو اتنا ہی دینا پڑے گا۔ بس ذرا جلدی پڑھ لیا کرنا کہیں کرایہ بڑھ نہ جائے۔''
''جی اچھا۔'' اس نے کہا اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اب وہ شاعری کی بجائے کہانیاں لکھا کرے گا جسے کسی کو دکھانے کی ضرورت ہی نہیں۔
جب تک وہ یہ ناول ختم کرتا اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کہانیاں لکھا کرے گا۔ اس طرح شاعری کا دامن دھیرے دھیرے اس سے چھوٹتا گیا اور نثر کی طرف دھیرے دھیرے مائل ہوتا گیا۔
گھر میں کرائے پر ناول آتے رہے اور وہ انہیں پڑھتا رہا۔ صرف پڑھتا ہی نہیں رہا بلکہ غور بھی کرتا رہا کہ ان ناولوں میں کیا تکنیک استعمال کی جارہی ہے۔ کرداروں کی تعمیر کس طرح کی گئی ہے۔ مکالمے کس انداز سے تحریر کیے گئے ہیں۔ کس ناول کے پلاٹ میں کتنی جان ہے وغیرہ وغیرہ۔
جب وہ کئی ناول پڑھ چکا تو اس نے بھی ایسا ہی کوئی ناول لکھنے کی ٹھانی۔ ایک رجسٹر لے کر بیٹھا اور الفاظ اتارنے لگا لیکن چند پیراگراف لکھنے کے بعد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ بالکل مایوس ہو جاتا اس کے بھائی افسانوں کا ایک مجموعہ لے کر آگئے۔ اس نے ان افسانوں کو پڑھنے کی کوشش کی تو اس پر ایک نئی دنیا کا انکشاف ہوا۔ ان کہانیوں کو ایک ہی نشست میں پڑھا جاسکتا تھا۔ ان کہانیوں کی بنت اسے آسان معلوم ہوئی۔ اس نے ناولوں کو چھوڑ کر افسانے پڑھنا شروع کردیے۔
ان افسانوں کو پڑھتے پڑھتے اس نے ہائی اسکول

پاس کرلیا۔ اب اس کا مطالعہ اتنا ہو گیا تھا کہ وہ اپنے تخیل کو کام میں لاکر کوئی کہانی لکھ سکتا تھا۔ ابھی اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ زندگی کے حقیقت پسندانہ رویوں کو کہانی کا حصہ بنا سکے۔ اس نے تصور میں ایک کہانی گھڑی اور لکھنے بیٹھ گیا۔

یاد ہے وہ دن جب صبح کے وقت ادھر آفتاب نے اپنی سنہری کرنوں سے سارے جہان کو روشن کر دیا۔ ادھر تو اپنی چاندی صورت لیے سر پر گھڑا اٹھائے ناز و ادا سے کنویں پر آئی۔ میں تجھے الفت بھری نگاہوں سے دیکھتا۔ ہاں...... محبت سے دیکھتا۔

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ رسائل اور اخبارات میں کہانیاں شائع ہوتی ہیں لیکن کس طرح شائع ہوں گی وہ اس سے بے خبر تھا۔ وہ اپنے ایک استاد بھائی امر چند قیس کے پاس پہنچ گیا جس کے ایسے اخباروں میں کچھ جان پہچان تھی۔

"میں نے ایک کہانی لکھی ہے اور چاہتا ہوں اسے کسی اخبار میں شائع کرادیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم نے جو کچھ لکھا ہوگا اچھا ہی ہوگا لیکن پھر بھی اس کہانی کو ایک نظر دیکھ لوں پھر کچھ کہہ سکوں گا۔" وہ اس کہانی کو امر چند قیس کے پاس چھوڑ کر آ گیا۔

اس نے اپنی دانست میں بہت اچھی کہانی لکھی تھی لیکن اسے یہ اُمید نہیں تھی یہ کہیں شائع ہونے کے لائق بھی ہوگی۔ اگر اسے کچھ اُمید تھی تو اپنے دوست امر چند قیس سے تھی کہ اس کے تعلقات بہت ہیں وہ کہیں نہ کہیں اسے شائع کرادے گا۔

وہ روزانہ امر چند سے ملتے تھے لیکن منہ سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ اس انتظار میں تھے کہ وہ خود کوئی ذکر چھیڑے۔ ایک روز امر چند نے خود سے بتایا کہ اس نے وہ کہانی ایک پندرہ روزہ اخبار کے سپرد کر دی ہے اگر قابلِ اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہو جائے گی۔ اوپندر ناتھ سن کر خاموش ہو گیا۔ اُمید کی ایک شمع اور روشن ہو گئی کہ جب کہانی اخبار تک پہنچ گئی ہے تو شائع بھی ضرور ہو جائے گی اس نے گھبراہٹ میں اخبار کا نام نہیں پوچھا تھا۔ اگر کام معلوم ہو جاتا تو وہ خود اس اخبار کو دیکھ لیتا۔ وہ دوسرے دن پھر امر چند کے گھر پہنچ گیا۔

"یار تم نے اخبار کا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"کیا کرو گے نام پوچھ کر۔"

"میں وہ اخبار خرید کر دیکھ تو لیتا کہ شائع ہوئی یا نہیں۔"

"نام بتا دوں تو سارا مزہ ہی کرکرا ہو جائے۔ جب چھپ جائے گی تو خود ہی پتا چل جائے گا۔"

"یہ کہو تم نے کہیں بھیجی ہی نہیں ہے ورنہ نام تو ضرور بتاتے۔"

"جب چھپ جائے تو خود ہی دیکھ لینا۔"

"یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کب چھپے گی۔"

"بھئی اخبار میں اور کہانیاں بھی آتی ہیں۔ نمبر آنے پر تمہاری کہانی بھی چھپ جائے گی۔"

اوپندر ناتھ نے اسے بھی محض تسلی سمجھا اور گھر چلا آیا۔ اس کے ذہن میں ایک اور کہانی کا پلاٹ مچل رہا تھا لیکن مایوسی ایسی تھی کہ قلم اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اخباروں میں بڑے لوگوں کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ شاید چھاپنے کے لیے پیسے بھی لیتے ہوں میرے پاس نہ تو پیسے ہیں نہ میرا نام ہے میری کہانی کون چھاپے گا۔ ایک امر چند قیس پر تکیہ تھا۔ اس نے اسی کے سہارے پندرہ دن کاٹ دیے۔

امر چند قیس اس سے ملنے آیا تو اس کی بغل میں ایک اخبار دبا ہوا تھا۔ اوپندر ناتھ کے سینے میں اس کا دل زور سے دھڑکا۔ شاید یہی وہ اخبار ہو۔

"یہ کون سا اخبار ہے۔"

"پندرہ روزہ ستیہ نگار۔"

"تم نے میری کہانی اس اخبار کو بھیجی تھی؟"

"ہاں۔"

"تو کیا شائع ہو گئی؟"

"ابھی تو شائع نہیں ہوئی لیکن ان کا خط آیا تھا۔ تمہاری کہانی اگلے شمارے کے لیے منتخب کرلی گئی ہے۔"

"یہ اخبار والے اسی طرح ٹالتے رہتے ہیں۔"

"تم اسی طرح لکھتے رہو۔ تم میں صلاحیت ہے۔ دیکھنا ایک دن آئے گا یہ اخبار والے تمہارے پیچھے پیچھے پھریں گے۔"

"کہانی چھپ جاتی تو مجھے یقین آ جاتا۔ اب تو کچھ لکھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔ اس سے تو اچھے مشاعرے تھے ادھر غزل لکھی ادھر مشاعرے میں پڑھ دی۔"

"میرے یار دل چھوٹا مت کر۔ یہ دیکھ۔" امر چند نے بغل سے اخبار نکالا اور اس کے آگے پھیلا دیا۔ اس کی کہانی پوری آب و تاب سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا نام بطور

مصنف جلی حروف میں جگمگا رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ کوئی دھوکا ہو لیکن پھر وہ خوشی سے اچھل پڑا۔

''امر چند میں نے تم سے کہا تھا نا کہ مجھ میں کہانی لکھنے کی زبردست صلاحیت ہے اگر یہ کسی قابل نہ ہوتی تو اخبار والے اسے کیوں شائع کرتے۔''

''میری جان یہ ایک مقامی اخبار ہے۔ جالندھر سے باہر اسے کسی اخبار میں شائع کراؤ گے تو زبردست مقابلہ ہو گا۔ افسانہ نگار بننا چاہتے ہو تو اس سے بہتر کہانیاں لکھنی ہوں گی۔''

''تم کیا سمجھتے ہو ایک ہی قسم کی کہانیاں لکھتا رہوں گا۔ دیکھتے جاؤ میں کیسے کیسے رنگ بکھیرتا ہوں۔''

اسی سال اس نے ہائی اسکول پاس کر لیا تھا لہٰذا اور ڈی اے وی کالج جالندھر میں داخلہ لے لیا۔

دبلے پتلے اوپندر ناتھ نے کالج میں قدم رکھا تو اس کا نام ایک شاعر اور مصنف کی حیثیت سے کم از کم جالندھر کی حد تک مشہور ہو چکا تھا۔ وہ کالج پہنچا تو کئی لڑکے اس کی دوستی کی خواہش لیے آگے بڑھے۔ دوستی کے لیے اس کی باہیں بھی ہر وقت کھلی رہتی تھیں۔ جس سے ملتا خلوص کے دریا بہا دیتا۔ باتونی ایسا کہ جہاں بیٹھتا دن سے رات کر دیتا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ وقت باتوں میں ضائع کر دیتا، دوست ایسے بناتا جن کا تعلق لکھنے پڑھنے سے ہوتا۔ اپنے اسی شوق میں وہ ہم جماعت حبیب کے قریب پہنچ گیا۔ وہ بہت دن سے دیکھ رہا تھا کہ اس لڑکے کے ہاتھ میں ہر وقت کتابیں رہتی ہیں۔ دوسرے لڑکے جب خالی اوقات میں گپ شپ کرتے نظر آتے تھے وہ کسی درخت کے نیچے مطالعہ میں مصروف نظر آتا تھا۔ اسے یہ لڑکا اپنے ڈھب کا نظر آیا۔ ایک دن وہ اس درخت کے نیچے پہنچ گیا جہاں حبیب بیٹھا تھا۔

''میرا نام اوپندر ناتھ ہے۔''

''مجھے معلوم ہے تم میری ہی کلاس میں تو ہو۔''

''اور تم حبیب ہو؟''

''بالکل۔''

''اس وقت کیا پڑھ رہے ہو؟''

''میرا رجحان شاعری کی طرف ہے۔ یہ بھی اردو نظموں کا ایک مجموعہ ہے۔''

''کبھی مجھے بھی شاعری سے شغف تھا۔ اب تو کہانیاں لکھتا ہوں، ایک دو کہانیاں شائع بھی ہوئی ہیں۔ کبھی موقع ملا تو پڑھواؤں گا۔''

سوانحی خاکہ

پیدائشی نام: اندر نارائن

معروف نام: اوپندر ناتھ اشک

والد: مادھو رام

والدہ: واشتی دیوی

وطن: جالندھر

تعلیم: بی اے

تعلیمی ادارہ: ڈی اے وی کالج۔ جالندھر

رہائشی مقامات: جالندھر، لاہور، دلی، الہ آباد

پہلی بیوی: شیلا دیوی

دوسری بیوی: مایا دیوی

تیسری بیوی: کوشلیہ

بیٹے: رمیش، نیلابھ

تاریخ پیدائش: 14 دسمبر 1910ء

وفات: 19 جنوری 1996ء

''پڑھنے کی حد تک مجھے ناولوں اور افسانوں سے بھی دلچسپی ہے بلکہ میں کہوں کہ فلسفے سے لے کر رومانس تک سب کچھ پڑھ لیتا ہوں۔ میرے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔'' حبیب نے کہا۔

''کیا تم اپنے کتب خانے کی مجھے سیر نہیں کراؤ گے؟''

''کیوں نہیں، جب ہماری دوستی ہو ہی گئی ہے تو ہماری کتابیں بھی ایک دوسرے کی دوست ہیں۔''

حبیب کی دوستی اس کے لیے سودمند ثابت ہوئی۔ اس کے ساتھ مل کر اس نے اردو ادب کا اچھا خاصا مطالعہ کیا۔ ان کتابوں تک اس کی رسائی ہوئی جو اب سے پہلے اس کی دسترس میں نہیں تھیں۔

پہلی کہانی ''یاد ہے وہ دن'' کی اشاعت کے بعد اور حبیب کی صحت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ لکھنے بیٹھا تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور مسلسل کہانیاں لکھتا رہا۔ رشتہ الفت، سیرت کی تپلی عرف باوفا بیوی، خاموش شہید، آزاد مطرب، اتنے نزدیک، احساس فرض، سردار وغیرہ کہانیاں لکھنے کے بعد اسے شوق ہوا کہ اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا۔ اس اشتیاق کا اظہار بھی اس نے امر چند قیس کے سامنے کیا۔ دونوں نے مل کر پانچ کہانیوں کا

انتخاب کیا اور ''نور رتن'' کے نام سے شائع کرا دیا۔ امر چند قیس نے اس کا منظوم مقدمہ تحریر کیا۔

اس مجموعے کی اشاعت کے بعد کالج میں اسے خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ اساتذہ تک اسے قدر کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ خاص طور پر ایک بنگالی استاد ڈاکٹر گنگا چرنی کر اس کے بہت قریب آ گئے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے اس کی تمام کہانیاں سن لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے دو نصیحتیں کیں۔

''تصنیفی کام کو آسان مت سمجھو۔ سخت ترین محنت ہی تمہیں آسانی سے ہمکنار کر سکتی ہے اور دوسرے یہ خیال رکھو کہ تمہارا اسلوب سادہ ہونا چاہیے۔ سادہ اسلوب ہی دلوں میں اترتا ہے۔''

انہی کی تلقین سے وہ انگریزی ادب کے مطالعے کی طرف راغب ہوا۔ اس شوق میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب اس کی ملاقات ایک جرنلسٹ رتن چند موہن سے ہوئی۔ یہ جرنلسٹ غیر ملکی کہانیوں کو دیسی رنگ روپ میں رنگ کر اپنے نام سے چھپواتا تھا۔ اوپندر ناتھ جب ان کہانیوں کو پڑھتا اور سنتا تھا تو ان کہانیوں کے مقابلے میں اپنی کہانیاں طرز اور فن کے لحاظ سے بے جان اور فنی حسن سے محروم دکھائی دیتیں۔ اپنی ہی نہیں سدرشن اور پریم چند کی سماجی کہانیوں میں بھی تخیل کی وہ اڑان، وہ حسن و جمال اور بنیادی خیال کی وہ جدت و ندرت نظر نہیں آتی تھی۔ اوپندر ناتھ نے بھی انگریزی ادب کا بے پناہ مطالعہ کیا۔ اس نے بھی رتن چند موہن کے زیر اثر ہندوستان کے سیاسی و سماجی مسائل کو چھوڑ کر تصوراتی کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔

یہ کہانیاں بے مقصد کہانیاں تھیں لیکن تفریح کا اچھا ذریعہ تھیں۔ دھیرے دھیرے اس صحافی کا اثر کم ہونے لگا اور اس کے سامنے زندگی کی حقیقت کھلنے لگی لیکن اس دوران اس نے اس صفت کو اچھی طرح سمجھ لیا جو کہانی کو دلچسپ بناتا ہے۔ یہ وصف اس کی کہانیوں میں ہمیشہ برقرار رہا۔ خشک سے خشک مسائل کو بیان کرتے ہوئے بھی اس کا تیکھا انداز پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا سامان بنا رہا۔ پھر بہت بعد میں ایسے حادثات رونما ہوئے کہ زندگی اس کے سامنے عریاں شکل میں سامنے آ گئی جس نے حقیقت کا وہ وسیع آسمان اس کے سامنے کھول دیا کہ آخری کہانی لکھنے تک پھر کبھی کردار وضع کرنے اور تخیل سے پلاٹ بننے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

کالج میں ایک بھرپور زندگی گزارنے کے بعد جب اس نے بی اے کر لیا تو گھر کا ماحول دیکھ کر اسے آمدنی بڑھانے کا خیال آیا۔ اس وقت تک اس کی اتنی شہرت ضرور ہو گئی تھی کہ ڈگری ملنے سے پہلے ہی اسے ایک اسکول میں نوکری مل گئی۔ ڈگری ملنے کے بعد بھی وہ اس اسکول میں پڑھاتا رہا اور شاید یہیں پڑھاتا رہتا کہ اس کی ملاقات اردو شاعر میلا رام وفا سے ہو گئی۔ میلا رام وفا کچھ دن لاہور میں گزار چکے تھے۔ انہوں نے اسے لاہور چلنے کی ترغیب دی۔

''تم جیسے آدمی کے لیے اسکول کی نوکری خودکشی سے کم نہیں۔ کیوں اپنی صلاحیتوں کو زنگ لگا رہے ہو۔ میں لاہور جا رہا ہوں تم بھی میرے ساتھ لاہور چلو۔ لاہور ادبی مرکز ہے۔ بڑے بڑے ادیب و شاعر وہاں جمع ہیں۔ وہاں رہ کر تمہیں لکھنے کے لیے ماحول ملے گا۔ ادیبوں سے ملنے کے مواقع ملیں گے جو تمہاری ترقی کا باعث بنیں گے۔ کتنے ہی رسائل شائع ہوتے ہیں ان میں تمہاری تخلیقات شائع ہوں گی۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن میری نوکری کا بھی تو کوئی بندوبست ہو۔''

''یہ تم نے اچھی کہی۔ تمہارے مطلب کے وہاں بہت سے کام ہیں۔ دسیوں اخبار نکلتے ہیں۔ ہندی اخبار بھی بہت سے ہیں کہیں نہ کہیں تک جاؤ گے تمہارے قلم میں جان ہے۔ بہت جلد اپنا مقام بنا لو گے۔''

یہ ترغیبات جاذب نظر نہ بھی ہوتیں تو وہ گھر کے ماحول سے اکتا چکا تھا۔ دم گھٹنے والی فضا میں کب تک سانس لیتا۔ اڑنے کے لیے پر تولنے لگا اور بالآخر ایک بڑا فیصلہ کر کے اسکول کی نوکری چھوڑ دی اور میلا رام وفا کے ساتھ لاہور چلا گیا اور ایک سستا سا کمرا کرائے پر لے کر رہنے لگا۔

ان دنوں لاہور میں ایسے ادارے موجود تھے جو افسانہ نویس ملازم رکھتے تھے۔ اسے بھی ''بھیشم'' لاہور میں بطور افسانہ نویس ملازمت مل گئی۔ اس کے ادارتی شعبے سے منسلک ہونے کے بعد کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ادیبوں سے اس کے تعلقات استوار ہونے لگے۔ ان ہی میں ایک ادیب ''سدرشن'' بھی تھے جو رسالہ ''چندن'' نکالتے تھے۔ انہوں نے اسے اپنے رسالے میں لکھنے کی دعوت دی۔

☆......☆

اس کے لاہور چلے آنے کے بعد اس کے باپ مادھو رام کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی۔ سبب یہی تھا کہ لاہور

جا کر اس کے بگڑنے کا ڈر تھا۔ ان دنوں لاہور میں ایسے ادارے موجود تھے جو افسانہ نویس ملازم رکھتے تھے۔ اسے بھی "بھیشم" لاہور میں بطور افسانہ نویس ملازمت مل گئی۔ اس کے ادارتی شعبے سے منسلک ہونے کے بعد کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ادیبوں سے اس کے تعلقات استوار ہونے لگے۔ ان ہی میں ایک ادیب "سدرشن" بھی تھے جو رسالہ "چندن" نکالتے تھے۔ انہوں نے اسے اپنے رسالے میں لکھنے کی دعوت دی۔

☆......☆

اس کے لاہور چلے آنے کے بعد اس کے باپ مادھورام کو اس کی شادی کی فکر ہونے لگی۔ سبب یہی تھا کہ لاہور جا کر اس کے بگڑنے کا ڈر تھا۔ وہ خود بگڑ چکے تھے اس لیے اس کی طرف سے بھی یہی گمان تھا۔ بیوی سے بھی کہہ رکھا تھا کہ جو لڑکی نظر آئے اسے اوپندر کے لیے پسند کرلو۔

"واہ، ایسے کیسے پسند کرلوں۔ میری بہو چاندی ہو گی۔ پھر میرا بیٹا بی اے پاس ہے۔ ایسی ویسی لڑکی میرے بیٹے کے ساتھ تھوڑی جچے گی۔"

"ایسی ہی چاندی نہ لے آنا جیسی تم آئی تھیں۔"

"میری تو چھوڑو۔ میں تو اوپندر کی بات کررہی ہوں۔ تم آٹھویں پاس تھے اور وہ بی اے پاس ہے۔"

"بس بس بکواس بند کرو۔ یہ کام بھی میں خود ہی کرلوں گا۔ ہری چند کی طرف جاتا ہوں۔ وہ اپنی بیٹی کو ابھی میرے ساتھ کردے گا تم جانتی نہیں ہو اس دیالو کو۔"

"تم تو ہر وقت نشے میں رہتے ہو تم سے بات کون کرے۔"

"ہاں رہتا ہوں۔ کرلے جو کرنا ہے۔ ابھی اور پی کر آتا ہوں۔"

"بڈھے ہو گئے پر حرکتیں وہی رہیں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی اس کے پاس سے ہٹ گئی۔

مادھورام پنجابی کا ایک گیت گنگناتا ہوا ہری چند کے گھر جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ اس نے احتیاط کے طور پر شراب کی ایک بوتل بھی اپنے ساتھ لے لی کہ اگر ہری چند کے پاس نہ ہوئی تو اس کے پاس تو ہوگی۔

سورج ڈھلنے لگا تو وہ دانتی دیوی کو کچھ بتائے بغیر گھر سے نکل گیا۔ راستے میں ایک دو جگہ رکتا ہوا وہ ہری چند کے گھر پہنچ گیا۔ ہری چند بھی برہمن تھا اور اسی کی طرح متوسط خاندان کا فرد تھا۔ ہری چند کے ساتھ اس کا بڑا بھائی اور اس کے بیوی بچے بھی رہتے تھے۔ مادھورام کی اس سے بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ دوستی اس لیے بھی گہری ہوتی چلی گئی تھی کہ وہ بھی شراب کا رسیا تھا۔ دونوں اکثر ساتھ بیٹھ کر پیا کرتے تھے۔

ہری چند گھر سے باہر آیا تو مادھورام کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ "اس وقت بھگوان سے کچھ اور مانگ لیا ہوتا۔ ابھی تیرے ہی بارے میں سوچ رہا تھا اور تو آگیا۔"

"جھوٹ بول کر کیوں پاپ کمارہا ہے۔ گلا خشک ہو رہا ہوگا۔ شراب یاد آرہی ہوگی۔ میرے بارے میں کیوں سوچنے لگا۔"

"شراب یاد آئے یا تیرے بارے میں سوچوں ایک ہی بات ہے۔"

"اچھا ایک بات بتا، گھر میں کچھ پڑی ہے۔" مادھو رام نے پوچھا۔

"ہاں ہے تو مگر تجھے پوری نہیں پڑے گی۔"

"اس کی فکر مت کر۔ میں بھی لے آیا ہوں۔"

"بس پھر ٹھیک ہے۔ چل اوپر کوٹھے پر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

وہ دونوں گھر کے اندر کی چند سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھے پر پہنچ گئے۔ ہری چند بھاگ کر بوتل اور دو گلاس لے آیا۔ دونوں نے گلاس بنائے اور پھر گلاس پر گلاس ختم ہونے لگے۔

مادھورام بھول ہی گیا تھا کہ وہ کس کام سے ہری چند کے پاس آیا تھا۔ نشہ گہرا ہوچکا تھا۔ مادھورام بس اٹھنے ہی والا تھا کہ ہرچند کی بیٹی کسی کام سے اوپر آئی۔ اسے دیکھتے ہی مادھورام کو یاد آگیا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔

"یہ شیلا ہی تھی نا۔"

"ہاں وہی تھی۔"

"کتنی بڑی ہوگئی ہے۔"

"مادھورام، تجھے واقعی نشہ ہوگیا ہے۔ ایسے کہہ رہا ہے جیسے تو نے اسے بچپن کا دیکھا اب دیکھا ہو۔ ابھی پرسوں تو دیکھ کر گیا ہے۔ چار دن میں کیا جگ بیت گئے۔"

"ارے تجھے لڑکیوں کا پتا نہیں ہے۔ ہر چار دن بعد بڑی ہو جاتی ہیں۔ اچھا یہ بتا کہیں سگائی وگائی بھی ہوئی ہے؟"

"نہیں ابھی تو نہیں ہوئی۔"

"سمجھو ہوگئی۔"

”سمجھ کیسے لوں۔“

”ایسے سمجھ لے کہ میرا بیٹا اوپندر ناتھ بی اے کر چکا ہے۔ لاہور میں ملازمت کر رہا ہے۔ میں نے شیلا کو اس کے لیے پسند کر لیا۔ تو تیاری پکڑ۔“

”مادھورام، یہ تیرا میرا زمانہ نہیں، تو پہلے اوپندر سے تو پوچھ لے وہ کیا کہتا ہے۔“

”اسے کیا کہنا ہے۔ مجال ہے اس کی کہ انکار کردے۔“

”وہ بی اے پاس ہے اور شیلا نے صرف پرائمری کیا ہے۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا۔“

”مجھے گٹ پٹ کرنے والی بہو نہیں چاہیے۔ عورت بچے پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے نوکری کرنے کے لیے نہیں۔ تجھے اوپندر کی طرف سے اب بھی کوئی شک ہے تو کل ہی اسے تیرے دروازے پر لا کھڑا کروں گا۔ خود پوچھ لینا اس سے۔“

”اچھی طرح سوچ لے مادھورام۔ ابھی تو نشے میں ہے۔ کل کلاں کو بات سے پھر نہ جانا۔“

”نشے میں ہوگا تیرا باپ۔ جو کہہ رہا ہوں پورے ہوش میں کہہ رہا ہوں۔ کل اوپندر کو بھی خط لکھ دوں گا۔“

اوپندر کو خط لکھ کر بلا لیا گیا۔

”ہم تمہاری شادی کر رہے ہیں۔“

”ابھی مجھے شادی نہیں کرنی۔“

”میں نے تم سے تمہاری رائے نہیں پوچھی۔“

”پھر مجھے بلایا کیوں ہے۔“

”یہ بتانے کے لیے کہ ہم ہری چند کی بیٹی سے تمہاری شادی کر رہے ہیں۔“

”پتاجی مجھے کوئی اچھی ملازمت تو ملنے دیں۔“

”ملازمت بھی مل جائے گی پہلے شادی تو کرو۔“

اس کی پرورش ہی اس انداز میں ہوئی تھی کہ باپ کے سامنے بولنے کی ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔ جتنی مزاحمت کر سکتا تھا اس نے کی اور پھر ہتھیار ڈال دیے۔

شیلا کو اس نے دیکھا تھا نہ اس کے بارے میں کوئی اور سوال کیا۔ شیلا سے اس کی شادی ہوگئی۔

شیلا دیوی پرائمری پاس تھی۔ بدصورت، بدسلیقہ اور اکھڑ۔

اوپندر ناتھ پہلی چیز جو دیکھ سکتا تھا وہ شکل و صورت تھی۔ اسے سخت مایوسی ہوئی۔ شیلا دیوی کو قبول صورت بھی

تصنیفات (ہندی)

ناول

ستاروں کے کھیل، گرتی دیواریں، گرم راکھ، بڑی بڑی آنکھیں، پتھرال پتھر، شہر میں گھومتا آئینہ، ایک رات کا نرک، ایک ننھی قندیل، باندھو نہ ناؤ اس ٹھاؤں، بیشا، پلٹتی دھارا، اتی نیتی۔

افسانوی مجموعے

پنجرا، انکور، نشانیاں، چھینٹے، دو دھارا، کالے صاحب، جدائی کی شام کا گیت، بینگن کا پودا، پلنگ، آکاش چاری، ابال اور دیگر کہانیاں، دوردرشی لوگ، چاچا رام دیتا، یہ راجے یہ رشی۔

ڈرامے

جے پراجے، سورگ جھلک، چھٹا بیٹا، آدی مارگ، قید اور اڑان، پینترے، الگ الگ راستے، انجو دیدی، بھنور، بڑے کھلاڑی، لوٹتا ہوا دن، اسنو دیوی۔

یک بابی ڈرامے

دیوتاؤں کی چھایا میں، طوفان سے پہلے، چرواہے، پکا گانا، پردہ اٹھاؤ پردہ گراؤ، اندھی گلی، صاحب کو زکام ہے، مکھڑا بدل گیا۔

تنقید

اردو کاویہ کی ایک نئی دھارا، ہندی کہانیاں اور فکشن، ہندی کہانی ایک انترنگ پریچے، آدھی زمین انویشن کی سہ یاترا۔

شاعری

پرات پردیپ، ارمیاں، برگد کی بیٹی، دیپ جلے گا، چاندنی رات اور اجگر سڑکوں پر ڈھلے سائے، کھویا ہوا پربھا منڈل، اور شیہ ندی، پیلی چونچ والی چڑیا کے نام، سورگ ایک تل گھر ہے، ایک دن آکاش نے کہا۔

مضامین

ریکھائیں اور چتر، زیادہ اپنی کم پرائی، کچھ دوسروں کے لیے، چھوٹی سی پہچان، کھونے اور پانے کے بیچ، استاد کی جگہ خالی ہے۔

نہیں کہا جاسکتا تھا۔ چند روز کے بعد یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ حد درجہ بدسلیقہ ہے۔ کسی چیز کو کہاں رکھنا ہے کہاں ہونا چاہیے اسے کچھ پتا نہیں تھا جو چیز جہاں پڑی ہے بس پڑی ہے۔ تعلیم یافتہ نہیں تھی اس لیے اوپندر ناتھ کی اہمیت سے واقف ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کی کتابوں کو سنبھال کر رکھ ہی نہیں سکتی تھی، البتہ یہ اسے معلوم تھا کہ اس کا پتی پڑھا لکھا ہے اس لیے اس کی قدر کی جانی چاہیے اور اس کا ہر مشورہ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ جب طبیعت میں ایسی صلح جوئی ہو تو لڑائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ابتدائی دنوں میں اوپندر ناتھ اس پر خوب برستا تھا لیکن وہ اللہ کی بندی تو اس کی پوجا کرتی تھی۔ وہ برستا رہتا اور وہ سر جھکائے رہتی۔

اس پھوہڑ بیوی کے اندر اسے کچھ ایسے انوکھے اوصاف کے انکشاف ہوئے کہ وہ دھیرے دھیرے اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ روزنامہ اخبارات کی کمر توڑ محنت، تخلیقی اظہار کی کوششوں اور ادبی جدوجہد میں رہتے ہوئے اپنی بیوی کو آگے پڑھائے گا اور اپنے معیار کے مطابق ڈھال لے گا۔

ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اپنی آمدنی بڑھائے۔ اس نے لاہور کے مشہور روزنامہ ''وندے ماترم'' میں ملازمت کرلی۔ یہاں وہ نائب مدیر کی حیثیت سے آیا۔ بارہ سے چودہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا لیکن زیادہ تنخواہ کے لالچ میں کام کرتا رہا۔

اس نے سدرشن کے رسالے ''چندن'' میں بھی لکھنا شروع کردیا تھا۔ اس رسالے میں اس کی ایک کہانی ''عورت کی فطرت'' شائع ہوئی اور اس کی اشاعت نے ادبی دنیا میں اچھا خاصا ہنگامہ گرم کردیا۔ کچھ دنوں کے لیے اشک کی ذات متنازع ہوگئی۔ ہوا یوں کہ کرسچن کالج لاہور کی دو طالبات کا ایک خط شائع ہوا جس میں ''عورت کی فطرت'' کے بارے میں انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ مصنف نے اس میں ہندوستانی عورت کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے اور اس کی روایتی شوہر پرستی اور وفاشعاری کی ہنسی اڑائی ہے۔

اس سے لاہور کی ادبی دنیا میں اچھا خاصا معرکہ گرم ہوگیا۔ سدرشن نے اگلے ہی شمارے میں ان سوالات کے بھرپور جوابات دیے لیکن مخالفت کی آوازیں پھر بھی اٹھتی رہیں۔ اوپندر ناتھ کو بھی پوری طرح تسلی نہ ہوسکی۔ اس نے پریم چند کو خط لکھا اور ان سے ان کی رائے طلب کی۔

اس کے بعد پریم چند سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔

یہ قضیہ ختم ہوا تو اس نے اپنا دوسرا مجموعہ شائع کرنے کا ارادہ کیا اور جان بوجھ کر اس کا نام ''عورت کی فطرت'' رکھا اور پریم چند سے درخواست کی کہ وہ اس کا مقدمہ تحریر کریں۔ پریم چند نے یہ درخواست قبول کرلی اور یہ مجموعہ پریم چند کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔

اس وقت پریم چند کا مقدمہ تحریر کرنا کسی افسانہ نگار کا لوہا منوانا سمجھا جاتا تھا چنانچہ اس مجموعے کی اشاعت نے اشک کی شہرت میں اضافہ کیا اور ادیبوں نے پہلی مرتبہ اس کا نوٹس لیا۔

وہ اس وقت پریم چند اور رنویر سنگھ ویر کے اسٹائل میں کہانیاں لکھتا تھا۔ ان دنوں اس نے رفاقت، محبت، سیلاب، خاموش شہید، شگنتلا وغیرہ جیسی لازوال کہانیاں لکھیں۔ یہ کہانیاں ستیہ گرہ اور انقلابی تحریکوں پر لکھی گئی تھیں۔ اس کے بعد عورت کی فطرت، تانگے والا، جھشتی کی بیوی وغیرہ بھی لکھیں جو بہت مشہور ہوئیں۔ ان میں سب سے زیادہ عورت کی فطرت کی شہرت ہوئی۔

اس کی کہانیاں اب ہر ہفتے شائع ہو رہی تھیں۔ اخبار کی معروفیت نے اسے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ اس نے وقت بچانے کے لیے بہت سوچ سمجھ کر ''وندے ماترم'' کی نوکری چھوڑ دی اور روزنامہ ''ویر بھارت'' کی نائٹ شفٹ میں کام کرنے لگا لیکن جلد ہی یہ نوکری بھی چھوڑ دی اور ایک نئے ہفتہ وار ''بھونچال'' کا کام سنبھال لیا لیکن اس کے مالک سے تکرار ہو جانے پر جلد ہی اس سے بھی چھٹی لے لی۔

انہی دنوں اس کی زندگی میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ ایک دن اچانک اسے معلوم ہوا کہ اس کے سسر پاگل ہوگئے ہیں اور انہیں لاہور کے پاگل خانے میں داخل کرادیا گیا ہے۔ یہ اطلاع کوئی کم روح فرسا نہیں تھی۔ اس کی بیوی کا رو رو کر برا حال تھا کہ ایک اور اطلاع آگئی جس نے اسے مزید پریشان کردیا۔ اطلاع یہ تھی کہ اس کی ساس اپنے جیٹھ سے لڑ کر لاہور چلی آئی ہے اور بیٹی کے گھر رہنے کی بجائے ایک سیٹھ کے یہاں روٹی پکانے اور برتن دھونے کا کام کررہی ہے تاکہ لاہور میں رہ کر شوہر کی دیکھ بھال کرسکے۔ اس اطلاع نے تو اسے ششدر کردیا۔ اسے کسی طرح یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کی ساس برتن مانجھنے کا کام کرے۔ وہ فوراً اس سیٹھ کے گھر گیا تاکہ اپنی ساس کو بہلا پھسلا کر اپنے

ساتھ رہنے پر رضا مند کر سکے۔ اتفاق سے وہ سیٹھ اس کے نام سے واقف تھا اس کی کئی کہانیاں بھی پڑھ چکا تھا۔ اس نے اشک کو بڑی عزت سے بٹھایا اور خوب خاطر مدارات کی۔ یہ سن کر حیران بھی ہوا کہ اس کے گھر کام کرنے والی عورت اوپندر ناتھ اشک کی ساس ہے۔ یہ سن کر اداس بھی ہوا کہ وہ اسے لینے آیا ہے۔

''تمہاری ساس بہت اچھی عورت ہے۔ ہم اس سے بہت خوش ہیں۔ وہ بھی یہاں بہت خوش ہے۔ پھر بھی تم بات کر کے دیکھ لو۔ میں زبردستی نہیں کروں گا۔''

وہ درمیان سے ہٹ گیا اور اس کی ساس کو لا کر بٹھا دیا۔ اشک نے انہیں بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بیٹی کے گھر کا دانہ تک چکھنے کی روادار نہیں تھی۔ اشک نے بھی سوچا کہ جب وہ یہاں خوش ہے تو اسے یہیں رہنے دیا جائے۔

وہ مطمئن تھا کہ معاملات خوش اسلوبی سے سلجھ گئے لیکن اس کی بدنصیبی تھی کہ اسی سال اسی کے محلے کے ایک لڑکے کی سگائی سیٹھ کی لڑکی سے ہوگئی۔ یہ لڑکا حال ہی میں ڈپٹی مجسٹریٹ ہوا تھا اور محلے والوں کو حقیر سمجھنے لگا تھا۔ ایک مرتبہ اشک سے بھی اس کی منہ ماری ہو چکی تھی۔ اشک کے لیے یہ بات ناقابل برداشت ہوگئی کہ وہ اس گھر کا داماد ہوگا جہاں اس کی ساس نوکرانی تھی۔ وہ اس وقت سے ڈرنے لگا جب وہ داماد کی حیثیت سے وہاں جائے اور مجھے اپنی سسرال کی نوکرانی کے داماد ہونے کا طعنہ دے۔ اسے اپنی بیوی کا بھی خیال آتا تھا کہ وہ وہاں جائے گی تو اس کی کتنی بے عزتی ہوگی۔ اس نے اس خدشے کا اظہار اپنی بیوی سے بھی کیا۔ اسے تو اس نزاکت کا احساس نہیں تھا لیکن اس نے اس فرق کو مٹانے کی کوشش کی جو اس کے اور ڈپٹی مجسٹریٹ کے درمیان تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ اس کی ساس وہاں کی نوکری چھوڑ دے لیکن وہ نوکری چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ اشک نے تہیہ کیا کہ وہ ڈپٹی کلکٹر بن کر دکھائے گا۔ اس نے معلومات کیں تو معلوم ہوا وہ ڈپٹی کلکٹری کے مقابلے میں نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ اس کی عمر زیادہ ہو چکی تھی۔ اب ایک ہی راستہ تھا کہ سب جج بن جائے تاکہ اس کی بیوی جب اس گھر میں جائے تو سب جج کی بیوی کی حیثیت سے جائے صرف نوکرانی کی لڑکی کی حیثیت سے نہیں۔

اس نے سب جج بننے کا فیصلہ کر لیا اور قانون پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ آخری امتحان میں بیٹھنے والا تھا کہ اسے معلوم ہوا اس کی بیوی کو تپ دق ہوگئی ہے۔ وہ کچھ دنوں تو اس کی بیماری سے اکیلا ہی جوجھتا رہا لیکن پھر اسے سینی ٹوریم میں داخل کرانا پڑا۔ اس کے خواب اچانک زمین پر آگرے۔ زندگی یکسر تبدیل ہو کر رہ گئی۔ اب اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ اخبار کی ذمہ دار نوکری کا بوجھ اٹھا سکے۔ ہفتے میں دو بار تپتی دوپہر میں آٹھ میل چل کر بیوی کو دیکھنے جانا پڑتا تھا۔ وہ ٹیوشن پڑھاتا رہا۔ ایک ہفتہ وار اخبار کے لیے کہانیاں لکھتا رہا۔

لاہور کی بے حس سڑکیں اسے سائیکل پر اِدھر اُدھر بھاگتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ادیبوں سے بھرا یہ شہر اس کے کسی کام آنے کو تیار نہیں تھا۔ کبھی کبھی عرب ہوٹل کی طرف جا نکلتا تھا۔ جہاں اسے اپنی کہانیوں پر تنقید کے سوا کچھ سننے کو نہیں ملتا تھا۔ کسی کو یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی کہ یہ خاموش ادیب مسائل کی کس دلدل میں اتر چکا ہے۔ جدوجہد اس کا مقدر تھی۔ وہ اکتائے بغیر حالات سے لڑ رہا تھا۔ قانون کی کتابیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ کتابیں بند کرتا تو کہانیوں کا رجسٹر کھول لیتا۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ زندگی کی تلخیوں نے ابھی تک اس کا منہ کڑوا نہیں کیا تھا۔ وہ مسائل کی دلدل میں اترنے کے باوجود نہ اس کے بارے میں لکھتا تھا نہ سوچتا تھا۔ تصور سے انوکھے اور انجانے پیار کی رومانی کہانیاں لکھتا تھا۔ مثالی عورتوں، عاشقوں، سیاست دانوں اور فنکاروں کو اپنی کہانیوں کے کردار بناتا تھا۔ اس کی کہانیوں سے حقیقی زندگی کی ذرا بھی بو نہیں آتی تھی۔

اتنی جدوجہد کے باوجود وہ حوصلہ نہیں ہارا تھا لیکن جس دیوار کا سہارا لے کر وہ چل رہا تھا وہ دیوار ہی گر گئی۔ اس کی بیوی شیلا دیوی دو سال کے بیٹے رمیش کو پیچھے چھوڑ کر اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔

اب تک وہ زندگی کی غلاظت کی طرف سے بے پروا تھا اب خود زندگی اس کے لیے بے مقصد ہوگئی۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس کی ساری جدوجہد سارے پلان کو لایعنی بنا دیا۔ اس کے اندر سے ایک ہی آواز آتی تھی کہ اب جینے کا کیا فائدہ تب اس نے خودکشی کی کوشش کی لیکن جس زندگی سے وہ بے زار تھا اسی زندگی کی طرف پھر لوٹ آیا۔ خودکشی کی کوشش ناکام ہوگئی۔

اب وہ اکیلا تھا۔ بے سہارا تھا، زندگی اس کے

نزدیک سوالیہ نشان تھی، اپنی پریشانی کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ وہ زندگی کے بارے میں کچھ بنیادی سوالات میں گھرا ہوا تھا۔

ان دنوں اس کی طبیعت کا میلان کچھ ایسا ہو گیا کہ کہانی لکھنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا۔ جذبات کا ایسا ہیجان تھا جسے نثر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے دکھ غزل میں سمونے کی کوشش کی۔

ہائے کیا چیز ہے پہلو میں دھڑکتی ہوئی شے
سنگ یا خوار ہے درد بھرا دل نہ بنے
گو ہے نانِ جویں کے لیے محتاج مگر
ہم در منعم کم ظرف کے سائل نہ بنے

……

ظہور جس کا ستم ہو کرم کے پردے میں
ستم ظریف خدا سے بڑا نہیں کوئی

……

یہ تقاضائے دیانت ہے یا احساسِ انا
خوبی دیکھی ہے جو دشمن میں اسے مانا ہے

……

عمر نے باندھ دیا جسم کو اک حجرے سے
دل ہے کم بخت کہ اڑنے کے بہانے مانگے

……

میری شہرت ہے کہ رسوائی جو سچے جھوٹے
سارے عالم میں ہیں اب عام فسانے میرے

……

پھینک دے چاہے حوادث راہ سے ہر بار دور
جائے گی منزل کہاں جب زندگی منزل میں ہے

……

اٹھاؤ بساط، اشک بس بھی کرو
تمہیں جانا اب اپنے گھر چاہیے

یہ غزلیں بھی اس کے ہیجان کو کم نہ کر سکیں۔ اسی عالم دیوانگی میں اس کی ملاقات ہری کرشن پریمی سے ہوئی۔ اس تعارف نے اسے ہندی شاعری سے آشنا کیا۔

اس نے اپنی ادبی زندگی پنجابی بیت سے شروع کی پھر اسے چھوڑ کر وہ اردو میں غزل کہنے لگا۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اور اس کا شوقِ اظہار کہانیوں کی طرف مڑ گیا۔ اب وہ زندگی کے کچھ ایسے حقائق سے آشنا ہوا کہ کہانی لکھنا دو بھر ہو گیا۔ اس نے پھر غزل کا دامن تھاما لیکن ہری کرشن پریمی کی

تصانیف (اردو)

خاکہ / خودنوشت

منٹو میرا دشمن، پرتوں کے آر پار، شکایتیں اور شکایتیں، آسمان اور بھی ہیں۔ چہرے انیک، فلمی جیون کی جھلکیاں، بیدی میرا ہمدم میرا دوست۔

ناول

ستاروں کا کھیل، پتھر ال پتھر، گرتی دیواریں، بڑی بڑی آنکھیں، ایک ننھی قندیل، شہر میں گھومتا آئینہ۔

افسانوی مجموعے

نورتن، عورت کی فطرت، ڈاچی، کونپل، ناسور، قفس، چٹان، کالے صاحب، اشک کے منتخب افسانے، ٹریس پر بیٹھی شام، ٹیبل لینڈ اور دوسرے افسانے۔

ڈرامے

اصلی راستے۔ قیدِ حیات، پینترے، گرداب، چھٹا بیٹا، انجو باجی، جنت کی جھلک

یک بابی ڈرامے

پاپی، چرواہے، تولیے، پڑوسن کا کوٹ۔

تنقید

میری افسانہ نویسی کے چالیس برس۔

تراجم

یہ آدمی یہ چوہے (ناول)، ہز ایکسلینسی (ناول)، رنگ ساز (ناول)، لمبے دن کی یاترا رات میں (ڈراما)، کھینچ کے پار (ڈراما)، ابھی شپت (ڈراما)، ہٹ چکت (ڈراما)۔

تالیف شدہ

سنگیت ہندی۔ سنگیت اردو۔

صحبت نے اسے ہندی میں لکھنے کی ترغیب دی۔ اس نے پریمی جی سے ایک چھند سیکھ کر اس چھند میں نظمیں لکھیں اور لگاتار نظمیں لکھتا چلا گیا۔

تل تل جتاہوں میں لیکن

نہیں چھوڑتا
پاؤں جمایا ہے میں نے جو
اس کو اُچل اٹھمھ بنانا

☆

نہیں آج ہی کیوں ہم نے دیپک پالے
نہیں آج ہی کیوں ہم اس اندھکار سے لڑنے والے
ہم سے پہلے پروجوں نے
جب جب اندھکار سے لے کر
اپنا دل بدل
گھیرے ڈالے
دیپک پالے

ان نظموں کے بعد وہ کبھی اردو کی طرف لوٹ کر نہیں آیا۔ آخر عمر تک شاعری کرتا رہا اور ہندی سے ناتا جوڑے رکھا۔ اس نے پہلا مجموعہ کلام ''پرات پردیپ'' شائع کیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی جن حالات سے دوچار ہوتی رہی، اس کے احساسات میں جو اتار چڑھاؤ آتے رہے انہیں اپنی نظموں میں قید کرتا رہا۔ اس کا مشاہدہ اس کا ترقی پسند نظریہ اور شاعر اس کی نظموں میں گھل مل کر سامنے آتے گئے۔

اس نے کچھ ایسی فنکاری سے نظمیں تخلیق کیں کہ وہ ہندی کا اہم ترین شاعر شمار ہونے لگا۔

☆......☆

مئی کے مہینے کی تپتی دوپہر تھی۔ وہ گھر کی دہلیز پر چٹائی بچھائے دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ سنیاسیوں کی طرح گیان دھیان کی حالت میں آنکھیں بند تھیں۔ وہ دل ہی دل میں اپنی پریشانی کا حل ڈھونڈ رہا تھا کہ اسے نروان مل گیا۔ ایک روشنی سی ہوئی اور اسے یوں لگا جیسے اس کا دماغ روشن ہو گیا۔ ان الہامی لمحوں میں اس کے سارے سوالوں کے جواب مل گئے اور اسے پوری طرح مطمئن بھی کر گئے۔

اس گہری جدوجہد کا اکارت جانا اس کے سامنے ظاہر ہو گیا جو اس نے سب جج بننے کی کوشش میں کی تھی۔ دکھ تکلیف غریبی رہنماؤں کا دوغلا پن اس پر ظاہر ہو گیا۔ اس نے اپنے حالات کی بے بسی کو جانا اور اسے وہ نظریہ مل گیا جو اب تک اس کے پاس نہیں تھا۔ اسے لگا کہ زندگی کتنی بھی تلخ اور کڑوی کیوں نہ ہو پچھلے کچھ سالوں کے تجربے اور زندگی کے بنیادی سوالات کے صحیح اور تشفی بخش جوابات میری زندگی کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہیں لہٰذا ان احساسات کو آنے والی نسلوں کے لیے تحریری شکل میں چھوڑ دیا جانا چاہیے۔

دھیان گیان سے حاصل ہونے والی روشنی نے فیصلہ دیا اور اس نے قانون کی کتابیں بیچ دیں۔ کہیں نوکری نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اور زندگی کو ادب کے سپرد کرتے ہوئے معرکۃ الآرا ناول لکھنے کا تہیہ کر لیا۔

وہ نوکری نہ کرنے کا تہیہ کر چکا تھا لیکن پیٹ تو بھرنا ہی تھا۔ اس نے کہانیاں لکھ لکھ کر گزارہ کیا۔ اپنی مشہور کہانی ''ڈاچی'' اور اپنی بیوی کی بیماری اور موت سے جڑی ہوئی تھوڑی بہت جذباتیت لیے کہانیاں لکھیں۔

ڈاچی اس کی وہ پہلی کہانی تھی جسے حقیقت پسندانہ کہا گیا۔ یہ کہانی اشک کو مقبول بنانے کا سبب بنی۔ اس کا اصل سبب اس میں زندگی کی حرکت ہے جسے کہانی میں بڑی خوب صورتی سے پرویا گیا ہے۔ یہ کہانی سماج کے اندرون شخصی اور بین الاقوامی تعلقات کو اجاگر کرتی ہے۔

وہ تخلیقی سفر کرتے ہوئے اس مقام تک آ گیا تھا جہاں انگلینڈ سے لوٹے ہوئے کچھ نوجوانوں نے ''انگارے'' کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ چھاپا۔ یہ کہانیاں عریاں حقائق کی کہانیاں تھیں اور اردو میں بالکل نئی چیزیں۔ ان کہانیوں کا براہ راست تعلق زندگی کے تلخ حقائق سے تھا، تصورات سے نہ تھا۔ پھر ادب میں ایک بغاوت کا آغاز ہوا جسے ''ترقی پسند ادب'' کے نام سے یاد کیا گیا۔ اس ادب کے تحت زندگی کے تاریک گوشوں کو ادب کا حصہ بنایا گیا۔ یہ ادب جیسا بھی تھا اشک کو حقیقت پسندانہ نظریہ دے گیا۔

وہ کبھی انجمن ترقی پسند مصنفین کا باقاعدہ رکن نہیں بنا لیکن اس کے خیالات اور نظریہ فن اس تحریک سے متاثر ضرور ہوا۔ اس تحریک کے اثر سے اس نے اپنے دکھ سے دوسروں کے دکھ کو دیکھنا سیکھا اور ترقی پسند تحریک متاثر ہو کر آفاقی ڈھنگ سے سوچا۔ اس دوران اس نے اردو سے ہندی میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا سبب ہری کرشن پریمی سے اس کی دوستی تھی۔ انہی کے توسط سے وہ ہندی میں لکھنے والوں سے ملا۔ وہ بھٹ جی، مادھو جی اور شری چندر گپت کے گھر آنے جانے لگا، یہ سب ہندی میں لکھنے والے تھے۔ ان کے اثر سے وہ ہندی کی طرف کھنچنے لگا۔

ماکھن لال چترویدی کے کرم ویر میں بھی اس کی کہانیاں چھپنے لگیں تو اس کا حوصلہ ہوا۔

وہ ایک پارٹی تھی جس میں بنگال کے انجینئر ہری بھائی گوئل جس نے ہندی کا لائنوٹائپ ایجاد کیا تھا کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس پارٹی میں ہری بھائی گوئل نے ہندی کو سب

سے زیادہ سائنٹفک زبان ہی نہیں کہا بلکہ آزاد بھارت کی ہونے والی قومی اسکرپٹ بتایا۔ اس نے اس دعوے کی بھی تردید کی کہ اردو سارے ہندوستان میں بولی بھی اور پڑھی جاتی ہے۔

اوپندر ناتھ اس تقریر سے اتنا متاثر ہوا کہ یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ اردو کا زور لاہور، دلی، لکھنؤ یا حیدر آباد تک ہے اور اخبارات کلکتہ سے لے کر اندور تک اور لاہور سے لے کر کھنڈوا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اردو والے ہندی لکھنے والوں سے تعصب برت رہے ہیں۔ پریم چند جیسے ادیب کو ایم اسلم کے بعد چھاپا جاتا ہے تو پھر ان کی کیا حیثیت۔

یہ سراسر فرقہ پرستی۔ میں نے طے کیا کہ ہندی میں لکھوں گا جہاں کسی طرح کا فرقہ وارانہ تصور نہ ہوگا اور مقابلہ صرف میرٹ پر ہوگا۔"

لیکن یہ خیال دیر پا ثابت نہیں ہوا۔ ہندی میں لکھنے کے باوجود اشک نے اردو کا دامن نہیں چھوڑا۔ زندگی کے آخری سالوں میں وہ نہ صرف دوبارہ اردو میں غزل کہنے لگا تھا بلکہ اپنی ہندی تخلیقات کو بھی اردو کا جامہ پہنانے لگا تھا۔

پریم چند کے بعد وہ اکیلا ایسا ادیب تھا جو دونوں زبانوں کا یکساں احترام کرتا رہا۔

☆......☆

کہانیاں لکھتے لکھتے وہ ایک ناول لکھنے لگا۔ اس کا نام اس نے "ایک رات کا نرک" رکھا۔ اس ناول کا اس نے ابھی کچھ ہی حصہ لکھا تھا کہ اس کی نظر سے اتر گیا جو اسے لگا کہ اس کا کچھ حصہ کسی ضخیم ناول کا حصہ تو بن سکتا ہے لیکن مجموعی حیثیت سے وہ ایک کامیاب ناول نہیں کہلا سکتا۔

اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ ہندی ناول "ستاروں کے کھیل" لکھنے بیٹھ گیا۔ یہ ناول ایک قدیم ہندو گاتھا کے مکمل تخمینہ کے مقصد سے لکھا گیا تھا۔ وہ اس گاتھا سے متعلق بنیادی اخلاقی افکار پر سوال اٹھانا چاہتا تھا۔ روایتی اخلاقیات کے عدم جواز سے پیچھا چھڑانے کی اس کوشش میں اس نے ایک ایسی حکایت کا انتخاب کیا جو اس قدیم گاتھا کی طرح انوکھی تھی۔

ناول میں آدھا راستہ طے کر لینے کے بعد اس نے دوسرے حقیقت پسندانہ سرے کی طرف چلنے کی کوشش کی۔ یہ ناول آخر کار ایک خوفناک کہانی بن کر رہ گیا جو اصل کہانی کی طرح غیر یقینی تھا۔ یہ الگ بات کہ یہ ناول بے حد مقبول ہوا۔ اس ناول کے بارے میں خود لکھتا ہے۔

"اگرچہ اس وقت آنکھوں کو حقیقت پسندانہ نظر نہیں ملی تھی پھر بھی کچھ آدرش وادی حالتوں کی سچائیوں کو پانے کی کوشش میں ضرور کرتا تھا۔ میرے دماغ میں بچپن سے یہ سوال اکثر اٹھا کرتا تھا کہ کوئی دوشیزہ زندگی بھر کسی اپاہج کے لیے کیسے گزار سکتی ہے۔ جیسا کہ "ستی انسویا" کی کہانی میں تھا۔ اپنے اردگرد کی زندگی پر جب میں نظر دوڑاتا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔ سماج، اطوار اور شدید جذباتیت۔ یہی تین چیزیں ہیں جو کسی عام عورت کو اس طرح کی ستی بنا سکتی ہیں۔ اس خیال کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے میں نے تخیل سے ایک کہانی گھڑی۔ ایسی حالتیں گھڑیں جن سے بالکل ویسے ہی اپاہج عاشق کو لیے لیے گھومنے پر ناول کی ہیروئن مجبور ہوتی ہے۔"

وہ یہ ناول لکھ تو رہا تھا لیکن یہ بھی سوچتا جاتا تھا کہ زندگی گھڑے گھڑائے ڈھنگ سے نہیں چلتی۔ پھر کیسے چلتی ہے؟ اور ایسی کہانی ناول کا حصہ بن بھی سکتی ہے؟

وہ ان دنوں بہت الجھا ہوا تھا۔ ستاروں کا کھیل نامی ناول تقریباً ختم ہونے کو تھا۔ وہ رات بھر اس ناول پر کام کرتا رہا تھا۔ صبح دیر سے سو کر اٹھا تھا۔ شام ہوئی تو ٹہلتا ہوا مکتبہ اردو، لاہور پہنچ گیا۔ چودھری نذیر احمد نے خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔

"اشک صاحب آپ کا ناول کس منزل تک پہنچا؟"

"بس آخری باب لکھ رہا ہوں۔ دو چار دن میں ختم کرلوں گا۔"

"اس کی کہانی پر تو آپ مجھ سے بات کر چکے ہیں۔ اب دیکھیے عوام میں اس کی مقبولیت کیسی ہوتی ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ پروفیسر فیاض محمود آگئے۔ پروفیسر صاحب کہانیاں اور یک بابی ڈرامے لکھتے تھے۔ نوجوان آدمی تھے۔ دو چار تخلیقات ہی سے انہوں نے ادیبوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی۔ ان کے آنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اشک کے ناول "ستاروں کا کھیل" پر بات ہونے لگی۔ چودھری نے پروفیسر صاحب سے ناول لکھنے کی فرمائش کی۔

"آپ نے کہانیاں تو بہت لکھی ہیں اشک جی کی طرح کوئی ناول بھی لکھ ڈالیے۔ اشک جی بھی کہانیاں لکھتے لکھتے ناول کی طرف آئے ہیں۔"

"میں پہلے سے گھڑا گھڑایا ناول لکھنے کے حق میں

نہیں۔ کبھی لکھا تو ایسا ناول لکھوں گا جو زندگی ہی کی طرح چلے، بڑھے اور پھیلے۔ پہلے سے طے شدہ ابتداء یا انتہا اس کی نہ ہو۔“

یہ ایک طرح سے اشک پر طنز بھی تھا لیکن بات معقول تھی لہٰذا اس کے دل میں بیٹھ گئی۔

وہ اب تک اپنے تجربات سے یہ جان چکا تھا کہ زندگی تو درحقیقت انہی چھوٹے بڑے تجربات، انہی ننھے ننھے مظاہر میں اَن دیکھے اور بے معنی لیکن حقیقی زندگی پر گہرا اثر چھوڑ جانے والے اعداد و شمار سے بنی ہے۔ اس دن کے بعد سے زندگی کے بارے میں اس کا زاویہ نگاہ ہی بدل گیا۔ اردگرد کی چیزوں کو وہ گہرائی سے دیکھنے لگا۔ اس نظر سے زندگی کو دیکھنے سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ زندگی گھڑے گھڑائے ڈھنگ سے نہیں چلتی۔ ”ستاروں کا کھیل“ اس کی نظروں سے اتر گیا۔ اس کے ذہن میں ایک ایسے ناول کا خاکہ تیار ہونے لگا جس میں سماج کی بنیاد پرستی اور برے رسوم و رواج میں جکڑے ہوئے ادنیٰ متوسط طبقے کے ایک نوجوان کی نفسیات کی حقیقت پسندانہ مصوری ہو۔ اس نے ادنیٰ متوسط طبقے کے ایک نوجوان کی پانچ سال کی زندگی کی کہانی بیان کرنی شروع کی اور اس کا نام گرتی دیواریں رکھا۔

اسے اندازہ تھا کہ یہ ایک ضخیم ناول ہوگا جیسا کہ دنیا کا سب سے بڑا پہلا ناول ٹالسٹائے کا ”وار اینڈ پیس“ جو ڈیڑھ ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

اشک نے حجم کے اعتبار سے اس سے بھی طویل ناول لکھنے کا منصوبہ بنایا۔

گرتی دیواریں اس کی انتہائی اہم تخلیق ثابت ہوئی۔ وہ 37-1936ء سے شروع ہونے والی تحریروں سے لے کر اواخر عمر تک بے شمار تخلیقات کے دوران بار بار اس فن پارے کو مکمل کرنے کی طرف ملتفت ہوتا رہا۔ افسوس کہ چار ہزار صفحات میں پھیلا ہوا یہ ناول نامکمل ہی رہا۔

یہ ناول اپنی طرز میں یکتا ہے۔ اسے اگر دنیا کا ضخیم ترین ناول کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

موجودہ حالت میں اس کا یہ ناول چھ حصوں پر مشتمل ہے۔ گرتی دیواریں، شہر میں گھومتا آئینہ، ایک ننھی قندیل، باندھوں نہ ناؤ اس ٹھاؤں، پلٹتی دھارا اور اتی تیتی (نامکمل)۔

اس ناول کا پہلا حصہ ہیرو کی عمر کے اس حصے کو لے کر لکھا گیا جب کہ وہ نہیں سمجھ پاتا کہ آخر کار زندگی میں اسے کرنا کیا ہے۔ وہ کبھی اس راستے کو پکڑتا ہے کبھی اس راستے کو۔ کبھی ایک طرف سرپٹ بھاگتا ہے کبھی دوسری طرف۔ وہ ادیب، مصور، اداکار، موسیقی نواز کبھی کچھ بننا چاہتا ہے۔ اس کی ناکام محبت اور بے جوڑ شادی اور اس کے فرق کے خارجی کشمکش کو ناول کا یہ حصہ پیش کرتا ہے۔

شہر میں گھومتا آئینہ اس ناول کا دوسرا حصہ ہے۔ اس حصے کو لکھنے کے لیے اشک کو دس سال انتظار کرنا پڑا کیونکہ اس کا پیٹرن اس کو نہیں مل رہا تھا۔ پھر اس نے ایک ناول پڑھا اور یہ پیٹرن اسے مل گیا۔

”ایک ننھی قندیل“ تیسرا حصہ ہے۔ اس حصے میں تقسیم سے پہلے کے الہ آباد کی حقیقی عکاسی کرتے ہوئے ناول کے ہیرو کی جدوجہد، کشمکش کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس حصے میں اس عہد کے لاہور کا ادبی ماحول اور اردو صحافت کی خوبیاں خامیاں اور صحافت سے وابستہ لوگوں کا تفصیل سے ذکر ہوا ہے اس کے ساتھ ہیرو (چیتن) کی جدوجہد، خوابوں، خواہشوں، اندرونی کشمکش اور الجھنوں کی بھی حقیقی عکاسی ہوئی ہے۔

اس حصے کے آتے آتے چیتن کی فطرت میں تبدیلی آتی ہے۔ گرتی دیواریں کا چیتن سادہ، بھولا، رومانی اور جذباتی ہے لیکن ننھی قندیل کا چیتن ٹھیک ویسا نہیں۔ اپنے تمام بھولے پن کے باوجود وہ کافی ہوشیار ہو گیا ہے۔

”باندھوں نہ ناؤ اس ٹھاؤں“ دو حصوں میں منقسم، 1200 صفحات میں پھیلا اس ناول مالا کا اگلا پڑاؤ ہے۔ پہلا حصہ ”تکلیف اور تناؤ“ ہے اور دوسرا حصہ ”اور واپسی“ ننھی قندیل کا ماحول لاہور اور وہاں کے لوگ ہیں۔

پہلے حصے میں چیتن کی تکلیف اور تناؤ کا نمایاں تعین ہوا ہے۔ اپنی تمام ہوشیاریوں کے باوجود چیتن نہ غیر انسانی ہے نہ جذباتیت سے عاری، لوگوں کو پہچاننے یا بے وقوف بنانے کا فن بھلے ہی اس نے سیکھ لیا ہو مگر اپنے اندر پرورش پا رہے ہیں جذباتی اور حساس نوجوان کو جھٹلا نہیں پاتا اور صدمے اٹھاتا ہے۔ چیتن کی جدوجہد، اس کی مفلسی اور اس میں ہار نہ ماننے والی فطرت کی نشاندہی کرتے ہوئے اشک نے ہمیشہ کی طرح چیتن کے اردگرد سڑک پر اسٹال لگانے والے نیلام کاروں سے لے کر شاندار جلسہ گاہوں میں منظم زندگی جینے والے اعلیٰ طبقے کے ادیبوں اور شاعروں کے روپ میں کرداروں کا انبار لگا دیا۔

پہلا حصہ اگر موجیں مارتا ہوا زندگی کا دریا ہے تو دوسرا حصہ ”اور واپسی“ ایک چھوٹی سی جھیل ہے۔ بظاہر اس حصے میں بیان کردہ ایک اعلیٰ متوسط طبقے کے افسر کی مغرور حسین لڑکی اور چیتن کی محض محبت کی داستان لگتی ہے لیکن اس کو صرف داستان محبت کہنا مصنف کا مقصد نہیں۔ پہلے حصے میں جہاں مصنف نے چیتن کے خارجی ماحول اور جدوجہد کا بیان کیا ہے تو دوسرے حصے میں چیتن کی داخلی دنیا میں جھانکنے اور اس کے ذریعے اپنے اندر بہتے شفاف سرچشمے کو پہچاننے اور اس طرف پلٹنے کی کہانی ہے جسے اس داستان محبت کے ذریعے سے ہی پیش کیا جاسکتا تھا۔

اس ناول کا پانچواں حصہ اس نے ”پلٹتی دھارا“ کے نام سے لکھا۔ اس میں ناول کے ہیرو ”چیتن“ کی کہانی کو ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ چیتن اس حصے میں ایک ایسے موڑ پر آکھڑا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے دو متبادل راستے ہیں مصنف بنے یا قانون کا امتحان پاس کرکے سب جج کے مقابلے میں شریک ہو۔ بالآخر چیتن دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے۔ قانون کی پیچیدگیوں میں ڈوبتا ابھرتا نظر آتا ہے۔ معاشی تنگ و دو بھی جاری رہتی ہے۔ وہ کبھی ٹیوشن پڑھاتا ہے اور کبھی اپنا خرچ چلانے کے لیے ہفتہ وار اخبارات میں کہانیاں لکھتا ہے۔

اس حصے میں خود اشک کی زندگی کے اتنے واقعات اس میں شامل ہوگئے تھے کہ لوگ اسے اس کی سوانح کہنے لگے۔ اس ناول کی طوالت بھی یہی بتارہی تھی کہ وہ اس ناول کے ذریعے اپنی سوانح لکھ رہا ہے۔ اشک کو اس کی وضاحت کرنی پڑی۔

”گرتی دیواریں میری سوانح نہیں ہے۔ اسی طرح چیتن بھی میں نہیں ہوں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے خاص واقعات، محسوسات اور پس منظر اسے دیا ہے۔ چیتن کو اپنی شخصیت نہیں صرف اپنے جذبات یا سادہ لوحی میں نے دی ہے اور پھر اسے آزادانہ طور سے پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے۔ چیتن کی زندگی کے کئی چھوٹے چھوٹے لیکن اہم ترین واقعات میں نے اپنے شناسا نوجوانوں کی زندگی سے لیے ہیں۔ چیتن وہ بہت کچھ کرتا ہے جو میں نے کبھی نہیں کیا یا وہ بہت کچھ نہیں کرتا جو میں نے کیا ہے۔“

”پلٹتی دھارا“ کے بعد وہ ”اتی نیتی“ لکھنے بیٹھ گیا۔ گرتی دیواریں کے اس آخری حصے میں اس کا ارادہ گزشتہ تقریباً چار ہزار صفحات کے طویل قصے کو ایک اہم پڑاؤ تک پہنچانا تھا اور زندگی کی محرک طاقتوں، پیٹ کی بھوک، محبت اور جنس کی بھوک اور انا کو ایک ایک کرکے پرکھتے ہوئے انسان کی زندگی میں مقدر کی اہمیت کو پرکھنا تھا۔

وہ اس ناول کو پوری زندگی لکھتا رہا۔ درمیان میں اس کی دیگر تخلیقات بھی منظر عام پر آتی رہیں۔ جب موقع ملتا تھا وہ اس ناول کو آگے بڑھاتا رہتا تھا۔ آخری حصہ ”پلٹتی دھارا“ نامکمل تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔

اپنے انتقال سے پہلے اس حصے کے لیے غیر تحریری ابواب کا جو خاکہ بنایا تھا اس میں کانگریسی اخبار میں چیتن کے کام کرنے کی داخلی کہانی بھی شامل کی تھی جس سے وہ اس وقت کی سیاسی حالت بھی اجاگر کرنا چاہتا تھا۔ اشک کے نزدیک زندگی میں مقدر ایک اہم محرک ہے۔ آدمی سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ اور ہے۔ چیتن مخصوص صلاحیت سے قانون کے امتحان میں امتیازی مقام حاصل کرتا ہے تو دوسری طرف اس کی بیوی کا انتقال ہوجاتا ہے۔ اس لڑکی کا بھی انتقال ہوجاتا ہے۔ جس کی شادی چیتن کے محلے دار اور ہم جماعت سے ہونا طے تھی اور جس کے گھر میں چیتن کی ساس خانساماں کا کام کرتی تھی یعنی وہ سب ہی ختم ہوجاتا ہے جس نے چیتن کو قانون پڑھ کر سب جج بننے کے لیے اکسایا تھا۔ یہیں اشک مقدر کے سوال، انسان کی زندگی اور اس کی تگ و دو کی لایعنیت کا تجزیہ کرتے ہوئے ان عناصر کو اجاگر کرنا چاہتا تھا جو زندگی کو بامعنی اور جینے کے لائق بناتا ہے۔

دنیا میں ایسے بے شمار ناول ملتے ہیں جو پورے نہیں ہوسکے۔ اسے دیکھتے ہوئے ”گرتی دیواریں“ کا یہ ادھورا پن ایک اہم عنصر ہے۔ اشک نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ایسا ناول لکھنا چاہتا ہے جو زندگی ہی کی طرح چلے، بڑھے اور پھیلے۔ اس کی ابتداء اور خاتمہ پہلے سے طے شدہ نہ ہو۔ خاتمہ تو افسانوں کا طے شدہ ہے۔ زندگی تو ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہے۔ اس نظریہ سے دیکھیں تو ”گرتی دیواریں“ اپنے مواد اور اپنے ادھورے پن کے ساتھ انسانی کہانی کی بجائے پورے عہد کی کہانی کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ وہ انسانی تصویر کی بجائے اس عہد کی تصویر پیش کرتا ہے۔

اس کی طبیعت میں اضطراب بہت تھا۔ زیادہ دیر کسی جگہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اسی لیے گرتی دیواریں تحریر کرتے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہوئے اس کی یکسانیت سے نکلنے کے لیے اور کچھ دوسری وجوہات کی وجہ سے وہ دیگر ناول بھی لکھتا رہا۔ اس کے ایک ناول ''گرم راکھ'' کا بہت چرچا ہوا۔ اسے کسی نے حقیقت پسندانہ کہا تو کسی نے فطرت پسندانہ، خود اشک کا کہنا تھا کہ یہ سماج کے ذریعے سے افراد کی عکاسی اور مسائل پر مبنی ناول ہے۔ میں نے یک طرفہ محبت اور اس کی ناامیدی کو لے کر یہ ناول لکھا ہے۔

اس ناول میں طنز، ظرافت اور مزاح کا جو روپ ملتا ہے وہ بھی اسے ہندی کے دیگر ناولوں سے الگ کرتا ہے۔ اس ناول کی ایک اور خصوصیات یہ تھی کہ لاہور شہر اپنی بیشتر خصوصیات کے ساتھ کسی بھی ناول میں ابھی تک شاید ہی اتنا نمایاں ہوا ہو جتنا لاہور ''گرم راکھ'' میں ہے۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد ہی تنقید نگار اشک کے بارے میں یہ رائے دینے پر مجبور ہوئے۔

''اشک ہندی کا پہلا ناول نگار ہے جو کبھی بھی اپنے ناولوں کو طبقہ، سماج اور اس عہد کے منظرنامے سے کاٹ کر اپنے کرداروں میں ڈرائنگ روموں، کمروں یا ریل کے ڈبوں میں سے لیے جاتے ہوئے بھی صرف ان تک محدود رکھنا نہیں جانتا۔ وہ ہر وقت آپ کو احساس دلاتا رہے گا کہ یہ ایسے لوگوں کی کہانی ہے جو آدمیوں کے درمیان میں رہتے ہیں جن میں کچھ سماجی تعلقات اور روابط ہیں۔''

اوپندر ناتھ اشک کچھ دنوں کے لیے روزی کی تلاش میں جالندھر کے پاس بسے ''پربت نگر'' میں بھی رہ چکا تھا۔ یہاں اسے کچھ ایسے تجربات ہوئے۔ مکاری، فریب کاری اور خود غرضی کے کچھ ایسے انکشاف ہوئے کہ اس نے انہیں بنیاد بنا کر ایک ناول ''بڑی بڑی آنکھیں'' لکھنے پر مجبور کردیا۔ اپنے تجربات کو بنیاد بنا کر لکھے گئے اس ناول میں درحقیقت آشرم یا مٹھوں یا وسیع پیمانوں پر ایک کمیون بنا کر ایک خوب صورت اور مثالی زندگی کے جھوٹ کو پیش کیا۔

''پورا کا پورا دیونگر ایک ایسے دیش کی علامت بن جاتا ہے جس کا سربراہ بڑے آدرش کی باتیں کرتا ہے لیکن جس کی عین ناک کے نیچے بدعنوانی، اقرباء پروری، دھوکا دہی، استحصال اور ایذا رسانی پرورش پا رہی ہے اور ناول کا ہیرو سوچتا ہے کہ جب تک اس نظام کو اوپر سے نیچے تک نہیں بدلا جاتا اس ملک کا کچھ نہیں ہوگا یہی تو اس ناول کا راز ہے۔'' (اشک)

غور سے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایک علامتی ناول ہے جس میں دیونگر کی علامت کے ذریعے ہندوستان کی سچائی کو ظاہر کیا گیا تھا۔

☆......☆

اس کا ہندی شعری مجموعہ شائع ہوا تو اس میں شامل دکھ بھری نظموں سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے۔ اخبارات میں بھی اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔

ایک روز وہ گھر میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بیوی کی موت کے بعد وہ اکیلا ہی دن گزار رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا تھا۔ اس نے اندر ہی سے آواز دے دی کہ جو بھی ہے اندر آ جائے۔ اکثر اس کے دوست ہی آتے تھے۔ اس نے سوچا تھا انہی میں سے کوئی ہوگا لیکن جب آنے والا سامنے آیا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ لڑکی خوب صورت بھی تھی اور نوعمر بھی۔ اس کے دوستوں میں اب تک کوئی لڑکی نہیں تھی۔ آنے والی کو اس سے پہلے دیکھا بھی نہیں تھا۔

''اشک جی! آپ مجھے دیکھ کر یوں کیوں حیران ہو رہے ہیں۔ بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟''

''میں نے آپ کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا اس لیے حیران ہو رہا ہوں۔ تشریف رکھیے۔'' اس نے پھیلی ہوئی کتابوں کو ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

''میں آج ہی تو آپ کے گھر آئی ہوں پھر اس سے پہلے دیکھتے کیسے۔''

''میرا مطلب ہے میرا آپ سے تعارف نہیں۔''

''میں پاروتی ہوں۔ ایک ہندی اسکول میں پڑھاتی ہوں اور آپ کی نظموں کی عاشق ہوں۔ میں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ ایسی دکھ بھری نظموں کا خالق کس قسم کی زندگی گزارتا ہے۔''

''دکھ تو اپنے اندر ہوتے ہیں۔ گھر میں تو کتابیں بکھری ہوتی ہیں۔ پھر بھی دیکھ لو کیسے رہتا ہوں۔''

''کیا نظمیں لکھتے ہیں آپ، میں نے ہندی میں ایسی نظمیں آج تک نہیں پڑھیں۔''

''آپ کو ان نظموں میں کیا اچھا لگا؟''

''احساس کی شدت اور زبان کا فطری پن۔''

''مجھے تمہاری رائے سن کر خوشی ہوئی۔ تم شاعری کی اچھی پارکھ ہو۔''

''میں شاعری پڑھاتی ہوں۔''

''پڑھانا اور بات ہے سمجھنا اور بات ہے۔ جس طرح شاعری کرنے والے مخصوص لوگ ہوتے ہیں اسی طرح اس

کی سمجھ رکھنے والے گنتی کے لوگ ہوتے ہیں۔"
"میں نے آپ کی دکھ بھری زندگی کے کچھ واقعات سنے ہیں۔ انہیں سن کر بہت دکھ ہوا۔"
"یہ تمہارا دردمند دل ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا۔"
"آپ کہیں تو میں آپ کے لیے چائے بناؤں؟"
"صرف اس لیے اجازت دے رہا ہوں کہ اس بہانے تم بھی چائے پی لوگی۔"
پاروتی اٹھلاتی ہوئی اٹھی اور رسوئی (باورچی خانہ) میں چلی گئی۔ رسوئی کی حالت وہی تھی جو گھر میں عورت کے نہ ہونے سے ہوتی ہے۔ وہ کچھ دیر اس بے ترتیبی کو دیکھتی رہی اور پھر رسوئی کی صفائی میں مشغول ہو گئی۔ چولہے پر چائے کا پانی رکھا اور ایک ایک چیز ترتیب سے رکھنے لگی۔ اس طرح اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔
وہ چائے بنا کر لے آئی۔ "عورت کے نہ ہونے سے سب سے بڑا نقصان رسوئی کو ہوتا ہے۔"
"رسوئی سے مجھے کیا لینا دینا۔"
"باقی گھر میں بھی کون سی ترتیب ہے۔" پاروتی نے کہا۔ "آپ کہیں تو میں دوسرے تیسرے دن آ کر صفائی ستھرائی کر جایا کروں۔"
"کیوں زحمت کرو گی۔"
"اس بہانے آپ سے باتیں بھی ہو جایا کریں گی۔"
"میں کبھی گھر پر نہیں بھی ہوتا ہوں۔"
"تو کیا ہوا۔ میں اپنے من میں یہ تو کہہ سکوں گی کہ میں اشک جی کے گھر گئی تھی۔"
"تم ضدی لڑکی ہو اور میرے کسی ناول میں جگہ پا سکتی ہو۔"
وہ اس وعدے کے ساتھ چلی گئی کہ پھر آئے گی۔
اشک کو بھی اس کا آنا اچھا لگا تھا۔ اس کے اٹھتے ہی گھر سونا سونا لگنے لگا حالانکہ وہ اسی سونے گھر میں رہ رہا تھا۔
دوسرے دن اسکول کی چھٹی ہوئی تو وہ پھر اس کے گھر میں موجود تھی اور پھر یہ ہر دوسرے تیسرے دن کا معمول بن گیا۔ ایک دن اس کے کچھ دوست آئے تو وہ بھی موجود تھی۔ اب اس بات کو باہر نکلنا ہی تھا سو نکلی۔ یہ مشہور ہو گیا کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ لوگوں نے اس قصے کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ جب یہ قصہ اسکینڈل بن کر مشہور ہونے لگا تو اسے ہوش آیا۔ اس کے دشمن پہلے ہی کیا کم تھے۔ اس کی تخلیقات پر تو انگلیاں کم اٹھتی تھیں کردار پر زیادہ اٹھنے لگیں۔
لاہور کے ادبی حلقوں میں اس کے دوستوں تک نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس لڑکی کو بھی کہیں سے معلوم ہو گیا کہ وہ بدنام ہو رہی ہے۔ اس نے اشک سے شادی کا تقاضا شروع کر دیا۔ وہ لڑکی یوں تو بہت اچھی تھی لیکن اشک کے خیال کے مطابق شادی کے لیے مناسب نہیں تھی۔ اشک نے اپنی دانست میں اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ زیادہ تر گھر سے باہر رہنے لگا۔ گھر میں ہوتا بھی تو اس کے آتے ہی باہر نکلنے کی تیاری کرنے لگتا۔ پاروتی اتنی بچی نہیں تھی کہ اس بے رخی کو محسوس نہ کرتی۔ اب وہ کھل کر سامنے آنے لگی۔ اس نے اشک سے دوٹوک بات کی کہ وہ اس کے گھر آئے اور اس کے والدین سے بات کرے۔ اشک صاف انکار کر سکتا تھا لیکن اس خیال سے اس نے وعدہ کر لیا کہ صاف انکار سے بات اور آگے بڑھ جائے گی۔ اس نے کہہ دیا کہ فرصت ملتے ہی وہ اس کے گھر آئے گا۔ اس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا لیکن پھر اسی میں عافیت بھی کہ لاہور سے کہیں فرار ہو جائے اور اس لڑکی سے چھٹکارا پا لے۔ اس نے مہاتما گاندھی کے "آشرم وردھا" جانے کی سوچی اور اس کی اطلاع دینے وہ اپنے دوست پروفیسر موہن سنگھ کے پاس پہنچا۔ وہ کسی کو بتا کر نہیں جا رہا تھا لیکن کوئی تو راز دار ایسا ہو جس کے ذریعے اسے خبریں پہنچتی رہیں۔ پروفیسر موہن نے اس کے وردھا جانے کی مخالفت کی اور اسے مشورہ دیا کہ وہ امرتسر کے نزدیک سردار گروبخش سنگھ کی بسائی گئی مثالی کالونی پریت نگر جائیں۔ انہوں نے اسے ایک سفارشی خط بھی دے دیا کہ وہاں پہنچتے ہی وہاں رہنے کا بندوبست ہو جائے گا اور اخبار میں نوکری بھی مل جائے گی۔
اس نے سفارشی خط مٹھی میں دبایا اور پریت نگر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچتے ہی وہ یہاں کے حسین مناظر میں کھو گیا۔ یہ جگہ اس کے خوابوں کی تعبیر معلوم ہو رہی تھی۔ چاروں طرف قدرتی حسن بکھرا پڑا تھا۔ شاید یہ بستی بسائی ہی اس لیے گئی تھی کہ لوگ یہاں مہنگے داموں زمین خریدیں اور بسانے والے کو فائدہ ہو۔ اس مقصد کے لیے ایک اخبار بھی نکالا گیا تھا جس میں اس بستی کا پروپیگنڈا کیا جاتا تھا۔
اشک نے بعد میں ایک ناول "بڑی بڑی آنکھیں" لکھ کر پریت نگر کی حقیقت کا پردہ چاک کیا اور کرداروں کے نام بدل کر حقائق بیان کیے۔ بستی کے بانی کا نام اس نے دیوا جی اور بستی کا نام دیو نگر رکھا۔

"دیو اجی ایک بہت ہی چالاک انجینئر ہے جو امریکا میں رہ کر آیا ہے اور روزی روزگار کو کیسے مذہب، انسانیت، محبت اور باہمی تعاون اور باہمی شاباشی جیسے نعروں کے پردے میں چھپایا جاسکتا ہے۔ یہ اچھی طرح جانتا ہے۔ اسے موجودہ سماج کی ناہمواریوں کا بھی علم ہے اور وہ ان ناہمواریوں میں عام آدمیوں کی گھٹن کو بھی جانتا ہے۔ اس لیے اس نے ایسے تمام لوگوں کو خوش کرنے اور ان کے پیسے کا استعمال اس سستی زمین کو مہنگے داموں میں بیچنے کے لیے کرنے کی خاطر بیٹھے چاشنی بھرے لفظوں سے ایک خواب کو تشکیل کیا ہے جسے وہ دور دراز بیٹھے لوگوں کے سامنے اپنے اخبار کے ذریعے لہراتا رہتا ہے تاکہ وہ دیونگر میں زمین خرید کر اس مقصد سے کوٹھیاں بنوائیں کہ ریٹائر ہو کر وہاں بس سکیں۔"

بہر حال اسے اس دھوکے کے کاروبار سے غرض نہیں تھی۔ وہ یہاں کے قدرتی حسن سے متاثر ہوا تھا۔ خوابوں کی اس نگری میں اس نے قلم سنبھالا اور "گرتی ہوئی دیواریں" لکھنے بیٹھ گیا۔

اس نے یہاں تقریباً دو سال گزارے۔ اس دوران اس کی ملاقات مایا دیوی نامی ایک لڑکی سے ہوئی۔ اشک بھی اب اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اکیلے زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ اب اسے شادی کر لینی چاہیے۔ مایا دیوی سامنے تھی۔ ایک ایسی جھنجلاہٹ بھی تھی جس کی وجہ سے وہ شادی کر بیٹھا۔ اس کی زندگی میں کوشلیہ نام کی ایک لڑکی آئی تھی۔ وہ اس سے شادی کرنے کو تیار بھی تھی لیکن کوشلیہ کے رشتے دار اس غریب، غیر منظم، من موجی، آوارہ، باغی کہانی کار کے ساتھ کوشلیہ کے تعلقات کے خلاف تھے۔ اس صورتِ حال میں اشک نے تجویز دی تھی کہ چپ چاپ شادی کر لی جائے لیکن کوشلیہ اس پر تیار نہیں ہوئی۔ اس دوران مایا دیوی درمیان میں آگئی اور اشک نے شادی کر لی۔ کوشلیہ بھی اس شادی میں شریک ہوئی تھی اور آپس میں طے کیا تھا کہ اب وہ کبھی نہیں ملیں گے اور نہ ہی خط کتابت کریں گے۔

یہی کوشلیہ جی بعد میں یعنی مایا دیوی سے شادی کے صرف چھ ماہ بعد اشک کی بیوی بن کر اس کے گھر آئیں اور پھر پوری زندگی اس کے ساتھ رہیں۔ دکھ میں بھی سکھ میں بھی۔

اشک نے مایا دیوی سے شادی کر تو لی تھی لیکن انتخاب غلط ہو گیا۔ بقول اوپندر ناتھ "محترمہ ایسی آئیں کہ انہوں نے ڈیڑھ مہینے میں مجھے مجبور کر دیا کہ میں نوکری چھوڑ دوں اور بھاگ جاؤں لہٰذا میں نے نوکری چھوڑی اور بنگلور بھاگ جانے کا منصوبہ بنالیا۔"

آل انڈیا ریڈیو دلی اسٹیشن نیا نیا قائم ہوا تھا۔ ملک بھر کے ادیبوں شاعروں کو ریڈیو کی ملازمت میں بڑی جاذبیت نظر آرہی تھی۔ ریڈیو اسٹیشن پر ادیبوں کی کہکشاں سی بن گئی تھی۔ کچھ تو باقاعدہ ملازم تھے اور کچھ یونہی گپ شپ کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔

کرشن چندر جب ڈراما سیکشن کا انچارج ہو کر دلی ریڈیو اسٹیشن آئے تو انہیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت پیش آئی جو ہندی ڈراموں کی اصلاح کر سکے اور ہندی میں لکھے گئے اسکرپٹس کی درستی کی ذمہ داری لے سکے۔ ان کی نظر اوپندر ناتھ اشک پر پڑی اس لیے بھی کہ وہ ہندو تھا اور اس لیے بھی کہ ہندی ادیب تھا۔ ہندی ادب میں وہ اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ ان دنوں "پریت نگر" میں ہے۔ انہوں نے اسے بلانے کے لیے خط لکھ دیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ یہ خط اس وقت اس کے پاس پہنچا جب وہ پریت نگر کی نوکری چھوڑ کر بنگلور جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بنگلور میں اندھا مستقبل اس کے سامنے تھا۔ کرشن چندر کے خط نے اس کا "حال" روشن کر دیا۔ ایک ساتھ اتنے قلم کاروں کی موجودگی، باعزت تنخواہ اور اپنی صلاحیتیں منوانے کا ذریعہ وہ کرشن چندر کے بلاوے پر دلی آگیا۔

پریت نگر، نوکری اور مایا دیوی کو چھوڑ دیا۔

اوپندر ناتھ دلی اسٹیشن پہنچا تو کرشن چندر، منٹو، ن م راشد یہاں پہلے سے موجود تھے۔ بعد میں راجندر سنگھ بیدی، راجا مہدی علی خان، اختر الایمان اور احمد ندیم قاسمی بھی کچھ عرصے کے لیے یہاں چلے آئے۔ دیوندر ستیارتی گھومتے پھرتے آتے ہی رہتے تھے۔ اس کے علاوہ جتندر دلی ہی میں تھے۔

ہندی مشیر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے اشک نے دلی کے بیشتر ہندی مصنفین کو تو ریڈیو پروگراموں میں حصہ لینے کے لیے بلایا ہی ساتھ ہی لاہور، الہ آباد، میرٹھ، متھرا اور کلکتہ سے بھی ہندی ادیبوں کو دعوت دی۔ اتنے سارے تخلیق کاروں کی جماعت نے فطری طور سے مقابلے کے جذبے کو پروان چڑھایا۔ اشک کے پہلے کے لکھے بھی ڈرامے ریڈیو پر نشر ہوئے۔ ریڈیو کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے نئے ڈرامے بھی لکھے۔ انجو دیدی، الگ الگ

راستے اور بلنور جیسے ناٹک۔ سیونہ، چمک، تولیے اور چرواہے میں شامل یک بابی ڈراما اور چٹانی، بلاور، سپنے اور کھنک جیسی کہانیاں اسی دور کی تخلیقات ہیں۔

کرشن چندر ڈراما سیکشن کے انچارج تھے جب کہ اوپندر ناتھ اشک ہندی ڈراموں کے اصلاح کار کی حیثیت سے ملازم ہوا تھا۔ منٹو اردو ڈراما نگار تھا۔ اس لحاظ سے اوپندر سے نہ اس کا کوئی مقابلہ تھا نہ برابری۔ دونوں میں اتنا ہی فاصلہ تھا جتنا اردو اور ہندی کے درمیان لیکن منٹو کے دل میں ایک پرانی خلش تھی جسے وہ شاید بھول بھی چکا ہو لیکن اوپندر کو دیکھتے ہی پرانے زخم تازہ ہو گئے اور وہ انتقام پر اتر آیا۔

منٹو میں انانیت بہت تھی۔ ہر دوست سے اپنی مرضی کے مطابق توقعات وابستہ کر لیتا تھا۔ وہ تو بس یہ چاہتا تھا کہ پوری دنیا اس کی خواہش کے مطابق چلتی رہے۔ اس کے اندر ہمیشہ ایک جنگ چھڑی رہتی تھی۔ جہاں کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہوئی اور وہ ہتھیار باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ انتقام پر تل جاتا۔ جب دلی ریڈیو اسٹیشن پہنچا تو اس کی مقبولیت نے اس میں تکبر کا عنصر بھی شامل کر دیا ایسے میں اس کا سامنا اوپندر ناتھ سے ہو گیا۔ منٹو کو سب کچھ یاد آ گیا۔ اوپندر بھی کسی کو خاطر میں نہ لانے والا مزاج رکھتا تھا۔ وہ بھی دبنے کو تیار نہیں تھا۔

بات یہ ہوئی تھی کہ بہت پہلے اشک نے منٹو کی ایک کہانی ''خوشیاں'' کو دو کوڑی کی کہانی کہہ دیا تھا۔ یہ بات کسی ذریعے سے منٹو تک پہنچ گئی تھی۔ اشک سمجھ رہا تھا کہ یہ بات آئی گئی ہو گئی ہو گی لیکن منٹو کو سب کچھ یاد آ گیا۔

ایک روز ریڈیو اسٹیشن کے ایک کمرے میں اوپندر کچھ لکھنے میں مصروف تھا کہ منٹو ٹہلتا ہوا ادھر آ نکلا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت شرارت بھری وہی چمک تھی جو ایسے مواقع پر اس کی آنکھوں میں روشن ہو جاتی تھی۔ اس کے سینے میں جلتا ہوا الاؤ اس کے ہونٹوں تک آ گیا۔

''کیوں جی، میری کہانی ''خوشیاں'' کیا ابھی تک تمہیں ناپسند ہے یا اب عقل آ گئی۔''

اوپندر سمجھ رہا تھا کہ منٹو بات کو کس طرف لے جانا چاہتا ہے اور کیا اگلوانا چاہتا ہے۔ اس نے بات کو ٹالنے کے لیے اس کے ایک ڈرامے کی تعریف شروع کر دی لیکن منٹو کے دماغ کی سوئی تو ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی تھی۔

''تمہیں میری کہانی میں کیا پسند نہیں آیا جو تم نے اسے دو کوڑی کا کہہ دیا؟''

''میں نے دو کوڑی کا لفظ ہرگز استعمال نہیں کیا تھا۔ میں نے صرف ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔''

''یہی تو پوچھ رہا ہوں تمہیں کیا پسند نہیں آیا۔''

اتنے اصرار کے بعد اوپندر کو اپنی ناپسندیدگی کا سبب بتانا پڑا۔ اس کی تنقیدی رائے سن کر منٹو بھڑک اٹھا۔

''تمہیں افسانہ نویسی کا علم بھی ہے تم خود کیا لکھتے ہو مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔''

اس سے پہلے کہ اوپندر بھی کوئی جواب دیتا چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔ اوپندر کو اسٹیشن ڈائریکٹر نے بلایا تھا۔ اسے جانا پڑا اور بات بظاہر ختم ہو گئی لیکن بات ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے سے نکلا تو منٹو اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ منٹو نے حقارت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ایک طرف کو نکل گیا۔ اوپندر ناتھ نے شکر بھیجا کہ اس نے کچھ کہا نہیں مگر رنجش ادھر بھی تھی۔

ایسا ہر روز ہونے لگا۔ اس صورتِ حال سے اشک تنگ بھی تھا۔ آخر ایک روز وہ کرشن چندر کے کمرے میں پہنچ گیا۔

''تم منٹو کو سمجھا دو۔ وہ مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتا ہے۔ میں ابھی تو کچھ نہیں کہہ رہا ہوں لیکن ایک دن میں بھی اسے کھری کھری سنا دوں گا۔''

''میرے سمجھانے سے کیا وہ سمجھ جائے گا۔ تم اس معاملے کو جس طرح چاہو سلجھا لو۔ میں نہ اس کی حمایت کروں گا نہ تمہاری۔''

چراغ حسن حسرت بھی ان دنوں ریڈیو پر آ گئے تھے۔ منٹو سے ان کی دوستی بھی تھی۔ وہ ان کی رنگین محفلوں میں شریک ہوتا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ حسرت کو بیچ میں ڈالے لیکن پھر اس کی خودداری نے گوارا نہیں کیا کہ اس کا جھگڑا دوسرے نمٹائیں۔ اس نے یہ جنگ خود لڑنے کا فیصلہ کیا۔ وہ منٹو کے کمرے میں پہنچ گیا۔

''میں نے تمہاری کہانی ''دھواں'' پڑھی۔''

''کیسی لگی؟'' منٹو نے پوچھا۔

''نہایت بکواس کہانی ہے۔ فحاشی کے سوا اس میں رکھا ہی کیا ہے۔''

''یہ تم کہہ رہے ہو جسے میں افسانہ نگار مانتا ہی نہیں۔ ہاں ڈراما لکھ لیتے ہو وہ بھی اگر انہیں ڈراما مان لیا جائے۔''

''ڈرامے تو تم بھی لکھ لیتے ہو لیکن کیا جھک مارتے

ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔" اوپندر نے کہا اور مزید کسی بحث سے الجھے بغیر اٹھ کر کرشن چندر کے کمرے میں چلا گیا۔

منٹو کا غصہ تو ابھی اترا ہی نہیں تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کرشن کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اوپندر نے یہاں بھی اس کا سامنا کرنا مناسب نہ سمجھا اور اسٹوڈیو میں چلا گیا۔ بات یہ تھی کہ اسے منٹو کی کہانی "دھواں" بھی پسند تھی اور ریڈیو سے نشر ہونے والے اس کے ڈرامے بھی لیکن اس کا مقصد تو محض تنگ کرنا تھا۔ اسی لیے وہ برائی کر رہا تھا تاکہ منٹو جو اپنی تخلیقات کی مخالفت برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا بھڑک اٹھے اور اندر ہی اندر جلتا رہے۔

نتیجہ حسب توقع نکلا۔ منٹو کئی دن تک اسے گالیاں دے دے کر اپنا بخار اتارتا رہا۔ ایک تخلیق کار کے لیے یہ سب سے بڑا امتحان ہے کہ کوئی اس کی تخلیق کو برا کہے اور وہ اسے برداشت کر لے۔

☆......☆

اشک نے دلی پہنچتے ہی چند دوستوں کی موجودگی میں کوشلیہ سے شادی کر لی تھی۔ شادی سے پہلے وہ ہیڈ مسٹریس تھیں۔ گھر میں رہنے کی عادی نہیں تھیں۔ پڑے پڑے بور ہو جاتی تھیں۔ اوپندر کی مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ اس کے پاس گھر میں رہنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ دلی کی ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور وہ ان سب کا حصہ بنا ہوا تھا۔ ان دنوں دلی میں ادیبوں کے تین بڑے مرکز تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پر پطرس بخاری کا دفتر تھا جہاں ادبی، لسانی اور دنیا جہان کے موضوعات پر گفتگو اور منصوبہ بندیاں ہوتیں۔ چراغ حسن حسرت کا آشیانہ جہاں ادیبوں کی قلمی مہمات اور مختلف ادبی رجحانات پر گفتگو ہوتی اور بادہ شبانہ کی محفلیں جمتیں۔ تیسرا مرکز حفیظ جالندھر کا نگار خانہ شعر و سخن تھا۔ اس سے آگے چل کر میراجی، قیوم نظر، مختار صدیقی اور یوسف ظفر کے مشورے سے حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی گئی۔ وہ ان سب محفلوں کی رونق بڑھا کر گھر پہنچتا تو کوشلیہ سو چکی ہوتی اور وہ لکھنے بیٹھ جاتا۔

کوشلیہ نے اپنے لیے کوئی مصروفیت نکالنے کے لیے اسے بتائے بغیر ہندوستانی فوج کے خواتین ونگ میں نوکری کر لی۔ فوج میں عورتوں کی نوکری کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور لوگ سمجھتے تھے کہ انگریزوں نے یہ ونگ اپنی تفریح کے لیے قائم کیا ہے۔ اوپندر نے ان خدشات کا اظہار اپنی بیوی کے سامنے کیا لیکن وہ اڑی رہیں۔

"تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے اگر عورت اچھے کردار کی ہو تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

اوپندر نے کوشلیہ سے زیادہ دنیا دیکھی تھی۔ شادی نئی نئی ہوئی تھی۔ لڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت تو خاموش رہا لیکن خاموشی سے فیض احمد فیض سے ملاقات کی۔ فیض صاحب بھی فوج میں آ گئے تھے۔ ان سے کہہ کر کوشلیہ کو ان کے دفتر میں ملازمت دلوا دی۔ یہاں مصروفیت زیادہ نہیں تھی۔ دو چار خط ٹائپ کرنا ہوتے تھے۔ خالی اوقات میں اوپندر کے ڈرامے ٹائپ کرتی رہتی تھیں۔

ریڈیو پر منٹو اور اوپندر ناتھ اشک کی نوک جھوک زوروں پر تھی۔ کرشن بھی منٹو ہی کا ساتھ دیتا تھا۔ اس لیے اوپندر دبا رہتا تھا۔ ن م راشد بھی منٹو کا دوست تھا۔ اس لیے اس کی اور دھاک بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس دوران منٹو نے راشد سے بھی بگاڑ لی۔ منٹو کی قسمت خراب تھی کہ ن م راشد پروگرام ڈائریکٹر ہو گئے۔ نہلے پر دہلا یہ ہوا کہ راشد نے اس عہدے پر براجمان ہوتے ہی کرشن کا تبادلہ لکھنو کرا دیا۔ منٹو کے تکبر کی عمارت کا ایک ستون اور گر گیا۔ اس کے کمزور ہوتے ہی اسے نیچا دکھانے کے لیے اوپندر اس کی تاک میں لگ گیا اور یہ موقع اسے جلد ہی مل گیا۔

کرشن چندر کی جگہ ایک پروگرام اسسٹنٹ لکھنو سے تبادلہ ہو کر آیا۔ منٹو نے حسب عادت اس سے راہ و رسم پیدا کر لی اور ساتھ ہی اوپندر کے خلاف اسے بھڑکانا شروع کر دیا۔

اشک نے سوچنا شروع کر دیا اور پھر اس نے بھی وہی داؤ آزمانا شروع کر دیا جو منٹو آزما چکا تھا۔ اس نے اٹھتے بیٹھتے اس لکھنوی پی اے کی تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ خوشامد پسند آدمی ثابت ہوا اور بہت جلد اوپندر سے گھل مل گیا۔ جب وہ اسے خوب شیشے میں اتار چکا تو اس نے اپنی مونچھیں درست کیں اور حملہ آور ہو گیا۔

"ڈرامے ذرا دیکھ بھال کر براڈکاسٹ کیا کیجیے۔ اگر کوئی غلطی چلی گئی تو ذمہ داری آپ کی ہو گی۔ ہندی مسودے تو آپ پڑھ ہی لیتے ہیں اردو مسودے میں آپ کو سنا دیا کروں گا۔ اگلے ہی دن اس پروگرام اسسٹنٹ نے منٹو کا ڈراما "آوارہ" نکالا جو نشر ہونے والا تھا اور اوپندر کو بلا لیا۔

اوپندر نے نہ صرف مسودہ سنایا بلکہ لال پینسل سے الفاظ اور محاورات بدلتا چلا گیا۔

"دراصل راشد صاحب (ن م راشد) ان الفاظ اور محاورات کے سخت خلاف ہیں اس لیے بدل رہا ہوں۔" اس نے صرف الفاظ نہیں بدلے بلکہ انجام تو بالکل ہی کاٹ دیا اور تین انجام اپنی طرف سے تجویز کر دیے کہ ان میں سے کوئی ایک منتخب کر لیا جائے۔"

"اب اس مسودے کو آپ راشد صاحب کے پاس لے جائیے اور ان سے کہیے یہ تبدیلیاں آپ نے خود کی ہیں۔"

"مگر یہ تو آپ نے کی ہیں۔"

"یہ تبدیلیاں آپ کی طرف سے ہوں گی تو آپ کی علیت کا رعب پڑے گا۔ راشد صاحب تخلیقی لوگوں سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ کرشن چندر کا تبادلہ ہی اس لیے ہوا تھا کہ وہ کسی تبدیلی کے بغیر ڈراما جانے دیتے تھے۔ غلطیاں بعد میں سامنے آتی تھیں۔"

ریڈیو کی سیاست ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ کوئی بات چھپی رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ منٹو کے علم میں فوراً آ گیا کہ اس کے ساتھ کیا..... ہوا ہے۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا راشد کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"ڈراما ہوگا تو بغیر تبدیلی کے ہوگا ورنہ نہیں۔"

اب اس کو کیا کہا جائے کہ وہ راشد سے بھی بگاڑ چکا تھا۔ وہ بھی ضد پر آ گئے۔ "ڈراما انہی تبدیلیوں کے ساتھ ہو گا۔"

دوسرے دن میٹنگ میں ڈرامے کا قصہ پیش ہوا اور اس ڈرامے پر تنقید ہوئی۔ راشد صاحب کو خوش کرنے کے لیے سب ہی نے اپنا حصہ ڈالا اور خوب تنقید کی۔

ڈراما منٹو کا ہو اور اس پر تنقید ہو۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ کبھی ایسا ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے سارا غصہ اوپندر پر اتارا۔ اوپندر بھی کم نہیں تھا۔ اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیے۔ اتنا شور ہوا کہ اسٹیشن ڈائریکٹر بھی کمرے میں آ گیا۔ منٹو نے اسے بھی زبان کی دھار پر رکھ لیا۔

ڈائریکٹر یہ فیصلہ دے کر چلا گیا کہ ڈراما تبدیلیوں کے ساتھ ہی نشر ہوگا۔

منٹو نے اس کے بعد کسی سے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے اپنے کمرے میں آیا۔ ٹائپ رائٹر اٹھایا اور ریڈیو کی عمارت سے باہر نکل گیا۔

اوپندر کو اس طرح اس کے چلے جانے کا بڑا دکھ ہوا۔ اس نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ منٹو نوکری چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کا مقصد تو محض اسے تنگ کرنا تھا۔

وہ اداس رہنے لگا تھا۔ منٹو سے اس کی چلتی بھی تھی اور اب اس کی کمی بھی محسوس کر رہا تھا۔ ریڈیو ایسی جگہ بن گئی تھی جہاں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔

ریڈیو کا ماحول تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ کرشن تو لکھنو چلا ہی گیا تھا اختر الایمان بھی نوکری چھوڑ گیا۔ جو باقی رہ گئے تھے وہ راشد کی خوشامد میں لگے ہوئے تھے۔ ادبی ماحول ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ مقابلے کی وہ فضا ہی نہیں رہی تھی جس میں رہتے ہوئے اس نے بہترین ڈرامے لکھے تھے۔ انہی ڈراموں کی بدولت ہندی ڈراموں میں اس کا نام سب سے زیادہ اہم ہو گیا اس نے ہندی ڈرامے کو نصابی کتابوں سے نکال کر براہ راست اسٹیج سے جوڑا۔ انہیں تاریخی پورا تک کتھاؤں سے نکال کر سیدھے اپنے سماج سے مربوط کیا اور ان میں سماج کے اوہام و خرافات، حماقتوں، ریا کاریوں اور جھوٹ کو طنز و مزاح کے پیرائے میں بہترین مصوری کی۔ ہندی کا کوئی دوسرا تخلیق کار ایسا نہیں تھا جو اتنا سنجیدہ ہو کر فن کی تخلیق کرتا ہو۔

جو لوگ اسے ڈراما لکھنے کی تحریک دلاتے تھے وہ اب نہیں رہے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کی نوکری ایک ایسا ادبی اکھاڑا ثابت ہوئی تھی جہاں اسے اپنی صلاحیتیں اور ہنر مندی دکھانے کا بھرپور موقع ملا تھا لیکن اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر استعفیٰ دے دیا اور فوج کے نمائندہ اخبار "فوجی اخبار" میں نوکری کر لی۔

اس نوکری کی بھاری تنخواہ کی بدولت اس کے حالات بدل گئے۔ اس کے گھر میں تخلیق کاروں کی محفلیں ہونے کے بدلے فوجی افسروں کی پارٹیاں ہونے لگیں۔

☆......☆

منٹو ریڈیو کی نوکری چھوڑ کر بمبئی چلا گیا۔ بمبئی فلم نگری تھی۔ یہاں اچھا لکھنے والوں کی ضرورت ہمیشہ رہتی تھی۔ منٹو کا نام کسی کے لیے نیا نہیں تھا۔ ذرا سی تگ و دو کے بعد اسے مشہور فلم کمپنی "فلمستان" میں تین سو روپے ماہوار کی نوکری مل گئی۔

اس ادارے میں اس کی تنخواہ پانچ سو تک پہنچ گئی۔ افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے اس کی آمدنی دو ڈھائی ہزار تک پہنچ گئی۔

اس منزل تک پہنچ کر اسے سب کچھ بھول جانا چاہیے

تھا لیکن وہ کچھ بھی نہیں بھولا تھا۔ اسے سب کچھ یاد تھا۔ پھر اس نے ایسی ترکیب سوچی جو وہ ہی سوچ سکتا تھا۔ اس نے اوپندر کو خط لکھا اور اسے بمبئی کی فلمی دنیا سے جڑ جانے کا مشورہ دیا۔

"دہلی میں پڑے کیوں بھاڑ جھوک رہے ہو۔ بمبئی چلے آؤ۔ یہاں دولت کی ریل پیل ہے۔ دونوں ہاتھوں سے سمیٹو۔ میرے قدم جم چکے ہیں تمہارے لیے بہت سے مواقع پیدا کرسکتا ہوں۔"

خط پڑھتے ہی عجیب سی قربت کا احساس ہوا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی منٹو ہے۔ اسے شدت سے اپنے جرم کا احساس ہونے لگا۔ میں تو اسے ملازمت سے نکالنے کا محرک بنا تھا اور وہ میرے مستقبل کے لیے فکرمند ہے۔ اس نے نہایت جذباتی انداز میں کوشلیہ کو یہ خط دکھایا۔ وہ متاثر تو بہت ہوئیں لیکن یہاں ان کی نوکری لگی ہوئی تھی۔ یہ انہیں منظور نہیں تھا کہ اوپندر بمبئی چلے جائیں اور وہ خود دلی میں رہیں۔

بات ٹل گئی۔ اوپندر نے اپنی مجبوری لکھ کر بھیج دی۔

وہ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن اسباب بنتے جارہے تھے۔ فیض صاحب کا تبادلہ ہوگیا۔ ان کی جگہ جو فوجی افسر آیا اس نے کوشلیہ سے کوئی بدتمیزی کی۔ وہ غصے میں دہرا دون گئیں۔ مقابلے کے امتحان میں بیٹھیں اور جونیئر کمانڈنٹ بن کر واپس آگئیں۔

اس دوران منٹو کے کئی دل لبھانے والے خط آچکے تھے اور اوپندر نے بالآخر بمبئی جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ کوشلیہ نے سنا تو اپنا تبادلہ نیوی میں کرالیا اور ٹریننگ کے لیے شوہر کے ساتھ بمبئی جانے کا فیصلہ کرلیا۔

وہ بمبئی پہنچا تو منٹو خود اسے لینے اسٹیشن آیا۔ اوپندر خوش ہوگیا کہ منٹو نے اسے معاف کردیا ہے لیکن اس کی یہ غلط فہمی بہت جلد دور ہوگئی۔

"وہ تمہارا لال کیا ہوا مسودہ اب تک میرے پاس ہے۔" منٹو نے وکٹوریہ میں بیٹھے بیٹھے ایک ترچھی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

اوپندر کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا مطلب ہے اسے سب کچھ یاد ہے لیکن وہ یہاں لڑنے نہیں آیا تھا۔ اس نے منٹو کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو دہلی کی دہلی میں رہ گئی اگر یہیں اسی طرح لڑنا ہے تو میں ابھی واپس دلی چلا جاتا ہوں۔"

"نہیں نہیں یہاں ایسا نہیں ہوگا۔" منٹو نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔

منٹو نے کہہ تو دیا تھا کہ اب ویسا کچھ نہیں ہوگا لیکن اوپندر سوچوں میں پڑ گیا۔ جب اس کا دل صاف نہیں تو اس نے مجھے یہاں کیوں بلایا۔ اوپندر نے تشویش کے ساتھ سوچا۔

کنٹریکٹ پر دستخط کرنے سے پہلے اس نے منٹو کی پوزیشن اور اس ادارے کے بارے میں چھان بین کی تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ فلمستان کے مالک مکرجی منٹو پر جان چھڑکتے ہیں۔ اس کا ایک طاقتور گروپ یہاں موجود ہے۔ فلمستان میں ایک ہی منظر کو سب مکالمہ نویس لکھتے ہیں۔ منٹو سب کے مکالمے پڑھتا ہے۔ تبدیلی کا اسے اختیار ہے اس کا مطلب ہے اب وہ میرے مسودے کو لال کرے گا۔ ان حقائق کو جاننے کے بعد اسے پھریری آگئی۔ وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچنے لگا۔ ایک تدبیر پر اس کے ذہن کی سوئی رک گئی۔ اس نے فلمستان کے مالک مکرجی کے سامنے دو شرطیں رکھیں۔ میرا کمرا الگ ہوگا۔ صرف میں ہی لکھوں گا اور میں ہی ڈائیلاگ ڈائریکشن کروں گا۔

ان شرائط کا مقصد ہی یہ تھا کہ منٹو اس کے مکالموں پر ہاتھ صاف نہ کرسکے۔ شرائط منظور ہوگئیں اور اس نے لگاتار دو فلمیں لکھیں۔ پہلی فلم "مزدور" اور دوسری "سفر" تھی۔

اشوک کمار نے جو مکرجی کا سالا تھا اور خود بھی فلمستان سے وابستہ تھا کسی بات پر بہنوئی سے خفا ہوکر اپنی فلم الگ پروڈیوس کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اشوک کو کہانی کی تلاش ہوئی تو اس نے اوپندر سے رابطہ کیا۔ اوپندر نے اسے آئیڈیا سنایا جو اس نے پسند بھی کرلیا لیکن بات معاوضے پر آکر رک گئی۔

"میں مکالمہ نویس ہونے کی تنخواہ لیتا ہوں۔ کہانی لکھوں گا تو دو ہزار لوں گا۔"

"میں پیسوں کا انتظام کرتا ہوں۔ تم کہانی لکھنا شروع کرو۔" اشوک کمار نے تھوڑی سی تکرار کے بعد وعدہ کرلیا۔ منٹو کو معلوم ہوا تو اس نے اوپندر کو نیچا دکھانے کے لیے بغیر معاوضہ لیے کہانی لکھنے کا وعدہ کرلیا۔ فلم کا نام "آٹھ دن" رکھا گیا۔

اوپندر کہانی لکھ کر اشوک کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔

منٹو اس کا پتا کاٹ کر خوش ہوتا رہا۔ اس نے اپنی دانست میں اوپندر کو دو ہزار کا چونا لگا دیا اور آئندہ کے لیے

راہیں بھی مسدود کردیں۔

اوپندر بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ اس نے ایک اور ترکیب نکال لی "آٹھ دن" کا ڈائریکٹر اس کا دوست تھا۔ اوپندر نے اس سے کہہ کر اس فلم میں پنڈت طوطا رام کا مزاحیہ رول لے لیا۔

اصل کہانی میں یہ رول بہت مختصر تھا لیکن اوپندر نے اسے اس خوبی سے ادا کیا کہ اشوک کو بے حد پسند آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس رول کو بڑھا کر پوری فلم میں رکھا جائے۔ یہ کردار خالص ہندی زبان بولتا تھا۔ اشوک نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اس کردار کے تمام مکالمے اوپندر لکھے گا۔

منٹو زچ ہو کر رہ گیا۔ ایک روز وہ اتنا پریشان ہوا کہ سیٹ پر اوپندر سے الجھ پڑا۔ بات اتنی بڑھی کہ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ اشوک نے درمیان میں پڑھ کر صلح کرا دی۔

صلح تو کئی مرتبہ ہو چکی تھی۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ دونوں اپنی اپنی فطرت سے مجبور تھے کوئی مستقل ہتھیار ڈالنے کو تیار نہیں تھا۔ اوپندر ڈھیلا پڑتا تو منٹو تن جاتا۔ منٹو ڈھیلا پڑتا تو اوپندر ہتھیار بند ہو جاتا۔ دونوں ملتے بھی تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں پر بھی جاتے تھے لیکن ایک چنگاری تھی جو ایک دوسرے کے سینوں میں سلگتی رہتی تھی۔ ایک شطرنج تھی جس پر دونوں کھیل رہے تھے۔ ایک دوسرے کی چال کاٹ رہے تھے۔

☆......☆

اوپندر نے بمبئی کے قیام کے دوران کہانیاں، مکالمے اور گانے لکھے۔ تین فلموں میں اداکاری بھی کی لیکن اسے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ وہ یہاں کھپ سکتا ہے۔ پیسے کمانے کے باوجود اس نقلی دنیا میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔

بمبئی صرف فلمی مرکز نہیں تھا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا دفتر یہاں تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے لوگ یہاں تھے۔ ادبی جلسے ہوتے تھے۔ پیپلز تھیٹریکل ایسوسی ایشن (اپٹا) کے تحت ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے۔ اوپندر بھی فلمی مصروفیات سے وقت نکال کر ان نشستوں میں شامل ہونے لگا۔ ان نشستوں نے اسے فلموں کی نقلی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں سیر کرنے کی تخلیقی سہولت فراہم کی۔

قیام پاکستان کا وقت قریب آرہا تھا۔ سیاسی حالات بہت گرم تھے۔ جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکریٹری سجاد ظہیر نے اوپندر سے ہندو مسلم فساد پر ایک ڈراما لکھنے کی گزارش کی۔ یہ یک بابی ڈراما کمیونسٹ پارٹی کے پیپلز پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوا لیکن اپٹا نے اسے کھیلنے سے انکار کر دیا۔ اوپندر نے اپنی ہدایت میں ڈراما تیار کیا اور بلراج ساہنی کو مرکزی رول دے کر اس ڈرامے (طوفان سے پہلے) کو پیش کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اسے پہلی بار بمبئی کے علاقے "اندھیری" میں اسٹیج کیا۔ اس کا ارادہ اس ڈرامے کو ہر محلے میں اسٹیج کرنے کا تھا لیکن اس سے پہلے کہ ایسا ہوتا برطانوی حکومت نے ڈرامے پر پابندی لگا دی۔

اوپندر نے فلمستان والوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ تیسرے سال نوکری نہیں کریں گے۔ یہ مدت 1946ء میں ختم ہونے والی تھی اوپندر اور کوشلیہ نے طے کیا تھا کہ لاہور جا کر اپنا ذاتی مطبع شروع کریں گے اور اپنی کتابیں خود شائع کریں گے۔ کوشلیہ موٹا موٹا سامان لے کر لاہور چلی گئی تھیں۔

اوپندر ناتھ کو فلمستان کی مدت ختم ہونے کے بعد روانہ ہونا تھا۔

وہ اپنے ڈرامے کی ریہرسل کے بعد سینڈ ہرسٹ روڈ سے واپس اپنے مکان کی طرف آرہا تھا کہ تیز بارش ہوگئی۔ وہ اسی طرح بھیگتا ہوا گھر تک آگیا۔ گھر پہنچتے ہی ہلکا سا بخار ہوگیا۔ ظاہر ہے اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ وہ بارش میں بھیگ گیا ہے۔ اس نے پروا نہیں کی۔ رات میں بخار اور تیز ہوگیا۔ صبح ہوئی تو بخار اتر چکا تھا لیکن جتنی دیر میں وہ باہر نکلنے کی تیاری کرتا بخار پھر تیز ہوگیا۔ وہ ڈاکٹروں کے پاس جانے کا چور تھا لہٰذا گھر ہی میں پڑا رہا۔

دوسرے دن وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ بس تھوڑی سی کھانسی تھی۔ وہ اپنی مصروفیات میں مصروف ہوگیا۔ تین چار دن کے وقفے کے بعد بخار پھر ہوگیا۔ اب اسے تشویش ہوئی اس نے ڈاکٹر کو دکھایا۔ ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا ٹی بی (تپ دق) کے آثار ہیں۔

اس نے کوشلیہ کو تار لکھ دیا کہ فوراً چلی آئے۔ کوشلیہ نے لاہور پہنچ کر "مطبع" کے انتظامات شروع کر دیے تھے کہ یہ تار ملا وہ فوراً بمبئی چلی آئی۔

وہ اسے فروری 1947ء میں "پنچ گنی" لے گئیں اور اسے بیل ایئر سینی ٹوریم میں داخل کروا دیا۔

پنچ گنی میں وہ ڈیڑھ سال رہا۔ ڈاکٹروں نے اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے پر پابندی لگا دی تھی لیکن اس کی انگلیاں

حرکت میں رہیں اس کا قلم چلتا رہا۔ وہ برابر لکھتا رہا۔ وہ سینی ٹوریم ہی میں تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ اس نے اس المیے پر ایک کہانی ''ٹیمل لینڈ'' کے نام سے لکھی اس کے علاوہ بچے، استر اور جب سنت رام نے بیلن اٹھایا جیسی کہانیاں، مختصر نظم ''برگد کی بیٹی'' اور یک بابی ڈراما ''کیسا ساب کیس آیا'' بیماری کے دوران ہی تخلیق کیں۔

اس کی نظم ''دیپ جلے گا'' اس تبصرے کے ساتھ ''ہنس'' میں شائع ہوئی کہ اس نظم کے تخلیق کار دور دراز پنچ گنی کے ٹی بی سینی ٹوریم میں مریض ہیں۔

نظم کے ساتھ اس نوٹ کے شائع ہوتے ہی ہندی تخلیق کاروں کی توجہ اس کی طرف گئی اور اتر پردیش کی پہلی قومی حکومت نے اسے علاج کے لیے پانچ ہزار روپے کا تعاون دیا۔

اسی سال اس کے ضخیم ناول گرتی دیواریں کا پہلا حصہ شائع ہوا۔ ناول کے شائع ہوتے ہی اس کی بڑے پیمانے پر شہرت ہو گئی۔ پریم چند کے گئودان کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی ہندی ناول ہو جس پر اتنا لکھا گیا ہو۔ ناول شائع ہوتے ہی تبصروں کے انبار لگ گئے۔

''گرتی دیواریں'' ایک بڑا کینوس ہے جس میں ہر اس واقعے، حادثے، اُمید، آرزو، کامیابی، ناکامی، پیار اور چوٹ کا ان کی کشمکش کا ناول ہے جو نچلے متوسط طبقے کی زندگی کا تانا بانا کستے اور ڈھیلا کرتے ہیں یا بنتے ہیں۔ ہر گلی۔ کوچے اور مکان ڈیوڑھی کے تعارف اور گھر باہر کے اپنے پرائے کے تعلق سے ایک سستے اوچھے پن کی بو آتی ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر سیلن کی سی ٹھہری ہوئی غلیظ بے شرم بو، ہر چیز ہر بات کے اندر ایک ہائے ہائے بھری بے کاری جی توڑ اور جان مار کوشش...... جس کا نتیجہ آخر میں ایک دن مصیبت زدہ ابتر انداز سے مسکراتی ہوئی ہار لاچاری اور سمجھوتا۔ بس یہی رنگ ہے۔ ہر طرف اس نچلے متوسط طبقے کی دنیا کا۔''

''یقیناً یہی محلوں کے زمینی اور معاشرتی جغرافیہ کی عکاسی میں اشک جی کو حیرت انگیز کامیابی ملی ہے۔ ٹوٹے پھوٹے، بوسیدہ کھنڈروں جیسے مکانوں کی گندگی اور سڑاند، تنگ گلیوں کی نالیوں سے اٹھنے والی بدبو۔ وہاں پر باندھی ہوئی بھینسوں کی پونچھوں سے اچھلتی ہوئی چڑ، دھول، دھکڑ اور گرد و غبار کے ساتھ ساتھ باشندوں کے داخلی رشتوں آپسی تناؤ اور سڑکوں کا چھوٹے چھوٹے اسباب کو لے کر لڑتے جھگڑتے مرد و عورتوں کی جیسی زندہ اور جیتی جاگتی مصوری اس ناول میں کی گئی ہے ویسا کم ہی دکھائی دیتا ہے۔''

☆......☆

سینی ٹوریم میں پڑے پڑے فلمی دنیا سے کمایا ہوا سارا روپیا ختم ہو چکا تھا۔ ملک کی تقسیم نے لاہور جا کر مطبع شروع کرنے کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ایسے ہی اتر پردیش کی غیر متوقع امداد نے اس کے عزائم کو مہمیز کیا۔

اب سوال یہ تھا کہ سینی ٹوریم سے نکل کر وہ کہاں جائے گا۔ لاہور یاد آتا تھا لیکن اب وہ ہندوستان کا نہیں پاکستان کا حصہ تھا۔ وہاں نہ ہندی ادب کی کھپت ہو سکتی تھی نہ اس کا مستقبل تابناک تھا۔ ہندوستان میں رہ کر اسے یہ امید تھی کہ اگر کبھی وقت پڑا تو ہندوستانی حکومت اس کی مدد کرے گی جیسے اس وقت کی۔ سوال یہ تھا کہ ہندوستان بہت بڑا ہے کہاں جا کر رہے۔ اسی حالت میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جالندھر، دلی، بمبئی یا کسی اور جگہ کی بجائے الہ آباد جا کر رہے گا۔ الہ آباد ہمیشہ سے ہندی ادیبوں کا گڑھ رہا ہے۔ خود اس کے کئی دوست وہاں تھے جو اسے کئی بار مدعو بھی کر چکے تھے۔

اس نے اپنا سامان باندھا اور الہ آباد پہنچ گیا۔ کچھ عرصہ ایک دوست کے گھر گزارا اور پھر ایک مکان لے کر وہاں منتقل ہو گیا۔

حکومت نے دو سو روپے ماہانہ کا وظیفہ اس کے نام جاری کر دیا۔ کتابوں کی رائلٹی بھی اسے مل رہی تھی جو گزارے کے لیے کافی تھی۔ وہ سینی ٹوریم سے باہر آ گیا تھا لیکن بستر کا قیدی اب بھی تھا۔ اسے چلنے پھرنے، بستر سے بلاضرورت اٹھنے، زیادہ باتیں کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ گرمی کے باوجود سوئٹر اور مفلر لپیٹنے پر مجبور تھا۔ آنکھوں میں شوخی اسی طرح موجود تھی۔ ٹی بی سے چھلنی پھیپھڑوں کے باوجود وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ قہقہوں کی گونج میں اگر محلے بھر میں نہیں تو کمرے میں تو زلزلہ برپا کرنے کی طاقت اب بھی باقی ہے۔ وہ دو سال بستر پر پڑا رہا لیکن اس نے بستر کو علالت کا بستر نہیں بننے دیا۔ میدانِ عمل بنا دیا۔ اسی پلنگ پر بیٹھے بیٹھے کہانیاں اور نظمیں لکھتا رہا۔ اسی پلنگ کے گرد مذاکرے ہوئے۔ مشاعرے ہوئے، ادبی بحثیں ہوتی رہیں۔

اتر پردیش حکومت نے مشہور افسانہ نگار خواجہ احمد عباس کی ایک کہانی ''سردار جی'' پر مقدمہ دائر کر دیا۔ اوپندر

بستر پر تھا لیکن اس کا حوصلہ احمد عباس کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی بستر علالت پر بیٹھے بیٹھے ایک مجلس مخالفت قائم کی اور عباس کو لکھا کہ ہندی اردو بھی لکھنے والے آپ کے ساتھ ہیں۔

اس کی کوششوں سے اتنا تو ہوا کہ حکومت نے مقدمہ واپس لے لیا لیکن یہ سزا بھی اسے ملی کہ اس کا وظیفہ بند کر دیا گیا۔

وہ جیسے تیسے گزارا کرتے رہے۔ کوشلیہ نے حالات کی اکھاڑ پچھاڑ میں نوکری بھی چھوڑ دی تھی۔ جو کچھ وہ لکھ رہا تھا اس پر گزارہ تھا تب اس کی بیوی آگے بڑھی۔ تقسیم سے پہلے اس نے چاہا تھا کہ لاہور میں پبلشنگ ہاؤس قائم کر لیں۔ پھر لاہور پاکستان میں چلا گیا اور یہ خواب ادھورا رہ گیا۔ اب کوشلیہ نے امرتسر ہی میں پبلشنگ ہاؤس قائم کرنے کی ٹھانی۔ انہوں نے حکومت سے قرض لے کر ”نیلابھ پرکاشن“ کے نام سے ادارہ قائم کیا اور اشک کی کتابیں شائع کرنا شروع کر دیں۔

برسوں پہلے ایک نوجوان نے بڑا آدمی بننے کے شوق میں بڑے شہر میں قدم رکھا تھا اور اب ایک نہیں تین تین بڑے شہروں میں گھومنے کے بعد الہ آباد آ گیا تھا جسے دوسرا جالندھر کہا جا سکتا تھا۔ اب وہ بستر سے اٹھ کر اسی جدوجہد میں شامل ہونے والا تھا جس کا آغاز جالندھر میں کیا تھا۔ وہ اور کوشلیہ کتابوں کے بیگ اٹھائے گھر سے نکلے۔ پورے ملک کے دورے کرتے رہے تاکہ اپنی کتابیں بیچ سکیں اور اپنے پبلشنگ ادارے کو معاشی طور پر مستحکم کر سکیں۔ دکان دکان شہر شہر دورے کیے اور کتب فروشوں سے آرڈر لیے۔

1956ء میں اسے سوویت سرکار کی دعوت پر یوم کالی داس کے جلسے میں حصہ لینے کے لیے سوویت یونین بلایا گیا۔ اس دورے میں وہ کابل، اسٹالن گراڈ، لینن گراڈ، ماسکو اور مختلف دوسری جگہوں کا سفر کیا۔ بہت سے لکھنے والوں اور اداکاروں سے ملاقاتیں کیں۔

وہاں سے آ کر وہ ایک ایسے کام میں مشغول ہو گیا جس نے تاریخی حیثیت حاصل کر لی۔ اس نے اس وقت کی بہترین ہندی تخلیقات کا ایک ضخیم انتخاب ”سنگیت“ کے نام سے تالیف کیا۔ تاریخی اہمیت کے اس مجموعے میں پرانی اور نئی نسل کے لکھنے والوں کی بہترین تخلیقات تھیں ساتھ ہی اسے بہت سے ایسے نئے اور ابھرے ہوئے تخلیق کاروں کو پہلی بار پیش کیا گیا جو بعد میں بہت مشہور ہوئے۔

اسی سال اس نے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کا خاکہ ”منٹو میرا دشمن“ کے عنوان سے تحریر کیا۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران دونوں نے ایک ساتھ بہت سا وقت گزارا تھا۔ منٹو کی اچھائیاں برائیاں سب اوپندر کے سامنے تھیں بلکہ وہ ان کا نشانہ بنتا رہا تھا۔ اس نے ان تمام واقعات کو اس طرح بیان کر دیا کہ منٹو کی پوری شخصیت پڑھنے والے کے سامنے آ گئی۔

پچاس کی دہائی تک ہندی میں خاکہ بہت کم تخلیق کیا گیا تھا اور جو کچھ تخلیق ہوا تھا وہ عقیدت کے پھول سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اوپندر نے ”منٹو میرا دشمن“ لکھ کر اس تاریخ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

اس خاکے کا ہندی میں کافی تیکھا ردِعمل ہوا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اردو کے ادیب ایسے کھلے تذکرے کے عادی ہو چکے تھے۔ عصمت چغتائی کے سگے بھائی اور مشہور مزاح نگار عظیم بیگ چغتائی کی موت پر لکھا گیا خاکہ ”دوزخی“ نے جہاں اردو ادیبوں کو چونکا دیا تھا وہیں خاکہ نگاری کے اسلوب کا پیش رو بھی ثابت ہوا۔ اردو کے ادیب و قاری ایسے بے باک خاکے کے اسلوب سے متعارف تھے اس لیے ”منٹو میرا دشمن“ ان کے لیے اسی روایت کی ایک کڑی تھی اس کے برعکس ہندی میں خاکوں کی ایسی کھلی اور بے باک روایت کا شدید بحران رہا ہے۔ ہندی میں اس بے باکی کی کوئی روایت نہیں تھی لہٰذا اشک کا یہ خاکہ ان کی روایت سے مختلف ہونے کی وجہ سے ہنگامے کا باعث بنا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی تعریف شروع ہو گئی۔

عجیب بات ہے کہ اس کے ناولوں سے زیادہ اس ایک خاکے نے اسے شہرت دوام بخشی۔

اس کی جب پچاسویں سالگرہ منائی گئی تو وہ اتنا اہم اور مشہور ہو چکا تھا کہ تیس سے زیادہ سرکردہ ہندی اردو تخلیق کاروں نے اسے مبارک باد دی تذکرے لکھے اور اس کی شخصیت کا بے باک تجزیہ کیا۔ یہ تمام مضامین کوشلیہ کی ادارت میں شائع ہوئے۔

اس کی آبائی ریاست پنجاب کی سرکار نے اس کے آبائی شہر جالندھر میں اس کے لیے عوامی اعزازی تقریب بھی منعقد کی۔ اس کی طبیعت پھر ناساز رہنے لگی تھی لیکن مصروفیات قدم قدم پر تھیں۔ مئی 1961ء میں وہ قومی زبان پرچار کمیٹی کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے آسام گیا۔ اس ادارے کا قیام مہاتما گاندھی کے ذریعے

وردھا میں عمل میں آیا تھا۔ اجلاس کے بعد وہ آسام کے مختلف مقامات کا دورہ کرتا رہا لیکن ایک مقام کالم پونگ پہنچ کر بیمار ہوگیا۔ وہ کسی حال میں بھی کام کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی بیماری کے دوران اس نے ''گرتی دیواریں'' کا دوسرا حصہ ''شہر میں گھومتا آئینہ'' پورا کیا۔

وہ بیماری سے نمٹنے کے بعد الہ آباد واپس آگیا۔ اگلے سال آندھرا پردیش اور کیرل گیا۔ پھر کسولی گیا جہاں اس نے گرتی دیواریں کے تیسرے حصے ایک ننھی قندیل کے کچھ ابواب لکھے۔ یہاں اسے دمے کا سخت دورہ پڑا۔ اس سے پہلے یہ شکایت اسے کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے بعد وہ بیماری سے مسلسل دوچار رہا۔ کبھی بہت زیادہ کبھی کم لیکن اس کے باوجود وہ برابر لکھتا رہا۔ تپ دق جیسے موذی مرض نے بھی اسے لکھنے سے نہیں روکا اسی طرح اس نے دمے کے ساتھ بھی جینا اور لکھنا سیکھ لیا۔

1969ء میں اس نے گرتی دیواریں کا تیسرا حصہ ایک ننھی قندیل اور اس کے ساتھ ہی 25 یک بابی ڈراموں کا مجموعہ شائع کیا۔

اسے ایک وفد کے ساتھ ماسکو جانا تھا لیکن اب وہ اتنی اہمیت حاصل کرچکا تھا کہ اپنی شرائط منوا سکتا تھا۔ اس نے یہ شرط رکھ دی کہ چونکہ وہ گرتی دیواریں کا چوتھا حصہ لکھ رہا ہے اس لیے وہ اس سال روس کا سفر نہیں کرسکتا۔ اس کی شرط مان لی گئی لہٰذا مئی 74ء میں وہ روس گیا۔

روس روانہ ہونے سے پہلے اس کے دوست کیمبرج یونیورسٹی کے شعبہ ہندی کے صدر جناب اسٹیوورٹ میک گریگر کا خط اس کے پاس آیا۔

''وہاں کا کام نمٹا کر کیمبرج آؤ اور خطبہ دو۔''

اوپندر نے اس کی ایک کاپی ماسکو بھجوا دی۔ اس نے ماسکو کا دورہ مکمل کرنے کے بعد کیمبرج اور لندن یونیورسٹی میں جدید ہندی افسانوی ادب پر خطبے دیے۔

جب اس کے دوست جرمنی کے دانش ور پیٹر گیا فلے کو اشک کے انگلستان میں ہونے کا پتا چلا تو انہوں نے نہ صرف اسے ہالینڈ آنے کی دعوت دی بلکہ اس کے خاندانی دوست بان یونیورسٹی کے شعبہ سنسکرت کے صدر ڈاکٹر تلک راج کو بھی مغربی جرمنی کی اس وقت کی راجدھانی بان میں خطاب کے لیے بلایا۔ ڈاکٹر گیا فلے اس کی رہائش گاہ لندن آئے اور اسے ساتھ لے گئے۔

ڈاکٹر گیا فلے نے نہ صرف یہ کہ سات دنوں میں کار سے ہالینڈ کے مشہور شہروں کی سیر کرائی بلکہ مشہور مصور ایم براں اور وان گانگ کی نمائش بھی دکھائی۔ بان میں اس کے جرمن میزبان ڈاکٹر تلک راج کی کوششوں سے بان یونیورسٹی کے اساتذہ کے مذاکرے میں جن میں انگریزی اور سنسکرت کے اساتذہ بھی تھے اوپندر نے خطبہ دیا۔ ابھی وہ خطبہ دینے کھڑا ہوا تھا اور صرف اتنا کہا تھا ''میں اب آپ کو جدید ہندی ادب کے بارے میں کچھ بتاؤں گا'' کہ سامعین میں سے ایک لڑکی کھڑی ہوئی اور چیخ چیخ کر کہنے لگی۔

''نہیں نہیں، ہمیں ہندی ادب میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ سامنے الماری میں آپ کے ضخیم ناول کے پانچ حصے پڑے ہیں اور ہم سنتے ہیں آپ دو اور لکھیں گے۔ آپ مہربانی فرما کر ہمیں بتایئے کہ اتنا ضخیم ناول لکھنے کی آپ کو تحریک کہاں سے ملی۔ آپ نے ان ناولوں میں کیا لکھا ہے؟ اگلے ناولوں میں آپ کیا لکھنے جارہے ہیں۔''

اوپندر کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ 1947ء میں گرتی دیواریں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ ملک کے طول و عرض میں کشمیر سے کیرل اور چندی گڑھ سے کلکتہ تک مختلف شہروں میں گیا تھا۔ ان شہروں میں اس نے شاعری سنائی، ڈرامے پیش کیے لیکن کبھی کسی نے اسے ضخیم ناول پر سوال نہیں کیا اور یہاں یہ جرمن لڑکی اس کے ناول کے سلسلے میں سوال کررہی تھی۔ وہ یہ طے کرچکا تھا کہ جب تک ناول پورا نہیں کرلیں گے صرف ردِعمل سنیں گے خود کچھ نہیں کہیں گے لیکن اس نے اپنی قسم توڑ دی اور پورے تین گھنٹے تک گرتی دیواریں کے محرکات اور اس کے مختلف حصوں میں جن مسائل کا ذکر ہے اس کے بارے میں تفصیل سے اپنی بات کہی۔

اس خطبے کا مثبت پہلو یہ نکلا کہ ڈاکٹر گیا فلے نے اپنی انگریزی کتاب ''بیسویں صدی کا ہندی ادب'' میں پورا باب اس کے ناول پر لکھا۔

یہاں اپنے ناول کی ایسی پذیرائی دیکھ کر اس کی ایسی ہمت بندھی کہ واپس آتے ہی اس ضخیم ناول کا چھٹا حصہ ''پلٹتی دھارا'' لکھنے بیٹھ گیا۔ چند صفحات لکھنے کے بعد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ صفحات آگے نہیں بڑھ سکیں گے کیونکہ اس کا بیشتر حصہ لاہور کے پس منظر میں لکھا جانا تھا۔ لاہور دیکھے بہت دن ہوگئے تھے۔ اس نے چاہا کہ کچھ جزئیات تازہ کرنے کے لیے ایک بار لاہور ہو آئیں لیکن دونوں ملکوں کے تعلقات بگڑ جانے سے اسے ویزا نہ مل سکا اور پھر

بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ یہاں اس کی قوت ارادی کام آئی۔ وہ کامل دو مہینے تک دھیرے دھیرے چڑھنے کی مشق کرتا رہا۔ اس نے کمال کر دیا۔ اس مشق کے بعد وہ ڈھائی کلو میٹر کی سیدھی چڑھائی چڑھ گیا۔ یہاں اس نے ناول کا حصہ مکمل کیا۔ پہاڑ سے اترا تو وہ رئیس ترین آدمی تھا جس نے افسانے میں حقیقت کا رنگ بھر لیا تھا۔

ایسی محنت شاید ہی کسی فنکار نے کی ہو۔

ناول کا یہ حصہ ''دھولا دھار کی چھایا'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

وہ ضخیم ناول ''گرتی دیواریں'' کا چھٹا حصہ کب کا مکمل ہوا پڑا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ اس کی طباعت کے لیے پیسوں کا انتظام نہ کر سکا۔ اس نے اس کا ایک آزاد حصہ ''نیلا مجھے معاف کرنا'' کے نام سے الگ سے چھپوا دیا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس نے تحریک پا کر اس نے چھٹے حصے ہی سے ناول کا ایک آزاد حصہ ''بہرام پور کے ویرانے'' کے نام سے تیار کیا۔

اس کی عمر 85 سال ہو گئی تھی۔ بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ ہاتھوں میں گٹھیا تھا۔ تیس برس پرانا دمہ تھا۔ پھیپھڑے کمزور تھے۔ بڑھاپا کیا کم بیماری ہے۔ اس پر مستزاد یہ بیماریاں۔ ان شدید رکاوٹوں کے باوجود وہ اپنا ناول مکمل کرتا رہا وہ تو اس وقت چونکا جب اسے معلوم ہوا کہ اس کے پبلشنگ ادارے ''نیلابھ پرکاشن'' پر ساڑھے تین لاکھ کا قرض چڑھ گیا ہے۔ یہ قرض ہوش اڑا دینے والا تھا۔ اس کے دونوں بیٹے آپس میں لڑ پڑے۔ اس قرض کا ذمہ دار ایک دوسرے کو قرار دے رہے تھے۔

اس کے دو بیٹے تھے۔ رمیش پہلی بیوی شیلا دیوی کی یادگار تھا اور دوسرا ''نیلابھ'' تھا جو کوشلیہ کے بطن سے تھا۔ نیلابھ کی ماں زندہ تھی جو ہر موقع پر اس کی حمایت بھی کرتی رہتی تھی۔ اس لیے نیلابھ دینے کو تیار نہیں تھا جب کہ رمیش کو یہ زعم تھا کہ وہ بڑا ہے۔ گھر میں ہر وقت تکرار رہنے لگی۔

اس کی اپنی بیماری، بیوی کی بیماری، گھر میں تکرار، وہ تن کر کھڑا ہو گیا۔ ''تم آپس میں مت لڑو، قرض جتنا بھی ہو جس نے بھی چڑھایا ہوا سے میں اتاروں گا۔ میری عمر ایسی ہے کہ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہے لیکن نیلابھ پرکاشن کو اس کے پیروں پر کھڑا کر کے دکھاؤں گا۔'' پھر اس نے اسی طرح دنیا کو چونکا دیا جیسا کہ گھر میں پرچون کی دکان کھول کر چونکا یا تھا۔

اگلے دس سال تک یہ حصہ ادھورا پڑا رہا۔

اس دوران وہ اپنی خودنوشت ''چہرے انیک'' لکھنے بیٹھ گیا۔ اس خودنوشت میں تقریباً پچاس برسوں کے ادبی سماج کی ایک شفاف تصویر ہے۔ اس کے ہر حصے میں وہ اپنا ایک نیا چہرہ دکھاتا ہے اور اس کوشش میں اوپندر کے اس چہرے کے متعلق: کتنے ہی دوستوں کے چہرے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ ایک حصے میں اپنے سنجیدہ چہرے کے پیچھے چھپے مسرور، نقالی، چہل باز، لطیفہ گو اور جوکر کو بے نقاب کیا ہے۔ ایک حصے میں اپنے غصیلے، مخالف اور اپنے اندر چھپے غمزدہ انسان کو بے نقاب کیا ہے۔ ایک حصے میں اپنے ستم ظریفانہ روپ کی پرتیں اکھاڑی ہیں۔ ایک حصے میں فلمی دنیا میں گزرے دنوں کے تجربات ہیں۔ ایک حصہ اس کی سادہ لوحی اور آسانی سے یقین کرنے والے کی عکاسی کرتا ہے۔

چہرے انیک اس لحاظ سے باقی خودنوشتوں سے الگ ہے کہ اس میں مصنف ''میں'' کی شکل میں نہیں بلکہ تیسرے فریق کی شکل میں آیا ہے یعنی مصنف نے خود کو ایک کردار کے روپ میں دیکھا اور بیان کیا۔

وہ اس خوش نوشت کے پانچ حصے ہی لکھ پایا تھا کہ 1980ء میں اسے ویزا مل گیا اور وہ پاکستان چلا گیا۔ لاہور کے گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ پرانے دوستوں سے ملاقاتیں کیں۔ ادبی اجتماعات میں شرکت کی حسین یادوں کو تازہ کیا اہم نوٹس لیے اور واپس آکر چھٹا حصہ لکھنے بیٹھ گیا۔ اسے پورا بھی کر لیا تھا کہ اسے لگا کہ کچھ تفصیلات غلط جا رہی ہیں۔ وہ ایک مرتبہ پھر پاکستان گیا۔ اس مرتبہ بھی اس کا پرجوش استقبال ہوا۔ انجمن ترقی اردو پاکستان نے اس کی پچاس سالہ خدمات کے بدلے اپنا سب سے بڑا ایوارڈ اسے دیا۔ واپس آکر اس نے ناول کے آخری حصے کو دوبارہ لکھا۔

اسی دوران وہ چند خاندانی جھگڑوں میں گرفتار ہو گیا۔ اس کا چھوٹا بیٹا ناراض ہو کر لندن چلا گیا اور بی بی سی میں ملازم ہو گیا۔ نیلابھ پرکاشن کی دیکھ بھال وہی کر رہا تھا۔ اس کے نہ ہونے سے ادارے کی حالت بے حد خراب ہو گئی اور مسلسل نقصان ہونے لگا۔ بڑا لڑکا سخت بیمار ہو گیا۔ ادارے کا کام بالکل ہی ٹھپ ہو گیا۔ اس کی بیوی کوشلیہ جو پبلشنگ ہاؤس کی مرکز و محور تھیں فالج کا شکار ہو گئیں۔

کاغذ کی قیمت میں بے حد اضافہ ہو گیا۔ کتابوں کی ساری خرید سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لی اور وہ بڑے پبلشرز سے بازی نہ جیت سکا۔ تمام کتابیں گوداموں میں

اس کی شناخت... اوپر کے بڑے دانت

ابن انشا سے کون واقف نہیں۔ انہیں ان کی خوبصورت شاعری اور شگفتہ کالم نگاری کی وجہ سے آج بھی سب جانتے ہیں، مگر ان کا اپنا ایک پرابلم تھا کہ وہ سوائے ایک اداکارہ کے کسی کو پہچانتے نہیں تھے۔ اگرچہ وہ روزانہ ایک فلم بڑی پابندی سے دیکھتے تھے۔ یہ قصہ قیام پاکستان کے دو تین برس بعد کا ہے جب ابن انشا لاہور میں رہتے تھے اور ان کے گھر کے اردگرد نشاط سینما اور کیپٹل سینما تھے۔ ایبٹ روڈ پر واقع اپنے اس مکان میں وہ کئی برس رہے اور سینما گھروں کے قریب ترین ہونے کی وجہ سے وہ روزانہ ایک فلم دیکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن ان کے ایک ادیب دوست نے ان سے پوچھا۔

"یہ تم روزانہ فلم کیوں دیکھتے ہو؟"

"مجھے ہندوستانی فلموں کی ہیروئن بڑی اچھی لگتی ہیں۔"

"اچھا۔ کون کون سی ہیروئن اچھی لگتی ہیں تمہیں؟"

"یوں تو سبھی ہیروئن اچھی لگتی ہیں۔ مگر سوائے ایک کے کسی کو پہچان نہیں پاتا نہ ہی ان کے نام مجھے معلوم ہیں۔"

"وہ خوش نصیب ہیروئن کون ہے جس کا نام بھی تمہیں یاد ہے اور جسے تم پہچان بھی لیتے ہو؟"

"اس کا نام ثریا ہے۔ میں اسے اسکرین پر دیکھتے ہی پہچان لیتا ہوں۔"

دوست نے جب ان سے اس خصوصی رغبت کی وجہ پوچھی تو جانتے ہیں، ابن انشا نے کیا جواب دیا؟ انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"دراصل میں اس کے اوپر کے دانتوں کی وجہ سے اسے پہچان لیتا ہوں جو باہر کو نکلے ہوئے ہیں اور اتنے نمایاں ہیں کہ مجھے اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔"

ثریا، اپنے اونچے دانتوں کے علاوہ اپنی معمولی شکل وصورت کی وجہ سے پُرکشش شخصیت کی مالک نہیں تھی۔ اس کے باوجود اپنے دور کی نامور اداکارہ تھی۔ وہ اپنے دور میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ تھی۔ اس زمانے کی دو بڑی اداکاراؤں کامنی کوشل اور نرگس پر اسے اس لیے برتری حاصل تھی کہ وہ اپنے گانے بھی خود ہی گاتی تھی۔ اپنی

بند ہو گئیں۔ وہ نرا ادیب تھا کاروباری معاملات جانتا نہ تھا۔ معاشی پریشانیاں سر اٹھانے لگیں۔ ان پریشانیوں سے تنگ آکر اس نے ایک ایسا کام کیا کہ ہندی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اس نے تھوڑے سے پیسے لگا کر اپنے گھر میں پرچون کی دکان کھول لی تاکہ خاندان کی روزمرہ کی ضرورت پوری ہو سکے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دلی کے قومی روزناموں نے اس پر اداریے لکھے، ملک کے انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں کے رسالوں میں ہنگامہ مچا رہا۔

سال بھر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

مخالفین مذاق اڑاتے رہے اور وہ تیکھے جواب دیتا رہا اور حکومت کے ہاتھوں بک جانے والے ادیبوں کی خوب خبر لی۔

اسے دکان چلاتے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا کہ اس نے پھر کمر باندھی۔ وہ دلی گیا اور حکومت کی غلط پالیسیوں اور چھوٹے مصنف پبلشروں کی افسوسناک صورت حال پر وزیراعظم راجیو گاندھی کو ایک میمورنڈم ان سے ملاقات کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا۔

راجیو گاندھی اور تو کچھ نہ کر سکے البتہ یہ ہوا کہ ان کے کہنے پر وزارت انسانی وسائل نے اس کے لیے چار برسوں کے لیے وظیفہ جاری کر دیا تاکہ وہ اپنا ناول مکمل کر سکے۔

1946ء میں تپ دق سے نبرد آزما ہونے والا یہ ادیب ابھی تک زندگی سے جنگ کر رہا تھا۔ اس کے تجربات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس کا ناول مزید آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ اپنے ناول کا ساتواں حصہ لکھنے بیٹھ گیا۔ چار سال اور گزر گئے۔ اس نے ساتویں حصے کے تیس ابواب مکمل کیے۔ اب ناول میں ایک ایسا مقام آ گیا جسے مکمل کرنے کے لیے پہاڑ پر جانا ضروری تھا تاکہ افسانے میں حقیقت کا رنگ بھرا جا سکے۔ اس کی عمر اب اسی سال ہو چکی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب پہاڑ پر کیا چڑھ سکوں گا۔ ممکن تھا اس کا کام ادھورا رہ جاتا خوش قسمتی سے ہماچل کے وزیراعلیٰ شانتا کمار کے علم میں یہ بات آئی۔ انہوں نے اوپندر کو ہر طرح کی سہولت دے کر دھرم شالہ مدعو کیا۔ کھانے پینے اور ٹھہرنے کی سہولت دے کر ایک فل ٹائم ٹائپسٹ بھی مہیا کروا دیا۔ یہ سب تو ہو گیا تھا لیکن پریشانی یہ تھی ناول کے اس حصے کے لیے کم از کم ڈھائی کلومیٹر کی چڑھائی چڑھنا ضروری تھا جب کہ اب وہ

آواز کا جادو جگانے کے ساتھ ساتھ اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا بھی لوہا منوا چکی تھی۔ اس کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اس نے شادی نہیں کی اور کنواری ہی دنیا سے رخصت ہوگئی۔ شادی نہ کرنے کی وجہ اس کی سخت گوش نانی کو قرار دیا جاتا ہے۔ دیو آنند کے ساتھ اس کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ 1948ء سے 1951ء تک اس نے دیو آنند کے ساتھ چھ فلموں میں لیڈنگ رول ادا کیے تھے۔ اسی دوران میں ان دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ استوار ہوگیا تھا اور وہ شادی کرنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی نانی سماج کی دیوار بن گئی اور ان کی سیاست نے یہ ثابت کردیا کہ "یہ شادی نہیں ہوسکتی۔"

مگر اس حقیقت کو ایک شخص ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ثریا نے اس کے عشق میں مبتلا ہونے کی وجہ سے دیو آنند سے شادی نہیں کی۔ وہ مزنگ لاہور کا ایک درزی تھا۔ جس کا دعویٰ تھا کہ وہ ثریا کا عاشق ہے اور ثریا بھی اس پر مرتی ہے۔ وہ ادھیڑ عمر کا اور خاصا بدشکل آدمی تھا۔ مگر اپنے عشق کے ہاتھوں مجبور تھا۔ گزشتہ صدی کے پچاس اور ساٹھ کے عشروں میں اس کا یہ عشق بہت مشہور رہا۔ لاہور کے اخبارات کے فلمی ایڈیشنوں میں اس کے مراسلے اور بیانات اکثر چھپتے رہتے تھے جن میں وہ اس بات کے دعوے کرتا تھا کہ ثریا اس کی ہے اور اس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ وہ شادی کرے گی تو صرف اسی سے کرے گی ورنہ عمر بھر کنواری رہے گی۔ اس زمانے میں لاہور کے تقریباً سبھی اخبار ثریا کے اس عاشق کے بارے میں کچھ نہ کچھ چھاپتے رہتے تھے۔ کچھ لاہوریئے اس سے مزہ بھی لیتے تھے، انہی کے ورغلانے پر وہ دو چار باراتیوں کے ساتھ دلہا بن کر بمبئی چلا گیا کہ اپنی محبوبہ کو دلہن بنا کر لاہور لے آؤں گا۔ بمبئی جا کر میرین ڈرائیو میں واقع ثریا کے گھر کے باہر اس نے پڑاؤ ڈال دیا کہ میں برات لے کر آگیا ہوں۔ مگر حسبِ توقع اسے وہاں کسی نے کوئی لفٹ نہیں دی کہ وہ ہفتہ بھر کی کوشش بسیار کے باوجود ثریا سے ملنے میں کامیاب نہ ہوا۔ لاہور واپس آ کر اس نے نہایت آزردگی سے بتایا۔ "میرے دشمنوں نے مجھے ثریا سے ملنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ انہیں خطرہ تھا کہ وہ مجھ سے نکاح کر کے لاہور چلی جائے گی اس لیے انہوں نے اسے کمرے میں بند کردیا تھا۔ مگر ثریا میری ہے اور دیکھنا وہ میرے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرے گی۔"

مرسلہ: انور فرہاد، کراچی

پچاس سال سے چھوڑی ہوئی صحافت کو اپنایا اور سال بھر میں 58 مضامین لکھ کر اخباروں کے سپرد کیے۔ قرض اتارنے کی دھن ایسی سوار تھی کہ توسیعی خطبات میں حصہ نہ لینے کی اپنی قسم کو توڑا اور دور دراز احمد آباد اور اندور تک جا کر خطبات دیے۔

یہی نہیں اسی عالم میں وہ دلی گیا اور اپنے تیرہ یک بابی ڈراموں کا سیریل منظور کرالیا اور اسے پروڈیوس کرنے کے لیے اپنے چھوٹے بیٹے کو دلی بھیجا۔

اسی نے ہماچل میں پہاڑ پر چڑھنے کے لیے جو محنت کی تھی۔ اس سے زیادہ محنت اب کر ڈالی۔ محنت کا پھل پیسوں کی صورت میں تو مل گیا لیکن صحت گرتی چلی گئی۔ کمر میں سخت درد رہنے لگا۔ اس نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ ایسے موقعوں پر گھریلو نسخوں پر یقین رکھتا تھا۔ اس معاملے میں چھوٹا موٹا حکیم وہ خود تھا۔ آزمائے ہوئے گھریلو علاج شروع ہوگئے لیکن دواؤں میں تاثیر نہیں رہی تھی یا بڑھاپے کی ہڈیاں سرکش ہوگئی تھیں۔ درد کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا۔ مجبوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔

ڈاکٹر نے کمر پر پٹی باندھ کر پیروں میں اینٹ لٹکا دی گویا کہہ رہا ہو بہت گھوم پھر لیے۔ اب لیٹے رہو۔ درد ایسا تھا کہ کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ ڈاکٹر نے درد کم کرنے والی گولیاں دی تھیں۔ ان کا اثر کم ہوتے ہی وہ پھر درد سے بے حال ہوجاتا۔ گولیاں پھر دے دی جاتیں۔ کوشلیہ نے اس کے بستر کے برابر ہی بستر لگا لیا تھا۔ وہ خود بیمار تھیں۔ فالج کا حملہ دو مرتبہ ہوچکا تھا۔ چلنے پھرنے سے رہ گئی تھیں۔ اشک کی دونوں بہویں دونوں کی خدمت کررہی تھیں۔ اشک کو اب کوئی فکر نہیں تھی۔ فکر تھی تو یہ کہ اب لکھنے پڑھنے کا کیا ہو گا۔

"کوشلیہ کیا میں اب کبھی نہیں لکھ سکوں گا۔"

"کیوں نہیں لکھیں گے ابھی تو آپ کو بہت کام کرنا ہے۔"

"تکلیف ہے کہ نجات ہی نہیں لینے دیتی۔"

"کوئی تکلیف ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی۔"

"میری بینائی بھی بہت کم ہوگئی ہے۔"

"آنکھوں پر زیادہ زور نہ دیجیے۔ ویسے بھی آپ تو ڈکٹیشن دیتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن درد ایسا اٹھتا ہے کہ خیالات اِدھر سے اُدھر چلے جاتے ہیں۔"

''ڈاکٹر دو بے آئے تھے۔ بہت تسلی دے کر گئے ہیں۔ بہت جلد آپ کو اس درد سے نجات مل جائے گی۔''

''اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھ لیں اب بچوں کے بچوں کی خوشیاں اور دیکھ لوں۔ بس یہ آرزو ہے۔''

''دل چھوٹا کیوں کرتے ہیں۔ ہمیں سب کی خوشیاں دیکھنا نصیب ہوں گی۔''

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ٹائپسٹ آگیا۔ وہ ان دنوں ایک کتاب ''آدھی صدی کی ہندی کتھا لیکھیکائیں'' مرتب کر رہا تھا۔ وہ بولتا جاتا اور ٹائپسٹ ٹائپ کرتا جاتا۔ بولنا بھی یکسوئی کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ گرم پانی کی بوتل لے کر وہ اِدھر اُدھر کروٹیں بدلتا رہتا اور بولتا جاتا۔ ٹائپ کرنے والے کو بھی رحم آنے لگتا تھا کہ یہ کیسا مریض ہے جو آرام کرنے کی بجائے مسلسل بول رہا ہے۔

اس نے یہ کتاب مکمل کرلی۔

اس کتاب میں بہت تھوڑا کام تھا لہٰذا بہت جلد فرصت مل گئی۔ دراصل اس کتاب پر کمر کی تکلیف سے پہلے کام شروع کردیا تھا لہٰذا ہفتہ پندرہ دن میں مکمل کرلیا۔

اب وہ خالی تھا۔

وہ آدمی کیا تھا قوت ارادی کا شاہکار تھا۔ بیس سال پہلے کا لکھا ہوا ناٹک یاد آیا۔ اسے لکھ تو لیا تھا لیکن مطمئن نہیں ہوا تھا۔ درد کو بھلانے کے لیے اس ناٹک پر سوچتا رہا اور واقعی یہ اپنا علاج آپ کرانے کے مترادف ہوا۔ سوچتے سوچتے ناٹک کی دنیا میں پہنچ گیا اور درد کی ٹیسیں محسوس ہونا ختم ہوگئیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ بالکل ٹھیک ہوگیا ہے۔

وہ کئی دن تک اس ناٹک پر سوچتے ہوئے آرام پاتا رہا اور پھر اسی درد کے عالم میں اسے ڈراما کا اختتام سوجھ گیا۔ فائل نکلوائی۔ اسے ایک مرتبہ پھر پڑھا اور ٹائپسٹ کو سامنے بٹھا کر لکھوانے لگا۔

ڈراما پورا ہوگیا۔ من کے مطابق بن گیا۔ درد بھی کم ہوگیا۔

اسے یوں لگا جیسے اس ڈرامے کو مکمل کرنے کے لیے ہی وہ بیمار پڑا تھا۔ ڈراما مکمل ہوتے ہی اس کے درد میں کمی آگئی۔ ڈاکٹر نے اجازت دے دی کہ اب وہ چھڑی لے کر چل سکتا ہے۔

وہ چھڑی لے کر چلنے لگا لیکن صرف ضرورت کی حد تک۔ ابھی ایسا ٹھیک نہیں ہوا تھا کہ سیر و تفریح کے لیے جاسکے۔

ابھی کچھ اور چوٹیں مقدر میں تھیں۔ وہ چھڑی کے باوجود باتھ روم میں پھسل گیا اس بار اس کے سینے اور کندھے پر چوٹیں آئیں۔

اس نے پھر بستر پکڑ لیا۔ لگاتار دو مہینے تک بستر پر لیٹے رہنے سے اس کا پیٹ خراب ہوگیا۔ اوپر سے دمے نے پریشان کیا۔ رات بھر کھانستے رہنے سے دوسروں کی نیند خراب ہوتی تھی۔ اس نے اپنا بستر باہر برآمدے میں لگالیا تھا تاکہ دوسروں کی نیند بھی خراب نہ ہو اور کھلی ہوا میں سانس لینے میں بھی آسانی ہو۔

وہ بہت کمزور ہوگیا تھا۔ نہ نیند آتی تھی نہ بھوک لگتی تھی۔ ڈاکٹر کے مشورے سے وہ نیند کی گولیاں کھانے لگا تھا۔ اب وہ کھلی ہوا میں آرام سے سونے لگا تھا۔

اس رات بھی حسبِ معمول نیند کی گولی کھائی تھی۔ آدھی رات کو کسی وقت اس کی آنکھ کھلی۔ سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چھڑی سنبھالی اور پانی پینے کے لیے اٹھا۔ اب چکر آئے یا کسی چیز سے ٹکرایا، چھڑی دور جا پڑی اور وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کی چیخوں سے پورا گھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب صبح کا انتظار کیا جانے لگا کہ صبح ہو تو کسی ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ صبح ہوتے ہی اسے سوروپ کرنی اسپتال لے جایا گیا۔ ایکسرے کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ ایکسرے دیکھ کر اسپیشلسٹ نے میجر آپریشن کا مشورہ دیا۔

''تھوڑا خطرہ تو ہے لیکن اگر آپریشن کامیاب ہوگیا تو یہ پندرہ بیس دن میں اٹھنے بیٹھنے لگیں گے۔''

اسے سوروپ کرنی اسپتال میں بھرتی کرادیا گیا۔ چار دن بعد آپریشن ہونا تھا۔ کوشلیہ کے کانوں میں ڈاکٹر کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''تھوڑا خطرہ تو ہے سوچ لیجیے رسک ہے۔''

کوشلیہ نے اپنے بیٹے نیلابھ سے فون پر بات کی۔

''ڈاکٹر کہتے ہیں آپریشن رسک ہے۔ تم کہو تو ہم یہ رسک لے لیں۔''

''آپ کیا کہتی ہیں۔''

''بیٹا میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں فون کیا ہے۔''

''میں تو رسک کے لیے تیار نہیں۔ آپریشن روک دیجیے میں آرہا ہوں۔''

آپریشن روک دیا گیا۔ نیلابھ دلی سے آگیا۔ اب

یہی طے ہوا کہ آپریشن نہ کیا جائے۔ ویسے ہی ہڈی جوڑنے کا بندوبست کیا جائے۔

ٹریکشن لگا کر ٹانگ کو شکنجے میں کس دیا گیا اور پیر میں اینٹیں لگادی گئیں۔ وہ ڈیڑھ مہینے تک اسپتال کے بستر پر پڑا رہا۔

اس جیسا چنچل آدمی بہت جلد اس سزا سے اکتا گیا۔ ملاقات کے لیے آنے والے ہر آدمی سے اس کی یہی استدعا تھی کہ اسے کسی طرح گھر لے جایا جائے لیکن ظاہر ہے ڈاکٹروں کی اجازت کے بغیر یہ ناممکن تھا۔

ڈیڑھ مہینے اسپتال میں رہنے کے بعد اسے گھر لے آیا گیا لیکن پوری طرح ٹھیک ہونے میں ابھی دو مہینے اور لگنے تھے۔ ان دو مہینوں میں مسلسل فزیوتھراپی ہوتی تھی۔ ایک تجربہ کار فزیوتھراپسٹ ورزش کرانے آتا تھا۔ تکلیف دور ہوتے ہی اس کی شوخی لوٹ آئی تھی۔

”چلیے آمدنی کا ایک اور ذریعہ نکل آیا۔“ ایک دن نہایت سنجیدگی سے اپنے فزیوتھراپسٹ سے کہنے لگا۔

”مبارک ہو ذریعہ کیا نکلا۔“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”آپ نے مجھے اتنے داؤ پیچ سکھا دیے ہیں کہ کسی سے بھی کشتی لڑسکتا ہوں۔ ایک طرف اوپندر ناتھ پہلوان دوسری جانب کوئی بھی پہلوان ٹکٹ فروخت ہوں گے تو آمدنی تو ہوگی۔“

”اوپندر ناتھ جی آپ کی شوخیاں نہیں گئیں۔“

”وہ کہاں جانے والی۔ ہمارے ساتھ کے اکثر پہلوان مرکھپ گئے۔ اب کشتی تو لڑ نہیں سکتے۔ شوخیاں ہی سہی۔“

”کوشلیہ میرے ضخیم ناول کے پندرہ بیس ابواب لکھنے سے رہ گئے ہیں۔ ذرا اٹھ کر بیٹھوں تو اسے مکمل کرلوں۔ ہندی والے بھی کیا یاد کریں گے کہ میں نے کوئی شاہکار تخلیق کیا تھا۔ ویسے تو میرے ڈرامے بھی ہندی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ناول کی کیا بات ہے۔ لو میں اپنی تعریف خود ہی کرنے بیٹھ گیا۔“

”تو اس میں جھوٹ کیا ہے۔ آپ ایک نے ہندی ادب میں ہزاروں کی کمی کو پورا کیا ہے۔“ کوشلیہ بولی۔

”تم تو پتنی ہو، تم تو تعریف کروگی ہی۔“

”ہمارا آپ کی پتنی بننا ہی بتاتا ہے کہ آپ کچھ تھے۔“

”ہم کچھ بھی نہیں تھے کوشلیہ۔ بس یہ سمجھو بن باتی کا

دیا تھے ہم۔ تم ہمارے جیون میں آئیں تو ہم کچھ بن سکے۔"
دونوں طرف خاموشی سی چھا گئی۔ پھر ایک آواز ابھری۔ "میں کہوں اشک جی۔"
"کیا ہے۔"
"کیا سو گئے۔"
"نہیں تو۔"
"جی بہت گھبرا رہا ہے۔ کوئی نظم سنایئے۔"
"تمہیں تمام ہی نظمیں تو سنا چکا۔ تمہیں سنائے بغیر تو کاغذ پر لفظ نہیں اتارتا۔ نیا ہے کیا جو سناؤں۔"
"جو سنا چکے ہیں وہی سنا دیجیے۔"
"تمہیں یاد ہے مجھے میری تقدیر پنچ گنی کے سینی ٹوریم لے گئی تھی۔"
"ہاں آپ نے بھی کیسے کیسے دکھ جھیلے ہیں۔"
"میں نے سینی ٹوریم کی دکھ بھری راتوں میں "دیپ جلے گا" نظم لکھی تھی۔"
وہ اس نظم کے اشعار سنا رہا تھا اور کوشلیہ جی اس کی ہمت کی داد دے رہی تھیں جو ہر مرتبہ موت کو دھوکا دے کر بھاگ آتا ہے۔ شاید اس مرتبہ بھی......
برتن گرنے کی آواز سے اس کا دھیان کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر پائی۔ رسوئی میں بلی آگئی تھی۔ بلی راستہ کاٹ گئی یہ تو سنا تھا۔ بلی نے جملہ کاٹ لیا یہ نہیں سنا تھا۔
"بہو نے کوئی خیال تو نہیں کیا۔"
"کس بات کا۔"
"یہی کہ ہم نے اپنے پوتے کی شادی نومبر کی بجائے دسمبر میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"
"اچھا ہے نا، اس وقت تک ہم ٹھیک بھی ہو جائیں گے۔"
"ہم اب کون سے غلط ہیں کرسی پر بیٹھ کر تو اب بھی منڈپ کی سیر کر سکتے ہیں۔"
"کرسی پر کیوں ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ آگے بڑھ کر مہمان کا سواگت کریں۔"
"سواگت کریں گے۔ کیوں نہیں کریں گے۔ وہ دن تو آئے۔"
اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی لیکن شادی سے دو چار دن قبل اس کی حالت پھر بگڑ گئی۔ اب تاریخ آگے نہیں بڑھائی جا سکتی تھی لہٰذا یہ طے ہوا کہ اشک کے کمرے کے سامنے منڈپ سجا دیا جائے گا۔ دلہن کو وہ لوگ شادی کے لیے لے آئیں گے اور سیدھے سادے ڈھنگ سے شادی ہو جائے گی۔

شادی والے دن منڈپ سجا دیا گیا۔ وہ کسی طرح ہمت کر کے وہیل چیئر پر دو گھنٹے بیٹھ کر شادی کی رسمیں دیکھتا رہا۔ جب رسمیں ختم ہو گئیں تو وہ بستر پر نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ مہمان ایک ایک کر کے اس کے کمرے میں اس کی خیریت دریافت کرنے آتے رہے۔ شادی کی خوشی اس کے چہرے پر تھی لیکن مہمانوں سے ملتے ملتے تھک گیا تھا۔
"اب اور کسی کو نہ لانا۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ سونا چاہتا ہوں۔" اس نے بیٹے سے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔
اس کے بعد طبیعت ایسی بگڑی کہ سنبھلنے میں نہیں آئی۔ بالآخر اسے اسپتال لے جانا پڑا۔ ڈاکٹروں نے آپس میں مشورہ کیا۔ خون چڑھایا گیا۔ گلوکوز چڑھایا گیا۔ ہاتھوں کی نسیں پیروں کی نسیں، نیزل فیڈنگ کے لیے ناک میں پائپ۔ ڈاکٹروں نے کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن سب کوشش بے کار۔
19 جنوری 1996ء کو کمرے میں ڈاکٹروں کی بھیڑ تھی۔ اس کی نبض ڈوب گئی مگر سانس پھر بحال ہو گئی۔ دل دھڑکنے لگا۔ شام تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔
وہ بے ہوش تھا اور اسے ہوش میں لانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ وہ تھا کہ کسی کو بتائے بغیر موت سے جنگ کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔
ڈاکٹر، دوائیں دعائیں ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔
باہر سورج ڈوب رہا تھا اور یہاں ادب کا سورج غروب ہو رہا تھا۔
19 جنوری 1996ء کا سورج پوری طرح ڈوبا نہیں تھا کہ اوپندر ناتھ اشک اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اس کی ایک نظم اس وقت اس کے بستر کے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔

جنم دوسری بار ملے تو
صحت ملے یہ تو چاہوں گا
لیکن ہو دماغ یہی
ہو یہی تخلیقیت کی بے تابی
محنت کی ہمت رہے یہی بہتر کی خواہش
ذرا اور صلاحیت مل جائے تو کیا کہنا
ذرا اور بڑھ پائیں تو کیا کہنا

ماخذات:

اوپندر ناتھ، اشک: راجندر ٹوکی،
منٹو میرا دشمن: اوپندر ناتھ، اشک

سلمیٰ اعوان

وہ بلتستان کا شہزادہ تھا اور یہ مغل شہزادی۔ دہلی کے قلعہ کی پروردہ لیکن جب عشق نے حسن کو پابہ زنجیر کیا تو وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس برف زار میں اس نے اپنی وفا کی وہ قندیلیں روشن کیں جو تاریخ کا حصہ ہیں۔

ایک باوفا شہزادی کا ذکرِ خاص، ہماری تاریخ کا دلچسپ باب

جیپ اسکردو ائیر پورٹ روڈ پر تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ روح اللہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو پھر آپ آہی گئیں بلتستان۔ پر میں حیران ہوں آپ اکیلی کیسے چلی آئیں؟“

اُس نے چہرہ کھڑکی سے باہر کیا۔ ہوا کے تھپیڑوں نے بالوں کی لٹوں سے اٹکھیلیاں شروع کر دیں۔ روح اللہ کو شاید ابھی تک اس کے وجود کا یقین نہیں آرہا تھا۔ ریت کے لمبے چوڑے میدان شروع ہو گئے تھے۔ سڑک کے دورویہ

درخت پیچھے رہ گئے تھے۔ اوائل بہار میں یہ درخت بہت مسحور کن خوشبو فضا میں بکھیرتے ہیں گمبہ اسکردو اور امام بارگاہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ جب اُس نے اپنا رُخ اندر کیا اور بولی۔ ”ارے میرا وطن ہے یہ روح اللہ! مجھے تو یہاں آنا ہی تھا۔ رہی بات تنہا آنے کی۔ بتاؤ تم لوگ نہیں ہو کیا یہاں۔ بھلا شبیر اور تم میں کوئی فرق ہے۔“

وہ ہنسی تھی اور ہنسی میں اُس کی ذات سے متعلق سب کچھ چھپ گیا تھا۔ تبھی روح اللہ کامیاب داستان گو کی طرح شروع ہوا۔

بلتستان کو چینی لوگوں نے بلور، لداخیوں نے اسے بلتی یل یا سری بتان (خوبانیوں کی سرزمین) خلیجی ممالک نے اسے تبت خورد اور یہاں کے باشندوں کو تبتی کہا ہے۔ ایرانی مبلغین کی اس علاقہ میں آمد کے بعد اس کا نام تبتی زبان کے لفظ ”بلتی“ اور فارسی کے لفظ ”ستان“ سے بلتستان بنا اور یہی اس کا آج کا نام ہے۔

ریت کا میدان ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ہوا گرم تھی۔ روح اللہ نے ساری گرم ہوا اپنے چہرے پر لینے کی کوشش کی اور پھر بولا۔

”گیارہویں صدی عیسوی میں یوں ہوا کہ رینگو گلیشئر اپنی جگہ سے ذرا سا سرک گیا اور دریائے شیوق میں زبردست طغیانی آگئی۔ اس کی تباہ کاریوں نے اس عظیم سلطنت بلور کو تباہ کر دیا۔ سینکڑوں دیہات نیست و نابود ہوگئے۔ لاکھوں انسان اس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس سیلاب نے اپنی راہ میں آنے والی ہر وادی کو کاٹ کر گہری اور ریتیلی وادیوں میں بدل دیا۔ اس طوفان کا زیادہ نشانہ بلور کا دارالحکومت جو مقامی روایات کے مطابق ”رگیایل“ (بڑی اور بادشاہ کی جگہ) کہلاتا تھا، برسوں ایک ریتیلے اور پتھریلے میدان کی صورت میں پڑا رہا۔ جس کی وجہ سے تبتی لوگوں نے اسے اسکرم دو یعنی خشک اور ویران جگہ کا نام دیا۔ اسکرم دو بعد میں کثرت استعمال سے اسکردو بن گیا۔“

جیپ کی رفتار بڑی سُست تھی۔ کہیں کہیں ننگے بچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف یوں چمکتی تھی جیسے کسی کالے کلوٹے چہرے پر برص کے دھبے۔

شگری کلاں گزرا۔ جیپ اس نے دائیں جانب موڑ لی۔ نصف کلومیٹر پر شگری بالا تھا۔ پھر جیپ ایک جگہ رُک گئی۔ روح اللہ باہر آ گیا۔ وہ بھی اُتر آئی۔

باہر دھوپ تیز ضرور تھی۔ پر ہوا کی تیزی تپش کو محسوس نہیں ہونے دیتی تھی۔

یہ جگہ شگری بالا تھی۔ سامنے ایک بڑے سے ٹیلے پر زمانہ قدیم کے رہائشی محل کے آثار پائے جاتے تھے۔ روح اللہ نے ایک پتھر کے پاس جا کر کہا۔ ”اسے دیکھیے ہم اسے اپنی بلتی زبان میں بردوسنساس (چکی کے پاٹ کا سرہانہ) کہتے ہیں۔ یہ پتھر آج بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ ایک خوبصورت داستان وابستہ ہے۔“

اب وہ ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گیا تھا۔ اس نے عینک اُتار دی تھی اور ابھی یہ الفاظ اس کے ہونٹوں سے نکلے ہی تھے کہ ”ہاں تو جب یہ وادی اسکردو...“

اس نے جو اس سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی، روح اللہ کی بات کاٹ دی۔ ”روح اللہ! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ تاریخ کا یہ عظیم سرمایہ مجھے اتنی جلدی نگلوانے کی کوشش مت کرو۔ میں اسے ہضم نہ کر پاؤں گی۔ میں کوئی دنوں کے لیے تھوڑی آئی ہوں۔ مہینوں رہوں گی۔ چپہ چپہ کونا کونا چھانوں گی۔ وادی وادی گھوموں گی۔ چلو اُٹھو مجھے گھر لے چلو۔ بیوی بچوں سے ملاؤ اور جب شام ڈھلے گی تو یہاں آئیں گے اور پھر اسی ٹیلے پر بیٹھ کر میں تم سے یہ تاریخی داستان سنوں گی۔“

روح اللہ شرمندہ سا ہو گیا۔ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ”دراصل میں بھی عجیب سرپھرا آدمی ہوں۔“

اس کا چہرہ ابھی بھی معصوم تھا۔ اس کا جسم ابھی بھی زمانہ طالب علمی جیسا دبلا پتلا تھا۔ اس نے عینک آنکھوں پر چڑھائی اور جیپ کی طرف بڑھا۔

اب پھر اسکردو ائیرپورٹ روڈ پہیوں کے نیچے تھی۔ ویران سڑک مقپون پل یعنی ہرگیسہ نالہ آیا۔ اس میں سدپارہ جھیل کا پانی رواں دواں تھا۔

اسکردو ڈگری کالج کے ساتھ ہی اسکردو بازار شروع ہوتا ہے۔ دکانوں کے اندر بیٹھے باریش مرد۔ دکانوں سے باہر باتیں کرتے لوگ۔ چلتے پھرتے بچے۔ غیرملکی سیاحوں کی ٹولیاں بازار میں ایک بھی عورت نظر نہیں آتی تھی اور جب جیپ یادگارِ شہداء کے پاس سے گزرنے لگی اُس نے کہا۔ ”روح اللہ ذرا میں فاتحہ پڑھنا چاہتی ہوں۔“

وہ اُتری۔ اُن شہداء کی یادگار جنہوں نے بلتستان کو پاکستان میں مدغم کرنے کے لیے آزادی کی جنگ لڑی اور شہید ہوئے۔ اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

پھر چشمہ بازار گزر گیا۔ اسکمیدان کی گلیوں میں سے

ہوتے ہوئے وہ اب سیٹلائٹ ٹاؤن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خوبانی کے درخت پھلوں سے بوجھل تھے۔ پر پھل ابھی کچا تھا۔ توت بھی کہیں کہیں نظر آجاتا تھا۔ دراصل یہ مئی کے آخری ہفتے کا پھل تھا۔ گھروں میں سیبوں کے درختوں پر پھل ابھی موٹے بیروں جیسے تھے۔ گیلاس اور شوغون پک چکے تھے۔ صرف دو درختوں پر اسے آلو بخارا نظر آیا تھا۔

پھر جیپ ایک آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ گھر زیرِ تعمیر لگتا تھا۔ صحن میں بجری اور پتھر پڑے تھے۔ سارا کنبہ بڑے کمرے میں جمع تھا۔ ایک مشترکہ گھر جو وہ پیچھے چھوڑ کر آئی تھی، ایک اور مشترکہ گھر جو اس کا استقبال کر رہا تھا۔ روح اللہ کا بڑا بھائی ایم ڈی خان اسکردو کے ایک بڑے تعلیمی ادارے کا سربراہ تھا۔ ان کی لاہوری بیوی بہت تپاک سے ملی۔ پر روح اللہ کی بیوی سیماں! تبریز کی پیداوار، اسکردو کا قیمتی فیروزہ جسے دیکھ کر اس نے سوچا۔

”تبریز کا سارا حسن سمیٹ لائی ہے اور یقیناً پیچھے ایک قطرہ تک نہیں چھوڑ کر آئی ہوگی۔“

نشست کا سارا انتظام قالین پر تھا جس نے پورے کمرے کو اپنے سرخ رنگ میں سمیٹا ہوا تھا۔ یوں اطراف میں صوفے بھی پڑے تھے۔ پر وہ تو شاید بے کار ہی جگہ گھیرے بیٹھے تھے۔ خاتون خانہ نے دستر خوان بچھایا۔ ملازم آفتابہ لایا۔ خواتین نے داہنے ہاتھوں کے بس چپے دھوئے۔

تبھی ایک بوڑھی عورت مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ تو دادی جواری کا گویا شور مچ گیا۔ آنے والی کا چہرہ چاند کی کرنوں جیسا ٹھنڈا اور ملائم تھا۔ وہ سبز اونی کپڑے کی کن مو (قمیص) پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ ٹوپی جو بلتی مردانہ ٹوپی سے ملتی جلتی تھی (جس پر چاندی کے منقش زیورات جنھیں طومار کہتے ہیں سلے ہوئے تھے) سر پر رکھے اور اس پر سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے گلے میں فلا پہنا ہوا تھا۔ (کپڑے کی پٹی پر بڑے بڑے فیروزے چاندی کے فریم میں جڑ کر دیئے جاتے ہیں) ہاتھوں میں فیروزے کی انگوٹھیاں اور پاؤں میں بلم تھا۔ جس پر اتنی نفیس اور حسین وجمیل کڑھائی تھی کہ بہت دیر تک اس کی نظریں جوتی پر مرکوز رہیں۔

سیماں نے اس کی نظریں جوتوں پر گڑی دیکھ کر کہا۔ ”یہ چھور بٹ کی خاص چیز ہے۔ آپ کے لیے منگائیں گے۔“

”ارے نہیں سیماں۔“ اس نے تکلف کرنا شاید ضروری سمجھا تھا۔

دستر خوان پر اُبلے ہوئے سفید چاول، پالک آلو کی بھجیا، بھنا ہوا گوشت، اچار اور سلاد سج گئے۔ دادی جواری روح اللہ کے منجھلے بھائی سے اپنے اس بیٹے کی باتیں کر رہی تھی جو ٹیکشی میں رہتا تھا

اس نے بہت لمبی آہ سینے سے نکالی تھی اور پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگایا تھا۔ کھانے کے بعد رکابیوں میں گیلاس اور شوغون آئے۔ اس نے جی بھر کر ان پھلوں کو کھایا پھر وہاں شور مچا۔ وہ لوگ دادی جواری سے گیت سننے کی فرمائش کرنے لگے۔ للی نے ڈوہر محلے فزا اور آسیہ کے گھر فون کیا۔ فزا کا بیٹا اور آسیہ کا بھائی ڈیانگ اور ڈامن بجانے کے ماہر تھے۔ پر فزا اور اس کا بیٹا ”کھرمنگ“ گئے ہوئے تھے۔

اور پھر اس کمرے میں راگ ورنگ کی محفل جمی۔ دادی جواری بلتستان کی موسیقی پر ایک پورا مکتب تھی۔ روح اللہ کا چھوٹا بھائی ڈاکٹر سیف اللہ کمرے میں آیا اور بولا۔ ”ملکہ بلتستان تشریف لاتی ہیں۔“

اور یہ ملکہ بلتستان آسیہ تھی۔ اتنی خوبصورت اور تیکھی کہ واقعی ملکہ کہلانے کی حقدار تھی۔

آسیہ کے بھائی نے ”ڈانگ شنگ“ (بجانے والی چھڑی) کے ساتھ اس مہارت سے ڈامن بجایا اور دادی جواری نے حزنیہ لے میں ”شنگشیر پا“ کا گیت گایا۔

اسکردو کا نوجوان شنگشیر پا جسے گلاب سنگھ والئی جموں نے قیدی بنا لیا تھا۔ اس کی دلاری بیوی کے جذبات واحساسات کا گیت۔ جو کچھ اس طرح ہے:

بیوی: جموں کشمیر سے آنے والے پیارے ماموں آپ کو میری جان شنگشیر پا کی خبر ہو تو مجھے بتائیں۔

ماموں: ماموں کی عزیز بھانجی میں نے اسے دیکھا تو نہیں۔ سنا ہے کہ وہ جموں کے قید خانے میں ہے۔

بیوی: ہاں ہاں وہ جو جموں کے قید خانے میں ہے وہی میرے بچپن کا ساتھی ہے۔

یہ خشک بنجر اور سنگلاخ چٹانوں والا علاقہ درحقیقت اتنا دلچسپ رنگین بلند پایہ فنون لطیفہ اور اعلیٰ تہذیبی روایات کا حامل ہوگا، یہ تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

یہ شگری بالا کی شام تھی۔ سورج بس دیو قامت پہاڑوں کے پیچھے ڈبکی لگانے ہی والا تھا۔ اس وقت سطح

میر سید علی ہمدانیؒ اور کشمیر

قدیم ایام سے لے کر 725ء تک اس علاقے پر ہندومت اور بدھ مت کے پیروکار راجاؤں کی حکومت رہی ہے مگر ان ادوار میں بھی ترکستان اور افغانستان کے راستے ایران کے تمدن و ثقافت کے اثرات یہاں تک پہنچتے رہے۔ گلگت بلتستان و کشمیر قدیم زمانے سے ہی وسط ایشیاء کی ریاستوں سے ملا ہوا ہے اور ان ریاستوں میں ایران اس کے لیے ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔

ان علاقوں میں اسلام حملہ آوروں کی زور زبردستی سے نہیں بلکہ مرحلہ وار ایران و ترکستان سے آئے ہوئے مبلغین کے ذریعے پھیلا۔ ان مبلغین نے نہ صرف یہاں اسلام پھیلایا بلکہ بہت سے ہنر بھی متعارف کرائے، جس سے معیشت نے بہت ترقی کی۔ آٹھویں صدی ہجری کے شروع تک یہاں ایرانی اثرات واضح نہ تھے لیکن 725ھ کے بعد ایرانی تہذیب و تمدن براہِ راست پہنچے اور یہ خطہ فارسی زبان اور معاشرے کے زیر اثر آ گیا۔

حضرت سید شرف الدین کو کشمیر میں اسلام کا اولین مبلغ سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے ہی روابط کا افتتاح کیا اور پھر یہ سلسلہ بلا انقطاع چل نکلا۔ مبلغین ایران گروہ در گروہ وادی کشمیر میں وارد ہونے لگے اور گوشہ گوشہ اللہ کے ذکر سے گونج اٹھا۔ حضرت شرف الدین نے فارسی زبان ہی کو ذریعہ تعلیم بنایا اور اسی طرح انہوں نے وادی میں اسی زبان کو رواج دے کر تعلقات کو مزید مضبوط اور مستحکم کیا۔ یہاں مسلم حکومت کے ساتھ ساتھ ثقافت اور تہذیب و تمدن کی بنیاد بھی سادات کرام کے مبارک ہاتھوں سے رکھی گئی۔ علماء صوفیائے کرام ہی یہاں مسلم سلطنت اور حکومت کے اصلی معیار تھے۔ ان کی خانقاہیں درس گاہیں تھیں۔ عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مختلف ہنروں اور پیشوں میں مہارت رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے انہی کے ذریعے علوم کے ساتھ ساتھ فنون بھی پھیل گئے۔ مدارس، مساجد، خانقاہیں اور دیگر عمارات تعمیرات ہوئیں۔ قصبوں، شہروں اور دیہاتوں کو نئی زندگی اور رونق مل گئی اور اس مقدس قافلہ کا جو فرد جہاں پر قیام پذیر ہو گیا وہاں علمی، روحانی اور تہذیبی مرکز کی بنیاد پڑی۔

شاہ میری حکومت کے مستحکم ہوتے ہی دربار نبویؐ کے ایک روحانی اشارہ کے تحت حضرت میر سید علی ہمدانیؒ نے اپنے دو سفیروں میر سید حسین سمنانی اور میر سید تاج الدین کو 772ھ میں حالات کے مشاہدہ کے لیے اس علاقے میں بھیجا۔ انہوں نے سید علی ہمدانیؒ کو کشمیر کے مفصل حالات سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد آپ پہلی بار عہد سلطان شہاب الدین 774ھ میں یہاں تشریف فرما ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی صدیوں سے سست رفتار جہلم میں مدوجزر کے ساتھ ایک نہ رکنے والا طوفان پیدا ہوا جو پرانے فرسودہ

مرتفع دیوسائی کی طرف سے آنے والی ہوائیں بہت تیز تھیں۔ وہ اس ٹیلے پر بیٹھی تھی جس پر شگری خاندان کے رہائشی محل کے آثار کہیں کہیں نظر آتے تھے۔ روح اللہ یساں کی طرف محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے تاریخ کا یہ عظیم ورثہ اسے سونپ رہا تھا۔

رگیالمو (شہزادی) شگری کی شادی ایک گمبھیر مسئلہ بن گئی تھی۔ یہ حسن کی مورت دنیا کی دو قدیم ترین تہذیبوں کا سنگم تھی۔ اس کے خدوخال اور صبیح رنگت میں اگر ایک طرف یونان جھلکتا تھا تو دوسری طرف اس کی شخصیت پر تبت کی چھاپ تھی۔

ہاں تو میں رگیالمو (شہزادی) شگری کے بیاہ کے قضیئے کو ابھی چھوڑ کر پیچھے لوٹتا ہوں اس زمانہ میں جب یہ میرا پیار ابھی اسکرم دو تھا۔ اس مہیب طوفان کے بعد آباد ہونا شروع ہوا تھا۔ اسی دوران مغرب کے دردستان کے اطراف سے بہت سے قبائل کے ساتھ ایک ایسا قبیلہ بھی آیا جو یونانیوں کی اولاد تھا اور سکندر اعظم کی طوفانی یلغار کے دوران ہندوکش کے پہاڑوں میں رہ گیا تھا۔ یہ لوگ شگری کے نام سے جانے جاتے تھے۔ یہ دلیر، جری اور تنومند تھے۔ بہت جلد سارے علاقے پر چھا گئے اور ان کا سردار پورے علاقے کا رگیالفو (بادشاہ) بن گیا۔ مقامی آبادی پر بھی رنگ غالب تھا۔ حاکم اور محکوم نے ایک دوسرے کے رنگ میں اپنے آپ کو ڈبو دیا۔ اس خاندان کے آخری رگیالفو (بادشاہ) کا کوئی بیٹا نہیں تھا صرف ایک بیٹی رگیالمو شگری تھی۔ وہی تاج شاہی کی وارث تھی۔

وزراء اور امراء جھگڑتے تھے۔ بالتی یل (بلتستان کا قدیم نام) کے مقامی راجہ بھی اس شہزادی کے ساتھ رشتہ جوڑنے کے لیے مرے جاتے تھے۔ تب یہ محل جس کے کھنڈر پر ہم اس وقت بیٹھے ہیں۔ نہایت عالی شان تھا۔

شاید وہ بھی کوئی ایسی ہی شام ہوگی۔ اس شام بھی دیوسائی سے ہوائیں بہت تیز چل رہی ہوں گی۔ اپی چوشگری

عقائد، بوسیدہ روایات اور غیر عوامی زبان کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔
ایران سے روحانی روابط کا سب سے بڑا ذریعہ میر سید علی ہمدانیؒ ہی ہیں۔ آپ ایک عظیم داعی اسلام تھے۔ آپ کو امیر کبیر علی ثانی اور شاہ ہمدان کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ نے خطہ کشمیر کو نور اسلام سے منور فرما کر احسانِ عظیم کیا۔ اسی لیے آپ حواری کشمیر بھی کہلاتے ہیں۔ آپ شریعت اور طریقت کو ایک ساتھ تطبیق دینے والے بزرگ تھے۔ آپ نے یہاں تبلیغ دین کے لیے ایک باقاعدہ نظام قائم کیا۔ آپ نے کبرویہ سلسلہ کو رواج دیا۔ آپ نے اپنے آخری دورہ کے موقع پر علاقہ کے لوگوں کو اورادِ فتحیہ کے انمول تحفہ سے نوازا اور اس کے پڑھنے کا ایک خاص انداز سکھایا تاکہ مذہبی طور پر ابتری کا شکار کشمیری معاشرے کو دین اسلام کی روشنی سے منور کیا جاسکے۔ آپ نے وظیفہ صبح گاہی کے طور پر انجام دینے کے لیے اورادِ فتحیہ کو لازم قرار دیا۔ اورادِ فتحیہ کے روزانہ ورد نے آپ کی یاد کو مقامی مسلمانوں کے سینوں میں آج تک زندہ اور محفوظ رکھا ہے۔ یہ وہ مشعل ہے جو گزشتہ چھ سو سال سے زائد عرصے سے روشن ہے۔

حضرت سید علی ہمدانیؒ نے کشمیر میں اشاعت اسلام کے لیے جو پُرامن اور علمی تحریک شروع کی اس کا پہلا اور نمایاں اثر کشمیریوں کے مذہب اور سماج پر پڑا۔ آپ سے قبل کشمیر عجیب طرح کی ابتری کا شکار تھا۔ آپ نے کشمیر کو مذہبی طور پر سنوارا۔ آپ بڑے ہی شیریں سخن خطیب تھے۔ آپ ہی نے سرینگر کی مشہور خانقاہ معلیٰ کو ایرانی خانقاہوں کے انداز پر تعمیر کروایا تھا۔ اسی خانقاہ سے آپ دین اسلام کی اشاعت کا پرچار کرتے تھے۔ آپ حکمت دین کے تمام تقاضوں سے آگاہ تھے۔ اسی لیے مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی خوب صورت انداز میں دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تھوڑے ہی عرصے میں خطہ کے ہزاروں غیر مسلم اسلام کی روشنی سے متعارف ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

سید علی ہمدانیؒ اور ان کے ساتھیوں نے کشمیر میں اسلام کو محض مسجد تک محدود مذہب کی حیثیت سے متعارف نہیں کروایا بلکہ اسے ایک مکمل تہذیب اور ثقافت کی صورت میں عملی طور پر قائم کرنے میں شب وروز انتھک محنت بھی کی اور یہ محنت ایک مکمل اور ہمہ گیر انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

اقتباس: میر سید علی ہمدانیؒ۔ از خواجہ زاہد عزیز
مرسلہ: عائشہ جونیجو۔ ٹورنٹو، کینیڈا

کے محل کی چھت پر شہزادی شکری اپنی سہیلیوں کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی۔ ان کے درمیان چہلوں کا سلسلہ جاری تھا۔ رگیالمو شکری کی بے تکلف دوست کہہ رہی تھی کہ اس کے لیے کوئی شہزادہ ادھر سے آئے گا۔ ادھر کا یہ اشارہ دیوسائی کے پہاڑوں سے تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک اس کی نگاہ اس سیاہ پتھر پر پڑی۔ روح اللہ نے اپنے داہنے ہاتھ سے ایک پتھر کی طرف اشارہ کیا جو وادی جواری کے قریب ہی پڑا تھا۔

رگیالمو شکری کی چیخ سی نکل گئی۔ ایک جوان رعنا اس پتھر کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ ایسا وجیہہ تھا کہ جیسے سورج دیوتا ہو۔ شہزادی پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ وہ فقیر سا لگتا تھا۔ پر اس کے ایک ہاتھ میں سونے کی تسبیح تھی اور قریب ہی ایک تھیلا پڑا ہوا تھا۔ یہی پتھر بردوسناس (چکی کے پاٹ کا سرہانہ) اس کے سر کے نیچے تھا۔

اس پر سے رگیالمو شکری کی نظریں ہٹ نہیں رہی تھیں۔ نوجوان نے مغرب کی سمت دیکھا۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ وہ اُٹھا اور نماز پڑھنے لگا۔ بدھ مت کی پیرو شہزادی کے لیے یہ سب بہت عجیب تھا۔ وہ نیچے بھاگتی ہوئی آئی اور اس کے پاس پہنچی۔ اس نے سلام پھیرا، السلام علیکم کہا۔ پر وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ زمانہ شاید ساکت ہو گیا تھا۔ بہت دیر بعد اس نے اپنی زبان میں پوچھا۔ ”کون ہو تم اور کہاں سے آئے ہو؟“

وہ جوان رعنا مقامی زبان نہیں جانتا تھا۔ بس اس سوال کے جواب میں مسکراتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ سے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ اشارہ دیوسائی کی طرف تھا اور اپنا نام ابراہیم بتایا۔

وہ تو اسے کوئی دیوتا سمجھی تھی۔ بھاگم بھاگ باپ کے پاس پہنچی۔ پھولتی سانسوں کے ساتھ اسے بتایا کہ ایک دیوتا ان کے دوار پر آیا ہے۔ رگیالفو (بادشاہ) اپنے مصاحبوں کے ساتھ اس وقت بیٹی کے معاملے پر ہی بات چیت کر رہا تھا۔
جب بیٹی نے دامن کھینچا کہ تم اُٹھو اور چل کر اپنی آنکھوں سے دیکھو۔

اور رگیالغو بھی اسے دیکھتے ہی اپنے دل سے ہار گیا۔ اس کی صورت میں کچھ ایسی نرالی کشش تھی کہ اس نے اس کے پاؤں چھوئے اور بصد منت وہاں سے اُٹھا کر مہمان خانے میں لائے۔

اور رگیالمو شکری کے بیاہ کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اسے وہ یوں بھایا تھا کہ لخت جگر کو اس اجنبی، انجان اور ناواقف کے حوالے کرنے میں اسے عین راحت محسوس ہوئی۔ بیٹی سے بھی رائے لی گئی اور وہ بھی گھائل ہی نکلی۔

یوں وہ سلطنت بلتی یل کی شہزادی سے شادی کر کے یہاں کا داماد بنا۔ تبتی زبان میں گھر داماد کو مقپا کہتے ہیں۔ وہ ابراہیم مقپا جو بروئے آداب مقپون ہو گیا۔ درحقیقت یہ پہلا مسلمان تھا جو اس علاقے میں پہنچا اور مرتے دم تک اپنے مذہب پر قائم رہا۔

مستند تاریخی روایات کے مطابق یہ نوجوان رعنا مصر کے شاہی خاندان کا مفرور شہزادہ تھا جو پہلے کشمیر آیا تھا۔ وہاں کی خانہ جنگی سے اس نے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن مقامی لوگوں نے بغاوت کر دی اور اس کی جان کے درپے ہو گئے۔ وہ کشمیر سے بھاگتا ہوا براستہ دیوسائی اسکردو پہنچا اور اس شہزادی سے ٹکرایا جس کے بیاہ کے مسئلے نے باپ کی نیندیں اُڑا رکھی تھیں۔

اور یوں اس خاندان کی ابتداء ہوئی جس نے بائیس پشتوں تک نہایت کر و فر سے حکومت کی۔ اس خاندان کے بادشاہ بوغا نے موجودہ اسکردو شہر بسایا۔ ناقابل تسخیر قلعہ کھرفوچو بنایا اور یہی وہ زمانہ تھا جب حضرت امیر سید علی ہمدانی ان کے خواہر زادے حضرت سید محمد نور بخش اور دوسرے ایرانی مبلغین یہاں آئے۔ ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر بوغا کا بیٹا شیر شاہ مشرف بہ اسلام ہوا۔

''اُف توبہ روح اللہ'' یسماں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''تمہیں مکینکل انجینئرنگ کی بجائے آثار قدیمہ کی ہسٹری پڑھنی چاہیے تھی۔ بس کرو۔ اب کہف الوری آپا پریشان ہو گئی ہوں گی۔''

''احمق بلتستان کی تاریخ علی شیر خان انچن (عظیم) کے ذکر کے بغیر ادھوری ہے۔ نامکمل ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے ماضی کے گڑے مردوں کی اُکھاڑ پچھاڑ تو ضروری ہے۔''

''ہاں تو وہ اولوالعزم فرمانروا جس کی عظیم فتوحات اور اصلاحات نے اسے تاریخ میں انچن (عظیم) بنایا۔ شیر شاہ کا پڑپوتا علی شیر خان انچن تھا۔ جس پر بلتستان کی تاریخ نازاں ہے۔''

پہاڑوں کی شام، دل کش شام جہاں ٹھنڈی ہوائیں دامنوں سے چمٹی جاتی تھیں۔ جہاں خاموشی اور سناٹے کا حسن تھا۔ ریت کے ذرے اُڑتے تھے اور دھوپ کی زرگری آنکھوں کو بھاتی تھی۔

ایسے میں گرم چائے کا کپ کیسی بڑی نعمت تھی۔ یسماں پتھروں پر بیٹھی، گھونٹ گھونٹ چائے پیتی کیسی پیاری لگتی تھی۔ دادی جواری بھی اپنے ہلم (جوتے) اُتارے بیٹھی تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹا اس کا سرخ و سفید چہرہ، جوان گنت لکیروں کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ جس کی ہر لکیر ایک دہائی کی داستان سناتی تھی۔ ذرا دور سیاہ پُرہیبت پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔

روح اللہ نے بلتی میں شاید جواری دادی سے کچھ کہا تھا۔ ان کی آواز ان ویرانوں میں گونج اُٹھی تھی۔

''ان ایام میں، ان ایام میں جب میرا یہ مادر وطن اسکردو دودھ کے تالاب کی مانند ہوا کرتا تھا۔ ان ایام میں، جب یہ سیاہ ریگستان سرسبز و شاداب ہوا کرتا تھا۔ میرے علی شیر خان انچن نے دنیا کو زیر کیا۔ ارے! میرے علی شیر خان انچن نے دنیا کو زیر کیا۔ دنیا کو زیر کیا۔ دنیا کو زیر کیا۔''

یادوں کی دولت تاریخ کے اوراق سے اس کی یادداشت میں جمع ہوتی رہی۔ پھر جب اس میں مزید معلومات ذہن میں جمع کرنے کا یارا نہ رہا تو وہ بولی۔ ''چلو اب چلتے ہیں۔ سب راہ دیکھ رہے ہوں گے۔''

☆......☆

وہ بہت دن چڑھے تک سوتی رہی۔ رات کے پہلے پہر خوابوں میں علی شیر خان انچن کے گھوڑے پہاڑوں پر دوڑتے رہے تھے۔ دوسرے پہر وہ زبیر کے ساتھ اپنے گھر میں تھی، اس سے گلے شکوؤں میں اُلجھی ہوئی۔ تیسرے پہر ایک ننھا سا بچہ اس کی چھاتی پر لیٹا کلکاریاں مارتا تھا اور جب اس کی آنکھ کھلی، ساری کائنات اُلٹی ہوئی تھی۔

یسماں دروازے میں کھڑی کہہ رہی تھی۔ ''آپ جلدی سے تیار ہو جایئے۔ روح اللہ نے چھٹی لے رکھی ہے۔ سدپارہ جھیل اور دیوسائی چلنا ہے۔''

اور جب وہ دانت صاف کر رہی تھی تو اس سے بھی باتیں کیے جا رہی تھی۔ جو اس کے دل میں بستا تھا۔

''پروردگار! اب میں اپنے ہی فیصلوں کی کسوٹی پر

نہیں پرکھ سکتی۔ جانبداری کا دامن ہاتھ میں آجاتا ہے۔ پر میں چاہتی ہوں تو بھی میری طرح جانبدار بن جا۔ تو جانتا ہے اچھی طرح جانتا ہے۔ میں اپنے آپ سے مجبور تھی اور مزید سمجھوتا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ بس تجھ سے اتنی سی التجا ہے کہ میرا دل پتھر کا کردے۔"

وہ باورچی خانے میں ہی آگئی۔ بڑی بھابی سارا کچن صاف کیے بیٹھی تھی۔ نوکرانی نے مٹی کے چولہے لیپ دیے تھے۔ فرش پر جو لکی سی دری بچھی تھی وہ اس پر ہی بیٹھ گئی۔ للی نے پلیٹ میں گھر کا بنا ہوا کلچہ جس پر خشخاس لگی ہوئی تھی، رکھ دیا۔ نمکین چائے کا پیالہ بھی آگیا تھا۔

جب تک بڑی بھابی آئیں۔ وہ کلچے پر بچے خشخاس کے سارے دانے چڑیا کی طرح ٹھونگ ٹھونگ کر کھا بیٹھی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اخبار لے کر بڑے کمرے میں آگئی۔ ابھی پہلی خبر پر نظریں جمی ہی تھیں جب باہر سے روح اللہ کی آواز کانوں میں پڑی۔ "سیماں ڈاکٹر ابراہیم آئے ہیں۔"

سیماں شاید اس کی طرف آرہی تھی۔ غالباً دہلیز پر کھڑی تھی جب اس کی پُرمسرت آواز سماعت سے ٹکرائی۔ "اللہ کیسا خوبصورت دن کتنا پیارا اور بھاگ بھرا مہمان آیا ہے۔"

"بھاگ بھرا۔" اس نے زیرلب کہا اور پھر خود ہی اپنے آپ سے بولی۔ "ہوگا کوئی بختاور، ہم جیسے نصیبوں جلے۔"

اس کی تلخ سوچوں کا سلسلہ فی الفور ٹوٹ گیا جب چھ فٹی کشیدہ قامت پر متناسب وجود والا ایک مرد متانت سے قدم اُٹھاتا سیماں کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوا جہاں وہ بیٹھی تھی۔ آنے والے پر سرسری سی ایک نظر ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھی کہ چہرے کا نقش اپنی جگہ بلا کی جاذبیت رکھتا ہے اور ٹھہری ہوئی شفاف آنکھیں اپنے اندر شفقت اور نرمی سموئے ہوئے ہیں۔

غربی دیوار کے ساتھ ایک گز چوڑا اور تقریباً تین گز لمبا پھولدار ریشمی روئی سے بھرا گدیلا جو کشمیری طرز معاشرت کا ایک اہم جز ہے، بچھا تھا۔ ڈاکٹر ابراہیم نے اسی پر بیٹھ کر اس کی طرف توجہ کی تھی۔ اس کا تعارف کتنا مختصر تھا۔ پل لگا تھا۔ پر ڈاکٹر ابراہیم کو سیماں نے آدمی سے انسان اور انسان سے فرشتوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا اور وہ خجل سا نادم سا "سیماں آپ شرمندہ کرتی ہیں۔" کہتے کہتے سر جھکائے جارہا تھا۔

"آپ ہمارے ساتھ دیوسائی چلیے مزہ آئے گا۔"

"نہیں سیماں بی بی میں اسکردو اسپتال میں کچھ اہم آپریشنز کے سلسلے میں آیا ہوں۔"

اور اس نے سوچا کہ وہ جو زندگی میں کوئی اہم مشن پیش نظر رکھتے ہیں ان کے پاس وقت اور فرصت کہاں۔ گھنٹا بھر بعد وہ چلے گئے۔

سیماں نے چائے کے برتن سمیٹتے ہوئے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا تھا۔ "محرومیاں جونکوں کی طرح ان سے چمٹی ہوئی ہیں۔ ماں باپ تو بچپنے میں ہی چھوڑ گئے تھے۔ کس لگن اور ہمت سے پڑھا۔ شادی ہوئی تو بیوی کا بھی ساتھ نصیب نہ ہوا۔ چھ ماہ بعد فوت ہوگئی۔ اب بلتستان کے دکھوں کو سینے سے لگا لیا ہے۔ اس کے رگ وپے میں چھپے کانٹوں کو نکالنے میں دن رات جتے ہوئے ہیں۔"

"سیماں جلدی کرو۔" روح اللہ نے آواز دی۔

"میری سب تیاری مکمل ہے۔ بس چیزیں رکھنی ہیں۔"

اس نے پراٹھے، کباب، اچار اور چائے کے لیے کپ ٹوکری میں ڈال لیے تھے۔ شیبہ گلاب کا پھول بنی جیپ کے گرد منڈلا رہی تھی۔ اس نے اسے گود میں اٹھایا اور اندر جا بیٹھی۔ للی بھابی طاہرہ سب سوار ہوگئے۔ سیماں روح اللہ کے ساتھ آگے جا بیٹھی اور گاڑی سٹیلائیٹ ٹاؤن سے درہ سد پارہ میں داخل ہوگئی۔

دائیں بائیں آگے پیچھے گہرے چاکلیٹی اور سیاہ رنگے خوفناک قسم کے پہاڑ، اوپر تھوڑا سا نیلا آسمان نیچے نیلالا سندھ، سرمئی سڑک اور ادھر اُدھر بکھرے پتھر، بس یہی کچھ نظر آتا تھا۔

سد پارہ جھیل اسکردو سے کوئی آٹھ کلومیٹر جنوب میں ہے۔ یہی کوئی آدھ پون گھنٹا لگا ہوگا جھیل آگئی تھی۔

وہ سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ اس کے قدموں کے عین نیچے سد پارہ جھیل کا پانی ہواؤں کے جھونکوں سے مچلتا پھرتا تھا۔ بائیں طرف ایک ریسٹ ہاؤس جو ناردرن ایریا ورکس ڈیپارٹمنٹ کے زیر انتظام تھا۔ اب محکمۂ سیاحت پی ٹی ڈی سی دیکھ بھال کرتا ہے۔ سبز شیشے کی بلوریں، پیالی جیسی صورت والی اس جھیل کے عین درمیان ایک ٹاپو ہے۔ اس پر بھی دو کمروں کا ایک ریسٹ ہاؤس بنا ہوا ہے لیکن بے چارہ ریسٹ ہاؤس ہانپتا ہوا لگتا تھا۔

جھیل کے سبز پانی میں دخانی کشتیاں چلتی تھیں۔ ایک

میں غیر ملکی چھوکرے اور چھوکریاں بیٹھے ہوئے تھے۔ خدا کا شکر تھا ان کے وہ رک سیک ان کے جسموں سے الگ تھے۔ دوسری کشتی میں چند میدانی علاقوں کے لوگ تھے۔ دو شادی شدہ جوڑے سامنے ٹاپو کے کمروں سے نکل کر اب اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔

پھر وہ سڑک سے نیچے سیڑھیاں اُترتی گئی۔ بہت نیچے اور پھر عین جھیل کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اور جب وہ بیٹھی پانی سے کھیل رہی تھی۔ روح اللہ نے اس کی آنکھوں سے دوربین لگادی اور بولی۔ ''اوپر دیکھئے اوپر۔''

یہی کوئی پانچ سو فٹ اوپر، ادھر سدپر گاؤں کی طرف۔ روح اللہ اس کے عقب میں کھڑا اشارے دے رہا تھا اور اب کسی پروفیسر کی طرح لیکچر پر اُتر آیا تھا۔

''رگیالفو (بادشاہ) علی شیر خان انچن کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ وہ دفاعی دیوار ہے۔''

اُس نے غور سے دیکھا۔ اسے ٹوٹی پھوٹی شکستہ فصیل کے ٹکڑے نظر آئے تھے۔ یہ دفاعی دیوار گرتخنہ اور کرگل کے درمیانی پہاڑ سے لے کر استور تک پہاڑی سلسلے کے اوپر بنائی گئی تھی۔ کم و بیش سو میل لمبی اس دیوار میں مناسب جگہوں پر صدر دروازے اور ان دروازوں پر پہرے دار متعین تھے۔ تھور گو پر بھی ایسی ہی فصیل بنوائی گئی۔ تھور گو دروازے سے پہاڑ کے اوپر سدپارہ جھیل تک۔ سدپارہ جھیل پر بند باندھ کر اسے ایک ڈیم کی شکل دی گئی۔ جس سے اب تک اسکردو کی نصف آبادی سیراب ہوتی ہے۔ اسی جھیل میں سے ایک اور چوڑی نہر نکال کر اسے ''نالہ خوشبو'' میں ڈال دی گئی۔ اس نہر سے مغربی اسکردو سیراب ہوتا تھا۔

تبھی سیماں چیخی۔ ''پلیز! روح اللہ ہسٹری چھوڑ دو۔ کشتی خالی ہوگئی ہے۔ ہمیں سیر کراؤ۔''

سدپارہ جھیل ایک کلومیٹر لمبی اور تین بٹا چار کلومیٹر چوڑی ہے۔ اس سیر میں پورا گھنٹا لگا، وہ اور سیماں ٹاپو پر چڑھ گئے۔ وہاں جا کر اسے عجیب سے دکھ نے گھیر لیا۔

فضول ناس مارا ہوا ہے اس اتنی پیاری جگہ کا۔ جگہ جگہ پتھر پڑے تھے۔ جھاڑیاں گھاس پھونس یہاں وہاں اگی ہوئی تھیں۔

''کتنے پھوہڑ ہیں ہم لوگوں کو قیمتی چیزوں کو سنبھالنے کا بھی سلیقہ نہیں۔''

جھیل کے کنارے ''سدپارہ ان'' میں شادی شدہ جوڑے صوفوں پر بیٹھے۔ شیشوں سے تاکا جھانکی بھی کرتے جاتے اور ساتھ چائے بھی پیتے جاتے۔

''اس جھیل کے پانی سے اسکردو اور اس کے گردونواح میں بجلی کی فراہمی کے لیے دو بجلی گھر چل رہے ہیں اور مزید قائم کرنے کے منصوبے زیرِ غور ہیں۔''

بڑی بھابی شاید اُکتا گئی تھیں۔ اونچی آواز میں بولیں۔

''بس کرو۔ اب آگے بھی چلنا ہے۔''

کھانا دیوسائی میں کھانے کا پروگرام تھا۔

روح اللہ شیشے کے گلاس میں چشمے کا پانی لایا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اسے پئیں۔ یہ سونے کے ذرات والا پانی ہے۔''

وہ ہنسی کہ شاید یہ مذاق کرتا ہے۔ لیکن جب وہ سنجیدگی سے بولا کہ میں حقیقت کہتا ہوں تب اس نے غور سے پانی کو دیکھا اور واقعی اسے دو تین سنہری ذرے نظر آئے تھے اور اس نے گلاس یوں منہ سے لگا لیا جیسے وہ آبِ حیات ہو۔

اب چڑھائی نہایت عمودی ہوگئی تھی۔ سڑک تنگ اور ٹوٹی پھوٹی تھی۔ گو روح اللہ کی جیپ بالکل نئی تھی مگر ہر چار چھ فرلانگ پر ریڈی ایٹر کا پانی ابل جاتا تھا۔ سیماں کین کا ڈبہ اُٹھائے جب سڑک کے اوپر بہتے کسی چشمے سے اسے بھرنے نکلتی، تب پیچھے بیٹھی لی ہنستی۔ ''ارے شکر ہے سیماں آنٹی کہیں میں آپ کے ساتھ نہیں بیٹھی۔ ورنہ تو میری آپ نے پریڈ کروا دینی تھی۔''

جیپ ایک جگہ رُک گئی۔ روح اللہ نے اعلان کر دیا۔

''ہم دیوسائی پہنچ گئے ہیں۔''

بارہ سے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع سطح مرتفع دیوسائی کا میدان اس کے سامنے تھا۔ روح اللہ نے جیپ جس جگہ روکی تھی وہاں گوجر بکروال والوں نے اپنے کیمپ لگا رکھے تھے۔ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ چرتے پھرتے تھے۔ درخت نہیں تھے۔ بس کہیں کہیں جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

سیماں کے بچے بھوک سے بےتاب ہو رہے تھے۔

چٹانوں کے پاس اس نے دسترخوان بچھا کر سب کو آواز دی۔

اور جب وہ کھانا کھاتی تھی، اُس نے کہا۔ ''روح اللہ تمہاری اس دیوسائی نے مجھے ذرا متاثر نہیں کیا۔''

اُس نے مسکراہٹ ہونٹوں میں دبائی۔ اُس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ دیوسائی جتنی میری ہے اسی قدر آپ کی بھی ہے۔ رہی بات متاثر ہونے کی تو ابھی

آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔ آتے ہی تو کھانے پر ٹوٹ پڑی ہیں۔ ارے صاحب صبر ہے۔"

کھانے سے فارغ ہو کر اُس نے ظہر کی نماز پڑھی۔ سب جیپ میں بیٹھے اور جیپ دیوسائی کے کھلے میدانوں میں بھاگنے لگی۔ سنہری مائل سبز گھاس کے میدان۔ ان میدانوں میں کھلے پھول دور کناروں پر ایستادہ سرمئی پہاڑ جن کی چوٹیاں برفوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ راستہ کیا تھا رنگوں اور نظاروں کی دنیا ساتھ لیے چلتا تھا۔

ہم دیوسائی کی خوبصورت ترین جگہ بڑا پانی پہنچنے والے تھے۔ روح اللہ کی جیپ چڑھائی چڑھتے چڑھتے اب ایک دم نیچے اُترنے لگی تھی۔ نیچے کا منظر کسی جادو نگری کا تاثر دیتا تھا۔ سرسبز گھاس، پھول، شفاف نیلے پانیوں والا دریا، چوبی پُل۔

اُترائی خوفناک تھی۔ اس سے بھی خوفناک چوبی پُل پر جیپ کا چلنا تھا۔ وہ جیپ سے اُتر گئی تھی۔ چند قدم چلی لیکن ایسے جیسے خواب میں چل رہی ہو۔ پھولوں سے لدے پھندے یہ فردوسی ٹکڑے جن کی دید نے اس کی ہر مُو موتن کو سجدہ ریز کر دیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کو بھگو دیا تھا۔ لگتا تھا اُس کی آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ نظروں کی ہر سمت پھولوں کا دریا بہتا تھا۔

"پروردگار یہ تیری قدرت کا چھوٹا سا ادنیٰ سا ذرہ ہے مجھے بتا تو خود کیا ہوگا؟"

اس نے نماز نہیں پڑھی۔

روح اللہ نے برجی لا کے متعلق بتایا۔ برجی لا دیوسائی کی بلند ترین ٹاپ۔ جیپ کا تو راستہ نہیں بس ہائی کنگ ہی وہاں سے جا سکتی ہے۔ کیا بات ہے اس جگہ کی۔

اب وہ جھیل شیوسر پر پہنچے۔ سبز گھاس کے میدانوں اور برف پوش پہاڑوں میں گھری یہ جھیل پریوں کا مسکن ہی تو معلوم ہوتی تھی۔ یہی وہ جگہ ہے۔ روح اللہ نے فضا پر نظروں کے زاویے دائیں بائیں گھماتے ہوئے کہا۔ "جسے برطانوی مورخ جی۔ ٹی وین نے Detosoh کہا ہے۔ ہم لوگ غیارسہ (گرمیوں میں رہنے کی جگہ) کہتے ہیں۔ سردیوں میں یہاں گزوں کے حساب سے برف پڑتی ہے۔ مئی میں جب برف پگھلتی ہے تو برف کے نیچے دبے پودے پھوٹ نکلتے ہیں۔"

جس شام جب ہم شگری بالا میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ سیماں نے روح اللہ کی بات اُچک لی تھی اور پوچھ رہی تھی۔ اتنی تیز ہوائیں، تو ان ہواؤں کی وجہ بھی یہی دیوسائی ہے۔

روح اللہ پھر شروع ہو گیا تھا۔

"دن ڈھلنے کے بعد، بستیوں میں درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ لیکن یہاں موسم خوشگوار رہتا ہے۔ یہاں کی ٹھنڈی ہوائیں تھنگ برگے سدپارہ اور حسین آباد کے نالوں سے وادی کی طرف بڑھتی ہیں، جو اکثر آندھی کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔"

تبھی وہاں ایک جیپ آ کر رُکی۔ چند غیر ملکی اُترے۔ وہ تو اُترتے ہی تصویر کشی میں مصروف ہو گئے۔ سیماں اور روح اللہ بھی ایک پتھر پر بیٹھ کر تصویریں اُتروانے لگے اور وہ کھڑی رہی۔ بس یوں کہ بس نہ چلتا تھا کہ کیوں کر اس نظارے کو آنکھوں میں جذب کر لے۔ یہیں ڈیرہ ڈال لینا چاہتی تھی۔ پھولوں کی اس سیج پر ہمیشہ کے لیے سو جانا چاہتی تھی۔

غیر ملکیوں کی جیپ کا ڈرائیور اس کی محویت کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاس آیا اور وہ ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بولا۔ "دیوسائی پر ہی عاشق ہو گئی ہیں۔ وقت اور حالات نے کبھی اجازت دی تو گلتری جانا۔ اسی سے آگے کا علاقہ ہے۔ علاقائی خاصیت اور ماحول اور موسمی حالات کے لحاظ سے منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ سال کے آٹھ مہینے برف باری کی زد میں رہنے والا یہ علاقہ دنیا کی حسین ترین جگہ ہے۔ میں اسی علاقے کا ہوں، تم یقین نہیں کرو گی۔ زندگی جتنی کٹھن اور دشوار وہاں ہے شاید دنیا کے کسی خطے میں نہ ہو۔"

وہ سنتی رہی۔ پھولوں کے سمندر میں آنکھوں کو غوطے دیتی رہی اور پھر اسے خدا حافظ کہہ کر جیپ میں بیٹھ گئی۔ یہ کہتے ہوئے کہ "اگر وہاں کا دانہ چگنا ہوگا تو کوئی روک نہ سکے گا۔ یہاں کا کب سوچا تھا؟"

☆......☆

تیاری کے سب مراحل سے فارغ ہو کر جب اس کی مرمریں لانبی گردن اوپر اُٹھی، اور اُس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ سیماں پیچھے کھڑی عنابی ہونٹوں کے ساتھ مسکراتی نظر آئی تھی۔ اس نے دو قدم آگے بڑھائے اور عین اس کے بالمقابل آ کر بولی۔ "آپ مینڈوق کھر (پھول محل) اور عظیم تاریخی قلعہ کھرپوچو دیکھنے جا رہی ہیں اور مینڈوق رگیا لمو (پھول شہزادی) کا روپ دھارے ہوئے ہیں۔ بتایئے تو ذرا اگر علی شیر خان انچن کی روح نے آپ کو جپھی ڈال لی تو

میں کیا کروں گی۔"

اس نے سیماں کے گال پر پیار کیا اور بولی۔ "اگر ایسا ہوا تو مجھے وہیں چھوڑ آنا۔ ایسا عظیم فرمانروا مجھ پر فریفتہ ہو جائے تو بھلا اس سے بڑھ کر خوشی کی اور بات کیا ہوگی۔"

اور دونوں کا قہقہہ کمرے میں گونج اُٹھا۔

وہ اس وقت سبز بلتی گن مو (قمیص) پہنے کھڑی تھی۔ لانبے بالوں کی دو چوٹیاں اس کے سینے پر شیش ناگوں کی طرح پڑی تھیں۔ اس کے سر پر سیندوری ٹوپی تھی۔ جس کی پیشانی پر سجے طومار (چاندی کے منقش زیورات) جھلمل جھلمل کرتے تھے۔ فلو (گھنگھرو) اس کے ماتھے پر جھومر کی طرح پڑے تھے۔ سیماں نے اس کے گلے میں اپنا فلا بھی پہنا دیا تھا۔ تنگ مہری کی گھیر دار شلوار کے نیچے اس کے پاؤں میں چھوربٹ کا حسین و جمیل کشیدہ کاری کا ہلم (جوتا) بھی تھا۔ بلتی گن مو، ٹوپی اور ہلم تینوں چیزیں روح اللہ اس کے لیے کل شام لایا تھا۔

اس نے چادر اوڑھی اور بولی۔ "اب چلنا چاہیے۔"

اور سیماں کمرے سے باہر نکلتے نکلتے بولی۔ "میں تو سوچتی ہوں آپ کا بیاہ کسی بلتی سے نکاح پڑھوا دیں۔"

اس نے یک دم اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا۔ رُخ پھیر کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا اور خود سے کہا۔ "نکاح تو پڑھوایا تھا۔ بور کے یہ لڈو کھائے بیٹھی ہوں۔" پھر جیسے زبیر اندر سے چھلانگ لگا کر اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا اور اُسے اپنی بانہوں میں جکڑتے ہوئے بولا۔ "تم ایک اور نکاح کرو گی مجھے چھوڑ کر؟"

اور اس کے اندر کا دکھ بلبلا کر چیخا۔ "مجھ جیسی بانجھ سے کسی کو کیا سروکار؟"

اور اس نے آنسو پلکوں پر جھلملانے نہیں دیے۔ چادر سنبھالتی باہر بھاگی۔

سیماں نے بچے بڑی بھابی کے حوالے کیے۔ ٹوکری اُٹھائی۔ اپنے ملازم جذبہ کو ساتھ لیا اور تینوں سٹیلائٹ ٹاؤن کی سڑکوں سے نیچے اُترتی گئیں۔ سکمیدان کی گلیوں سے بازار میں آئیں اور سیماں نے بس ذرا سی آنکھیں ننگی رکھ کر بھاگتے ہوئے بازار پار کیا۔

امام باڑہ کلاہ میں ترکھان کام کر رہا تھا، وہ ٹھہر گئی۔ تعزیہ کی شکل چوب کاری سے نکھر رہی تھی۔ اس کے سراہنے پر سیماں بولی تھی۔

"دراصل یہ اتنا مہنگا پڑتا ہے کہ اجتماعی تعمیرات کے سوا عام آدمی انہیں بنوانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

وہ آگے بڑھنے لگی تھی۔ جب جذبہ نے اس کے بڑھتے قدموں کو روک دیا تھا۔ یہ کہتے ہوئے کہ بلتستان جب اپنی جنگ آزادی لڑ رہا تھا تو اسی جگہ اور اسی مقام سے قلعہ کھرپوچو تک پہنچنے کے لیے سرنگ کھودی گئی تھی۔

اس نے وہاں ٹھہر کر اک ذرا سی دیر کے لیے ان مناظر کو تصور کی آنکھ سے دیکھنا چاہا پر سیماں تیز رو پر سوار تھی۔ دامن کھینچ کر بولی۔ "چلی آؤ یہاں تو ہر تیسرے قدم پر تاریخی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ انہیں سننے لگو تو پہنچ چکیں کھرپوچو۔"

پولو گراؤنڈ کے نزدیک سیزر گر کھور کا علاقہ تھا۔ یہاں وہ سنار رہتے تھے جو کشمیر سے آئے تھے۔

اب وہ چھمیا کھور میں داخل ہو گئی تھیں۔ یہ جگہ ان کاشتکاروں کی ہے جو راجا کے مزارع تھے۔ راج گیری نظام ختم ہوا تو انہوں نے زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ اب مقدمے درج ہیں۔ حاکم اور محکوم دونوں عدالتوں میں پیشیاں بھگتتے ہیں۔

سامنے چھومک کا علاقہ نظر آتا تھا اور آگے دریائے سندھ موجیں مارتا پھرتا تھا۔

"بے چارہ چھومک" جذبہ نے زبان تالو سے لگا کر زوردار چچ چچ کیا۔ "سندھ جب چڑھا، چھومک پھنسا۔"

اب انہوں نے مینڈوق کھر (پھول محل) کے لیے چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ چڑھائی میں سانس بہت جلدی پھولتا ہے۔ ایک جگہ وہ رُک گئی۔ اُس نے نیچے دیکھا۔ وادی اسکردو اس البیلی شہزادی کی مانند نظر آئی تھی جو دیو قامت جنوں کی قید میں پڑی ہو۔

مینڈوق کھر شکستہ دیواروں کی صورت میں کھڑا تھا، اور سیماں بول رہی تھی۔ علی شیر خان انچن کی محبوب ملکہ گل خاتون کا مینڈوق کھر۔ یہ مغل اور تبتی طرز تعمیر کا ایک خوبصورت مرقع جس کے فرش اور چوکھٹیں سب سنگ مرمر سے بنے ہوئے تھیں۔

"تم لوگ بھی عجیب ہو، اس عظیم تاریخی ورثہ کو بھی نہ سنبھال سکے۔ اب مجھے بتاتی ہو کہ مغل اور تبتی طرز تعمیر کا دل کش مرقع ہے۔"

اور سیماں نے بے چارگی سے کہا۔ "میری جان، ہم تو اپنے آپ کو بھی نہ سنبھال سکے تھے۔"

وہ دونوں چبوتروں پر جوتے اُتار کر بیٹھ گئی تھیں۔ اس نے ٹوپی اور چادر اُتار دی۔ سیماں نے اپنے پُونی جیسے انگشت

دلکش موضوعات پر رنگا رنگ تحریریں لیے نومبر 2016ء کا دل خوش کن پاکیزہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
رفعت سراج اور انجم انصار ...... کے ماہرانہ قلم کے شاہکار ناولوں کی نئی اقساط
حیران کن حقیقتوں کا آئینہ ...... سحر ساجد کا دل پذیر ناولٹ ...... من جانبازم
زیست کے تلخ و شیریں رنگ لیے ...... سیما رضا ردا کی انوکھی تحریر
شیریں حیدر، ام طیفور اور ثمینہ عظمت علی کی خصوصی تحریریں
پاکیزہ کے اولین دنوں کی ساتھی
معروف و ہردلعزیز مصنفہ
نگہت سیما سے بھرپور گفتگو
نسرین جمیل سیال کے قلم سے ایک انوکھے عشق کی داستان ...... مکمل ناول کی صورت
اس کے علاوہ
قانتہ رابعہ، ہما بیگ، تسنیم منیر علوی، فاطمہ چوہدری، ہاجرہ ریحان،
کائنات غزل، ماوش طالب، مریم جہانگیر و دیگر ممتاز لکھاریوں کے پرلطف افسانے

شہادت بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ میز رگر کھور کا علاقہ ہے جہاں سے ہم آئے ہیں۔ یہیں مقپون بادشاہوں کا ہلال باغ تھا۔ ہلال باغ میں غوڑی ہل چنگڑا کا چبوترہ ابھی تک اسی طرح قائم دائم ہے۔ چھومیک کی طرف رگیہ ژبر کا شاہی باغ تھا جواب دریا برد ہو چکا ہے۔ ہلال باغ کے قریب شاہی قبرستان ریت کے ٹیلے کی صورت میں موجود ہے۔“

سیماں نے نوکر کو چھتری کھول دینے کا کہا تھا اور پانی کا گلاس اس کے ہاتھوں میں تھما دیا تھا۔

عین سامنے سدپارہ درہ تھا۔ نیچے چھومیک کا علاقہ جہاں عورتیں گھاس کاٹتی تھیں۔ چھتوں پر خوبانیاں اور توت پڑے سوکھتے تھے۔

اسکردو چھاؤنی میں کہیں کہیں ٹین کی چھتیں سورج کی روشنی میں چمکتی نظر آرہی تھیں۔ اس نے گردن اُٹھا کر اپنے اوپر پھیلے تین سو فٹ اونچے کھرپوچو کو دیکھا جس کی چوٹی پر انہیں پہنچنا تھا۔ اس کے پاؤں ان راہوں سے نا آشنا کہیں جو ذرا سا پیر پھسلا اور نیچے سنگے چھو (دریائے سندھ کا مقامی نام) کی جولانیاں اپنے آپ میں سمیٹنے کے لیے مشتاق اُس نے جھرجھری لی۔

دھیرے دھیرے رک رک کر جگہ جگہ ٹھہرتے ہوئے وہ ڈونکس کھر تک پہنچیں۔ یہ راستہ جس پر سے ہم چل کر یہاں تک پہنچے ہیں، علی شیر خان انچن کی محبوب ملکہ مینڈوق رگیالمو (پھول شہزادی) نے ہی بنایا تھا۔

وہ ڈونکس کھر کی شکستہ اور نوکیلی دیواروں کے پاس بیٹھ گئیں۔ اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی اور جذبہ نے روح اللہ کی کرسی سنبھال لی تھی۔

یہاں ایک حفاظتی چوکی بنی ہوئی تھی، جس پر پہرے دار متعین رہتے تھے۔ اسے مزید آگے بڑھنے سے اس نے یہ کہتے ہوئے روک دیا۔ ”خدا کا کچھ خوف کرو، جذبہ پہلے چائے تو پلا دو۔“

اور جب چائے کا مگ اس کے ہاتھ میں آیا، اس نے اوپر نیچے اور اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ اس وقت آسمان شفاف اور نیلا تھا۔ کائنات بس ہمالیائی اور قراقرم کی دیواروں میں سمٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

تازہ دم ہو کر پھر اُٹھے۔

گیٹ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں رنگ و روپ کھوئے بیٹھا تھا۔

اس قلعہ کے بیرونی دروازے پر شیر کا مجسمہ نصب تھا۔ دروازے کے سامنے ایک بڑا چوپال تھا۔

ڈوگرہ فوج نے آخری مقپون بادشاہ کو گرفتار کر کے اسی چوپال میں لا کر قالین پر بٹھایا تھا۔ شہزادیوں اور بیگمات کو بھی گرفتار کر کے لایا گیا۔ یہ کیسا اندوہناک منظر تھا۔ اور اس نے دکھ اور کرب کے سمندر میں غوطہ مارتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

”صرف اندوہناک نہیں، انسان تو جیتے جی قبر میں اُتر جاتے ہیں۔ آن بان شان عزت و جاہ و حشمت سب کچھ منوں مٹی کے نیچے دب جاتا ہے۔ پلٹن میدان ڈھاکا اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔ سقوط دہلی اور سقوط بغداد تو کتابی المیے تھے۔ سقوط ڈھاکا تو اس کی روح، اس کے جسم و جان کا المیہ تھا۔“

جذبہ نے اونچے اونچے گانا شروع کر دیا۔

میری ژ انچوگنگ دشمنی چدے کھیریدے چوامیر حیدر
نوژے سنگے ژدخ یورپی کھیدو پودرنگ بانی فیونی لے
چوامیر حیدر

ترجمہ: اے راجا امیر حیدر! تمہاری عزیز شہزادیوں کو دشمن اسیر کر کے لے جا رہے ہیں، اے راجا تم میں جو شیر کی طاقت ہے، وہ آج دکھاؤ۔

یہ محل کی اس معمر عورت کی فریاد تھی۔ جو یہ ستم برداشت نہ کر سکی اور اس نے اسی قلعہ کھرپوچو میں ہی موت کی نیند سونے والے شہزادے امیر حیدر کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ اس عظیم قلعہ کھرپوچو کو مقپون راجا بوغا نے تعمیر کروایا تھا اور اس کے پڑپوتے غازی میر کے بیٹے علی شیر خان انچن نے اسے فوجی نقطۂ نظر سے وسعت دی۔

پردہ تو وہاں کھڑی صرف یہ سوچتی تھی کہ وہ جنہوں نے اسے تعمیر کیا جن تھے یا دیو؟ منوں وزنی پتھر سینکڑوں فٹ بلندی پر لائے اور اسے یوں بنایا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ماورا ہاتھوں کی کاریگری کا گمان پڑتا ہے۔

دائیں ہاتھ پر آٹھ بڑے بڑے مورچے تھے۔ ان مورچوں پر چھت نہیں تھی، اور جب اس نے ان سوراخوں میں جھانکا۔ آدھا اسکردو نظر آرہا تھا۔ سارا قلعہ ایک چبوترے پر بنا ہوا ہے۔ فصیل کے ساتھ ساتھ دو منزلہ عمارت اردگرد تعمیر تھی۔ مین گیٹ کے قریب مسجد بنی ہوئی تھی۔ ڈوگرہ وزیر لکھپت رائے نے مسجد کے سوا سب کچھ جلا ڈالا تھا۔ مہتہ سنگھ نے اسے دوبارہ تعمیر کروایا۔ قلعے کے بیچ میں چٹان کھود کر ایک حوض بنایا گیا ہے، جس کا سائز تقریباً بارہ ضرب بارہ فٹ

ہے۔ اس میں پانی جمع رکھا جاتا تھا۔ قلعہ میں پانی لانے کے لیے شمالی جانب سے دریائے سندھ کے کنارے تک زمیں دوز راستہ موجود تھا۔ مسجد کے قریب دیوار میں موجود ایک کالے پتھر پر اشعار کندہ تھے۔ اس کے پوچھنے پر جذبہ نے بتایا کا سنسکرت ہے۔

مغربی حصے میں ایک اونچی جگہ پر راجا صاحب کا محل بھی تھا۔ پر اس کا کوئی نام ونشان موجود نہیں تھا۔ ایک گول کمرے کے جھروکوں میں سے تازہ ہوا کے جھونکے اور دریائے سندھ نظر آتا تھا۔

وہ گھومتے رہے، چپ چاپ روحوں کی طرح۔ پھر چلتے چلتے اس دروازے تک آگئے۔ جو نانگ ژھوق کی طرف تھا اور اپی چوئے سو کے نام سے مشہور تھا۔ دیواریں نیم خستہ تھیں۔ جذبہ بول رہا تھا اور اس کی انگلی بندوق کی نال کی طرح کسی جگہ کا نشانہ لے رہی تھی۔

''وہ دیکھیے جہاں دریائے شگر دریائے سندھ میں گرتا ہے۔ وہیں نانگ ژھوق کی بستی ہے۔ جس کے معنی ہیں کانٹوں کا گھر۔ کبھی یہ گاؤں بہت اہمیت کا حامل تھا۔ لیکن دریائے سندھ کے کٹاؤ سے بیشتر حصہ دریا برد ہوگیا۔ دریا جس جگہ بہہ رہا ہے، اس کے عین درمیان راجا اسکردو کا تفریحی محل بھی تھا۔ یہ جگہ اسکردو اور باہر سے آنے والوں کے لئے ایک پُر لطف سیر گاہ ہے۔ یہاں بڑے بڑے چناروں تلے ایک چشمہ بہتا ہے۔ منچلے چاقو اور چھریوں سے ان تناور چناروں پر اپنے نام کھود کھود کر لکھتے ہیں۔''

''کہیں بیٹھ جاؤ اب سیماں پلیز! میں تھک گئی ہوں۔ مینڈوق کھر کی خستہ حال دیواروں کے گلے لگ کر مجھے وہ کہانی سننا قبول نہیں۔ کیونکہ میری ٹانگیں بے جان ہیں۔''

جذبہ نے وہیں صاف سی جگہ پر دستر خوان بچھاتے ہوئے اپنی گلابی اردو میں کہا۔ ''لیجئے ابھی سے ڈھیر ہوگئیں۔ اتنی نازک تو نہیں دکھتیں، جتنا ظاہر کرتی ہیں۔''

''کمبخت'' وہ غصے سے چلائی۔ ''تیرا کلیجہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا چوتھے آسمان پر تو تو مجھے لے آیا ہے۔''

اور اس نے پوری بتیسی کھولتے ہوئے کہا۔ ''کھانا کھایئے اب۔''

اور جب وہ آسمان کی وسعتوں اور زمین کی پہنائیوں کو دیکھ رہی تھی۔ سیماں نے تاریخ کے ورق اُلٹ دیے تھے۔

''اس وقت پولو گراؤنڈ میں سنترا موسیقی بج رہی تھی۔

مور خور (Ant Eater)

دودھ پلانے والا ایک چوپایہ۔ جیسا کہ اس نام سے ظاہر ہے یہ صرف چیونٹیاں کھا کر گزارہ کرتا ہے۔ اس کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کے بدن پر بال ہوتے ہیں۔ اس قسم کا جانور لمبائی میں 18 فٹ تک دیکھا گیا ہے۔ یہ وسطی اور جنوبی امریکا میں پایا جاتا ہے۔ اسی قسم میں ایک چھوٹی نسل بھی ہے جو امریکا کے گرم خطوں میں ہوتی ہے۔ یہ جانور قد میں پہلی قسم کے مقابلے میں آدھا ہوتا ہے۔ ایک تیسری نسل اسی قسم میں دو انگلیوں والے مور خور کی ہے جو امریکا اور ٹرینی ڈاڈ میں ملتا ہے۔ یہ ہر سہ نسلیں صرف چیونٹیاں کھاتی ہیں۔ ان کے جسم اور اعضاء بھی اسی ڈھب کے ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے پنجے، چوڑے منہ میں لیسدار زبان، جس پر چونٹیاں چمٹ جاتی ہیں اور یہ ان کو چٹ کر جاتا ہیں۔ دوسری قسم کے جانوروں کے بدن پر بجائے بالوں کے چھلکے سے ہوتے ہیں۔ یہ قسم امریکا، آسٹریلیا اور مشرقی ممالک میں پائی جاتی ہے۔

مرسلہ: عباس جان۔ جہلم

اس نے ڈفوق (گول ہونے کے بعد گیند کو پہلی ہٹ مارنا) مارا تھا۔ جو مقدر کا سکندر تھا۔ جس کی فراخ اور پُرعزم پیشانی پر اس کے اندر اور باہر کی شجاعت اور دلیری رقم تھی۔ اس کے چہرے کا ایک ایک نقش اور خم اس کی طاقت اور سختی کا نمائندہ تھا۔

اب تاجور دھن بج رہی تھی۔ اس دھن کے ساتھ قرنا (ایک بہت بڑا اور لمبا بگل) کی آواز نے فضا کو بہت پُر ہیبت بنا دیا تھا۔ اس وقت پیڑوں کے سائے لمبے ہورہے تھے اور بالتی یل کا تاجدار اور عظیم فرمانروا علی شیر خان انچن پولو کھیل رہا تھا۔

پھر وہ رُک گیا۔ اس نے ہاتھ اُٹھا کر موسیقی بند کرنے کا اشارہ کیا۔ فضا کو سونگھا اور گھوڑا دوڑتا ہوا وہاں جا کھڑا ہوا۔ جہاں خدمت گار سر جھکائے مؤدب ایستادہ تھے۔ اسے خبر ملی تھی کہ دلی میں اس کی بیٹی شہزادہ سلیم کی پہلی ملکہ سخت بیمار ہے۔

اس نے ماتھے کا پسینا دائیں ہاتھ کی پہلی پور سے صاف کیا۔ ایک ثانیہ کے لیے اُفق کو دیکھا اور گھوڑے کو سرپٹ بھگا تا محل میں آیا۔

پھر وہ ننگے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور پڑاؤ ٹھکراتا، سرپٹ دلی پہنچا۔

اور جب وہ شہ نشینوں اور غلام گردشوں میں سے گزرتا ہوا محل کے اس حصے میں پہنچا جو تبتی شہزادی کے لیے مخصوص تھا اس وقت فانوس جل اُٹھے تھے۔

کنیزیں آداب بجالائی تھیں۔ اس نے قدم اندر رکھا تھا اور دیکھا تھا کہ بیٹی چھپر کھٹ پر آنکھیں موندے پڑی ہے اور پاس کوئی کھڑا ہے۔ اس کی ایک نظر بیٹی پر اور دوسری بے اختیار ہو کر اس وجود پر پڑی تھی جو ایستادہ تھا۔ نظر کا ٹھہراؤ زیادہ دیر نہیں رہا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ اُلجھ گیا کہ کوئی جیتا جاگتا انسان دیکھ رہا ہے یا کوئی ماورائی شے ہے۔

بیٹی نے آنکھیں کھولیں۔ ہاتھ بڑھایا۔ باپ نے اُسے تھاما اور بوسہ دیا۔ پھر جھکا اور اس کے قریب بیٹھا۔

وہ چلی گئی تھی اور بالتی یل کے تاجدار کو محسوس ہوا تھا جیسے کمرے میں جلتے سارے فانوس آناً فاناً بجھ گئے ہوں۔

وہ بیٹی سے باتیں کرتا رہا، بالتی یل (بلتستان) اور خاندان کی، اور اس نے نہیں پوچھا کہ وہ کون تھی۔ پھر یہ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا۔ وہ اگلی سہ پہر بیٹی کے پاس گیا۔ دونوں کے درمیان ابھی گفتگو کا آغاز ہوا ہی تھا۔ جب وہ آئی اور اس نے کہا۔ ”تم نے سیب کا جوس نہیں پیا۔ کیوں؟ یوں کھانے پینے سے منہ موڑ رہی ہو۔ کمزوری بہت بڑھ جائے گی۔“

تبتی شہزادی نے کہا۔ ”میں نے بہتیرا چاہا، پر میرا اندر اسے قبول کرنے سے انکاری تھا۔“

اُس نے چند لمحے اُسے دیکھتے رہنے کے بعد کہا تھا۔

”آؤ بیٹھو۔“

وہ خود بیٹھنا چاہتی تھی، پر رانی ماں سے خوفزدہ تھی۔ رانی ماں کی خادمائیں اسے محل کی رتی رتی خبر پہنچاتی تھیں اور اسے اپنی ٹکا بوٹی کروانا پسند نہ تھا۔ لیکن مصیبت تو یہ تھی کہ کچھ معاملات اختیار سے باہر ہو جاتے ہیں۔

بیٹی نے تھکان کے باعث آنکھیں موندھ لی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تھا یوں گویا جیسے اپنے آپ کو دیکھا ہو اور یہی وہ لمحے تھے کہ بس یوں لگتا تھا جیسے پہچان کا سارا سفر طے ہو گیا ہو۔

اس سہ پہر وہ بہت دیر تک علی شیر خان انچن سے بالتی یل، کشمیر اور لداخ کی باتیں کرتی رہی۔ رانی ماں کا ڈراؤنا بھوت دماغ کے کسی کونے کھدرے میں پڑا رہا اور وہ وجاہت اور شجاعت کے اس پیکر سے ایک نیا رشتہ استوار کرتی رہی۔

اور تب دفعتاً علی شیر نے کہا۔ ”آپ آیئے نا بالتی یل۔“

اس وقت اُس کی آنکھوں میں وارفتگی کا جنون تھا اور وہ دونوں شانے جھکائے پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا۔

تب باغ میں تیز ہوائیں چلتی تھیں۔ جامن اور آم کے پیڑوں کے پتے تالیاں بجاتے تھے اور دل بھی کسی کو پالینے کی خوشی کی تال پر رقصاں تھا۔

پھر اگلی شب خواجہ سرا آیا۔ اس نے جھک کر تعظیم دی اور کانوں میں سرگوشی کی کہ شہزادی گل خاتون اسے پائیں باغ میں ملنا چاہتی ہے۔

اس نے اس پیغام کو سنا۔ اس وقت کمرا فانوسوں کی روشنی سے بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ وہ چند لمحوں تک اس روشنی کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بڑی ٹھوس آواز میں بولا۔

”چوروں کی طرح رات کی تنہائی میں ملنا بالتی یل کے تاجدار علی شیر خان انچن کو زیب نہیں دیتا۔ میں اسے دن کے اُجالوں میں لینے آؤں گا اور بالتی یل کی رگیا لفو چھمو (ملکہ خاص) بناؤں گا۔“

اور خواجہ سرا نے کمرے سے باہر نکل کر اپنے آپ سے کہا تھا۔ ”اس آواز اور لہجے کا دبدبہ اور گونج کسی طور بھی ظلِ سبحانی سے کم نہیں۔“

وہ اس کی بیمار بیٹی کی دنیا میں آخری شب تھی۔ اسے لحد میں اُتار کر وہ واپس آ گیا۔ جہاں اس کے ساتھ ایک دکھ آیا تھا وہیں ایک جگمگاتی کرن بھی آئی تھی جو اس کی بند آنکھوں میں گھس جاتی تھی۔

پھر اُس نے شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر کی خدمت میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا جو اسے بے کل بنائے ہوئے تھی اور شہنشاہ نے کمال شفقت اور محبت سے اس کی خواہش کی تکمیل کی اور یوں وہ جلال الدین اکبر کی چچا زاد، بن گل خاتون کو جاہ و جلال اور شان و شوکت سے بیاہ کر لے گیا اور اسے مینداوق رگیا لمو کا خطاب دیا۔

بس وہ ایسے ہی دن تھے جب پہاڑوں پر جمی برف پگھل جاتی ہے اور دریائے سندھ اپنے شباب پر آجاتا ہے۔

ان دنوں وہ نگ ژھوق میں اسی جگہ جہاں اب دریائے سندھ بہتا ہے، اپنے تفریحی محل میں آئی ہوئی تھی۔ سنہری شاموں میں اس کے دراز گیسو علی شیر خان انچن کے شانوں پر بکھر جاتے تھے۔ وہ آسمان کی نیلاہٹوں کو دیکھتے دیکھتے کھڑ پوچو پہاڑ پر آڑی، قلعہ دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

اور وہ اس کے بالوں پر بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ "میندوق رگیالمو! تمہارے پاؤں پھولوں سے زیادہ نازک ہیں۔ قلعے کا راستہ بہت ٹیڑھا اور اُلجھا ہوا ہے۔ بھلا تم وہاں کیسے جا سکو گی؟"

اور پھر ایک دن اس نے اپنے دل سے کہا۔ "میں اس پُراسرار، اُلجھے ہوئے پیچیدہ اور دشوار گزار راستے کو سیدھا سادہ اور سہل بناؤں گی۔" یقیناً میں جدت کی خواہاں ہوں یا یہ بھی ممکن ہے کہ میں ان محلات کے یکساں طرز تعمیر سے اُکتا گئی ہوں۔ پر یہ بھی حقیقت ہے کہ میں ان فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں اپنے ماضی کی کوئی چیز دیکھنا چاہتی ہوں۔

میندوق رگیالمو (پھول شہزادی) اس وقت محل کی بالکونی میں بیٹھی بہت دور پہاڑوں پر نظریں جمائے اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ فضا بہت خشک تھی۔

ان دنوں وہ تنہا تھی۔ اس کا محبوب علی شیر خان انچن تین ماہ ہوئے گلگت اور چترال کو فتح کرنے گیا ہوا تھا۔

اس صبح جب وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ چھوغولمنہ کی دھنیں بج رہی تھیں۔ لشکر کوچ کے لیے تیار کھڑا تھا۔ باہر سیاہ ننگے پہاڑوں پر سورج کی کرنوں میں برف کی چاندنی مسکرا رہی تھی، اور اندر اس کی گھنی سیاہ پلکوں میں اٹکے آنسوؤں کے برف جیسے موتی، اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹوں کی کرنوں سے ہنستے تھے۔

اس نے اس کی ناک کے چہار گل (کوکا) کے قیمتی جھلملاتے پتھر کو اپنی انگلی سے چھوا پھر اس کی پیشانی پر طویل بوسہ دیا اور کہا۔ "علی شیر خان انچن ہمیشہ تمہیں خود سے قریب پائے گا۔"

اور جب وہ سرپٹ بھاگتے گھوڑوں کی آوازیں سنتی تھی مقبون ستن لہ شخفہ کی خاص دھن ان آوازوں میں دب سی گئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں کھول دیے تھے اور کہا تھا۔ "اے اللہ! میں اسے غازی کی صورت میں دیکھوں۔"

پھر اس کے شب و روز اس محل کو بنانے کی تگ و دو میں گزرنے لگے جو وہ اپنے ذوق اور مزاج کے مطابق بنانا چاہتی تھی۔ سارا اسکردو اس نے چھان مارا۔ تب جا کر میندوق کھر کے لیے جگہ منتخب ہوئی۔ کاریگروں اور ماہرین فن کا انتخاب ہوا اور یوں سنگ مرمر سے بنا ہوا یہ محل اور اس سے ملحقہ باغ جب تیار ہوا، علی شیر خان انچن گلگت کو فتح کرتا ہوا چترال کی طرف رواں دواں تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے دو سال بیت گئے تھے۔ وہ خوش تھی کہ اس نے ایک خوبصورت چیز تعمیر کروائی۔ مگر اب اسے ایک نئی فکر لاحق تھی۔ باغ کی شادابی کے لیے پانی درکار تھا اور اسکردو کی کسی عام کوہل سے اس تک پانی پہنچنا مشکل تھا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ جب وہ فاتح بن کر لوٹے تو عظیم الشان میندوق کھر دلکش اور خوش نظر باغ اہل اسکردو کے ساتھ ساتھ اسے خوش آمدید کہے۔ طویل سوچ و بچار کے بعد اس نے دہلی سے گنگو نامی ماہر معمار بلایا۔

ہنرمند کاریگر اسکردو پہنچا اور خدمت عالیہ میں حاضر ہوا۔

میندوق رگیالمو نے کہا۔ "میں چاہتی ہوں یہ نہر باغ کو زندگی دینے کے ساتھ ساتھ اسکردو شہر کی زرعی زندگی کی بھی جان بنے۔"

پھر اس معمار نے تفصیلی معائنہ کیا، صورتِ حال کو دیکھا۔ اس کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور ملکہ کی خدمت میں عرض کی۔

"مطمئن رہیے، آپ کی خواہش کے عین مطابق یہ نہر تعمیر ہوگی۔ مگر ایک درخواست کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

اور میندوق رگیالمو ہنس پڑی تھیں کہ معمار نے کہا تھا کہ یہ نہر اس کے نام پر ہوگی۔

"چلو ہمیں تمہاری یہ شرط منظور ہے۔"

اور گنگوپی آداب بجالاتے ہوئے اُٹھ گیا تھا۔

دفعتاً سیماں ماضی سے چھلانگ مار کر حال میں آوارد ہوئی۔ گنگوپی نہر ابھی آپ نے نہیں دیکھی۔ دیکھیں گی تو پتا چلے گا کہ ایسے وزنی پتھر اس میں استعمال ہوئے ہیں کہ بس یوں لگتا ہے جیسے یہ جنات نے جمع کیے تھے۔ حالانکہ اس نہر کو بنانے میں جن مزدوروں نے کام کیا وہ علی شیر خان انچن کے فوجی معیار کے مطابق نااہل اور کمزور تھے اور اسی بناء پر وہ انہیں اپنی مہم میں ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ آپ اب خود سوچ

لیں کہ جب کمزور اور نا اہل لوگوں کی جسمانی طاقت کا یہ عالم تھا تو فوجی معیار پر پورے اُترنے والے لوگ کیسے ہوں گے؟

اور پھر وہ گنگوپی نہر بنی۔ سماں غڑاپ سے پھر ماضی کے دریا میں کود گئی تھی۔

"نہر کیا بنی، باغ شاداب ہوا۔ اسکردو کے کھیت شاداب ہوئے۔ پانی کی فراوانی ہوئی۔ غلّہ اور چارے کی بہتات ہوئی اور لوگوں نے بے اختیار کہا۔ "ملکہ مینڈوق کھر ہمارے سروں پر سلامت رہے۔"

اور ایک رات جب وہ سونے کے لیے جارہی تھی۔ اسے دفعتاً یاد آیا کہ اُس نے ابھی ایک اور اہم کام بھی کرنا ہے اور وہ قلعہ کھرپوچو تک پہنچنے کا آسان اور سیدھا راستہ ہے۔

معتمد درباریوں نے اس کا ارادہ جان کر کہا۔ "مینڈوق رگیالمو چھمو (پھول شہزادی یا پھول ملکہ خاص) یہ خواہش جانے دیجیے۔ رگیالفو انچن اسے پسند نہیں کریں گے۔ قلعے کا راستہ ہمیشہ عام پیروں کی دسترس سے پوشیدہ ہونا چاہیے۔"

اور اس نے کسی قدر غصے سے کہا۔ "یہ صرف میرا اور رگیالفو (بادشاہ) کا معاملہ ہے۔ آپ لوگ حکم کی تعمیل کریں۔"

اور حکم کی تعمیل ہوئی۔ کھرپوچو تک پہنچنے کا وہ راستہ بنا، جس پر ہم ابھی چڑھ کر آئے ہیں۔ ان دنوں وہ مجسم انتظار بنی ہوئی تھی۔ سارے کام ختم ہوگئے تھے۔ وہ تھک چکی تھی۔ تنہائی کا جان لیوا احساس اب اسے تڑپانے لگا تھا۔ مینڈوق کھر کے جھروکوں سے سندھ کے نظارے اسے بہت بے کل کرتے تھے، اور جب ایک اُداس سی شام وہ دور پہاڑوں کے پیچھے ڈوبتے سورج کو دیکھتی تھی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

"پروردگار! میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اُس کے بازوؤں میں سونا چاہتی ہوں۔ میرے اس لامحدود انتظار کو اب ختم کردے کہ مجھ میں ضبط کا یارا نہیں رہا۔"

اور بس وہ لمحہ قبولیت کا تھا۔

خادماؤں نے اطلاع دی کہ "محاذ سے ایلچی آئے ہیں۔ قدم بوسی کی اجازت چاہتے ہیں۔ چترال کی فتح کی نوید اپنی زبان سے آپ کو سنانا چاہتے ہیں۔"

اور پیغامبر حاضر خدمت ہوئے۔ ملکہ گل خاتون پردوں کے پیچھے ان کی آوازیں سنتی تھی۔ دل کی دھڑکنیں اپنے عروج پر تھیں۔ وہ بتارہے تھے۔

"قابل تعظیم رگیالمو! چترال کو زیر کرنا صرف علی شیر خان انچن جیسے دلیر اور جری رگیالفو کے ہاتھوں ہی ممکن تھا۔

ہم ان مناظر کی منظر کشی سے قاصر ہیں جو فتح کی یاد میں وہاں منعقد ہوئے۔

"پولو گراؤنڈ میں چھوغو پراسول کی بارہ دھنیں بجیں۔ شہزادے گھوڑوں سے چھلانگیں لگاتے ہوئے گراؤنڈ میں اُترے اور انہوں نے رقص کیا۔ ڈیانگ والے نے ایسا ڈیانگ بجایا کہ مقامی آبادی بھی سردھنتی رہ گئی۔"

اور جب اس نے یہ جانا کہ رگیالفو کا لشکر واپسی کے لیے چل پڑا ہے۔ اس کا دل فضا میں اُڑتے پرندے کی مانند چہچہایا۔

سارا اسکردو استقبال کے لیے دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ مینڈوق کھر جگمگاتا تھا اور مینڈوق کھر کی رگیالمو بھی آنکھوں میں شوق اور وارفتگی کے دیئے جلائے، ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی کلیاں سجائے مجسم انتظار بنی بیٹھی تھی۔

وہ دوپہر معمول سے زیادہ روشن اور حسین نظر آتی تھی۔ سازندوں نے "شادیاں" دھن بجانی شروع کردی تھی کہ فاتح اپنے لشکر کے ساتھ شہر میں داخل ہوگیا تھا۔ اس نے گنگوپی شہر کو دیکھا اس نہر سے متاثر شاداب اسکردو پر گہری نظر ڈالی۔ معتمد درباریوں کے ساتھ قلعے کے نئے راستے کا معائنہ کیا، باغ دیکھا اور پھر مینڈوق کھر داخل ہوا۔

امراء وزراء جرنیل اور درباری بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ مغل اور تبتی طرز تعمیر کے اس محل کو اوپر نیچے دائیں بائیں سے دیکھتا وہ آگے بڑھتا چلا آیا۔ حتیٰ کہ وہاں آکر رک گیا جہاں مینڈوق رگیالمو سولہ سنگار کیے اس کے استقبال کے لیے چشم براہ تھی۔ ملکہ کے ہونٹوں اور آنکھوں سے چھنتی خوشی کی چاندنی اس پر برسنے لگی اور وہ اس میں نہاتا ہوا آگے بڑھا۔

پھر اس کے شانے اس کے فولادی ہاتھوں تلے آگئے۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکا اور یوں گویا ہوا۔

"گنگوپی نہر بنانے پر تم انعام کی مستحق ہو۔ میں انعام نہیں دوں گا۔ کھرپوچو قلعے کے لیے جو راستہ بنایا ہے، اس کے لیے سزا کی حق دار ہو۔ پر میں سزا بھی نہیں دوں گا۔"

جیسے فضاؤں میں قلانچیں بھرتی لقی کبوتری کے دل پر کسی شکاری کا کوئی تیر لگ جائے اور پل جھپکتے میں وہ پھڑ پھڑا کر زمیں پر گر جائے۔ بس تو ایسا ہی اس وقت ہوا۔ اور اس نے ان فولادی باہوں میں بس صرف ایک بار آنکھیں کھولیں اور پھر ہمیشہ کے لیے موند لیں۔

بولتے مجسمے

شاہد لطیف

ہر دور میں شاطروں نے مذہب کا سہارا لے کر سادہ لوح انسانوں کے جذبات سے کھیلا ہے۔ خاص کر ناخواندہ معاشرے میں ایسا کاروبار ہمیشہ عروج پاتا ہے۔ افریقی تو ابتداء سے ہی توہم پرست رہے ہیں۔ ان کو بے وقوف بنانے کے لیے اس شخص نے کیسا نایاب طریقہ ڈھونڈا تھا۔

ایک ایسا واقعہ جو آپ کو حیرت زدہ کر دے گا

میرے نزدیک برّ اعظم افریقا تو بس خزانوں کی کنجی تھی۔ حیرت ناک بات تھی کہ میں اس سے نفرت بھی کرتا اور ڈرتا بھی بہت تھا مگر مال و زر کے لیے اس سے پیار بھی جی کھول کر کرتا تھا اور وہ بھی یہ کہنے پر مجبور تھا کہ افریقا افریقا ہے۔

افریقا نے ہی ہم دونوں کو باہم ایک کر رکھا تھا۔ ابراہیم یعنی میں داؤدی کا رہنے والا تھا لیکن پلا بڑھا امریکا کے شہر شکاگو میں تھا۔ اور محمود علی داؤد، شام کے شہر دمشق کا رہنے والا تھا۔ یہ عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ ایک طرف ہمدرد تو دوسری طرف غصہ کا تیز، ایک طرف سخت گیر تو دوسری جانب لوگوں میں بے حد مقبول بھی تھا، طبیعت میں سادگی بھی اور بے چینی بھی تھی۔ یعنی ہر ایک مثبت چیز کا تضاد بھی اس کے اندر پایا جاتا تھا۔

Dowdy & Dawud داؤدی اینڈ داؤد ہماری فرم کا نام تھا جو وسطی افریقا میں مشہور تھی۔ اس تمام علاقے اور دریائے کانگو کے اطراف میں رہنے والے، کون ان سے

واقف نہیں تھا۔

ہم زیادہ تر ہاتھی دانت اور شتر مرغ کے پروں، ربڑ، سونا، قیمتی موتی اور مختلف اقسام کے نباتات اور کونین کا لین دین کرتے تھے۔ دریائے کانگو کے بالائی حصہ میں ہمارے کارخانے، گودام، گودیاں اور دفاتر واقع تھے۔ دریائی آمد و رفت کے لیے ہمارے اپنے چھوٹے، اسٹیمر چلتے تھے۔ سال میں دو مرتبہ ہم بڑے بڑے جہاز منگوا کر اپنا برآمدی مال Liverpool برطانیہ بھجوایا کرتے تھے۔

اب ہمارا کاروبار اس سطح پر پہنچ چکا تھا کہ ہم اپنی مرضی کی منہ مانگی قیمت لے کر کانٹی نینٹل چارٹرڈ کمپنی کو اپنا یہ چلتا ہوا کاروبار فروخت کر سکتے تھے۔ وہ حریف کمپنی کہ جس کے ساتھ ہم نے دس سال مقابلہ کر کے اس کو شرمناک حد تک منظر سے ہٹا دیا تھا۔ اس سودے کے بدلے، میں امریکا کے شہر شکاگو میں ایک عالیشان مکان میں ٹھاٹھ سے ساری زندگی رہ سکتا تھا جو میرا ایک پرانا خواب تھا۔ جبکہ محمود علی داؤد دمشق میں ایک آرام دہ زندگی کا ارمان پورا کر سکتا تھا۔ جہاں ایک خوب پھلنے پھولنے والا باغ ہوتا۔

”عرب کے کھجوروں کی تمام ہی اقسام میرے باغ میں ہوں گی۔“ وہ اکثر مجھ سے یہ بات خوب چٹخارے لے لے کر کہا کرتا تھا۔ اپنی ان خواہشات کے اظہار کے دوران بحث و مباحثہ اور کشیدگی بھی ہوتی، ایک دوسرے کو برا بھلا بھی کہا جاتا مگر پھر بھی ہم دونوں کا ساتھ تھا۔ یہ کہانی سالوں سے چلی آ رہی تھی۔

کیوں؟ اس لیے کہ یہ افریقا تھا۔ اس کا میٹھا میٹھا زہر ہماری روح میں اتر چکا تھا۔ اب ہم یہاں رہے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور محمود کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

”دیکھو محمود۔“ میں نے کہنا شروع کیا۔ ”پچھلے چار مہینوں میں، اب ہمارا یہ تیسرا آدمی غائب ہوا ہے۔ ہم اپنے اس تجارتی اسٹیشن کو یوں آسانی سے ہاتھ سے ہرگز نہیں جانے دیں گے۔ دریائے کانگو کے بالائی علاقے کا یہ بہترین اسٹیشن ہے۔ ہمارے حریف تو پہلے ہی زخموں کو چاٹ رہے ہیں، وہ تو ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔“

دوران گفتگو، محمود لکڑی کے دانوں والی ایک لمبی سی تسبیح کے دانے گنتا رہا۔ اب اس نے بھی منہ اوپر کر کے اپنے مقابل کو دیکھا۔ ”ہمارے پاس کئی ایک وفادار اور محنتی لوگ ہیں جو وہاں پر بہترین نتائج دے سکتے ہیں، علاقے اور وہاں کے لوگوں سے بھی واقف ہیں۔“

”وہ تو پھر صریحاً قتل ہوگا محمود! یہ بھی غائب ہو جائیں گے جیسے ان سے پہلے والے ..... گم ہو چکے ہیں۔“

جواب میں محمود علی داؤد نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بد قسمتی تو جیسے ہماری گردنوں پر سوار ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اندرون جنگل والوں کی حرکت ہو۔“

”نہیں نہیں وہ تو اس قصہ میں کہیں دور دور نہیں ہیں۔“

محمود نے اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میرے دوست اگر میری بات کا کوئی ثبوت نہیں، تو تمہاری بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ ان کا ہمارے آدمیوں کے غائب ہو جانے سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمیں تو کچھ علم ہی نہیں۔“

میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ تو ثابت ہے نا کہ ہمارے یکے بعد دیگرے، تین بہترین آدمی اسٹیشن سے پُراسرار طور سے ایکدم غائب ہو گئے۔“

محمود مسکرایا۔ ”اب اگر ان بدقسمتوں نے اپنی روحوں اور جسموں کا سودا شیطان سے کر لیا ہے تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ سب کو پتا ہے کہ ہمارے اس دور افتادہ اسٹیشن سے آدمی غائب ہو رہے ہیں پھر بھی یہ دیکھو وہاں پر جانے والے امید واروں کی درخواستیں۔“ اس نے سامنے میز پر رکھے کئی خطوط اٹھا کر دکھائے۔ ”ان میں ہماری کمپنی کے بھی امیدوار ہیں۔“

میں نے نظر بھر کر محمود کی طرف دیکھا۔ ”یقیناً ہم پھر نہایت گھٹیا درجے کے قاتل ہوں گے۔“

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمام غائب ہونے والے قتل کیے گئے ہیں؟“

”یہ میں کیسے جان سکتا ہوں؟ لوگ ایسے ہی تو بیٹھے بٹھائے غائب نہیں ہو جاتے؟ نہ کوئی شور نہ کوئی آواز نہ ہی کوئی سراغ۔“

داؤد کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ ”اللہ سب سے بڑا ہے۔“ اور دوبارہ تسبیح کے دانے گھمانے لگا۔

میں کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہوا اور باہر دیکھنے لگا۔ ہر طرف خوبصورتی کا دور دورہ تھا۔ مگر قدرتی نظاروں کو دیکھنے والی آنکھ بھی تو درکار ہوتی ہے۔ میرا کام تو بس افریقا کو بے رحمی سے نچوڑنا تھا۔ دولت کمانا تھا۔ افریقا کی خوبصورتی، تازگی اور انواع و اقسام کے پھولوں کی خوشبو بھی میرے نزدیک فضول تھی۔

اور پھر مجھے اپنے اس عظیم لاپو پو اسٹیشن کا خیال آ گیا جو

دریائے کانگو کے بالائی حصہ میں 300 میل کی مسافت پر تھا۔ ہماری فرم ڈبل ڈی "Double-Dee" کا یہ سب سے زیادہ اہم اسٹیشن تھا۔ یہاں دریا کا پانی خاصا گہرا تھا۔ چھوٹے بڑے اسٹیمروں کے لیے گودیاں بہت محفوظ تھیں۔

اسٹیشن کے شمال کی جانب گھنے جنگلات تھے جو ہاتھی دانت کے سلسلہ میں شاید پورے افریقا میں سب سے زیادہ مشہور تھے۔ ہمارے لیے تو یہ ایک نہ ختم ہونے والا دولت کا سرچشمہ تھا۔ یہیں سے ہم اپنا مال و اسباب برطانوی بندرگاہ لیورپول اور جرمن بندرگاہ بریمن کو برآمد کرتے تھے۔ یہاں کے مقامی لوگ من پسند اور اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔

☆......☆

ہینڈرک لمبا چوڑا اور نسلاً بور تھا۔ یہ بور جنوبی افریقا کے اصل ڈچ آبادکاروں کی نسل سے تھے جن کو اب تک Afrikaners کہا جاتا ہے۔ یہ اس اسٹیشن پر کئی سالوں سے ہماری فرم کا ایجنٹ چلا آرہا تھا۔ اس کی ان تھک محنت نے اسٹیشن کو ایک نہایت منافع بخش مرکز بنادیا تھا۔ سال میں ایک مرتبہ ایک خاص زمانے میں وہ اپنے دور افتادہ مقام سے شہر میں تین ہفتوں کے لیے تعطیلات گزارنے آیا کرتا تھا۔ بڑے پیمانے پر خوب دل کھول کے تفریح اور موج میلا کیا کرتا۔

تقریباً چار ماہ قبل اسی تفریح کے سلسلہ میں وہ کچھ زیادہ ہی نشہ کر گیا نتیجہ میں راہی عدم ہوگیا۔

پھر یکے بعد دیگرے تین ایجنٹ وہاں بھیجے گئے جو تمام ہی ایمان دار، منصفانہ سلوک کرنے والے اور مقامی مزدوروں کی نفسیات، رہن سہن اور زبان سمجھنے والے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس 'لاپوپو' اسٹیشن پر ذمہ داری سنبھالنے سے قبل ان کی فرم کے دیگر اسٹیشنوں میں اپنی بہترین ساکھ بنا چکے تھے۔

پچھلے چار مہینوں میں ایک ایک کر کے منظر سے غائب ہوتے چلے گئے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ابھی یہاں تھے اگلے لمحہ غائب۔ زمین کھا گئی یا آسمان؟ کسی کو کچھ علم نہیں ہوسکا۔ چلو ان میں سے کسی کو تو کوئی پیغام چھوڑنے کا موقع مل جاتا۔ حتیٰ یہ کہ ان کے جسموں تک کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

بظاہر ان کے یوں اچانک غائب ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اسٹیشن کے کھاتے، لین دین سب درست تھے۔ تمام غائب ہونے والے افراد درمیانی عمروں کے تھے، ان میں کوئی ایک بھی شکار کا جنونی نہیں تھا۔ کسی کی بھی ذاتی دشمنی نہیں تھی، اور ان کو مقامی افراد سے کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔ بس وہ سب بیٹھے بٹھائے غائب ہوگئے۔

مقامی کھوجیوں کی ایک دفعہ نہیں، کئی مرتبہ خدمات حاصل کیں۔ جنہوں نے سرتوڑ کوشش کر دیکھی۔ پھر جب تیسرا شخص غائب ہوا تو قریبی شہر سے باقاعدہ ایک سراغ رساں بلوایا جو 'چوتارا' تھا۔ (وہ شخص جس کے ماں باپ میں سے کوئی ایک مقامی افریقی ہو)۔ اس غریب نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہی رہا۔

تب پھر داؤد خود دریا کے راستے 'لاپوپو' گیا۔ ہر طرح کی تفتیش اور چھان بین کروا دیکھی۔ آس پاس کے بااثر افراد کو رشوت اور مٹھی گرم کرنے کی تگڑی پیش کش بھی کی، انعامات کا باقاعدہ اعلان بھی کروایا۔ اطراف میں میلوں جنگل چھنوا ڈالا۔ اندرون جنگل بستیوں میں خود چل کر گیا اور پیار اور دھمکیوں سے تفتیش کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

مگر ایک ہلکا سا بھی اشارہ نہیں ملا کہ اسٹیشن سے غائب ہونے میں کسی بھی طرح، مقامی لوگوں کا کوئی ہاتھ ہے۔

اور آج ہی صبح، بددل اور تھکاوٹ سے چور، داؤد، لاپوپو اسٹیشن سے ناکام واپس لوٹا تھا۔

"ابراہیم! ذرا بتاؤ تو سہی کہ اب ہم کیا کریں؟"

"ایک چیز تو ہم ہر وقت ہی کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے تمام اثاثے 'چارٹرڈ کمپنی' کو فروخت کردیں۔"

داؤد نے اس بات کے جواب میں ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ "اپنی فرم کو بیچ ڈالیں؟ اسرار کی تہہ تک پہنچے بغیر......؟ نہیں نہیں! میں ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا۔"

میں نے اٹھ کر گلاس میں پینے کا پانی ڈالا۔ "اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔" کہتے ہوئے پانی پی گیا۔

پھر...... اس کی جانب متوجہ ہوا۔

"تم بھی دوسروں کی طرح ہمیشہ اپنی ہٹ دھرمی اور ضد سے حالت جنگ ہی میں رہتے ہو۔ قسمت سے لڑنے کا بھلا کیا فائدہ؟ یہ قسمت ہی ہے جو زمین سے آسمان تک عروج دیتی ہے یا آسمان سے کھینچ کر فرش پہ دے مارتی ہے۔ میرا اب بھی یہی مشورہ ہے کہ اپنی فرم کو بیچ کر تم اپنے ملک اور میں اپنے ملک چلتے ہیں۔"

داؤد نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چہرہ اوپر اٹھا کر خالی نظروں سے چھت کو تکنے لگا۔

اسی دوران، ہمارے مکان کے چاروں طرف احاطہ کیے ہوئے برامدے میں سے ایک بے ہنگم سا شور اٹھا، مقامی

لوگوں کی بے سرو پا گفتگو کرنے کی تیز اور چبھتی ہوئی آواز آنے لگی۔ یہ ہمارے ملازمین تھے جو آپس میں بات چیت کررہے تھے۔ گاہے بگاہے فضول قسم کے قہقہے بھی شامل ہو جاتے۔

میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی کیوں کہ پچھلے بیس 20 سالوں سے میں اس قسم کا شور وغل سنتا چلا آرہا تھا۔ میرے نزدیک یہ افریقا کی ثقافت کا ایک حصہ تھا۔ جیسے ڈھول بجا بجا کر ایک بستی سے دوسری کو راتوں میں پیغام دینا۔

مگر اب کی دفعہ کچھ ایسا ہوا کہ میں بھی ہوشیار ہو کر پوری توجہ سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

کسی نے مقامی لہجے میں ہمارے بدقسمت اسٹیشن لا پو پو کا نام لیا۔ پھر کوئی سرگوشی میں دوبارہ ان کے اسٹیشن کا نام لینے لگا۔

اس پر میں نے اپنے ساتھی اور شریک کار داؤد سے کہا۔

”تو اب یہ بھی......“

”ہاں......“ داؤد نے جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی ان تین گم شدہ افراد کا ذکر کررہے ہیں۔ اب تو یہ کہانی بستی بستی جنگل جنگل مقبول ہو گئی ہے۔ دیکھ لو! ان کے اعلانیہ ڈھولوں نے ، 300 میل دور تک یہ خبر پہنچادی ہے۔ اور پھر بھی ان خطوط کی تعداد کو دیکھو۔ یہ لوگ اس کے باوجود وہاں ملازمت کے لیے بے چین ہیں۔“ اس نے سامنے رکھے خطوط ہاتھ میں لے کر ہوا میں اچھالے۔

اچانک باتوں کی بھنبھناہٹ ایک دم رک گئی۔ کچھ دیر مکمل خاموشی چھائی رہی۔ پھر کوئی مقامی لہجے اور انداز سے ہٹ کر بات کرنے لگا۔ مگر پھر فوراً ہی آواز اس قدر دھیمی ہو گئی کہ داؤد اور مجھے کچھ سننا بھی مشکل ہو گیا۔ دوبارہ ایک سکوت چھا گیا۔

”کچھ تم نے بھی سنا؟“ داؤد نے سوال کیا۔

میں اٹھا اور ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔ دبے پاؤں برآمدے کے پاس، دروازے پر اپنے کان لگا دیے۔ باہر سے پھر وہی آواز ابھری۔ اب کی دفعہ ایک کام کا لفظ ہاتھ لگا' اوم لینو'۔ پھر دوبارہ یہی لفظ' اوم لینو' بولا گیا۔ لفظ اوم لینو براعظم افریقا، خاص طور سے وسطی اور جنوبی افریقا میں 'جادوگر ڈاکٹر' کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تکالیف رفع کرنے والا دانا آدمی ہوتا ہے جو در اصل جادو کے بداثرات کو مریض سے دور کرتا ہے۔

میں نے پوری توجہ سے مزید کچھ اور سننے کی کوشش کی لیکن کچھ سنائی نہیں دیا۔ پھر میں اپنے کاروباری شریک کار کے پاس آ گیا۔

”یہ لوگ کسی نئے اوم لینو کے آنے کی بات کررہے ہیں۔“

”یہ بات کون کررہا تھا؟“ داؤد نے سوال کیا۔

”وہ چپٹے چہرے والا نیا لڑکا جو' ما کو پو' کہلاتا ہے۔“ محمود نے جواب دیا۔

”اچھا! مجھے بتلایا گیا ہے کہ وہ کسی اندرون جنگلی بستی سے ہماری ملازمت میں آیا ہے۔“

”ہاں ہاں وہی۔“

”بھلا اس کا اس اوم لینو سے کیا تعلق؟ اور خود اس' اوم لینو' کا ہمارے گمشدہ لوگوں سے کیا لینا دینا ہے؟“ داؤد نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک دم غصہ میں آ گیا۔ ”میں اس کو وہ سبق سکھاؤں گا کہ......“ اپنی ہی بات ادھوری چھوڑ کر الماری میں سے گینڈے کی کھال کا بنا ہنٹر نما کوڑا اٹھاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔

میں نے بہت اطمینان سے اس کے کاندھے پکڑ کر واپس کرسی پر بٹھا دیا۔ اور نرم لہجہ میں بولا۔ ”میرے دوست! غم کرنا چھوڑ دو۔ اس اسرار سے پردہ اٹھانے کے لیے اب میں شمال کی جانب جاؤں گا۔“

داؤد نے چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

”مگر......“ اس نے تھکاوٹ سے کہا۔ ”میں وہیں سے تو ابھی آرہا ہوں۔“

میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”ہاں!“ میں نے کہا۔ ”مگر جب تم وہاں گئے تھے تو یہاں کے مقامی اور وہاں شمال کے اس ڈاکٹر کے درمیان، نہ کوئی رابطہ تھا نہ یہ باتیں کہ' اوم لینو' بڑے بڑے کمالات اور معجزات دکھلا رہا ہے۔ میں نے ابھی برآمدے میں کھڑے ہو کر یہ باتیں سنی ہیں۔“

داؤد بیساختہ مسکرا دیا۔ ”تم بہت ہی دقیانوسی ہو، میں تمہارے خیالات کی عزت کرتا ہوں، لیکن یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ نئے ہوں یا پرانے مگر دکھوں اور تکلیفوں کو دور کرنے کے لیے ان بستیوں میں ہمیشہ ان اوم لینو... کی ضرورت اور نہ ختم ہونے والی مانگ قائم رہتی ہے۔“

”اور ان کے ساتھ ساتھ ju-ju کی بھی۔ یعنی کوئی نہ کوئی دیوتا بھی جو مجسموں کی صورت میں ہو تو زیادہ اچھا سمجھا جاتا ہے۔“ میں نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔“ داؤد نے مجھ سے اتفاق کیا۔

"میں بھی افریقا سے آشنا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے یہ ملازم Waranga قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب بھلا ان کا 300 میل دور، دریائے کانگو کے بالائی علاقوں والے قبائل یا وہاں کے اوم لینو اور ان کے ماننے والوں سے کیا تعلق ہوسکتا ہے؟ ہمارے ہاں شمال کا تو صرف ایک ہی لڑکا ہے۔ یہ بھی بتاؤ کہ شمال اور جنوب کی آپس کی دشمنیوں کے بعد بھی ان میں اب آخر وہ کیسا رشتہ پیدا ہوگیا؟ صرف ایک ہی تعلق ہے وہ ہے ایک مشترکہ دشمن۔"

"یہاں کوئی دشمن وشمن نہیں۔ پورا علاقہ پُر امن ہے۔ رہا شمال اور جنوب کے قبائل میں کوئی وجہ اشتراک، تو وہ جادو ہے۔ بد اثرات ختم کرنے والا بھی ان کی نظر میں جادوگر ہی ہوتا ہے۔ اوم لینو ہی ان کی مصیبتیں دور کرتا ہے، بیماری اور جسمانی تکالیف بھگاتا ہے، بارش درکار ہو تو اسی کی دعا نے کام دکھانا ہوتا ہے۔ کسی کا جانور گم ہوجائے تو یہ موصوف ہی عمل کر کے اس کو واپس آنے پر مجبور کردیتے ہیں۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اوم لینو اکثر بڑے خواب دیکھتے ہیں۔ طاقت، زمین، خزانے حتیٰ کہ مملکتیں بھی حاصل کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ہم ایسی داستانیں سنتے رہتے ہیں۔" میں نے جواباً کہا۔

"تمہارے خیال میں یہ کوئی سازش ہے؟" داؤد نے سوال کیا۔

"نہیں! یہ صرف افواہیں ہیں جو بنائی جارہی ہیں اور اوم لینو کے معجزات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جارہا ہے۔" کچھ توقف کے بعد میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں لاپو پوجا کر اپنے ان گم شدہ ایجنٹوں کا کھوج لگاؤں گا اور مجھے یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہاں وہ نیا جادوگر یا اوم لینو معجزات کی کیا کھچڑی پکا رہا ہے۔ میں اللہ کی مدد سے ضرور کامیاب ہوکر آؤں گا۔" میں مسکرا دیا۔

داؤد اس مسکراہٹ کا مطلب بخوبی جانتا تھا۔ ماضی میں کئی ایک مرتبہ مہم جوئی، کاروبار میں کوئی اہم فیصلہ کرنا اور کبھی کبھار موت پر بھی اس نے یہ مسکراہٹ دیکھی تھی۔ مگر ہمیشہ یہ کامیابی ہی لائی تھی۔ اس کی سفر کی تمام تھکاوٹ دور ہوگئی اور وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔

"تم کب نکل رہے ہو؟" داؤد نے پوچھا۔

"آج ہی رات کو۔"

داؤد کے چہرے سے حیرانی ٹپکنے لگی۔ "ناممکن! ہفتہ کی صبح سے پہلے تو اسٹیمر بھی نہیں جائے گا۔"

"میں وہاں خشکی کے راستے جنگل میں سے ہوکر جاؤں گا۔"

"اوہ! آخر تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟" داؤد نے بیساختہ کہا۔

میں مسکرا دیا۔ "کیوں کہ باہر برآمدے میں ہمارے 'وارنگا' قبیلے کے ملازمین اور شمال سے آئے ہوئے اس شخص کی بات چیت ہوئی ہے۔ ڈھول سے دوسری بستیوں کو پیغامات جا رہے ہیں۔ ادھر دریا کے بالائی حصوں میں معجزے دکھلائے جا رہے ہیں۔ یہ سوالات کرنے کا وقت نہیں ہے میرے دوست! وقت سے فوری فائدہ اٹھانا عقلمندی ہوگی۔ سنو! میں اس شمال سے آئے ہوئے 'ماکوپو' کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

داؤد نے مجھ کو شک کی نظروں سے دیکھا۔ اس کا اس طرح سے دیکھنا ہی بہت کچھ کہہ گیا۔

"ماکوپو؟ ہمارے اتنے بہت سے ملازمین میں سے کیا صرف یہ ہی رہ گیا تھا لے جانے کو؟ تم تو اس پر بالکل بھی بھروسا نہیں کرتے ہو؟"

"اسی لیے تو ساتھ لے جا رہا ہوں!" محمود کھڑا ہو گیا۔ "اس وقت اس پر بات کرنے کا وقت نہیں۔ مجھے سفر کی بھی تیاری کرنا ہے۔ ہاں! البتہ تمہیں ایک بہت ہی ضروری کام کرنا ہے۔"

"بتاؤ؟"

"یہ کہ میرے شمال کی جانب جانے کا گھر کے ملازمین، قطعاً کسی سے ذکر نہ کریں۔ اور نہ اس بات کا کہ میں ماکوپو کو اپنے ہمراہ لے کر گیا ہوں۔ خبردار وہ کسی کو بھی کوئی پیغام نہ دینے پائیں۔"

داؤد نے بے چینی کی حالت میں اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ تو تقریباً ناممکن سا کام ہے! یہ بھلا کیسے کیا جاسکے گا؟"

"اس کا بہترین حل یہ ہے کہ تم یہاں کے پولیس کمشنر کے پاس چلے جانا اور میرے یہاں سے جانے سے ایک گھنٹا قبل، گھر کے تمام چھوٹے بڑے ملازمین کو اندر کروا دینا۔ پولیس کمشنر کو تم جتنا مناسب سمجھو بتا دینا کہ ایک رات کے لیے وہ ان سب لوگوں کو کیوں اندر بند رکھے۔ مگر خاص خیال رہے کہ میری واپسی تک یہ میرے معاملے میں اپنی زبان بند رکھیں۔ میں اس بات کو بالکل بھی پسند نہیں کروں گا کہ اِدھر سے اُدھر پیغامات کی ترسیل ہو یا بستی بستی ڈھول بجا کر یہ خبر عام کی جائے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ میں افریقہ کو جانتا ہوں۔ اور مجرے کو پکنے سے پہلے روک دینا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں گنگناتا ہوا کمرے سے باہر نکلا اور ٹہلتا ہوا آگے بڑھا۔

داؤد نے مجھے ملازمین اور دیگر وارنگا قبائل کے بیچ میں سے جاتا دیکھا جو باہر برآمدے میں ٹکڑیوں میں بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ پھر وہ اٹھا اور پولیس کمشنر کی طرف چل دیا۔

یوں گھنٹے بھر کے اندر 'ڈبل ڈی' کے تمام مقامی ملازمین حوالات میں نظر بند کر دیئے گئے، جو خود ایک خلاف قانون اقدام تھا۔ ادھر میں خوف زدہ ماکوپو کے ہمراہ 300 میل کی مسافت طے کرنے کے لیے جنگل کی خاک چھاننے نکل گیا۔

☆......☆

کچھ دیر مسلسل سفر کرنے کے بعد ہم دونوں ایک جگہ سستانے کو رک گئے۔

"سنو؟" میں نے کہا۔

"جی صاحب!"

میں ایک نیچے گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا اور اس کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "دیکھو لڑکے! تم دریائے کانگو کے بالائی شمالی علاقہ سے آئے ہو اور ادھر ہمارے لوگوں میں بددلی اور مایوسی کا زہر گھول رہے ہو۔"

ماکوپو نے جواب میں سر اٹھا کر مجھے بے بسی سے دیکھا۔

"اب تم میری بات غور سے سنو۔ تم میرے ساتھ جنگل کے راستے شمال کو جا رہے ہو مگر ایک سراغ رساں کی حیثیت سے لہٰذا اپنی سونگھنے کی حس ہر وقت بیدار رکھو۔ اب تم مجھے اس اوم لینو کے پاس لے کر جاؤ گے جس نے تم کو یہاں ہمارے پاس بے چینی اور بددلی پھیلانے کے لیے بھیجا ہے۔ اب یہ بیماروں کو اچھا کرنے والا جو نیا شخص ادھر آیا ہے اس سے ملنے ہی کے لیے تو میں کل کا انتظار کیے بغیر نکل پڑا ہوں۔"

"میں حاضر ہوں۔" ماکوپو نے جواب دیا۔

"اگر تم نے غداری کی یا ہمارے لاپوپو اسٹیشن تک کے سفر میں، آس پاس کی بستیوں کو کوئی پیغام ترسیل کیا یا اشارے دیئے، تو یاد رکھنا کہ پھر تمہارا انجام اچھا نہیں ہوگا۔"

ماکوپو نے ڈرتے ڈرتے میری ... طرف دیکھا۔ اس کو پکا یقین ہو گیا کہ ضرورت پڑنے پر میں ایسا کر بھی سکتا ہوں۔

"جی صاحب آپ بے فکر ہو جائیں۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ "یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا۔ اب میرا اور تمہارا معاہدہ ہو گیا۔ اپنا سامان اٹھاؤ اور روانگی کے لیے تیاری کر لو۔ اب تم لاپوپو تک کی رہبری کرو گے۔"

ایک لفظ کہے بغیر ماکوپو نے عمل کرنا شروع کر دیا۔

یوں بے خانماں ہو کر ہم دونوں ایک طویل سفر پر روانہ ہو گئے۔ ماکوپو نے بھی اپنے وعدہ کا بھرم رکھا۔ راہ میں آنے والی بستیوں میں کسی سے کوئی کانا پھوسی ہوئی نہ کوئی پیغام ترسیل ہوا۔ حالاں کہ کھانے پینے اور کبھی کسی مقامی راہبر کی ضرورت کے لیے کسی بستی میں کچھ دیر کو رکنا بھی پڑتا تھا۔

جنگل کے پُرپیچ راستوں کا ایک جال تھا جس میں کبھی ہمیں قد سے اونچی گھاس ملتی، اور کبھی ایسے راستے جو اچانک تنگ ہو کر بالکل ہی بند ہو جاتے۔ پھر ان میں سے راستہ بنانا بھی ایک عذاب تھا۔

ہم نے دریا کو بہت پیچھے جنوب میں چھوڑ کر ایک قوس بناتے ہوئے چلنا شروع کیا۔ وہ راستہ نشیبی علاقوں کی بری آب وہوا اور مچھروں کی آفات سے محفوظ اور دلدلی علاقے سے کافی ہٹ کر واقع تھا۔ ہم ایسی سنگلاخ چٹانوں سے بھی گزرے جو سورج سے اس طرح تپتی تھیں جیسے بھٹے سے پکی ہوئی کوئی اینٹ۔ بعض ایسی سرد راتیں بھی بسر ہوئیں کہ جیسے کہ ہم Mount Kilimanjaro کی برف پوش چوٹی پر ہوں۔

ہم اپنے سفر کے بیسویں 20 دن خط استوا پر پہنچ گئے۔ آسمان پر بادل نہیں تھے۔ چبھنے والی گرمی تھی۔ ہم دونوں دن بھر آرام کرتے اور سہ پہر اور راتوں کو سفر کرتے۔ اس طرح تپش سے محفوظ رہتے۔

بالآخر ایک شام، ہم دوبارہ دریائے کانگو پر پہنچ گئے۔ چلتے چلتے ماکوپو رک گیا۔

"لاپوپو......" اپنے سامنے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پھر ہم ایک طویل پہاڑی ڈھلوان سے نیچے ایک وادی میں اترے۔ وہ رات کا وقت تھا۔ بہت دور آگ کے الاؤ نظر آ رہے تھے۔ کافی رات بیت گئی جب یہ لاپوپو اسٹیشن کے باہر پہنچے۔

میں ٹھہر گیا۔ "اب تم مجھے اوم لینو کے پاس لے کر چلو جو یہاں بیٹھ کر خوامخواہ نئے نئے اسرار گڑھ رہا ہے۔"

"مجھ پر رحم کریں جناب! یہاں تک میں آپ کو لے آیا ہوں۔ اب اس سے آگے مجھے معاف رکھیں۔ اوم لینو میری گفتگو سن سکتا ہے۔ وہ تو مٹی کے بنے دیوتاؤں کو بات کروا سکتا

ہے۔'' بولتے بولتے ماکوپو کی آواز بھرا گئی۔
میں مسکرا دیا۔ ''ہم دونوں میں ایک معاہدہ ہوا تھا۔ وہ یاد ہے؟ اپنی بننے والی قبر یاد ہے؟'' میں نے کہا۔ میری دھمکی میں اثر تھا اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔
اچانک ہی ماکوپو کھڑا ہو گیا۔ کچھ بات کرنے کی کوشش کی لیکن زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے ایک جھونپڑے کی جانب اشارہ کیا جو ہماری ایجنسی کے بنگلے کے پڑوس میں تھی۔ ''وہاں...... وہاں......'' بہت مشکل سے اس سے الفاظ ادا ہوئے۔ ''اوم لینو وہاں رہتا ہے...... وہاں لال مٹی کے بولتے دیوتا بھی ہیں۔''
میں نے سیٹی بجائی۔ ''یا اللہ رحم! ایجنسی کے اندر...... اسٹیشن کے اندر......''
اب تک تو حالات قابو میں ہی تھے۔ مجھے یقین تھا کہ دریا یا جنگل سے ہمارے یہاں آنے کا کوئی پیغام نہیں آیا ہوگا۔ اس لیے واچ ڈاکٹر کے جو بھی ارادے ہیں، اور غائب ہونے والے ایجنٹوں سے جو بھی تعلق ہے، اچانک میرے یوں سامنے آنے سے وہ ذہنی طور پر قطعاً تیار نہیں ہوگا۔ پھر ماکوپو کو اپنے ساتھ لیے پھرنے سے غداری کے امکانات بھی نہیں رہے تھے۔
اسٹیشن بالکل غیر آباد تھا۔ ایک نظر میں خاصے برے حال میں لگا۔ مہینوں کا جھاڑ جھنکاڑ اُگ آیا تھا۔ کیاریوں کی ترتیب قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ باغ کی باڑھیں بے ہنگم بڑھی ہوئی تھیں۔ ایک عجیب افسردگی سی چھائی ہوئی تھی۔
میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ رہائشی بنگلا، چھوٹے اسٹیمروں کے ٹھہرنے کی گودی اور گوداموں پر کہیں بھی کوئی چوکیدار نظر نہیں آیا۔ ایک گودام کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ یہ سب اس بات کا ثبوت تھا کہ ان لوگوں کو میرے آنے کا کوئی پیغام نہیں ملا۔
مجھے غصہ آنے لگا۔ میں بنیادی طور پر تاجر تھا۔ وقت اور اشیاء کا ضائع کرنا میرے نزدیک شیطان سے نفرت کرنے سے بھی زیادہ قابلِ نفرت بات تھی۔ میں نہایت آہستگی سے چلتا ہوا ایجنسی کے بنگلے کے دروازے پر آ گیا۔
باڑھ کے پار جنگل نظر آ رہا تھا۔ چاند کی چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ کبھی کبھار ہلکی ہوا چلتی تو پتے اور ہلکی شاخیں سرسراہٹ پیدا کرتیں، ورنہ پاگل کر دینے والی افریقی خاموشی، جس سے نئے آنے والے کا تو دل ہی بیٹھ جائے۔
بنگلے کے تقریباً برابر ہی بستی کے اصل واچ ڈاکٹر کا شفا خانہ تھا۔ میں نے نظروں سے دونوں گھروں کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگایا جو کسی لاش کے لے جانے کے لیے صرف چند گز ہی کا بنتا تھا۔ مگر......؟ مقامی اور شہر سے بلوائے گئے سراغ رسانوں نے یہاں کی ایک ایک انچ زمین دیکھ ڈالی تھی۔ اب میں خود یہاں پر موجود تھا۔ اگر اس جھونپڑی کے اندر قتل کی واردات ہوئی ہے تو لازماً اب کسی سراغ کا معلوم کرنا پڑے گا۔ یہ بھی ایک اٹل حقیقت تھی کہ ہمیشہ سے ہی شمال میں اوم لینو موجود رہے ہیں اور ان کے تجارتی اسٹیشنوں میں بھی ایسے لوگوں کی عام آمد و رفت رہا کرتی تھی۔
پتا نہیں کیوں میرے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اس اوم لینو اور ان کے آدمیوں کے قتل یا غائب ہونے میں کوئی قدر مشترک ضرور ہے۔
میں نے اوم لینو کی جھگی کو غور سے دیکھا۔ دیواروں کی درزوں سے ہلکی ہلکی روشنی نظر آ رہی تھی۔
''اے اللہ! مجھے رات کی تاریکی سے محفوظ رکھنا جب وہ مجھ پر چھا جائے۔'' میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ مگر ماحول کی ہیبت نے بھی میرے اعصاب کو جکڑ رکھا تھا اور قلب پر نفرت و خوف کا غلبہ تھا۔ پھر بتدریج میں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا۔ اعتماد کی چال چلتے ہوئے میں نے زوردار طریقے سے اوم لینو کے دروازے کو دھکا دے کر کھولا۔
دروازہ کھولنے پر ایک بوجھل فضا نے استقبال کیا۔ یہ دھوئیں سے بھرپور تھی۔ جس میں کئی طرح کے تیل، جلتی مشعلوں کا دھواں اور پسینے کی بو شامل تھی۔
میں بے خوف چند قدم آگے بڑھا اور محفل پر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی۔ چاروں جانب کثیف دھوئیں کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ کئی سو افراد اتنی کم جگہ میں سمائے ہوئے تھے۔ کچھ گھٹنوں کے بل، کچھ اپنے بازو زمین پر پھیلائے ہوئے سجدے کی حالت میں تھے۔
انہوں نے میری آمد سرے سے محسوس ہی نہیں کی۔ ایک باقاعدہ طریقے سے وہ لوگ دائیں اور بائیں ہل رہے تھے۔ ساتھ، ساتھ ان کی زبان سے الفاظ کم اور آوازیں زیادہ نکل رہی تھیں جو گاہے بگاہے، بہت ہلکی ہو جاتی تھیں۔ جھگی میں سامنے کی جانب پانچ عدد بھدی بناوٹ کے قد آدم مجسمے چکر کھاتے دھوئیں میں پُراسرار انداز سے کھڑے نظر آئے۔ ان پر لال مٹی کی بھونڈی لپائی کی گئی تھی۔ یہ ان کے دیوتا تھے، جن کو مقامی زبان میں JUJU کہا جاتا تھا۔
یہ سب میری تجربہ کار نگاہ نے سیکنڈوں میں بغور دیکھ

لیا۔اس کے ساتھ ساتھ میں نے کچھ محسوس بھی کیا۔یہ میرے حواس خمسہ سے متعلق ہرگز بھی نہ تھا۔نہ تو سماعت،نہ بصارت، نہ شامّہ،نہ ذائقہ اور نہ چھونے کا احساس بلکہ وہ احساس میری چھٹی حس پر اثر انداز ہوا۔مجھے دبے قدم آتی ہوئی موت اور اپنے انتہائی قریب آنے والی کسی تکلیف اور اذیت کا احساس ہوا۔

مگر میری حاضر دماغی قائم رہی، جس کا میں نے فوراً اللہ سے شکر ادا کیا۔پھر جب ان مجسموں کے پیچھے سے اوم لینو برآمد ہوا تو میں دوبارہ سے پُراعتماد ہو گیا۔

''دریائی قبائل کی بیماریاں اور دکھ دور کرنے والے پر سلامتی ہو۔'' میں نے یہ جملے بہت ہی بلند آواز میں کہے۔

ان الفاظ نے گویا پرستش میں ڈوبے ہوئے افریقیوں کو جھٹکے سے جگا دیا۔ان میں کئی ایک ایسے بھی تھے جو بن بلائے مہمان کے یوں آ جانے سے سخت طیش اور غصہ میں تھے۔بہتوں کے پاس نیزے، بھالے اور خنجر بھی تھے۔ان کی اکثریت ایسی تھی جو اس وقت دماغی طور پر بالکل اوم لینو کے کنٹرول میں تھی۔

وہ جہاں تھے وہیں رک گئے۔بعض نے پیچھے مڑ کر اوم لینو کو دیکھا، جیسے کسی حکم کے دیئے جانے کے منتظر ہوں۔

اس مختصر دورانیہ کے وقفہ کو میں نے اپنے حق میں استعمال کیا۔میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور چہرہ پر مسکراہٹ طاری کر لی۔

''میرے لوگو! تم پر سلامتی ہو۔'' میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے، موقع محل کے مطابق، سب لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

پھر خراماں خراماں، شاہانہ چال چلتے ہوئے سامنے کھڑے لوگوں کی طرف چلا۔ان لوگوں نے فوراً ہی میرے لیے راستہ بنا دیا۔اِدھر اُدھر دیکھتے اور ہجوم میں سے بعض کو پہچانتے ہوئے ان کا نام لیتا ہوا میں آگے بڑھا جیسے۔''ہو، لاکا گا!...ہو، آسافی کے بیٹے!''

جواباً ان افراد نے بھی چند جملے کہے۔

چند سیکنڈوں میں، میں اوم لینو کے بالمقابل پہنچ گیا، جو ان لال مٹی کے بنے ہوئے مجسموں سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

''اوم لینو! تم پر سلامتی ہو۔'' میں نے ایک دفعہ اور کہا۔

اوم لینو نے میری طرف دیکھا۔ہر طرف گھومتی ہوئی آنکھ میں غضب کی چمک تھی جس میں سے مکاری جھلکتی محسوس ہوتی تھی۔

''آقا! آپ پر بھی سلامتی ہو۔'' اس نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی جانب چہرہ کیا۔اس نے کبھی ان اوم لینوں پر توجہ نہیں دی تھی۔مگر پھر بھی مجھے اس بات کا یقین تھا کہ یہ اس بستی کا نہیں۔ایک دم، کیمرے کے شٹر کی سی تیزی سے میرے دماغ نے فیصلہ دے دیا کہ ان کے اس لاپو پو اسٹیشن کے آس پاس رہنے والے کسی بھی قبائل سے اس کا تعلق نہیں۔یہ ہر طرح سے دوسروں سے مختلف لگتا تھا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ کوئی عام اوم لینو نہیں ہے، یہ تو خاصا دولت مند انسان لگا۔اس کے دائیں ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی جس کے دستے پر سونے کا خول چڑھا ہوا تھا اور اس کے بالکل اوپر، سائنیسی طور پر نہایت عمدگی سے سکڑا ہوا ایک انسانی سر۔''نہیں نہیں! یہ عام اوم لینو نہیں کہ جس کو ڈرا دھمکا کر یا پیسے دے دلا کر کام نکالا جا سکے۔یہ ایک عیار، چالاک اور فنکار آدمی ہے اور اس کو عیاری، چالاکی اور فنکاری ہی سے مات دی جا سکتی ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

میں نے پوری سچائی کے ساتھ بولنا شروع کیا۔''مجھے آپ کی مہارت کے بارے میں بتلایا گیا ہے'' میں نے اوم لینو کے سامنے بے پروائی سے بیٹھتے ہوئے کہا۔اس کی دیکھا دیکھی وہاں موجود اکثریت بھی بیٹھ گئی۔اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کہیں قریب سے کوئی ہلکی اور گھٹی گھٹی سرگوشی میں میرا نام لے رہا ہو۔میں نے اس سرگوشی کو واہمہ جانا۔اور کچھ توقف کے بعد اپنی بات کو جاری رکھا۔''تمہاری دانش کے چرچے تو دور دور تک پہنچ رہے ہیں۔دیکھ لو میں بھی یہاں تم سے ملنے آیا ہوں۔''

''آپ کے ان الفاظ کا شکریہ! میں نے سنا ہے کہ آپ مسلم ہیں، ایک خدا کو ماننے والے۔'' اوم لینو نے کہا۔

میں مسکرایا۔ایک لمحہ کو تو میں پریشان ہو گیا کہ اس بات کا کیا جواب دوں۔کچھ دیر خاموشی سے کمرے کو تکتا رہا۔

مقامی لوگوں میں بہت سے اس اسٹیشن کے ملازمین بھی تھے جو میرے لحاظ اور اوم لینو کی توہم پرستانہ عقیدت کے درمیان منقسم تھے اور اس اچانک صورت حال سے خوش نہیں تھے۔

میں جانتا تھا کہ میں تباہی کے کنارے پر کھڑا ہوں جہاں ایک غلط قدم یا حرکت، اس جم غفیر کے سامنے موت ہو گی۔لہٰذا میں اطمینان اور سکون کے ساتھ نیچی نظریں کیے بیٹھا

رہا۔ تاکہ کسی کو یہ احساس نہ ہو کہ میں خوفزدہ ہوں۔ پھر ایکدم مجھے وہی سرگوشی سنائی دی کہ کوئی گھٹی ہوئی آواز میں میرا نام پکار رہا ہے۔

اسی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا گویا کوئی مجھے بغور دیکھ رہا ہے۔ کوئی طاقت مجھے گھیرے ہوئے تھی۔ میں اس ادم لینو یا جادوگر ڈاکٹر کے دماغ کی طرف سے بالکل بھی نہیں آرہی تھی اور نہ ہی یہاں بیٹھے ہوئے ان گنت لوگوں سے۔ یہ کوئی ماورا طاقت تھی جو مجھے کوئی پیغام دینا چاہتی تھی۔ یہ جو کچھ بھی تھا میرا واہمہ یا سوچ نہیں تھی مگر تاثر برابر قائم رہا۔

ادم لینو میرے ساتھ بات کر رہا تھا مگر میری توجہ الفاظ پر نہیں تھی۔ میں نے اپنے جسم کو معمولی حرکت دے کر اپنا چہرہ لال مٹی کے لیپ شدہ مجسموں کی جانب کر لیا۔

ایسا کرتے ہی میں نے اپنے اندر توانائی اور مثبت سوچ محسوس کی۔ اور اس بات کی آگاہی ہو گئی کہ مجھے کون مسلسل دیکھ رہا تھا اور کون مجھ سے ہمکلام ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اپنی نیم وا آنکھوں سے ان مجسموں کو دیکھا۔ وہ ایک کے پیچھے ایک کھڑے تھے۔ سب سے آخر میں کھڑے دو مجسمے خاصے بھدے تھے۔ آگے والے تینوں مجسمے، لال مٹی کی ماہرانہ لپائی میں اپنی جسامت، بازو اور ٹانگوں کی مناسبت سے کمال ہی تھے۔ میں کہاں کہاں نہیں پھرا تھا لیکن اس طرح کے شاہکار دیوتائی مجسمے میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

اچانک مجھے ماکوپو کے الفاظ یاد آئے۔ ’’لال مٹی کے بنے دیوتا جو بات بھی کرتے ہیں۔‘‘ میں اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔ ’’یا اللہ کیا واقعی یہ کوئی جادو ہے؟‘‘

وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ کسی نے عجیب اور پراسرار انداز میں ہلکے ہلکے نام پکارا۔ یہ کوئی وہم نہیں تھا۔ اب کی دفعہ مجھے یقین آگیا کہ کسی نے میرا نام لیا ہے۔ میں نے پوری کوشش کی کہ میرا اندرونی جذبات چہرے سے ظاہر نہ ہونے پائیں کیونکہ ادم لینو نے مجھ پر مسلسل نظر رکھی ہوئی تھی۔

میں نے مسکرا کر ادم لینو کی جانب دیکھا۔ میں آرام سے بات کر رہا تھا لیکن میرا دماغ کسی اور سمت میں کام کر رہا تھا۔ ’’تم نے بالکل ٹھیک کہا ادم لینو، میرا ایمان ایک خدا پر ہے۔ وہ ایمان جس کی جڑیں مضبوط ہیں، جس کی شاخیں خوب پھل پھول رہی ہیں، جن کا سایہ مسلسل اور لافانی ہے۔ میں ایک سیدزادہ ہوں، مسلمان ہوں، سچے نبی ﷺ کا ماننے والا اور ہر وقت شیطان مردود سے پناہ مانگنے والا۔‘‘

ادم لینو کے چہرے پر ایک عیارانہ مسکراہٹ ابھری۔ ’’تو پھر تم تاریکی میں رہنے والوں کے پاس کیا لینے آئے ہو؟‘‘

میں نے شائستگی سے جواب دیا جبکہ میرا دماغ بالکل ہی دوسری طرف نہایت تیزی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ میں نے غور سے اپنے بالمقابل کھڑے نام نہاد دیوتائی مجسمے کو دیکھا۔

’’اس لیے کہ میرے دماغ میں ایک ہلکا سا خیال پیدا ہوا ہے..... شاید وہ سچ ہی ہو۔‘‘ دوبارہ زور دے کر الفاظ دہرائے ’’شاید وہ سچ ہی ہو۔‘‘

جب میں یہ بات کر رہا تھا، تب ہی میں مسئلہ کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ جس کی خاطر جنگل جنگل کتنی ہی صعوبتوں سے گزر کر یہاں تک آیا تھا۔ ایک کامیاب اداکار کی طرح سے میں نے بتدریج اپنی آواز بلند کرنا شروع کی، اب اس میں رعب اور دبدبہ بھی شامل ہو گیا۔

’’کیوں کہ میرے قدم مجھ کو یہاں اسرار پر سے پردہ اٹھانے کے لیے لے کر آئے ہیں۔ اب میں تمہارے پاس آیا ہوں تاکہ تم مجھے اپنا شاگرد بنالو۔‘‘

میں یہ کہتے ہوئے ایک دم کھڑا ہو گیا اور اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ’’ابھی یا کبھی نہیں۔‘‘ ایک مرتبہ اور میں نے اپنے قریب ترین دیوتا کے مجسمے کو دیکھا پھر اپنا رخ افریقیوں کی جانب کر کے ان سے خطاب کرنے لگا۔
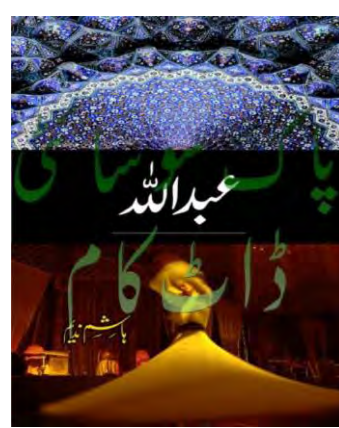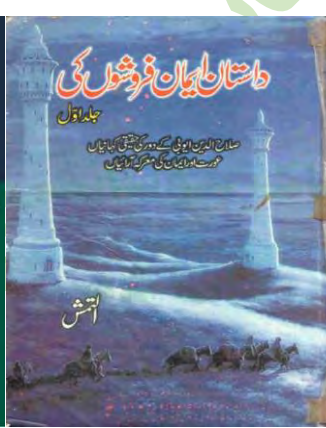
’’دریائی قبائل کے لوگو میری بات سنو! سالوں سال میں تم میں رہا ہوں، تم لوگوں کی تکالیف اور مصائب میں، جہاں تک ممکن ہوا مدد بھی کی ہے۔ تم لوگوں کے لائے ہوئے ہاتھی دانت اور ربڑ کا معقول معاوضہ دیا ہے۔ تم لوگوں کی کھیتی باڑی کے لیے جب ضرورت ہوئی، رقوم بھی دی ہیں۔ جب تمہارے جانور بیماری سے مر جاتے تھے تو وہ نقصان بھی میں ہی پورا کیا کرتا تھا۔ کیا تم لوگوں میں سے کوئی ایک بھی اس بات سے انکاری ہے؟‘‘

ہجوم کے درمیان سے ایک گونجتی ہوئی آواز ابھری۔

’’ہاں بے شک یہ بات سچ ہے۔‘‘

’’سچ ہے..... سچ ہے.....‘‘ بہت سی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ ’’میں نے تم کو اسلام پر اپنا یقین اور ایمان بتلا دیا جو نجات کا سیدھا راستہ ہے۔ پھر‘‘ ڈرامائی طور پر اپنی آواز ہلکی کر کے کہا ’’پھر تمہارے اس علاقے سے افواہیں گردش کرنے لگیں۔ پہلے پہل تو مجھے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

شک ہوا اور میں نے ان پر کان نہیں دھرے۔ مگر افواہیں بڑھتی چلی گئیں، ان کی گونج میرے کانوں اور میری روح میں بھی محسوس ہونے لگی۔ اب اسی لیے میں یہاں کچھ سننے اور دیکھنے آیا ہوں۔“

میں سانس لینے کے لیے رکا۔ پھر بیان جاری رکھا۔
”میں یہاں بولنے والے لال دیوتاؤں کو دیکھنے آیا ہوں جو بات کرتے ہیں۔“

تمام مجمع دم بخود ہو کر پوری توجہ سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اوم لینو ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی لاٹھی پکڑ کر جارحانہ انداز سے آگے بڑھا۔ مگر محمود نے اپنی تقریر جاری رکھی۔

”آج کی رات جب میں اوم لینو کے سامنے بیٹھا تھا، تب میں نے خود دیوتاؤں کو ہلکے ہلکے اپنا نام لیتے ہوئے سنا۔“

”یہ جھوٹ ہے۔ سفید جھوٹ!“ اوم لینو غصہ سے چلایا۔ ”یہ تو صریحاً دیوتاؤں کی توہین ہے۔“

میں نے دونوں ہاتھ سر سے اونچے کرتے ہوئے جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ ”یہ جھوٹ نہیں۔ بلکہ سچ ہے۔ ان دیوتاؤں سے خود پوچھ کر دیکھ لو۔“

اس پورے مجمع میں سانپ سونگھ گیا۔ پوری جھگی میں خاموشی چھا گئی۔ ایسے میں سب سے آگے کھڑے مجسمہ کی جانب سے ایک ہلکی سی آواز آئی۔ ”محمود علی“ پھر دوبارہ ایک روہانسی آواز سنائی دی ”محمود......“

آواز کیا آئی گویا قیامت آگئی۔ ہجوم آناً فاناً بری طرح سے گھبرا کر باہر کی جانب دوڑا۔ لیکن فوراً ہی میں نے بلند آواز میں ان سے کہا۔ ”ڈرو نہیں میرے لوگو۔ یہ دیوتا تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ میں خود بھی اسی حق کی تلاش میں آیا ہوں۔ دیکھو لو سچ مجھ پر ظاہر ہو گیا ہے۔ سنو، سنو۔“

ہجوم رک گیا اور لوگ واپس آنے لگے۔ میں نے اب آہستہ آواز میں بات کو جاری رکھا۔ ”کیا تمہیں یاد ہے کہ چار مہینوں کے اندر اندر، اسی اسٹیشن سے ہمارے تین ایجنٹ یکے بعد دیگرے غائب ہو گئے تھے۔“

”ہاں ہاں......“ کئی ایک آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

”تو ٹھیک ہے۔ اب تم سب لوگ یہاں سے چلے جاؤ اور ایک گھنٹے کے بعد آنا۔ یہ دیوتا تو بہت ہی اچھے ہیں۔ انہوں نے میرے گمشدہ آدمی زندہ حالت میں دوبارہ یہاں بھیجنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب سب لوگ چلے جائیں۔“

دروازے کی طرف ایک بھگدڑ مچ گئی۔ چند ہی سیکنڈ بعد جھگی میں صرف اوم لینو اور میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں مسکرایا۔

”تم جانتے ہو کہ اب میں بھی جان گیا ہوں! کہ تم نے ہی میرے ان تینوں آدمی کو دھوکے سے قابو کیا، ہاتھ پاؤں اور منہ باندھ کر ان کے جسموں پر لال مٹی کا لیپ کر دیا۔ دن میں تھوڑا سا کچھ کھانے کو دے دیا۔ جب وہ غریب تکلیف میں کراہتے تو تم یہاں کے سیدھے سادے لوگوں کو بے وقوف بناتے کہ دیکھو یہ میرے دیوتا بات کرتے ہیں۔ کیوں کیا ایسا نہیں ہے؟“

اوم لینو جواب میں مسکرایا۔ ”یہ سچ ہے جناب۔ لیکن اس کا آپ کو کیوں کر علم ہوا؟“

”کیوں کہ میں نے یہ بے شمار ju-ju دیکھ رکھے ہیں، مگر ان کی طرح کا ایک بھی نہیں کہ جن کی آنکھوں کی جگہ انسان کی آنکھیں ہوں۔“

ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے بات کو جاری رکھا۔
”اب تم ان کو مٹی کی قید سے نکالو گے۔ اور میرے اس عظیم لاپو پو اسٹیشن کے لوگوں سے کہو گے کہ اب میں، یعنی محمود علی ان خداؤں کا چہیتا ہے۔ اب تمہاری جو بھی کمائی ہوگی اس کا آدھ میرا۔“

وہ کھسیانا ہو کر مسکرا دیا۔ ”اور کوئی چارہ بھی نہیں جناب! مگر میری زندگی؟ کیا میں محفوظ رہوں گا؟“

”یہ تو تم نے منتخب کرنا ہے۔ یا تو یہ......“ لمبے کرتے میں سے عربی طرز کے خنجر کو نکال کر لہرا کر دکھایا۔ ”یا تم پہلے کی طرح سے بیماریاں اور دکھ درد ختم کیا کرو گے۔ مگر اب کی دفعہ جنوب کے علاقوں میں۔“ میں کہتے کہتے مسکرا دیا۔ ”یہ سب کچھ تم میرے ایک تنخواہ دار کی حیثیت سے میری فرم Dowdy & Dawud المعروف ڈبل ڈی کے لیے کرو گے۔ تو پھر تم نے کیا سوچا؟“

”ہاں میں آپ اور آپ کے شریکِ کار کے لیے کام کروں گا۔“

میں نے خنجر واپس اپنے کرتے کی جیب میں رکھ دیا۔
”ماشاءاللہ!“ میں نے کہا۔ ”تم ایک اچھے کارکن بن گئے ہو۔“

اور میں مٹی سے لیپ شدہ مجسموں کی طرف چلا۔ تاکہ اپنے ملازموں کو اس قید سے نکال سکوں۔

غلط فہمی

انور فرہاد

غلط فہمی کیسے کیسے گل کھلاتی ہے اس کے دو نمونے ایک پاکستانی فلم انڈسٹری سے اور دوسری بالی ووڈ کی کتھا۔ دونوں واقعات کافی مشہور ہیں لیکن اپنے اندر سبق کا بھی ایک پہلو لیے ہوئے ہیں۔ فلمی دنیا سے باخبر رہنے والوں کے لیے ایک دلچسپ موازنہ۔

دو معروف فلمی شخصیتوں کی زندگی کے اہم گوشے

روزنامہ جنگ کے مالک و مدیر میر خلیل الرحمٰن اور ماہنامہ رومان کے غنی دہلوی کی مشترکہ فلم ''سردار'' سپرہٹ ہونے کے بعد ان کی دوسری فلم ''سلطنت'' زیر تکمیل تھی جس کی کہانی، مکالمے اور منظر نامہ عزیز میرٹھی نے تحریر کیے تھے۔ نغمات احمد راہی کے اور موسیقار چشتی بابا تھے۔ فلم کے ہدایت کار جناب ایم ایس ڈار تھے۔ ان کے پروڈکشن آفس سلور اسکرین پکچرز واقع رائل پارک لاہور سے ڈار صاحب اور میں باہر آئے تو شام ہو رہی تھی۔ تصور پان

فروش سے صاحب نے تھری کیسل کا سگریٹ سلگا کر ایک طویل کش لیا اور جیسے ہی گھر کی طرف ہونے کے لیے مڑے، ڈار صاحب کی نظر تین رندان بلانوش پر پڑی۔ ایم جے رانا، احمد راہی اور بابا چشتی تینوں بلند عمارتوں کے پیچھے منہ چھپاتے مدقوق سورج کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ ڈار صاحب کھنکارتے ہوئے ان کی طرف بڑھے تو تینوں نے ٹھٹک کر کورس میں انہیں سلام کیا۔ ڈار صاحب نے سلام کا جواب دینے کی بجائے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا۔ ''او شرابیو! آنکھیں پھاڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ سورج پر کمند پھینک کر نیچے کھینچو تاکہ جلدی اندھیرا ہو اور تم میکلوڈ روڈ پر جا کر اپنے چراغ جلاؤ تمہارا کیا خیال ہے ڈار پریس جا کے جو گل تم کھلاتے ہو مجھے اس کی خبر نہیں؟''

تینوں تک تک دیدم دم نہ کشیدم۔ نظریں جھکا کر بغلیں جھانکنے لگے۔ ڈار صاحب نے پورے زور سے کھانس کر آخری دو انگلیوں میں دبائے سگریٹ کا حقہ کی طرح بھرپور کش لیا اور نصیحت کے انداز میں بڑے دکھ سے کہا۔

پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''چل ایناں نوں موج لین دے۔ اسی تے اپنے گھر چلیے۔''

''ارے نادانو! یہ وقت لوٹ کر نہیں آئے گا۔ جوا کھیلنے، شراب پینے اور بدمستیاں کرنے کے لیے ایک عمر پڑی ہے۔ اپنے کام کاج کی طرف دھیان دو۔ کوئی ہنر سیکھ لو۔ کچھ نام کما لو۔ میری نصیحت گرہ میں باندھ لو جس کی آگے آنے والی زندگی میں تمہیں بہت ضرورت ہو گی۔ منزل بہت دور اور راہیں بڑی کٹھن ہیں۔'' مجھ سے بولے۔

''انہیں موج لینے دو۔ ہم تو اپنے گھر چلیں۔''

☆......☆

رندان بلانوش نے شیخ و واعظ کی بات کبھی مانی ہے جو وہ مانتے۔ وہ تو حسب معمول اِدھر سورج غروب ہوتا۔ اُدھر وہ اپنے چراغ لالہ فام روشن کرتے۔ تینوں دوست اپنی اپنی جیب سے دیسی شراب کے تین ادھے نکلسن روڈ کے گاندھی، پٹیالہ گراؤنڈ کے سندھو یا پھر ریگل سنیما کے مسٹر پال سے منگواتے اور تینوں ہم پیالہ و ہم نوالہ اپنے اپنے ادھوں کے تین تین ڈبل پیگ بناتے اور آٹھ نو بجے سے لے کر رات کے بارہ ایک بجے تک ہرباش ہو جاتے۔

8۔ میکلوڈ روڈ پر مون لائٹ سنیما کے سامنے اور ایرا سنیما سے ملحق ایک بہت بڑی اور قدیم بلڈنگ میں رانگنی آرٹ پکچرز کا دفتر واقع تھا اور اس کے گراؤنڈ فلور میں ڈار پرنٹنگ پریس تھا۔ جہاں سنیماؤں کی اسٹیشنری، پوسٹر، کلینڈر اور ہینڈ بلز کے علاوہ انگریزی ماہنامہ مووی فلیش بھی چھپتا اور وہیں سے شائع ہوتا تھا۔ اسی پریس کے سامنے اینٹوں کے پختہ چبوترے پر یہ محفل جام و مینا بلاناغہ گرم ہوتی۔ ایک روز میں پریس میں اپنے مہربان ایم ایس ڈار صاحب کے چھوٹے بھائی جناب طفیل ڈار کے پاس بیٹھا رات گئے تک کام کرتا رہا اور باہر جمی محفل رندان سے ہنسی قہقہوں کی آواز آتی رہی۔ کام سے اکتا کر ذہن تازہ کرنے کے لیے میں دفتر سے باہر نکلا تو رانا صاحب نے ازراہ کرم فرمایا۔

''آیئے آیئے! کبھی ہم گناہ گاروں کے پاس بھی بیٹھ جایا کریں۔''

''شرمندہ نہ کیجیے رانا صاحب۔ میں کون سا عابد و زاہد ہوں۔ بے عیب تو وہی ذات واحد ہے۔'' میں نے جواب دیا تو انہوں نے نکو کو اندر سے کرسی لانے کے لیے کہا۔

نکو نے لپک کر کرسی لا رکھی۔ میں بیٹھ گیا تو چشتی صاحب نے کہا۔ ''آج تو آپ کو ہمارا ساتھ دینا ہو گا۔ زیادہ نہیں تو ایک لعل پیگ ضرور۔''

''سوری چشتی صاحب مجھے ابھی کام کرنا ہے۔''

''انکار نہ کر ظالم، یہ لال پری تو سِن ذہن کے لیے تازیانے کا کام دے گی۔''

''پلیز مجھے مجبور نہ کریں میں......''

احمد راہی میری بات کاٹ کر بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل۔ لیکن کبھی کبھی اسے......''

''تنہا بھی چھوڑ دے۔'' رانا صاحب نے راہی کی بات کو آگے بڑھایا۔

''دوستو! اگر مجھے اپنی محفل میں ضرور شامل کرنا چاہتے ہو تو ایک کوکا کولا منگوا دو۔ آپ کے ساتھ ساتھ گھونٹ گھونٹ میں بھی لیتا رہوں گا۔''

''اچھا بھئی تمہاری مرضی۔ جاؤ نکو دوڑ کے ایک یخ کوکا کولا......''

نکو نے فوراً تعمیل کی اور جلد ہی ایک کوکا کولا اور خالی گلاس لے آیا۔ میں نے مشروب گلاس میں ڈالا اور پینے کے لیے گلاس اٹھانا چاہا تو رانا نے تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایک منٹ۔" رانا نے اپنے وسکی کے گلاس میں انگلیاں ڈبوئیں اور میرے گلاس میں چھڑکتے ہوئے کہا۔ "یہ تو تمہیں پینا ہی پڑے گا۔ رندوں کی محفل میں کسی صوفی کا کیا کام۔" اس کی اس بچکانہ حرکت پر میں ہنس پڑا۔

"چلو منظور، ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں بہشت۔"

خلافِ معمول چشتی صاحب نے اپنا ادھا بہت جلد خالی کردیا۔ جب کہ رانا اور راہی کے گلاسوں میں آخری ڈبل پیگ باقی تھے۔ چشتی صاحب نے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے غلیظ گاڑھے پانی کو آستین کے کف سے صاف کرتے ہوئے کسی ندیدے بچے کی طرح رانا اور راہی کے گلاسوں کی طرف دیکھا اور اپنے خالی گلاس کو پانی سے آدھا بھر کر راہی کی طرف بڑھایا اور لڑکھڑاتی زبان سے تحکمانہ لہجے میں حسن طلب کا قابل داد مظاہرہ کیا۔

"راہی! اس پانی کا رنگ بدل دو۔"

راہی نے نشے سے اپنے سینے پر جھکایا ہوا سر اٹھا کر نیم باز آنکھوں سے چشتی بابا کے گلاس کو دیکھا اور اپنا پیگ اٹھا کر گلاس میں انڈیل دیا لیکن چشتی صاحب کے ہاتھ بڑھانے سے پیشتر ہی گلاس اٹھا کر منہ سے لگالیا اور غٹاغٹ چڑھانے لگا۔ چشتی صاحب چیخ اٹھے۔

"ارے ظالم۔ تڑکا لگانے کے لیے چند قطرے چھوڑ دو۔"

گلاس راہی کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹیبل پر گرا۔ گلاس کی باقی شراب زمین کا رزق بن گئی۔ تلچھٹ تک باقی نہ بچی۔ شاید رند تشنہ لب کی نظر لگ گئی۔

"سلطنت" ابھی زیرِ تکمیل تھی کہ فلمساز باری ملک نے خلیل قیصر کو ایک پنجابی فلم بنانے کے لیے ہدایت کار منتخب کرلیا۔ خلیل قیصر سے گاڑھی دوستی فلم سردار کے زمانے میں ہوئی تھی۔ جس کا اسکرپٹ عزیز میرٹھی نے تحریر کیا تھا اور وہ معاون ہدایت کار تھا۔ خلیل قیصر نے عزیز میرٹھی سے کہانی لکھنے کے لیے کہا تو وہ شش و پنج کا شکار ہوگیا۔ کیونکہ اسے پنجابی کہانی لکھنے کا تجربہ بالکل نہیں تھا۔ اس نے اپنی معذوری کا اظہار کیا تو خلیل قیصر نے کہا۔ "یار اسکرین پلے کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ ایک اچھی کہانی اور بے عیب منظر نامے کے مکالمے اردو میں لکھ دو تو وہ اردو فلم بن جائے گی اور اس کے مکالمے پنجابی میں لکھ دو تو وہ پنجابی فلم بن جائے گی۔ تم مجھے ایک اچھا اسکرپٹ لکھ دو۔ مکالمے میں حزیں قادری یا احمد راہی سے لکھواؤں گا۔ بات عزیز میرٹھی کی سمجھ میں آگئی اور اس نے "یار بیلی" کا اسکرپٹ مکمل کر کے یونٹ کو سنایا۔ تو سب نے پسند کیا۔ "یار بیلی" کی ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ عزیز میرٹھی نے پہلی بار کسی پنجابی فلم کا رائٹر ہونے کی خوشی میں ذہن پر زور دے کر مشہور کامیڈین ظریف کے لیے ایک گانے کا مکھڑا بھی پنجابی زبان میں بطور مشق تحریر کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ مکھڑا تھا۔ "نکلو آیا جے تیل پھلیل والا۔ عطرو پھچ ادلاں دے میل والا" گیت کے باقی بول وارث لدھیانوی نے تحریر کیے تھے۔

فلم یار بیلی سیٹ کی زینت بن چکی تھی جب ایک روز عزیز میرٹھی پان کھانے کے لیے مشاق پان فروش کی دکان پر کھڑا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور آواز آئی۔ "آداب عرض میرٹھی صاحب۔"

اس نے مڑ کر دیکھا تو پینٹ شرٹ میں ملبوس گلے میں سرخ رنگ کا ریشمی مفلر ڈالے، ایک دوہرے بدن کا ادھیڑ عمر روبرو تھا۔ شام کے وقت بھی اس نے آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ چڑھا رکھا تھا۔ انگلش کٹنگ کے سیاہ چمکدار بالوں میں ٹیڑھی مانگ کر رکھی تھی لیکن بالوں کی جڑوں سے جھانکتی سفیدی درازی عمر کی چغلی کھا رہی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما تھا۔ رنگ سرخی مائل گندمی تھا۔ بھرے بھرے چہرے پر جھریوں کا جال، اس کے عیاش طبع ہونے کی دلیل تھا۔ عزیز نے ان کے آداب عرض کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "آداب! معاف کیجیے میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟"

"مجھے عباس اجمیری کہتے ہیں۔ میں مشہور و معروف چائلڈ اسٹار رتن کمار کا باپ ہوں۔" انہوں نے بڑے فخریہ انداز میں اپنا تعارف کرایا۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔" عزیز نے کہا۔

"برخوردار! میں نے کراچی میں تمہاری فلم "سردار" دیکھی میں اور میرے اہلِ خانہ تمہارے کام سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کے اصرار پر اپنی دوسری فلم کی کہانی تم سے لکھانے کا فیصلہ کیا۔ میں بھی صرف تمہارے نام سے واقف تھا۔ ابھی ابھی ایک شخص سے تمہارا پتا پوچھا تو اس نے دور سے اشارہ کر کے بتایا کہ وہ جو پان کی دکان پر کھڑا ہے۔ کراچی میں بنی میری پہلی فلم "بیداری" بہت کامیاب رہی ہے لیکن لاہور چونکہ فلمسازی کا مرکز ہے۔ چنانچہ میں بھی مستقل طور پر لاہور منتقل ہوگیا ہوں۔" انہوں نے جیب

سے وزیٹنگ کارڈ نکالا اور عزیز کو تھما دیا۔

"یہ میرا پتا ہے۔ تکلیف نہ ہو تو کل یا پرسوں کوئی وقت نکال کر کوٹھی پر آجاؤ تاکہ تفصیل سے بات چیت ہو سکے۔"

سمن آباد مین روڈ پر ایک سبز رنگ کا بنگلا واقع ہے۔ جس کی پیشانی پر ایک گول دائرے میں قصر ملتانی لکھا ہے۔ اجمیری صاحب اسی بنگلے میں اپنے اہل وعیال سمیت مقیم تھے۔ موصوف کی دو بیٹیاں بے حد حسین وجمیل اور تین بیٹے خاصے قبول صورت تھے۔ سب سے بڑا بیٹا سید وزیر علی کرکٹ کا نامور کھلاڑی تھا اور سب سے چھوٹا مشتاق علی نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ منجھلا بیٹا سید نذیر علی عرف رتن کمار، چھوٹی سی عمر میں مدراس کی فلموں "دیوتا" اور "بہت دن ہوئے" اور بمبئی میں "بیجو باورا" اور راج کپور کی آرٹ فلم "بوٹ پالش" میں کلیدی کردار ادا کر کے کافی دولت اور شہرت کما چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں عباس اجمیری کے لیے رتن کمار سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے کم نہ تھا۔ تینوں بھائی بڑے مؤدب، ملنسار اور بااخلاق تھے۔

بہرحال دوسرے روز ہی عزیز میرٹھی قصر ملتانی میں عباس اجمیری صاحب سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ وزیر علی اور رتن کمار بھی موجود تھے۔ پُرتکلف چائے پر گفتگو کے دوران اجمیری صاحب نے ان سے ایک ایسی کہانی کا مطالبہ کیا جس میں رتن کمار کا مرکزی اور کلیدی کردار ہو۔ اس وقت عزیز کے ذہن میں ایسی کوئی کہانی نہ تھی جس میں بارہ تیرہ برس کے لڑکے کو مرکزی کردار دیا جا سکے۔ اس سے پہلے بچوں سے متعلق کوئی فلم بھی اس نے نہ دیکھی نہ ہی پاکستانی فلمی تاریخ میں ایسی کوئی روایت تھی جسے مثال بنا کر غور وفکر کیا جا سکتا۔ ملبوساتی، نیم تاریخی اور فینٹاسی فلمیں تو کئی دیکھی تھیں لیکن کسی میں بھی مرکزی کردار کمسن بچے نہ تھے۔ انہوں نے اسے "بوٹ پالش" کی کہانی بھی سنائی جو واقعی بڑی دلچسپ اور پُراثر تھی لیکن وہ کسی ہندوستانی فلم کی بابت سوچنا تو درکنار نام تک سننا گوارا نہ کرتا تھا۔ وہ عمر بھر ایجاد بندہ اگرچہ گندہ پر عمل پیرا رہا۔ ساتھ ہی اجمیری صاحب کا اصرار یہ بھی تھا کہ کہانی میں رتن کمار کا کردار رومانٹک بھی ہو۔ یہ شرط اس کے لیے سب سے کڑی تھی لیکن وہ جلد از جلد اپنے ہونہار بیٹے کو رومانٹک ہیرو کے کردار میں کامیاب اور مقبول عام کرانے کے خواہش مند ہی نہیں، بے چین وبے قرار بھی تھے۔ جب کہ عام تماشائی اس عمر کے بچے کو عشق ومحبت کے معاملات میں ملوث دیکھنے کا نہ تصور کر سکتے تھے اور نہ ہی برداشت۔ بہرحال اس نے ان سے دو چار روز کی مہلت لے لی اور گھر آتے ہی اپنی لائبریری میں آبیٹھا۔ بحرِفکر میں غوطہ زن کھانے پینے سے بے نیاز آدھی رات گزر گئی۔ اے خالق کون ومکاں، دستگیری فرما۔ اس تاریکی میں وہ روشنی دکھا جو گوہرِمقصود حاصل کرنے کے لیے تحریک کا باعث بن سکے۔ بالآخر نماز فجر کی ادائیگی کے ساتھ جائے نماز سمیٹنے سے پہلے حافظے کا جگنو چمک اٹھا۔ جس کی روشنی میں یاد آیا۔ جن دنوں وہ یونانی اساطیری ادب اور ہندو مائیتھالوجی کا بہ نظر غائر مطالعہ کر رہا تھا۔ دو کہانیوں کے موضوع اسے دل سے پسند آئے تھے۔ یونانی دیو مالا سے اس نے وینس دیوی کے بیٹے عشق کے دیوتا کیوپڈ اور حسن کی دیوی سائیکی کے رومان کو منتخب کیا تھا اور ہندو دیو مالا سے شیش ناگ کے دلچسپ موضوع نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس لعل بے بہا کے ہاتھ آتے ہی اس کی بے قراری کو قرار آ گیا۔ وہ بستر پر دراز ہوتے ہی اطمینان وسکون کی گہری نیند سو گیا اور ضرورت سے زیادہ دیر تک سوتا رہا۔ دوسرے روز اس نے اسی متھ کو بنیاد بنا کر مطلوبہ مواد اکٹھا کیا۔ کہانی کے تین اساسی کرداروں شیش ناگ (رتن کمار) ناگ (مس نیلو) اور سپیرا (ساقی) کے اردگرد ایک دلچسپ ودلکش، نظر فریب و حیرت انگیز پلاٹ تشکیل دیا اور مضبوط سیناریو کو برجستہ مکالموں سے مزین کر کے تین ہفتے کی محنت شاقہ اور عرق ریزی کے بعد فلم "ناگن" کا اسکرپٹ مکمل کر کے فلم ساز کے حوالے کر دیا۔ فوراً ہی فلم کی شوٹنگ شروع کر دی گئی۔ فلم چونکہ چھوٹی سی، یعنی صرف گیارہ ہزار فٹ طویل تھی۔ جب کہ عام فلموں کی لمبائی چودہ پندرہ ہزار فٹ سے کم نہیں ہوتی۔ کاسٹ بھی انتہائی مختصر تھی۔ ہدایت کار بھی بے حد محنتی اور اپنے کام سے مخلص تھا۔ پہلی فلم ہونے کی وجہ سے وہ اپنی تمام تر صلاحیت بروئے کار لانے میں کوئی فروگزاشت نہیں کر رہا تھا۔ کیونکہ اس فلم سے اس کا مستقبل وابستہ تھا۔ لہٰذا بہت کم سرمائے سے یعنی صرف ڈیڑھ لاکھ روپے اور بہت کم وقت پانچ ماہ کے قلیل عرصے میں تکمیل کے مراحل سے گزر کر نمائش کے لیے پیش کی گئی تو اس معمولی فلم "ناگن" نے خیبر کے پہاڑوں سے لے کر کراچی کے سمندروں تک کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ کئی فلمی پرچوں اور روزناموں کے علاوہ بطور خاص پاکستان ٹائمز میں زینو (صفدر برلاس) نے جو پاکستانی فلموں کو ہمیشہ نظر

انداز کرتے تھے۔ فلم پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے دوسری خوبیوں کے علاوہ منظر نامہ اور مکالموں کی خاص طور پر تعریف کی۔ انہوں نے لکھا، اسکرین پلے رائٹر کا کمال یہ ہے کہ اس نے ایک قطعی ناقابلِ یقین اور من گھڑت کہانی کو سو فیصد قابلِ یقین بنا دیا بلکہ انسان کے ازلی اور موذی دشمن سانپ سے تماشائی کے دل میں محبت اور انسانی یعنی سپیرے سے نفرت کے جذبات پیدا کر دیے۔ سانپوں کے جوڑے سے ہمدردی اس لیے کہ وہ محبت کرتے تھے اور سپیرے سے نفرت یوں کہ وہ دولت کی ہوس میں دو پیار کرنے والوں کے درمیان اپنے عبرت ناک انجام تک جدائی کا باعث بنا رہا۔ میرے عزیز دوست منیر نیازی نے کہا۔ ”عزیز! تمہاری اس کہانی میں جدائی کا عنصر فلم کی جان ہے اور جدت وندرت یہ ہے کہ فلم کے پہلے منظر میں ناگ اور ناگن ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں اور گیارہ ہزار فٹ کی فلم میں کہیں آپس میں نہیں ملتے۔ فلم کی دلچسپی پھر بھی قائم رہتی ہے اور جب دونوں ملتے ہیں تو فلم ختم ہو جاتی ہے۔“ پرنسپل عابد علی عابد نے کہا۔ ”ہجر و فراق کا طویل زمانہ بچھڑے محبوب کی تلاش اور جذبہ صادق کی فتح۔ ظالم کی شکست فلم کی روح اور کامیابی کی ضمانت ہے۔“ مشہور ہدایت کار ایم صادق نے فرمایا۔ ”ناگن کے نام سے حال ہی میں ایک کامیاب فلم ہندوستان میں بھی بنی ہے لیکن تمہاری کہانی اس سے ہزار درجے بہتر ہے۔ اس کی کامیابی کی وجہ صرف گانے اور موسیقی ہے جب کہ تمہاری کامیابی کا باعث بے مثال اسکرین پلے اور جاندار مکالمے ہیں۔“

نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود پرانے لوگوں کے ذہن میں آج بھی ناگن کی کہانی، گانے، موسیقی، خلیل قیصر کی ہدایت کاری رتن کمار، مس نیلو اور ساقی کی اداکاری کی یاد تازہ و تابندہ ہے۔

فلم ناگن کی کامیابی نے فلمز حیات کو بیک جست فرش زمیں سے عرش بریں پر پہنچا دیا۔ دولت کی فراوانی اور شہرت کے نشے نے ان سے ٹیکسی کی سواری چھڑوا کر کاروں کا ایک کارواں ترتیب دینے کے قابل بنا دیا۔ جناب اجمیری صاحب، بیگم اجمیری، وزیر علی، مسز وزیر علی، ان کے عزیز کیمرا مین شوکت، رتن کمار، ادارے کی مستقل ہیروئن مس نیلو۔ سب کے لیے ایک ایک کار خریدی گئی۔ ان کے علاوہ پروڈکشن کے لیے ایک کار اور ایک اسٹیشن ویگن ان پر مستزاد۔ رائل پارک میں جس جگہ اداکار اعجاز درانی کا اعجاز سینٹر قائم ہے وہاں کئی کمروں پر مشتمل فلمز حیات کا پروڈکشن آفس قائم کر کے بیک وقت کئی فلمیں شروع کرنے کے لیے خلیل قیصر، ایم جے رانا، رفیق رضوی، رحیم گل اور ریاض احمد (راجو) بحیثیت ہدایت کار سائن کر لیے گئے۔ ”ناگن“ بمبئی کے ایک اثنا عشری مہاجر خاندان پر ابھی بن رہی تھی کہ عزیز میرٹھی کی فلم ”یار بیلی“ بھی نمائش کے لیے پیش ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہو گئی جس کی سبھی دوستوں نے کھل کر داد اور دلی مبارک باد دی لیکن دروغ برگردن راوی۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر احمد راہی نے کسی خوشی کا اظہار کرنے کی بجائے طعن و طنز کا نشانہ بنایا۔ چونکہ سولہ سترہ برس کی پُرخلوص دوستی کے ناطے احمد راہی سے اسے یہ توقع نہیں تھی۔ اس لیے اس نے راوی کے بیان پر یقین نہ کیا لیکن ایک مشترکہ دوست نے بھی تائید کر دی۔

بابا چشتی، ایم جے رانا اور احمد راہی کو فلم یکے والی کی بے مثال کامیابی کا نشہ بھی سوار تھا۔ جو شراب کے نشے سے کچھ کم نہیں ہوتا لیکن ان کی زبان سے ان کا نام کبھی نہ سنا جو فلم کی اصل اساس تھے۔ فلم یکے والی، سعادت منٹو کا ایک مختصر افسانہ تھا جسے اداکار شیخ اقبال نے پھیلا کر ایک خوب صورت اسکرین پلے میں ڈھالا تھا اور یہ کہتے کہتے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا کہ میری فلم کی کمائی سے باری اسٹوڈیو وجود میں آیا۔ نہ کوئی فلم کی بانکی نار اداکارہ مسرت نذیر کا نام لیتا تھا جس کی جاندار و بے باک اداکاری نے فلم کو چار چاند لگا دیے۔ نہ کوئی ظریف کے مزاح کا ذکر کرتا۔ نہ ہدایت کار فلمساز اقبال کشمیری کا نہ ہی کوئی نکو کے مختصر رول میں اس کی پختہ اداکاری کی داد دیتا۔ انقلاب زمانہ ملاحظہ کیجیے اس واقعے کے چند روز بعد فلمز حیات نے ایک ملبوساتی اردو فلم کی کہانی لکھنے کے لیے احمد راہی کو سائن کر لیا اور عزیز میرٹھی کی پنجابی فلم یار بیلی کی کامیابی سے متاثر ہو کر اس سے پنجابی کی کہانی لکھنے کا معاہدہ کر کے ایک معقول رقم ایڈوانس بھی دے دی۔ فلم سازی کا لمبا چوڑا پلان بنانے کے بعد جہاں انہوں نے کئی ہدایت کار اور کئی کہانی نویس انگیج کیے وہیں چوہدری زمان کے اشتراک سے فیروز پور روڈ پر واقع اسکرین اینڈ ساؤنڈ اسٹوڈیوز کا انتظام بھی سنبھال لیا۔ بیک وقت ان کی ایک فلم ”سب چلتا ہے“ نے ڈائریکٹ کر رہے تھے۔ ”نیلوفر“ کو رفیق رضوی اور ”کلرک“ کو خلیل قیصر کے سپرد کیا گیا۔ ایک فلم ”بارات“ کے مصنف ہدایت کار رحیم گل تھے۔ جب کہ عزیز کے حصے

میں ریاض احمد راجو آیا۔ جس کی ہدایت کارانہ صلاحیت صرف یہ تھی کہ وہ عوامی اداکار علاؤالدین کا چھوٹا بھائی تھا۔

فلمز حیات کے دفتر میں بہت سے کمرے تھے۔ عباس اجمیری صاحب کے آفس کے علاوہ ہر رائٹر کو الگ کمرا ملا ہوا تھا تاکہ وہ تنہائی میں کسی دوسرے کی مداخلت کے بغیر سکون کی فضا میں یکسوئی سے اپنا تخلیقی کام سرانجام دے سکے۔ اس نے جلد ہی ایک خوب صورت کہانی ''مٹی دیاں موڑتاں'' کا ابتدائی خاکہ سنایا جو سب نے متفقہ طور پر بہت پسند کیا اور جتنی جلد ممکن ہو کہانی کا اسکرین پلے مکمل کرنے کے لیے کہا گیا۔ دوسرے دن سے اس نے سینار یو تحریر کرنا شروع کردیا اور مبادا مشق جرأت کرکے چند مناظر کے پنجابی زبان میں مکالمے بھی مشق نمونہ از کردارے بھگت ڈالے اور جب پورے یونٹ کو ''مٹی دیاں موڑتاں'' کا منظر نامہ ضمنی مکالموں کے ساتھ سنایا تو ہنس ہنس کر سب کے پیٹ میں بل پڑگئے۔ ہنسی سے بے قابو ہو کر وزیر علی کی آنکھوں سے تو آنسو چھلک پڑے اور اسے کہنا پڑا۔ ''عزیز بھائی! پلیز چند منٹ کے لیے رک جائیے۔''

اس کے ساتھ ہی رومانی اور ڈرامائی مکالموں پر بھی کھل کروادی گئی۔ فلم کے تھیم سانگ کا مکھڑا بھی اس نے لکھا جس کے باقی بول احمد راہی نے تحریر کیے تھے۔ مکھڑا تھا

دلاں دیاں کلیاں جن چمن جیاں صورتاں
اینا ں کولوں چنگیاں نے مٹی دیاں مورتاں

شامتِ اعمال جب وہ اسٹاف کو کہانی سنا رہا تھا تو اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ملحقہ کمرے میں احمد راہی ''نیلوفر'' کا کوئی گیت لکھنے میں مصروف ہے۔ عزیز کا انتہائی بلند اور پرجوش طرز بیان اور سامعین کے چھت اڑادینے والے قہقہے راہی کے ذہنی سکون کو پراگندہ اور توجہ کو منتشر کرنے کا باعث بن رہے ہیں۔ اس نے اسکرین پلے ختم کیا تو وزیر علی نے بے ساختہ کہا۔

''واہ...... واہ میرٹھی صاحب! آپ تو پنجابی بھی بہت خوب لکھتے ہیں اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔''

عزیز نے کہا۔ ''وزیر صاحب زبان سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اردو ہو، یا پنجابی عربی ہو یا فارسی، اصل میں لکھنے والے کی کھوپڑی میں کچھ مواد ہو اور تحریر کرنے کا قرینہ اور سلیقہ بس۔ یعنی آپ کے پاس موضوع اور مواد تو ہے مگر لکھنا نہیں آتا تو عبث اور اگر لکھنے پر عبور حاصل ہے لیکن لکھا کیا جائے یہ پتا نہ ہو تو ذہن منقذر تب بھی بات نہیں بنتی۔ گویا موضوع، مواد اور تحریر کرنے کی صلاحیت لازم و ملزوم ہیں۔ چولی دامن کا ساتھ ہے۔''

''کیوں ڈیڈی! اس فلم کے مکالمے بھی عزیز بھائی ہی کیوں نہ لکھیں۔ اس کا معاوضہ ہم ان سے طے کرلیں گے؟''

اس نے عباس اجمیری اور رتن کمار کو مخاطب کرکے ان کی رائے لینا چاہی۔

''ڈن...... ڈن۔'' دونوں نے بیک زبان پر زور تائید کی۔

دفتر عام طور پر چھ بجے بند ہوجایا کرتا تھا۔ وزیر علی رتن کمار اور اجمیری صاحب اسٹوڈیو چلے جاتے مگر عزیز کو اپنی نئی کامیابی کی اتنی خوشی تھی کہ اس نے اسی لمحے سے اسکرپٹ پر کام کرنے کا تہیہ کرلیا اور اجمیری صاحب سے کہا۔ ''میں آج رات گئے تک دفتر میں بیٹھ کر کام کرنا چاہتا ہوں۔''

انہوں نے فرمایا۔ ''کیوں نہیں۔ بڑے شوق سے کرو۔ دفتر بند ہونے کے بعد شکور تمہارے پاس رہے گا۔ سگریٹ، پان، چائے، جس شے کی بھی ضرورت ہو وہ لادے گا۔''

اجمیری صاحب چپراسی کو آرڈر دے کر رخصت ہو گئے۔ شکور نے تمام کمروں کے تالے لگادیے۔ احمد راہی خدا جانے دفتر سے کس وقت چلے گئے تھے۔ اب عزیز اپنے کمرے میں اور کمرے کے باہر شکور اسٹول پر براجمان ہو گیا۔ عزیز نے شکور کو چائے لانے کے لیے کہا اور سگریٹ سلگا کر پہلے منظر کے مکالمے پر غور کرنے لگا۔

احمد راہی اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھنے پر پوری دسترس رکھتے تھے۔ فلمی دنیا میں آنے سے پہلے وہ سویرا جیسے معیاری جریدے کی ادارت بھی سرانجام دے چکے تھے۔ عزیز سے ان کے دوستانہ مراسم سولہ سترہ سال سے قائم تھے۔ وہ بڑے مخلص اور وضع دار انسان تھے۔ انہیں نام و نمود کی ہوس بھی نہیں تھی۔ روپے پیسے کی طرف سے بھی بڑے بے نیاز واقع ہوئے تھے۔ کم گو اور لیے دیئے رہتے تھے۔ ان کی زبان سے کبھی کسی کی برائی بھی نہیں سنی تھی۔ ابتدائی زمانے میں عزیز کو جتنی پنجابی فلمیں لکھنے کا موقع ملا سب کے مکالمے اور گانے، انہوں نے ہی تحریر کیے تھے مگر برا ہو اس شراب خانہ خراب کا جس نے...... ان کے ذہن پر پوری طرح غلبہ پالیا۔ رات کے بارہ بجے ہوں

گے۔ شکور چائے اور سگریٹ لینے کے لیے گیا ہوا تھا اور عزیز سر تھامے ہاتھ میں قلم پکڑے ایک مکالمہ سوچنے میں غرق تھا کہ کسی نے سلطان راہی کے انداز میں ٹھوکر ماری اور ایک دھماکے سے دروازہ کھل گیا۔ عزیز نے چونک کر دیکھا احمد راہی نشے میں دھت دونوں بازوؤں سے چوکھٹ کا سہارا لیے ڈول رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خونی کبوتر کی طرح سرخ تھیں۔ جن میں خلافِ معمول شدید نفرت اور غصے کی تپش نمایاں تھی۔ وہ اپنے چہرے پر نشے کا نقاب چڑھا کر عزیز سے دست و گریبان ہونے آیا تھا۔ عزیز نے سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آیئے آیئے راہی صاحب اس وقت آپ شاید ڈیرے سے......''

وہ عزیز کی بات کاٹ کر دہاڑا۔ ''اوئے...... عزیز میرٹھی میرے مدھوں بر کی کھونا دیں...... اوئے میرے ڈھڈ تے مت مارنا ایں۔''

''مگر یار راہی۔''

''یک نہ اوئے یار مار!'' اس کی زبان میں لکنت اور لڑکھڑاہٹ تھی۔

''اس وقت تم نشے میں...... اس لیے میں......''

''اوئے یوپی دے تلنگر۔ تیرے پیو نے کدی پنجابی لخی سی؟''

اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے کہا۔ ''تمہارے باپ نے کبھی اردو لکھی تھی؟'' اس دوران میں اس نے دہلیز سے دو قدم آگے آکر کرسی کا سہارا لے لیا تھا۔

''اوئے میرے پیو بن کر پہنچنا ایں کمینیا۔'' کہہ کر کرسی اٹھا کر عزیز کو ماری۔ وہ تو بچ گیا لیکن راہی لڑکھڑا کر منہ کے بل فرش پر جا گرا۔ نشے کی وجہ سے خود کو سنبھال نہ سکا عزیز تیزی سے کرسی سے اٹھا۔ لپک کر آگے بڑھا اور فرش پر پڑے بے سدھ بھاری بھرکم وجود کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کا سر عزیز کے سینے سے اس طرح لگا تھا۔ جس طرح رنگ میں باکسر مخالف کی پنچ سے بچنے کے لیے لگاتا ہے گرمیوں کا موسم تھا۔ دونوں نے ململ کے کرتے اور لٹھے کی شلواریں پہنی ہوئی تھیں۔ عزیز نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر پیچھے ہٹایا۔

''ہوش کرو راہی۔ میں بے قصور ہوں۔ یہ گلہ میری بجائے پروڈیوسر سے کرنا چاہیے۔''

''چپ اوئے۔'' چیخ کر اس نے دونوں ہاتھ عزیز کے گریبان پر ڈالے اور کرتے کو گریبان سے لے کر دامن تک چیر کر دو ٹکڑے کر دیئے۔ عزیز نے بھی دونوں ہاتھ استعمال کر کے اس کے کرتے کو اچکن بنا دیا۔ اس کے بعد دونوں گتھم گتھا ہو کر گلی میں آ گئے۔ جہاں شور سن کر رحیم گل وغیرہ بھی نکل آئے۔ سمیع دہلوی کہیں سے لوٹ رہے تھے شور سن کر ادھر چلے آئے۔ نسیم پاپولر کے ماما ارشاد، صدیق ڈسٹری بیوٹر اور گلی کے دوسرے لوگ جمع ہو گئے۔ جنہوں نے راہی کو سمجھا بجھا کر بیچ بچاؤ کرا دیا۔

یہ خبر رائل پارک بلکہ پوری فلم نگری میں جنگل میں لگی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی ذکر تھا۔ دو شریف لکھاریوں، دو دوستوں میں ہاتھا پائی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے گریبان چاک کر ڈالے۔ آغا جی اے گل کے دفتر میں ان کے معاصین، ایس فضلی، ایم ایس ڈار، ولی صاحب، چاچا فضل، نثار اللہ گنڈا پور کے سر، اختر خان کے درمیان اس واقعے پر چٹخارے لے لے کر گرما گرم بحث ہوئی بالآخر بحث کو سمیٹتے ہوئے جناب ایم ایس ڈار نے فرمایا۔ ''عزیز میرٹھی لڑن والا بندہ نئی۔ ایسی گل دی میں گوائی دیناں، ایدے اچ ضرور راہی دی زیادتی ہووے گی۔'' بات رتن کمار، وزیر علی اور عباس اجمیری تک پہنچی تو انہوں نے راہی کو بلا کر کہا۔

''راہی صاحب! ہمیں آپ دونوں کے جھگڑے کی بابت جان کر سخت افسوس اور دکھ ہے۔ آپ جیسے عظیم فنکاروں کو ہاتھا پائی زیب نہیں دیتی۔ اللہ پاک نے آپ کے ہاتھ قلم تھامنے کے لیے بنائے ہیں لاٹھی چلانے کے لیے نہیں بنائے۔ آپ ہماری اردو فلم نیلو فر کی کہانی مکالمے اور نغمات لکھ رہے میرٹھی صاحب کو تو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔'' وزیر علی نے لقمہ دیا۔ رتن سے بھی خاموش نہ رہا گیا۔

''دیکھیے راہی صاحب! اگر میرٹھی صاحب کا پنجابی کہانی لکھنا کوئی جرم ہے تو یہ جرم ہم نے کیا ہے۔ یہ بے قصور ہیں۔''

''بالکل ٹھیک۔'' اجمیری صاحب بولا۔ ''ان سے آپ کا گلہ شکوہ جائز نہیں۔'' کچھ دیر کے لیے کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ جسے احمد راہی نے یہ کہہ کر توڑا۔

''اجمیری صاحب! میں نے دانستہ عزیز سے جھگڑا مول نہیں لیا۔ وہ میرا دوست ہے یہ حماقت مجھ سے نشے کی حالت میں سرزد ہوگئی۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔''

"شاباش! اپنی غلطی کو تسلیم کرلینا بڑے پن کی نشانی ہے۔ کیوں وزیر علی؟"

"بالکل ڈیڈی! رات گئی بات گئی۔"

اور یوں ان باپ بیٹوں نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے گلے سے ملا کر پھر سے ایک جان دو قالب کی زندہ مثال بنا دیا۔

☆......☆

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک معمولی سی غلط فہمی ایک بڑے سانحہ کو جنم دے دیتی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کب کون کہاں ٹھوکر کھا جائے، کوئی نہیں کہہ سکتا۔ یہ اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔ بمبئی فلم نگری میں بھی غلط فہمی کا ایک ایسا ہی واقعہ ہوا تھا جس پر فلمی پنڈتوں نے بہت کچھ لکھا۔ انہی سب رپورٹس کو مدنظر رکھتے ہوئے، اپنے الفاظ کا پیرہن دے کر قارئین کے سامنے ایک ایسی ہی داستان لا رہا ہوں کیونکہ قارئین میں بہت کم ایسے ہوں گے جنہوں نے راج ببر اور سمیتا پاٹل کا نام نہیں سنا ہوگا۔

سمیتا پاٹل نے 28 نومبر کو بیچ کینڈی اسپتال بمبئی میں ایک بچے کو جنم دیا۔ بچہ خوب تندرست تھا۔ بچے کو جنم دینے کے اگلے روز سمیتا کا جسم گرم ہونا شروع ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اس بخار کو فلو سمجھا اور فلو کی دوائیں دے دیں لیکن خاطر خواہ اثر نظر نہیں آیا۔ بخار اور اس کی علامات باقی رہیں۔ وقت گزرتا رہا اور 12 دسمبر کی رات اسے اچانک خون کی قے ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ناک سے بھی خون جاری ہو گیا۔ راج ببر اور گھر کے دیگر افراد گھبرا اٹھے۔ اسے سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے لیکن جب دوسری قے ہوئی اور وہ بے دم ہو کر واش بیسن پر ہی گر گئی تو راج ببر نے ایمبولینس کے لیے فون کیا اور اسے لے کر جسلوک اسپتال پہنچ گیا۔

سمیتا گھر میں تھی تو اسے ہوش تھا مگر جب اسپتال پہنچی تو مکمل طور پر بے ہوش ہو چکی تھی۔ اب صرف ناک منہ ہی نہیں کان اور آنکھوں سے بھی خون جاری ہو گیا تھا۔ اسی وقت اسے آئی سی یو کے ایک بیڈ پر لٹا کر 16 ڈاکٹروں کی ٹیم نے اپنی کوشش شروع کر دی تھی۔

مشہور صحافی راز داں لکھتے ہیں۔ یہ خبر مجھ تک پہنچی تو میں بھی جسلوک اسپتال کی جانب دوڑ پڑا۔ میرے ساتھ مہیش بھٹ بھی تھے۔ ہم لوگ بھاگم بھاگ گاڑی سے اتر کر اسپتال کی بلڈنگ میں داخل ہوئے تو لوگوں کا ایک جم غفیر نظر آیا۔ ہر شخص سمیتا کو خون دینا چاہتا تھا۔

سمیتا کا بلڈ گروپ "او" تھا جن لوگوں کا خون اس سے میل کھا گیا انہوں نے اپنے آپ کو خوش قسمت جانا جس کا نہیں ملا اس کے چہرے سے ایسا لگتا تھا جیسے اسے کسی بڑی محرومی نے آگھیرا ہے۔

دوپہر سے رات کے آٹھ بجے تک کا وقت اسپتال کے لاؤنج میں بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے گزر گیا۔ نہ بھوک نے ستایا نہ پیاس نے پریشان کیا۔ کسی کو کوئی خبر نہ تھی کہ سمیتا کے کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ پوری فلم انڈسٹری موجود تھی لیکن ہر آدمی بے بسی کی مورت بنا ہوا تھا۔ ہر طرف یہی سماں تھا کہ ایک انجان دوسرے انجان سے پوچھ رہا تھا۔ "اب کیا ہوگا؟" طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی ہیں۔ اس کی آنکھوں، ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ رہا ہے۔

اسی دوران میں شیام بینگل اندر سے باہر آئے تو مہیش بھٹ اور میرے سمیت سبھی لوگ ان کی طرف دوڑے کہ تازہ ترین صورتِ حال معلوم ہو سکے۔ انہوں نے بھی ذرا دیر نہ کی اور بولے۔ "سب افواہیں غلط ہیں۔ سب جھوٹ ہے۔ کہیں سے خون نہیں بہہ رہا۔ وہ بالکل نارمل ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

لوگوں کے ساتھ ساتھ ہماری امیدیں بھی ایک مرتبہ پھر بندھ گئی تھیں۔ میں نے سگریٹ سلگائی تھی اور مہیش جب کھڑے کھڑے تھک گیا تو پلر کا سہارا لے کر فرش پر بیٹھ گیا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے لوگوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اب وہ قدرے مطمئن تھے اور پورے لاؤنج میں دو دو تین تین لوگوں کی ٹولیاں بنی ہوئی تھیں۔ کوئی اوندھا لیٹا تھا تو کسی نے بازو موڑ کر اس کا تکیہ بنا لیا تھا۔ کسی نے اپنے ساتھی کی آغوش میں سر ٹیک دیا تھا تو کسی نے اپنے دوست کے کاندھے پر۔ کئی لوگ باہر کی سرد ہواؤں سے ٹھٹھر کر سکڑے بیٹھے تھے۔ تو کئی لوگوں نے دل بہلانے کے لیے شام کے اخبارات کھول لیے تھے جن میں سمیتا کی بیماری کی تفصیلات درج تھیں۔ ماحول میں سگریٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ مگر پھر بھی لوگ گھروں کی طرف جانے کے لیے تیار نہ تھے کہ نا معلوم کب ان کی ضرورت پڑ جائے، گویا اس وقت یہ حصہ اسپتال کا لاؤنج نہیں ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم لگ رہا تھا۔

آٹھ بجے سے کچھ اوپر کا وقت ہوا تو اسپتال کی

انتظامیہ نے لوگوں کی بھیڑ کو باہر نکل جانے پر مجبور کر دیا۔

جاتے جاتے شیشے کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے مڑ کر لاؤنج کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھا تو اب مجھے وہاں سناٹا سا دکھائی دیا۔ موت کا سناٹا۔ دل چاہا کہ اسپتال کی انتظامیہ سے التجا کر کے اپنے اور مہیش کے لیے خصوصی اجازت لے لوں لیکن یہاں ایک میں ہی سمیتا کا قریبی شناسا اور جاننے پہچاننے والا تو نہ تھا یہاں تو ہر شخص سمیتا سے خونی رشتے دار ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا۔ پھر بھلا انتظامیہ مجھے کس طرح سے اجازت دیتی۔

مجبوراً میں اور مہیش سونی کی گاڑی میں بیٹھ کر چل پڑے۔ پھر راستے میں ہی فیصلہ ہوا کہ چونکہ مہندر کپور کا گھر اسپتال کے قریب ہی ہے کیوں نہ وہیں رات بسر کر لی جائے؟ لیکن مہیش کو ایسا کرنا مناسب نہ محسوس ہوا لہٰذا وہ اپنے گھر چلا گیا اور میں مہندر کپور کے گھر ہی ٹھہر گیا جو دور دراز کے واقف کار لوگوں کے لیے انفارمیشن آفس بن گیا تھا۔

اس رات میری آنکھ کچھ ہی دیر کے لیے لگ سکی تھی۔ بار بار برے برے خیالات آتے رہے۔ میں ہر گھنٹے کے بعد اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور اپنے آپ سے پوچھتا تھا۔ ''تو اتنا پریشان کیوں ہے؟'' میں اپنی پریشانی کا جواز بار بار اس ہستی سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہوں جس سے بظاہر میرا کوئی تعلق کبھی نہیں رہا مگر تعلق جڑتا ہی نہیں۔

اپنے ہی خیالات سے تنگ آ کر میں نے کروٹ لی تو میری نظریں سامنے کی دیوار پر لگی گھڑی پر جا ٹھہریں۔ رات کے سناٹے میں گھڑی کی ٹک ٹک ایک عجیب سا سماں پیدا کر رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وقت آگے کی طرف نہیں پیچھے کی طرف پلٹ رہا ہے۔ بہت پیچھے کی طرف...... کئی سال پہلے کی طرف......!

☆......☆

سمیتا کے والد ضلع دھولیا کے رہنے والے تھے اور شروع ہی سے سیاست میں حصہ لیتے تھے۔ سیاست کی چالیں بدلیں تو شیواجی راؤ پاٹل نے بھی اپنا شہر بدل لیا اور پونا آ کر بس گئے۔ اس زمانے میں سانے گرو نامی سیاسی لیڈر سے بہت قریب ہو گئے تھے جن کا تعلق انقلابی تحریکوں سے تھا۔ لہٰذا جب شیواجی ان سے ملے تو خود بھی انقلابی تحریک کے ایک سرگرم کارکن بن گئے اور 1942ء کی ایک تحریک کی ناکامی کے سلسلے میں انہیں گرفتار کر لیا گیا اور عمر قید کی سزا ہو گئی۔

یہ عمر قید 1947ء میں ختم ہوئی تو شیواجی کی ملاقات اچانک ہی ایک لڑکی وِدیا سے ہو گئی۔ وِدیا خوب صورتی میں کسی سے پیچھے نہیں تھی تو حسن اخلاق میں بھی سب سے بڑھ کر تھی۔ مخلص، پُرخلوص اور ملنسار! شیواجی کو وِدیا ایک ہی نظر میں بھا گئی اور وہ اس پر اپنا دل ہار بیٹھے۔ کچھ یہی کیفیت وِدیا کی بھی تھی۔ اس کی سوچیں بھی شیواجی سے آگے نہ بڑھ سکی تھیں۔ رفتہ رفتہ دونوں قریب سے قریب تر آتے چلے گئے اور نتیجہ شادی کی صورت میں برآمد ہوا۔

شیواجی راؤ پاٹل جنہوں نے جیل سے رہا ہونے کے بعد کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تھی یکایک کانگریسی لیڈروں اور ان کی پالیسیوں سے ایسے بدظن ہوئے کہ سدا کے لیے کانگریس کو خیرباد کہہ دیا اور سوشلسٹ حلقے میں شامل ہو گئے۔ اس زمانے میں ان کی معاشی حالت اچھی نہ تھی اور گھر کے اخراجات بھی بڑی مشکل سے پورے ہوتے تھے لیکن فی الحال قسمت کچھ اور ہی چاہتی تھی۔

گھریلو حالات کی روز افزوں گرتی حالت کو محسوس کرتے ہوئے وِدیا نے نرسنگ کورس میں داخلہ لے لیا اور یوں یہ خاندان پونا آ گیا۔

کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند وقت بھی تیزی سے اپنا سفر سمیٹ گیا۔ اب وِدیا پونا کارپوریشن کے زیرِ انتظامی چلنے والے نائیڈو اسپتال کی میڈیکل اسسٹنٹ تھی اور اسی اسپتال میں انیتا، سمیتا اور گیتا نامی لڑکیوں نے وِدیا کی آغوش میں ایک ایک دو دو سال کے وقفے سے جنم لیا تھا۔

کہتے ہیں کہ لڑکی خدا کی رحمت ہوتی ہے اور یہاں تو یک نہ شد تین شد، تین لڑکیاں تھیں پھر بھلا خدا کی رحمت کیوں نہ جوش مارتی۔ ان بیٹیوں کی پیدائش کے فوراً بعد ہی شیواجی راؤ پاٹل نے دوبارہ کانگریس پارٹی جوائن کر لی اور کچھ ہی عرصے بعد انہیں مہاراشٹر کانگریس کا صدر بنا دیا گیا۔

وقت کی رفتار ابھی تک ماند نہیں پڑی تھی۔ پلک جھپکتے ہی کئی سال ہوا ہو گئے۔ شیواجی راؤ پاٹل قسمت کے دھنی بنتے جا رہے تھے اور اب تو انہیں صوبہ مہاراشٹر کا وزیر بنا دیا گیا تھا۔

سمیتا پاٹل نے 17 اکتوبر 1955ء کو جب شیواجی راؤ پاٹل کے گھر میں جنم لیا تھا تو اس گھر کے مالی حالات کچھ اچھے نہ تھے لیکن اس کی پیدائش کے فوراً بعد جس تیزی سے حالات میں تبدیلی رونما ہوئی اسے دیکھ کر شیواجی یہی کہا

کرتے تھے۔ میرے لیے سمیتا کا جنم بہت شبھ (مبارک) ہوا۔ یہ لڑکی بہت بھاگوان (قسمت والی) ہے۔"

سمیتا پاٹل نے جب تعلیم حاصل کرنے والی عمر میں قدم رکھا تو اسے پونا کے ایک بہت مشہور اسکول بھاوے گرلز ہائی اسکول میں داخلہ مل گیا جہاں پڑھائی کا ذریعہ انگریزی تعلیم تھی۔ سمیتا نے بارہویں جماعت تک اسی اسکول میں پڑھا اور پھر گریجویشن کے لیے فرگوسن کالج پونا میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کر دیا۔ تعلیمی میدان میں کسی سے کم نہ ہونے کے باعث اسے یہاں بھی کامیابی ملی اور وہ کالج کی ایک ہونہار طالبہ کہلائی جانے لگی۔ غالباً جب اس کے پتا جی (والد) کو مہاراشٹر کا وزیر بنایا گیا اور انہیں مستقل طور پر بمبئی میں رہائش پذیر ہونا پڑا تو سمیتا کو بھی بمبئی بلا لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سمیتا کی گریجویشن ڈگری پر فرگوسن کالج پونا کا نام نہیں لکھا ہے بلکہ "سینٹ جیوئیر کالج بمبئی" درج ہے۔

کالج سے فراغت کے بعد ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ آگے چل کر کیا کیا جائے کہ تبھی اسے "راشٹریہ سیوا دل" بننے کی اطلاع ملی۔ یہ ایک سیاسی گروہ تھا جس کا ایک ثقافتی دستہ بھی تھا۔ سمیتا نے یہ سوچ کر فارغ اوقات میں کیوں نہ اس دستے میں شمولیت اختیار کر لی جائے۔ پھر فوراً ہی اس نے اس پر عمل بھی کیا اور سب سے پہلے اس نے ثقافتی دستے میں شمولیت اختیار کی۔ اس دستے نے سب سے پہلے "مہاراشٹر درشن" کے عنوان سے ایک پروگرام مرتب کیا جس میں سمیتا پیش پیش تھی۔

اسی دوران میں اسے سوشلسٹ پارٹی کی رکنیت آفر ہوئی تو سمیتا نے یہاں بھی خندہ پیشانی سے کام لیا اور یہی نہیں بلکہ چند دنوں بعد ہی اسے راشٹریہ سیوا دل کی فنی مشیرہ بنا دیا گیا۔

سیوا دل کے ثقافتی دستے کا بنیادی مقصد جگہ جگہ جا کر اپنی ثقافت کا پرچار کرنا تھا۔ اسی مقصد کے تحت اس دستے نے قومی اتحاد کے موضوع پر رقص اور ڈرامے پیش کیے جن میں سمیتا سرفہرست رہی اور اس کا سب سے بڑا اور اہم فائدہ یہ ہوا کہ اسے اداکاری کے فن سے پوری طرح روشناس ہونے کا موقع ملا۔ اس کے بعد سمیتا نے مراٹھی زبان کے ڈرامے "چھن" میں کردار نگاری کی تو اس کے اداکاری کے شوق کو مزید جلا ملی۔ 1970ء کی دہائی میں ان ڈراموں اور رقص سے اس نے خوب شہرت حاصل کی تو اسے ڈاکومینٹری فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھانے کی آفر ہوئی۔ سمیتا کا تو بہت دل تھا کہ بڑھ کر اس آفر کو قبول کر لے، یہ اس کی خوش نصیبی تھی لیکن اس کی ماں ودیا نے اسے اس کی اجازت نہ دی اور یوں مجبوراً سمیتا کو انکار کرنا پڑا۔

1972ء میں سمیتا پاٹل نے بہ حیثیت اناؤنسر بمبئی ٹیلی ویژن سینٹر جوائن کیا تو اس کی شہرت میں "دن دگنی رات چوگنی ترقی" کے مصداق اضافہ ہوا۔ اس شہرت کا سب سے پہلا فائدہ ٹی وی پروڈیوسر کھوپ کر کی نے اٹھایا۔ 1974ء کے زمانے کی بات ہے جب انہوں نے "تیز و مدھم" نامی انگریزی کلاسیکی فلم کے لیے سمیتا کو سائن کیا۔ فلم کامیاب رہی اور سمیتا کی شہرت کی بنیادوں کو مزید مضبوط کر گئی۔ اسی عشرے میں آرٹ فلموں کے پروڈیوسر ڈائریکٹر شیام بینیگل نے اسے فلموں میں اداکاری کا مشورہ دیا تو سمیتا نے اسے سر آنکھوں پر لیا اور اپنی پہلی فلم "بھیگی پلکیں" سائن کر لی۔ یہ فلم ابھی تکمیل کے مراحل ہی میں تھی کہ اسے بچوں کی ایک فلم "چرن داس چور" کی آفر مل گئی۔ ابھی "بھیگی پلکیں" آن سیٹ ہی تھی کہ "چرن داس چور" ریلیز ہو گئی۔ اس فلم میں سمیتا کی اداکاری کو بہت سراہا گیا۔ یہاں تک کہ ٹی وی والوں نے اسے خود ایک سیریز "ابھی نتیری" (اداکارہ) کی کاسٹ میں شامل کر لیا۔

اپنے ذوق اور کام کی سراہنا کو دیکھتے ہوئے سمیتا نے باقاعدہ اداکاری میں تربیت حاصل کرنے کا پروگرام بنایا اور پونا فلم انسٹی ٹیوٹ میں ٹریننگ کے لیے اپلائی کر دیا۔ اسے سمیتا کی بدقسمتی کہا جائے یا کہ خوش نصیبی، پونا انسٹی ٹیوٹ نے سمیتا کی درخواست کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ وہ اداکاری سیکھنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ پونا انسٹی ٹیوٹ کے ذمے دار لوگوں کی اس غیر ذمے داری نے ہی شاید سمیتا کے اندر ایک آتش فشاں بھڑکایا اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ انسٹی ٹیوٹ کا فیصلہ قطعی غلط تھا۔ اس بات کو بہت کم افراد جانتے ہیں اور شاید اس بات کو بھی اپنے کیریئر کے ابتدائی دور میں اس نے فلم "راون" کے لیے گلوکاری بھی کی تھی۔

ان تمام کامیابیوں میں جس چیز نے سمیتا کو سب سے زیادہ شہرت بخشی وہ ٹی وی جیسا پاور فل الیکٹرونک میڈیا ہے۔ کچھ تو یہ بات ناقابل رد ہے کہ الیکٹرونک میڈیا لوگوں کے ذہنوں کو تبدیل کر دیتا ہے اور کچھ یہ کہ سمیتا کا انداز گفتگو اتنا نرالا اور دلکش تھا کہ جس پروگرام کی اناؤنسمنٹ وہ خود کرتی نہ چاہتے ہوئے بھی اس پروگرام کو دیکھنے کو دل

چاہتا۔ بقول خواجہ احمد عباس مرحوم۔

”تقریباً بیس برس پہلے (یعنی 1972ء میں) کا واقعہ ہے کہ ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ دوردرشن پر کیوں نہ آج مراٹھی پروگرام دیکھا جائے۔ ٹی وی آن کیا تو ایک خوب صورت سی، نمکین لڑکی پروگرام سنا رہی تھی۔ مجھے اس کا اندازِ تخاطب بہت پسند آیا۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ”واتمیا“ پروگرام روزانہ دیکھوں گا۔ اس بہانے سے اس لڑکی کی شکل تو نظر آئے گی۔

چھ مہینے گزر گئے۔ اب تو ”واتمیا“ کا پروگرام دیکھنا اپنا معمول ہو گیا۔ میں شروع میں اکیلا تھا پھر کارواں بنتا گیا۔ ”واتمیا“ شروع ہوا اور چوکری کی چوکڑی آکر بیٹھ گی۔ گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی تھی۔

”چھوکری بولتی کیا ہے۔ منہ سے جیسے پھول جھڑ رہے ہوں۔“

”مرہٹی شبد (الفاظ) اس کی زبان سے گویا مدھ (شہد) میں ڈوبے نکلتے ہیں۔“

”ہم کو چاہیے کہ بال ٹھاکرے کو چٹھی لکھیں کہ سمیتا پاٹل کو شیوسینا کا سب سے بڑا انعام دیں۔“

”ارے میں تو کہتا ہوں، مرہٹی بھاشا (زبان) کی بجائے اس بھاشا کا نام ہی سمیتا پاٹل کر دیا جائے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ کون مرہٹی کی مخالفت کرتا ہے۔“

ایک برس تک بات چیت اسی انداز سے ہوتی رہی۔ پھر کوئی اور اناؤنسر آگئی۔ جس لڑکی نے سمیتا کی جگہ لی، نمکین کچھ زیادہ ہی تھی۔ دانت بھی باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ میں نے مرہٹی سیکھنا ہی بند کر دی۔“

”بھیگی پلکیں۔“ آرٹ مووی تھی جسے صرف ایک مخصوص طبقہ پسند کرتا ہے لیکن سمیتا نے اس فلم میں اتنی جم کر اداکاری کی کہ بڑی بڑی ہیروئنوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ یہ فلم انٹرنیشنل فلم فیسٹیول میں مقابلے کے لیے شریک ہوئی تھی اور بین الاقوامی طور پر سراہی گئی تھی۔ سمیتا اس رول میں اتنی فٹ ہوئی کہ اسے آرٹ فلموں کے لیے ہی مخصوص کر دیا گیا۔ لہٰذا اس کے بعد اسے جتنی فلمیں ملیں وہ سب کی سب آرٹ موویز تھیں۔ مثلاً بھومیکا، بازار، چکر، ارتھ، صبح، منتھن، نشانت، منڈی وغیرہ۔ ایسی فلمیں قبول کرنے کے لیے بھی بڑی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ناقد نے بالکل صحیح کہا تھا کہ فلم میں اس قسم کے کردار کے اندر روح پھونکنے کے لیے اپنی روح کی گہرائیوں سے اداکاری کرنا ہوتی ہے اور ایسی اداکاری دکھانے میں فنکار کو ہر بار تھوڑا تھوڑا مرنا پڑتا ہے۔ یہ بات دل کو بھی لگتی ہے کیوں کہ کسی دوسرے کی زندگی ہو بہو جی کر دکھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور پھر ”جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا“ ایسی آرٹسٹک فلموں کی نمائش گنتی کے بڑے شہروں میں ہی ہوا کرتی ہے۔ چھوٹے موٹے شہر، قصبے اور گاؤں ان فلموں سے محروم ہی رہتے ہیں جب کہ ہندوستان اپنے دیہاتوں میں بستا ہے۔ مالی اعتبار سے یہ فلمیں گھاٹے کا سودا ہی رہتی ہیں۔ پروڈیوسر کو فلم پوری کرنے کے بعد بھی ڈسٹری بیوٹر ملنے کی امید کم ہی ہوتی ہے اس لیے فلم، پروڈیوسر کو اکثر پلے سے ہی بنانی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ اپنی فلم کے فنکاروں کو اُجرت بھی کتنی دے سکتا ہے؟

اس کے برعکس کمرشل فلموں میں درختوں کے اردگرد بھاگ دوڑ کر کے ناچتے گاتے ہیرو، ہیروئن کتنی بڑی بڑی رقمیں ڈکار جاتے ہیں۔

سمیتا نے اپنی مختصر فلمی زندگی میں کتنے اعزاز حاصل کیے اور کن کن ملکوں کی طرف سے دعوت پا کر اس نے اپنی اداکاری کے جھنڈے گاڑے۔ ان میں سے بہت سی باتیں آپ کے علم میں ہوں گی۔ میں اپنے اس خراجِ عقیدت میں چند فلموں کے اندر سمیتا کی زبردست اداکاری کا ذکر کرنا چاہوں گا جس نے میرے دل پر نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان فلموں میں جن کرداروں کو سمیتا پاٹل نے زندگی بخشی تھی ان کو نبھانا کسی چوٹی کی اداکارہ کے لیے بھی نہایت کٹھن تھا۔ ایک تو بھارتی فلم انڈسٹری میں اداکارائیں ہی کتنی رہ گئی ہیں۔ ہاں ہیروئنوں کا جیسے سیلاب آیا ہوا ہو۔ جو اپنے سڈول نیم برہنہ جسم کے بل بوتے پر ہیروئن بنی بیٹھی ہیں اور انہیں رول بھی ایسے ہی دیئے جاتے ہیں جو ایک ہیروئن کرے یا دوسری، اس سے فلم میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن سمیتا کی ان فلموں میں جس نہج کی اداکاری کی ضرورت تھی وہ شبانہ اعظمی کو چھوڑ کر آج کی کسی بھی بڑی سے بڑی ہیروئن کے بس کا روگ نہیں تھا۔ پہلے مینا کماری، پھر نرگس کے گزر جانے کے بعد اس طرح کے کرداروں کو زندہ جاوید بنا سکنے والی اداکاراؤں میں وحیدہ رحمٰن اور شرمیلا ٹیگور کا نام لیا جا سکتا ہے لیکن یہ دونوں عمر کے سفر پر کافی آگے نکل چکی ہیں۔ نتیجہ، بے چاری کو فلمی دنیا نے بھی سنجیدگی سے لیا ہی نہیں کہ انہیں اس طرح کے دشوار رول دے کر ان کی صلاحیت

کو پرکھا جا سکتا۔ حالانکہ ان کو موقع ملتا تو ممکن تھا وہ ہمیں مایوس نہ کرتیں۔ نوجوان اداکاراؤں میں صرف سمیتا پاٹل اور شبانہ اعظمی نے سخت ذہنی تناؤ والے ان منفرد کرداروں کو ہندی فلموں میں بڑی کامیابی سے عکاسی کی ہے۔

فلم ”بھومیکا“ ایک مشہور ایکٹریس کی دردناک آپ بیتی پر لکھی ہوئی کتاب سے ماخوذ تھی۔ کتاب میں اس ایکٹریس کو بڑی دلیری کے ساتھ جس جس طرح اسے مالی اور جسمانی دونوں اعتبار سے لوٹا کھسوٹا گیا تھا۔ وہ سب اس نے لاگ لپیٹ کے بغیر لکھ ڈالا تھا۔ ایسا رسوائے زمانہ اور بے باک رول قبول کر کے سمیتا پاٹل نے اپنی جرأت کا ثبوت دیا تھا۔ اس ایکٹریس کی زندگی جس طرح پامال ہوئی تھی اس کا سارا درد اور اس کا سارا غم و غصہ سمیتا نے ”بھومیکا“ میں اتنی کامیابی کے ساتھ اجاگر کیا تھا کہ لگتا ہی نہیں تھا یہ کسی اور کی کہانی ہے۔ دوسرے کی آپ بیتی کو اپنی آپ بیتی بنا کر دکھا دینا سمیتا پاٹل کی اداکاری کا کمال تھا۔

فلم ”بازار“ میں سمیتا پاٹل نے آج کی پڑھی لکھی لیکن کم ہمت نوجوان عورت کا مشکل رول بڑی خوب صورتی کے ساتھ ادا کیا تھا۔ یہ عورت ایک ایسے کھاتے پیتے شخص کے جھانسے میں آ کر اس کے ساتھ رہنے لگتی ہے جو اس سے شادی کر لینے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس عورت کو ایک صحافی دل و جان سے چاہتا ہے اور یہ بھی اس کے پیار کی قدر کرتی ہے لیکن ایک غریب اور سیدھے سادھے صحافی کی آمدنی ہی کتنی ہوتی ہے اس میں اس کا اپنا ہی گزارا مشکل سے ہوتا ہے اپنی محبوبہ کا خرچ وہ کیوں کر سنبھالے گا؟ اس لیے وہ کڑھتا رہتا ہے اور اپنی جھنجلاہٹ دوسروں پر اتارا کرتا ہے۔ آخر اس عورت کے آگے اس مکار آدمی کی پول کھل جاتی ہے اور وہ عورت بغاوت کر کے اسے سخت سست سنا کر اسے چھوڑ کر صحافی کے پاس چلی آتی ہے۔ ایک کمزور اور بے سہارا عورت کا بتدریج ارتقا سمیتا پاٹل نے جس سوجھ بوجھ اور لگن کے ساتھ دکھایا ہے اس سے معاشرے میں عورتوں کے اندر بیدار ہوتی ہوئی خود اعتمادی کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ جس طرح سمیتا پاٹل نے فلم کے کلائمکس میں اس جھانسے باز کو آڑے ہاتھوں لیا ہے ان کی وہ نفرت بھری آنکھیں ایک اکیلی عورت کے غصے سے نہیں دھوکا کھائی ہوئی پوری عورت ذات کے غیض و غضب سے دہک رہی تھیں۔ یہ سمیتا پاٹل کی اداکاری کا کمال تھا۔

”چکر“ کی ہیروئن کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ یہ عورت سیدھی جھونپڑی سے اٹھ کر چلی آ رہی ہے۔ ویسی ہی چال ڈھال، ویسا ہی لب و لہجہ اور وہی حد درجے کی غریبی میں بھی آس کی ایک جھلک لیے۔ حالانکہ کمرشل فلموں میں مفلسی کی چھاپ دکھانے کے لیے ہیروئن کو جو پیوند لگی سوتی ساڑی پہناتے ہیں وہ بھی لانڈری کی دھلی اور کلف لگی ہوتی ہے۔ یہاں غریب سمیتا پاٹل کی ساڑی میں پیوند تو نہیں لگا تھا، ہاں اس کے چہرے پر جو تاثر تھا اس سے اس کی زندگی میں لگے کئی پیوند صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اسے کہتے ہیں عظیم اداکاری! اس سے بھی زیادہ تعریف کی بات یہ ہے کہ سمیتا ایک سابق وزیر کی بیٹی تھی۔ بڑے ناز و نعم میں پلی تھی۔ غریبی کے بارے میں اس نے صرف ناولوں میں ہی پڑھا۔ اس کے باوجود وہ ”چکر“ میں سراسر ایک دکھاری گھاٹن ہی لگتی تھی۔

پھر چکر کے کلائمکس میں جب سمیتا کی جھونپڑی پر بل ڈوزر چلایا جا رہا ہے تو سمیتا کے چہرے پر شدید مایوسی کا جو رنگ تھا اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا گویا زمانے بھر کے گھروں سے اجاڑے ہوئے غریب سوال کر رہے ہوں کہ اب ہم کہاں جائیں؟ مجھے اب تک یاد ہے چکر دیکھ کر اس رات میں سو نہیں سکا تھا۔ سمیتا پاٹل کا وہ ویران آنکھوں سے خلا میں تکتا چہرہ رہ رہ کر میری نگاہوں کے آگے جم جایا کرتا تھا۔

”ارتھ“ میں ایک بیماری کی حد تک مرد پر اپنا اور صرف اپنا ہی حق جتانے والی ایک ایکٹریس کا رول سمیتا پاٹل نے کیا تھا۔ اس کی نفسیاتی الجھنوں کو جس طرح پردے پر سمیتا پاٹل نے پیش کیا، وہ اپنی مثال آپ تھا۔ ایک مرد کو اپنے پیسے کے زور سے خرید کر اس کی بیوی کی زندگی میں زہر گھول دینے کا منفی رول کرنے کو کوئی بھی دوسری ہیروئن تیار نہ تھی لیکن سمیتا پاٹل نے اس انداز سے وہ رول کیا کہ اس ایکٹریس سے نفرت نہیں ہوتی الٹا اس پر ترس آتا ہے۔ بیوی کا رول اس فلم میں شبانہ اعظمی نے کیا تھا اور جس جس سین میں یہ دونوں اعلیٰ پائے کی اداکارائیں آمنے سامنے آئی ہیں وہاں فلم دیکھنے والوں کی چاندی تھی۔ کتنی لاجواب اداکاری تھی دونوں کی ان دو مختلف کرداروں میں۔ لیکن وہاں بھی ایک سین میں اپنی جنونی کیفیت کی انتہا کا اظہار کرتے وقت سمیتا نے جس طرح گلے کے ہار کے بکھرے ہوئے خیالی موتی چنتے رہنے کی اداکاری کی ہے وہاں وہ یقیناً شبانہ پر سبقت لے گئی تھی اور یہ حقیقت بیان کر کے میں شبانہ کی اداکاری میں کمی رہ جانے کی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہوں۔

میں سمیتا کے شبانہ سے تھوڑا سا آگے نکل جانے کی بات کر رہا ہوں۔ جس طرح پچھلی اولمپک دوڑ میں رومانیہ کی لڑکی ایک اور اتھلیٹ سے ایک سیکنڈ کے اعشاریہ صفر صفر ایک سیکنڈ کے وقفے سے آگے نکل گئی تھی۔

''صبح'' میرے خیال میں سمیتا پاٹل کی سب سے زبردست فلم تھی۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ صبح جیسی دوسری فلم دیکھنا اب برسوں تک ہمیں نصیب نہیں ہو سکے گا۔ سمیتا ایک اونچے گھرانے کی بیوی بنی تھی جس کا شوہر ایک مشہور ایڈووکیٹ، جیٹھ ایک اعلیٰ سرجن اور ساس ایک جانی مانی سوشل ورکر تھی۔ سمیتا کو اس فلم میں اولاد کا سکھ بھی ملا ہوا تھا۔ ایک پیاری سی بیٹی تھی اس کی۔ اس پر بھی ایک گھٹن تھی جو اندر ہی اندر سمیتا پاٹل کا دم گھونٹے دے رہی تھی۔ وہ اپنی ایک نجی پہچان، اپنی الگ شناخت چاہتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے کمائے ہوئے نام کے تحت جینے کی بجائے خود اپنے نام اپنے کام کی بدولت پہچانی جانا چاہتی تھی۔

معاشرے میں رہتے ہوئے سمیتا پاٹل کا ایک ایسی عورت کا کردار نبھانا پڑے چیلنج کا کام تھا اور سمیتا پاٹل نے اس قدر گہرے اعتماد اور قدرتی ڈھنگ سے صبح میں اس رول کو ادا کیا ہے جیسے وہ پیدا ہی اسی کے لیے ہوئی تھی۔ جب آخر میں وہ اپنا گھر بار اپنے شوہر اور اپنی بچی تک کو چھوڑ کر اپنی انفرادی شخصیت کی کھوج میں نکل کھڑی ہوتی ہے تو یہ محض ایک کتابی کریکٹر نہیں ایک حد درجہ خود دار عورت کا قدرتی عمل لگتا ہے۔

فلم ''صبح'' کا وہ سین مجھے کبھی نہیں بھولے گا جس میں ایک شخص کمیشن بٹھائے جانے پر سمیتا پاٹل اس عہدے دار کے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہی ہے۔ ایک ایک کر کے ان تمام الزاموں کی تردید کرتے ہوئے اور پورے عملے کے کرپشن کا پردہ فاش کر کے سمیتا پاٹل بیان دیتے دیتے ایک پل کو رکتی ہے اور اس عہدے دار سے اچانک پوچھتی ہے۔

''آپ سن رہے ہیں نا؟'' وہ سوال کیا تو اس نے عہدے دار سے ہی تھا لیکن جس انداز سے سمیتا نے یہ پوچھا تھا اس سے صاف عیاں تھا کہ ہزاروں سال سے پستی چلی آ رہی ایک عورت پورے معاشرے سے یہ سوال کر رہی ہے۔

''آپ سن رہے ہیں نا؟''

بدلے، مار دھاڑ، خون خرابہ، ڈاکوؤں، اسمگلروں اور بے ایمان لوگوں کی فالتو اور بے جان کہانیوں پر بننے والی ہندی فلموں کے اس ویرانے میں سمیتا پاٹل ایک پھول بن کر کھلی تھی جس نے اپنے رنگ و بو سے دیکھنے والوں کو مسحور کر دیا تھا۔

☆......☆

راج ببر جب فلم انڈسٹری میں آیا تھا تو ان دنوں ایسے آرٹسٹوں کی کمی تھی جو ہیرو کے رول میں ولن اور ولن کے رول میں ہیرو کے اداکارانہ جوہر دکھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اتفاق سے راج ببر اس معیار پر پورا اترا تھا۔ چہرے پر ہیرو جیسی سادگی اور وجاہت بھی تھی اور تیور میں ولن کی سی تیزی اور تندی بھی۔ بی آر چوپڑہ نے اس کی اسی انفرادیت اور دوہری شخصیت کو بخوبی ایکسپلائٹ کیا اور اپنی فلم ''انصاف کا ترازو'' میں ثابت کر دیا کہ وہ ایک آرٹسٹ پردے پر پیش کر کے فلم بینوں کو سسپنس میں ڈالنے کا ہنر جانتے ہیں۔

''بھیگی پلکیں'' راج کی سمیتا کے ساتھ پہلی فلم تھی اور اسی فلم کی شوٹنگ کے دوران میں ان دونوں کا آپسی تعارف بھی ہوا تھا۔ ان دونوں کی یہ پہلی ملاقات بہت دلچسپ تھی۔ فلم کا یونٹ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے اڑیسہ گیا ہوا تھا۔ راج ببر اور سمیتا پاٹل کو 3 مارچ 1980ء کو لوکیشن پر پہنچنا تھا۔ سمیتا تو 3 مارچ کو ہی وہاں پہنچ گئی تھی لیکن راج ببر ''ہم پانچ'' کی شوٹنگ میں پھنس کر لیٹ ہو گیا اور چار پانچ دن بعد یعنی 4 مارچ کو لوکیشن پر پہنچا تھا۔ جب راج ببر کو وہاں پہنچتے ہی پروڈیوسر نے یہ بتایا کہ سمیتا اس کے تاخیر سے آنے کے سبب بہت ناراض ہے اور تین دن سے ہی یہ رٹ لگائے ہوئے ہے کہ جب ہیرو نہیں پہنچا تو اسے کیوں بلا لیا گیا ہے تو راج کو شرمندگی کا احساس ہوا۔ وہ سیدھا سمیتا پاٹل کے کمرے میں چلا آیا۔ راج ببر نے اس روز کھادی کا لمبا سا کرتہ اور پاجامہ پہنے ہوئے تھا جسے دیکھ کر سمیتا کی آنکھوں میں شوخی کا کوندا سا لپکا تھا۔ وہ اس وقت کھانا کھا رہی تھی۔

راج ببر نے بلا تمہید باندھے ہی کہا۔ ''نمستے! میرا نام راج ببر ہے۔ میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی، سوری۔''

اس پر سمیتا نے جواب دیا۔ ''کیوں؟ آپ کیوں سوری کہیں؟ یہ تو پروڈیوسر کا کام ہے۔''

تب راج نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو برا لگا تو میں اپنی سوری واپس لیتا ہوں۔''

اس پر سمیتا نے مزید کچھ نہیں کہا اور صرف مسکرا کر رہ گئی۔

لیکن بعد میں جیسے جیسے ''بھیگی پلکیں'' کی شوٹنگ آگے

بڑھتی گئی۔ ان کا یہ تعارف دوستی میں بدلتا چلا گیا۔ دوستی کا یہ رشتہ ان دونوں کو یوں بھی قریب لے آیا تھا کہ راج ببر اور سمیتا کی سوچیں ایک ہی جیسی تھیں۔ پھر سمیتا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کے لیے اپنے دل میں بے حد محبت اور احترام کا جذبہ رکھتی تھی۔ چاہے سیٹ پر ڈائریکٹر ہو یا اسپاٹ بوائے جیسا معمولی ورکر۔ اس کی نظر میں ہر انسان محبت اور احترام کا حق دار تھا۔ جن دنوں ''بھیگی پلکیں'' آن سیٹ تھی ان دنوں راج ببر نہ تو کوئی بڑا آرٹسٹ شمار ہوتا تھا اور نہ ہی اس کے پاس دو تین فلموں کے علاوہ کچھ تھا۔ یہ دور اس کے لیے جدوجہد کا دور تھا جب کہ سمیتا آرٹ فلموں کے حوالے سے کامیابی کی شناخت بن گئی تھی اور انڈسٹری میں اسے خاصی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس بڑائی کے باوجود سمیتا نے اپنے آپ کو راج ببر سے بڑا اور اسے چھوٹا آرٹسٹ نہیں سمجھا۔ بلا تکلف اسے کھانے میں شریک کر لینا، ہنسی مذاق کرنا اور دل کی بات کہہ دینا اسے پسند تھا۔ جب راج ببر نے اس کی یہ بے تکلفی اور حسن اخلاق دیکھا تو مقناطیس کی طرح سمیتا کی طرف کھنچتا چلا آیا۔

وقت کے پنچھی نے تیزی سے پرواز بھری تو راج کو یہ محسوس ہوا کہ سمیتا خود اس کی موجودگی اور عدم موجودگی میں اسی کے بارے میں سوچتی رہتی ہے۔ خود اس کا حال بھی اس سے جدا نہ تھا۔ وہ بھی ہر آن اس کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ پھر سمیتا کی یہ کمزوری بھی تھی کہ اسے اپنے جذبات کے ریلے پر قابو پانا نہیں آتا تھا اور ایک مرتبہ اسی کمزوری نے راج ببر پر خاموش محبت کا اظہار کر دیا تھا۔

لیکن اس واقعے سے پہلے میں آپ کو ایک اور بات بھی بتا دوں کہ سمیتا پاٹل کو آرٹ موویز سے کمرشل فلموں میں لانے کا سہرا بھی راج ببر ہی کے سر ہے۔ راج ببر نے ہی سمیتا کو مشورہ دیا کہ وہ کمرشل سنیما بھی سائن کر لے اگرچہ ان مسالا فلموں میں ہیروئن کو کچھ کرنا نہیں پڑتا لیکن یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ کمرشل فلمیں ہی ایک فنکار کو اسٹار کا درجہ دلاتی ہیں۔ ایک طرف تو پیسے کے معاملے میں فنکار مالی حیثیت سے مضبوط تر ہوتا ہے اور دوسرے کمرشل آرٹسٹ کے نام پر آرٹ مووی آسانی سے فروخت ہو جاتی ہے۔ سمیتا کو راج ببر کی یہ بات پسند آئی اور اس نے پہلی کمرشل فلم ''نمک حلال'' سائن کر لی۔ اس کے بعد تو گھنگرو، آج کی آواز، شکتی، عوام، پیٹ پیار اور پاپ، میرا گھر میرے بچے، جواب، تیسرا کنارہ، ہم دو ہمارے دو، مرچ مسالا، تجربہ اور وارث جیسی بڑے بینرز کی فلموں کی لائن لگ گئی۔

یہ 1981ء کی بات ہے جب راج ببر کی فلمیں مسلسل ناکامی سے دوچار ہو رہی تھیں۔ اس وقت اس کا کیریئر غیر یقینی کی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ سمیتا ان دنوں ٹاپ پر تھی اور اسٹار کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس کے باوجود سمیتا، راج ببر کے ساتھ فلمیں سائن کرنے پر زور دیتی تھی مگر راج ببر نئی فلم اسی وقت سائن کرتا جب کہ فلم کی کاسٹ میں سمیتا کا نام شامل نہ ہوتا۔ ایک دن سمیتا کا اتفاق سے راج ببر کا سامنا ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سمیتا نے فوراً اسے پکڑ لیا اور شکایت بھرے لہجے میں بولی۔ ''تم میرے ساتھ فلمیں کیوں نہیں لیتے؟ کیا بات ہے؟ کیا تم میرے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتے؟''

اس پر راج ببر نے جواب دیا۔ ''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میں آپ کے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتا۔ معاملہ صرف یہ ہے کہ آپ ٹاپ پر ہیں، اسٹار بن چکی ہیں جب کہ میں اپنی ترقی کے لیے آپ کو بلندی سے نیچے نہیں کھینچنا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کے کیریئر پر ذرا سی بھی آنچ آئے۔''

یہ سن کر سمیتا کے چہرے کی تازگی ماند پڑ گئی اور اس نے خاموشی سے نیچے نظریں جھکا لیں۔ راج ببر فوری طور پر یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اچانک اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے کچھ لمحے تو معاملے کی تہ تک پہنچنے میں صرف کیے اور جب اچانک سمیتا نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا تو... راج یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ سمیتا کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

''ارے، آ......پ......آپ رونے کیوں لگیں؟''

''کچھ نہیں بس ایسے ہی۔'' سمیتا نے گول مول جواب دیا اور اٹھ کر چلی گئی۔

کچھ دنوں بعد جب اس کی ''چٹ پٹی'' جیسی فلمیں پٹنے لگیں تو وہ خوش ہو کر راج ببر سے بولی۔ ''اب تو میری فلمیں فلاپ ہو رہی ہیں اب تو تم میرے ساتھ کام کر سکتے ہو نا؟''

اس واقعے نے راج کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ سمیتا پر اپنا دل ہار بیٹھا یہی کیفیت سمیتا کی بھی تھی۔

اس کے بعد ان دونوں فنکاروں نے مل کر چھ فلمیں ایک ساتھ سائن کیں۔ ''آج کی آواز'' ان کی پہلی سپر ہٹ فلم تھی۔

سمیتا اور راج ببر کے حوالے سے مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ اس زمانے میں ان دونوں کا افیئر بھی شروع نہیں ہوا تھا اور سمیتا دیو آنند کی فلم ''آنند اور آنند'' میں کام کر رہی تھی۔ اس کی شوٹنگ سے ایک دن قبل اس کا قاصد صبح چھ بجے آیا اور سورج سنیم (اسٹوری رائٹر) سے کہا کہ سمیتا نے اسے جمنی تھیٹر میں طلب کیا ہے جہاں وہ کسی فلم کا ٹرائل دیکھ رہی تھی۔ بقیہ قصہ آپ سورج کی زبانی ہی سنیے۔

اس کی عادت تھی کہ جس فلم میں وہ سمجھتی کہ اس نے اچھا کام کیا ہے وہ سب ہی دوستوں کو دکھاتی۔ میں سمجھا کہ مجھے ٹرائل دیکھنے ہی کے لیے بلایا ہے لیکن جب تک میں وہاں پہنچا ٹرائل ختم ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اور ہم ہوٹل ہی راک میں پہنچ گئے۔ کافی شاپ پر پہنچ کر اس نے آنند اور آنند کے سین میرے سامنے رکھ دیے۔

''میں تو تمہیں اچھا رائٹر سمجھتی تھی۔ یہ سین بھیجے ہیں میرے پاس۔'' وہ برہم لہجے میں بولی۔

میں نے سین پڑھے۔ دیو آنند صاحب کا قاعدہ تھا کہ وہ میرے لکھے ہوئے سینوں کو ڈائریکشن کے حساب سے اپنے رنگ میں ڈھال لیتے تھے۔ یہی انہوں نے اس بار بھی کیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''ٹھیک تو ہیں۔ کیا خرابی ہے؟''

اس نے ایک لفظ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھو، گڑبڑ، بہت گھٹیا لفظ ہے۔ مراٹھی میں اس کے گندے معنی بھی نکالے جاسکتے ہیں۔''

''تو بدل دو۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''واہ! میں کیسے بدل دوں تم بدلو۔''

''کاغذ پر لکھا ہوا لفظ گیتا یا قرآن نہیں ہوتا۔ تمہیں جو اچھا لگتا ہے وہ بول دینا۔''

''اور دیو صاحب؟''

''وہ بھی یہی کہیں گے جو میں کہہ رہا ہوں۔''

''تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے فلمیں بنانا مذاق ہے۔''

''اور تم اس طرح کہہ رہی ہو جیسے یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ سمیتا، فلم بنانا تصویریں اتارنا ہی تو ہے۔ یہ سب کچھ تو ہنسی ہنسی میں بھی ہو سکتا ہے۔ تم اتنی سنجیدہ نہ بنو، جو تم چاہتی ہو وہی ہو جائے گا۔''

وہ حیرت سے میرے چہرے کو دیکھنے لگی۔ اسے اب تک شاید ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا تھا جو فلم کو فن کی ایسی دیوی سمجھتے ہیں جو اپنے پجاریوں سے ان کا خون مانگتی ہے اور یہاں یہ شخص اس دیوی سے فلرٹ کرنے کے لیے کہہ رہا ہے۔ اسے یہ ڈر بھی نہیں لگتا کہ دیوی جان لے سکتی ہے۔

اتنے میں ہوٹل کی ایک کارکن لڑکی میرے پاس یہ اطلاع لے کر آئی کہ میرا فون ہے۔ میں حیران ہو گیا کہ کسی کو میرے یہاں آنے کی اطلاع کیسے ہو گئی۔ خیر فون اٹھایا تو معلوم ہوا کہ جناب راج ببر ہیں۔ اب معما حل ہوا۔

''دیدی (بہن) ہیں؟''

''کون دیدی؟''

''سمیتا پاٹل۔''

میں سمیتا کے پاس گیا اور بولا۔ ''تمہارے بھیا کا فون ہے۔''

میری بات سن کر وہ بہت زور سے ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔

دراصل راج ببر نے بہت منتوں مرادوں کے بعد اپنے خاندان میں 22 برس کے بعد لڑکے کے روپ میں جنم لیا تھا۔ یوں اس کی آمد پر پورے خاندان نے خوشیوں کے شادیانے بجائے تھے۔ اپنے بیٹے کی پیدائش پر جتنی خوشی اس کے والد، کشل ببر کو تھی اس سے کئی گنا زیادہ خوشی اس کے دادا کو تھی کہ خاندانی روایات کو آگے بڑھانے کے لیے نام لیوا تو پیدا ہوا۔ راج کو پیار سے بلو پکارا جاتا تھا۔

جیسے جیسے بلو بڑا ہوتا گیا۔ اس کی شرارتوں کا دائرہ بھی پھیلتا گیا۔ پانچ چھ برس کو پہنچتے پہنچتے بلو بلا کا شریر اور ضدی بن چکا تھا۔ وہ جس چیز کو پسند کر لیتا اسے پا کر ہی دم لیتا۔ چاہے کھلونا ہو یا سائیکل، اسے بس چاہیے تو چاہیے۔ چونکہ بلو اپنے دادا کا بہت لاڈلا تھا اس لیے بھی اس کی ہر خواہش آسانی سے پوری ہو جاتی تھی اور ہر شرارت نظر انداز کر دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ایسی ضد کر بیٹھتا تھا کہ جسے پورا کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا لیکن والد اور دادا کے لاڈ پیار نے اس کے دل پر چوٹ نہیں لگنے دی۔

ایک بار اس کے گھر میں ایک رشتے دار ملنے کے لیے آئے۔ وہ اسکوٹر پر آئے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب راج ببر یعنی بلو نویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ راج نے جیسے ہی اسکوٹر دیکھا تو مچل گیا اور اپنے والد سے بولا۔

''آپ ابھی اسے چلائیں۔ میں پیچھے بیٹھوں گا۔'' لیکن اس کے والد کو یہ مشکل درپیش تھی کہ انہیں کسی اور کی چیز کو استعمال کرنا تو دور رہا، چھونا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ان کے لاکھ

سمجھانے بجھانے پر بھی جب راج نہیں مانا تو کشل صاحب نے اسے پیچھے بٹھا کر اسکوٹر چلایا۔ تھوڑی دیر تک اسکوٹر کی سواری ہوگئی تو راج بہت خوش ہوا۔ یہ خوشی شاید سواری کی کم، ضد پوری ہونے کی زیادہ تھی۔

اسکول کا پہلا دن بھی بلو کے لیے کسی تماشے سے کم نہ رہا۔ اسکول جاتے وقت وہ اس بری طرح رونے لگا کہ اس کی دادی کو بھی اس کے ساتھ جانا پڑا۔ کلاس میں ان کے لیے بھی ایک کرسی رکھی گئی اور جب تک اسکول کا وقت ختم نہیں ہوگیا۔ انہیں بلو کے ساتھ ہی کلاس میں بیٹھنا پڑا۔ یہ سلسلہ تین چار دن تک چلا۔ اس کے بعد کہیں جا کر راج نے اکیلے اسکول جانا شروع کیا۔

پڑھائی کے معاملے میں راج میٹرک تک ٹھیک رہا مگر انٹر میں پہنچ کر اسے لیڈری کے شوق نے آ گھیرا۔ آگرہ کے مفید عام انٹر کالج میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ پولیس اسے بھی پکڑ کر لے گئی اور جب یہ خبر گھر پہنچی تو راج کی والدہ بہت گھبرائیں لیکن والد نے انہیں سمجھایا کہ راج کبھی کوئی غلط کام نہیں کرے گا اس لیے انہیں فکر نہیں کرنی چاہیے۔

رات کو جب پولیس نے وارننگ دے کر راج کو چھوڑا اور وہ گھر لوٹا تو ماں کی تشویش دور ہوئی۔

آرٹ اسٹیج اور ایکٹنگ سے راج کے والد کو بھی شروع ہی سے لگاؤ رہا ہے۔ ریلوے میں ملازم ہونے کے بعد جب بھی ریلوے ایسوسی ایشن کی طرف سے ڈرامے پیش کیے جاتے تو کشل صاحب بھی یہ ڈرامے دیکھنے ضرور جاتے اور بلو بھی ان کے ساتھ ہوتا۔ ریلوے ایسوسی ایشن سال میں دو تین بار ایسے ڈرامے پیش کرتی تھی۔ یہ تمام ڈرامے تاریخی ہوتے تھے۔ راج یہ ڈرامے دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ شاید انہی ڈراموں سے اسے ایکٹنگ کی امنگ حاصل ہوئی اور انٹر کالج میں راج نے اپنی زندگی کا پہلا ایک بابی ڈراما پیش کیا۔ اس کی اداکاری کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اس طرح یہ ڈراما راج کے اداکارانہ سفر کا پہلا نشان راہ تھا۔

71-1970ء میں راج نے پنجاب صوبے کی پٹیالہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ راج کے آگرہ چھوڑ کر پٹیالہ جانے کی اصل وجہ اداکاری کی وہ کلاس تھی جس کا اہتمام ان دنوں صرف اسی یونیورسٹی میں کیا گیا تھا۔ اس طرح اداکاری اور ڈراموں سے لگاؤ راج کو پہلی بار گھر سے دور لے گیا اور وہ پٹیالہ میں اکیلا رہنے لگا۔

اداکاری کی کلاس کے جو پروفیسر تھے ان کا اپنا الگ تھیٹر گروپ تھا اور راج ان کے تھیٹر گروپ میں شامل ہوگیا تھا۔ راج کی فنکارانہ زندگی کا یہ پہلا اور بہت اہم پڑاؤ تھا۔ یقیناً فنی مہارت اور خود اعتمادی اس نے اسی گروپ کے ساتھ حاصل کی تھی۔ یوں بھی تین سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کے لیے یہ عرصہ کافی ہوتا ہے۔

1974ء میں راج نے گریجویشن کرلیا اور اس طرح پٹیالہ یونیورسٹی کی اداکاری کی کلاسیں بھی مکمل ہوگئیں لیکن راج ایکٹنگ کو مزید جاری رکھنا چاہتا تھا۔ لہٰذا پٹیالہ کے بعد اس نے اداکارانہ مہارات کی مزید حصول یابی کے لیے نیشنل اسکول آف ڈراما میں داخلہ لے لیا جہاں 1975ء میں اس کی ملاقات نادرہ نامی مسلمان لڑکی سے ہوئی۔ نادرہ کا تعلق ایک بہت معزز و مہذب فیملی سے تھا۔ اس کے والد سجاد ظہیر کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے بانیوں میں سے تھے اور دہلی کی بہت مشہور شخصیت تھے۔ نادرہ کی والدہ معروف ادیبہ اور شاعرہ تھیں۔ ظہیر صاحب کا خاندان اور ان کا ادبی اور ثقافتی پس منظر راج ببر کی روایت پسند فیملی سے یکسر مختلف تھا۔ راج ببر کے والد ریلوے میں معمولی گارڈ تھے اور سارے خاندان کے واحد کفیل تھے۔ وہ تو اس وقت تک راج ببر کے تمام اخراجات اپنی جیب سے پورے کر رہے تھے جب کہ راج نیشنل اسکول آف ڈراما دہلی سے اداکاری کی تربیت حاصل کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں پر مستقبل کے سنہری خواب سجے تھے۔ اس کے برعکس نادرہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی خوش باش لڑکی تھی لیکن ان افراق کے باوجود تربیت کے دوران دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے اور ایک دوجے کے بغیر جینے کا تصور بھی محال سمجھنے لگے۔

اس زمانے میں جب کہ وہ نادرہ سے پیار کرتا تھا اس کی جیب اور پیٹ دونوں خالی رہتے تھے۔ راج ببر اسکول کے ہاسٹل میں ہی رہا کرتا تھا۔ یوں وہ ایک امیر زادی کے ناز نخرے برداشت نہیں کرسکتا تھا اور خود یہ کہتا تھا کہ بھئی وہ ٹھہری اردو بولنے والی بیٹی اور ہم ٹھہرے پنجابی بولنے والے باپ کے گنوار بیٹے۔ ہم تو ان سے ڈرتے ہیں۔ لیکن نادرہ کی بے تکلفی اور بے پروائی نے جلد ہی اس کا خوف ختم کرادیا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ نادرہ حقیقت میں ببر کو چاہنے لگی تھی اور جب دونوں کسی ڈرامے کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے تو ببر کو نادرہ کی حد درجہ جذباتیت کا علم ہو

گیا اور وہ بھی بے خوف و خطر اس کے پیار میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

نادرہ کا اپنا ایک ڈراما گروپ بھی تھا ”ایک جٹ“ اس گروپ کے ہر ڈرامے میں نادرہ اور ببر ساتھ ساتھ کام کرتے تھے۔ اس بنا پر بھی دونوں کو قریب آنے کا بھرپور موقع ملا۔ نادرہ ہدایت دیا کرتی تھی اور راج ببر لیڈنگ رول کیا کرتا تھا۔ یوں جو حوصلہ پٹیالہ یونیورسٹی کے دوران میں ملا تھا اب دہلی آکر اس میں مزید پختگی پیدا ہو گئی تھی۔

نادرہ نے راج ببر کی ہر طرح سے مدد کی۔ پیسا، آرام اور آسائش پا کر راج ببر پھولے نہ سمایا اور اس نے بہتر اور تابناک مستقبل کے لیے اپنی جدوجہد میں تیزی پیدا کر لی۔ آل انڈیا ریڈیو، دہلی دور درشن، نیشنل اسکول آف آرٹ، کالج، اسٹیج اور عام زندگی میں اسے نادرہ کی کرم نوازیوں کی بدولت ہی ہر جگہ کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی۔ اب راج ببر کی اگلی منزل بمبئی فلم انڈسٹری تھی جہاں وہ ایک بڑا فلم اسٹار بننا چاہتا تھا۔ نادرہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ راج ببر نامی گرامی فلم ایکٹر بن جائے تاکہ معاشی طور پر وہ اس کے برابر آسکے۔

1975ء ہی میں راج ببر نے نادرہ سے اپنی شادی کا ذکر والدین کے سامنے کیا لیکن اسی سال صرف تین ماہ پہلے اس کی دادی انتقال کر گئی تھیں۔ گھر والوں نے اسے سمجھایا کہ کم از کم تین ماہ اور رک جائے تاکہ معاشرہ بھی اعتراض نہ کر سکے۔ وہ لوگ نادرہ کے مذہب کی بندش کے روادار نہ تھے کیونکہ زمانے کے ساتھ اس کا خاندان بھی روشن خیالی کی راہ پر چل نکلا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ خاندان میں کچھ عرصہ پہلے ہی موت ہوئی تھی اس لیے انہیں شادی سے باز رہنا تھا پھر راج کے والد دوٹوک الفاظ میں یہ بھی کہہ چکے تھے کہ شادی کے بعد وہ اپنا اور اپنی شریکِ حیات کا خرچہ کس طرح برداشت کر سکے گا لیکن راج نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ کہہ دیا تھا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں، جلد یہ انتظام ہو جائے گا۔ میں نے تین سال تک ایکٹنگ پر ہی گزارا کیا ہے۔

ہوسکتا ہے راج اپنی کچھ مجبوریوں کی وجہ سے شادی کے لیے انتظار نہ کر سکا ہو۔ بہرحال پندرہ بیس دن کے اندر ہی اندر خاندان بھر کو راج ببر کی شادی کی تمام تیاریاں مکمل کرنا پڑیں اور بالآخر ایک دن راج اور نادرہ کی شادی کر دی گئی۔

موروثی امراض

ایسی بیماریوں کی تعداد بہت کم ہے جو صحیح معنوں میں جدی یا موروثی کہلائی جاسکتی ہیں۔ مرگی اور گٹھیا بیشتر آبائی امراض میں شمار کیے جاسکتے ہیں، کچھ اور امراض بھی ہیں جو عام نہیں ہیں مثلاً ایک نوع کا اندھاپن، جس میں دماغ پر بھی برا اثر پڑتا ہے یا معمولی قسم کا یرقان جس کا سبب خون کے سرخ ذرات کا کمزور ہونا ہے۔ علاوہ ازیں اگر آباؤ اجداد کسی مرض کا شکار رہ چکے ہیں تو اولاد میں ان امراض کا مقابلہ یا مدافعت کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ ان امراض میں ایڈز اور تپ دق خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ہڈیوں کی کمزوری اور ان کا آسانی سے ٹوٹ جانا یا پنڈلیوں کی نسوں کا پھول جانا اور ابھر آنا یا آنت اترنے کا مرض بھی خاندانی اثرات پر مبنی ہوتا ہے۔ موروثی امراض اور پیدائشی امراض میں فرق ہے۔

مرسلہ: آفاق عظیم۔ جہلم

1981ء میں راج ببر نے اپنے گھر والوں کو بتایا کہ وہ فلم فیئر یونائیٹڈ پروڈیوسرز ٹیلنٹ ریسرچ کے مقابلے میں شرکت کرنے بمبئی جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے پروڈیوسر، ڈائریکٹر پرکاش مہرہ نے بمبئی بلایا تھا۔ مقابلے کا نتیجہ کیا نکلا اس بات سے درکنار بمبئی پہنچتے ہی راج ببر کو ”انصاف کا ترازو“ کی آفر مل گئی۔ یہ فلم نا صرف کامیاب رہی بلکہ اس نے راج ببر کی جدوجہد بھی ختم کر دی اور اب وہ اسٹار کے درجے پر ایک ہی جست میں پہنچ چکا تھا۔

یہ خبر نادرہ کے لیے بھی بہت زیادہ خوشی کا باعث تھی۔ وہ اپنی بیٹی جوہی کو لے کر فوراً بمبئی روانہ ہو گئی تاکہ وہاں ایک نیا گھر قائم کر سکے۔ وہی چھوٹا سا گھر جو راج اور نادرہ کے خوابوں میں برسوں سے بسا ہوا تھا۔

راج ببر کی ایک ہی فلم نے اسے مستحکم کر دیا تھا۔ اس کے بعد تو گویا اس کے پاس فلموں کی لائن لگ گئی۔ ہر

پروڈیوسر اسے ہاتھوں ہاتھ لینا چاہتا تھا۔
ادھر نادرہ نے گھر سیٹ کرلیا اور ایک مرتبہ پھر اپنا ڈراما گروپ "ایک جٹ" نئے سرے سے تشکیل دینے لگی۔ اس طرح دونوں میاں بیوی الگ الگ راہوں پر اپنی اپنی منزل کی تلاش میں نکل پڑے۔ اب بہت کم وقت وہ ایک ساتھ گزار پاتے تھے۔ نادرہ اپنے ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف رہنے لگی اور راج فلموں کا سپر اسٹار بننے کے لیے جدوجہد کرنے لگا۔ نادرہ نا صرف اپنے ڈرامے خود ڈائریکٹ کرتی تھی بلکہ مالی تعاون اور بعض ڈراموں میں موسیقی بھی خود ہی ترتیب دینے لگی۔ اس طرح وہ راج ببر پر زیادہ توجہ نہ دے سکی۔

پھر ایک وقت یہ بھی آیا کہ دہلی اسٹیج والے راج ببر اور نادرہ کی تلاش میں بمبئی جا پہنچے۔ راج ببر کو وہ ہر طرح سے سپورٹ کرنے کے لیے تیار تھے اور منہ مانگی رقم بھی خرچ کرنے پر تیار تھے۔ نادرہ تو خیر دہلی اسٹیج کو وقت نہ دے سکی لیکن راج ببر اپنی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسٹیج ڈرامے کرنے لگا۔ ایک اسٹیج ڈرامے کے دوران ہی اس کی سمیتا پاٹل سے سرسری ملاقات ہوئی تھی لیکن اتنی موثر نہ تھی کہ راج ببر اس ملاقات کے حوالے سے سمیتا کو یاد رکھ پاتا مگر جیسے جیسے راج ببر فلموں میں کامیاب ہوتا گیا سمیتا پاٹل سے بھی اسے واقفیت حاصل ہوتی گئی اور بالآخر راج اور سمیتا کے عشقیہ چرچے عام ہونے لگے۔

یہ چرچے جب عام ہوئے اور نادرہ کے کانوں تک پہنچے تو اس نے یہی سمجھا کہ یہ محض پریس پروپیگنڈہ ہے۔ حقیقتاً کچھ زیادہ ہی اسے راج پر اعتماد تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ راج ببر نے نادرہ کے استفسار پر بھی اس حقیقت کو پریس پروپیگنڈے کا نام دیا ہو۔

سمیتا پاٹل پر یہ حقیقت عیاں تھی کہ راج ببر نا صرف پہلے سے شادی شدہ ہے بلکہ اس کے دو بچے بھی ہیں لیکن وہ دل کے ہاتھوں اتنی مجبور تھی کہ اس نے اس طرف توجہ ہی نہ دی اس کی وجہ سے ایک عورت کا گھر تباہ و برباد بھی ہوسکتا ہے۔ وہ تو بس آنکھیں موندے راج ببر کو اپنے خوابوں میں بسائے بیٹھی تھی اور ہر طرح سے اس کا حصول چاہتی تھی۔

عین ممکن ہے کہ راج ببر دو عورتوں کے درمیان پھنس کر کوئی مصلحت چاہتا ہو لیکن جذبات کی رو میں بہہ کر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ سمیتا پاٹل سے دوسری شادی کرلی جائے اور بالآخر اس نے ایسا ہی کیا۔

سمیتا پاٹل اور راج ببر نے 17 مارچ ۔۔۔۔۔۔ کو کلکتہ میں شادی کرلی۔

اس شادی کو ابتدا میں خفیہ رکھا گیا تھا۔ کلکتہ ہی میں شادی کرنے کو ترجیح اس لیے دی تھی کہ وہاں راج ببر کے خاندانی گرو رہتے تھے اور ان کے آشیرواد کے سائے تلے ہی راج ببر دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔

شادی کے بعد سمیتا راج ببر کو "بابا" کہہ کر پکارتی تھی اور راج ببر اسے صرف "با" کہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ سمیتا پاٹل اور راج ببر نے بھی بہت چاہا کہ ان کی یہ شادی خفیہ رہے لیکن چاہنے کے باوجود بھی وہ دنیا کی نظروں سے اس نئے رشتے کو چھپا نہ سکے اور جب رسائل واخبارات نے ان کی شادی کی خبریں شائع کرنا شروع کیں تو سمیتا اور راج نے بھی اعتراف کرلیا۔

نادرہ قطعی طور پر اس اندوہناک خبر کو برداشت نہ کر سکی اور اس نے یہی فیصلہ کیا کہ خاموشی سے وہ راج ببر کی زندگی سے نکل جائے۔ اس نے اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لیا اور وارسووا (بمبئی) میں اپنی ایک فیملی کے فلیٹ میں چلی آئی۔ اگرچہ راج ببر خود اس بات کے لیے تیار نہ تھا کہ سمیتا پاٹل کی آمد سے نادرہ گھر چھوڑ کر چلی جائے لیکن فی الحال وہ بھی نادرہ کی ضد کے آگے مجبور تھا۔ سمیتا پاٹل کے لیے تو اس نے پہلے ہی علیحدہ فلیٹ لے لیا تھا۔

کچھ دنوں بعد راضی نامے کی غرض سے راج ببر، نادرہ سے ملنے گیا اور اپنے بیٹے گموری، کی سالگرہ میں بھی اس نے خوشی خوشی حصہ لیا لیکن نادرہ نا تو راج ببر سے طلاق ... لینا چاہتی تھی اور نہ ہی اسے سمیتا پاٹل کی موجودگی منظور تھی۔ وہ تو اندر ہی اندر اپنا درد چھپا کر جینا چاہتی تھی۔ ان تمام باتوں نے راج ببر کی ذہنی حالت متوازن نہ رکھی اور وہ ٹینشن بھرے ماحول میں رہنے پر مجبور ہوگیا۔

ادھر سمیتا پاٹل خود بھی پریشان رہنے لگی اور احساس جرم اسے مارے ڈال رہا تھا مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ اسے بھی تو راج سے پیار تھا۔ پھر بھلا کس طرح اس سے دور رہ سکتی تھی۔ جب راج اس کے ساتھ ہوتا تو وہ بہت خوش، بہت جذباتی رہتی۔ خوشی میں اتنی پُرجوش کہ ان لمحوں میں وہ اپنے اور شوہر کے علاوہ کسی بھی تیسرے کو پسند نہیں کرتی تھی۔ سمیتا پاٹل کے روپ میں وہ کھلے آسمان کی طرح تھی مگر بیوی کے روپ میں اس کی ہمہ گیر شخصیت سمٹ کر بہت ہی مختصر ہوجاتی

تھی۔ سمیتا کے اندر یہ دونوں شخصیتیں ہمیشہ ٹکراتی رہتی تھیں اور اسی ٹکراؤ سے وہ دکھی ہو جاتی تھی۔

سمیتا شادی کے بعد ایک میچور، سلجھی ہوئی عورت بننا چاہتی تھی مگر اس کے مزاج میں اتنا ٹھہراؤ تھا ہی نہیں وہ ایک پنچھی کی طرح اڑان بھرنا چاہتی تھی۔ ایک ایسی اڑان جس کا احساس کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

سمیتا کو اپنا گھر بنانے، سجانے کا بے حد شوق تھا۔ اسی شوق کی تکمیل کی بنا پر راج نے اسے یہ گھر باندرہ میں لے کر دیا تھا جسے دیکھ کر وہ بہت خوش تھی۔ گھر میں کہاں کیا رکھا جائے اور کون سی چیز کس طرح اور کس جگہ بہتر لگے گی اس کا فیصلہ وہ گھنٹوں سوچنے کے بعد کیا کرتی تھی اور یہ باتیں راج ببر نے مجھے خود ایک انٹرویو میں بتائی تھیں جب میں شادی کے بعد اس سے ملا تھا۔ خیر، راج ببر بھی گھر سجانے سنوارنے میں سمیتا کا ہر دم ساتھ دیتا تھا۔ وہ دونوں اپنی ہی زندگی میں اتنا زیادہ مگن تھے کہ خاندان والوں سے بہت کم ملنا جلنا ہوتا تھا۔ راج سسرال بھی بہت کم جایا کرتا تھا۔ اکثر تو وہ بیرونِ ملک ٹور پر رہتے تھے۔

سمیتا نے بہت جلد راج ببر کے خاندان میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ راج ببر کے والدین جو نادرہ کے علاوہ راج کے ساتھ کسی دوسری عورت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ سمیتا کے ساتھ راج کا تعلق گوارا کر چکے تھے۔ سمیتا نے سچ مچ سارے خاندان کا دل جیت لیا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ سمیتا کے لیے راج کے والدین نے نادرہ کو ایک پل کے لیے بھی اپنی نظروں سے ہٹایا ہو۔ راج کے والدین جب بھی بمبئی آتے تھے وہ آسٹر شیل میں نادرہ کے ساتھ ہی رہتے تھے لیکن باندرہ میں سمیتا کے پاس بھی آ کر گھنٹوں بیٹھتے تھے۔

سمیتا نے بیوی بن کر بھی راج کا دل اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ وہ کبھی کوئی خیال، کوئی فیصلہ ایک دوسرے سے الگ ہٹ کر سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ راج رات کو دو تین بجے بھی آؤٹ ڈور سے لوٹتا تو وہ ساری رات ایئرپورٹ پر بیٹھی رہتی تھی۔ مچھر کاٹتے رہتے تھے اور وہ گھنٹوں انتظار کرتے کرتے جھلانے لگتی تھی۔ جب راج پلین سے اتر کر اس سے ملتا تو وہ تناؤ سے بھری ہوتی تھی اور راج ایک بچے کی طرح اسے سنبھالتا تھا۔

پھر جب گھر آ کر راج یہ کہتا تھا کہ تم کیوں میرا انتظار کرتی ہو؟ تو سمیتا جواب دیتی

Baba you desir much more

(تم اس سے زیادہ کے حق دار ہو جتنا میں تمہارے لیے کرتی ہوں) کاش! میں ایسی بیوی بن سکوں جو تمہاری اور صرف تمہاری دیکھ بھال کرے۔ تمہاری ہر چیز کی دیکھ بھال۔

میں راج کو آفرین کہتا ہوں کہ جس نے دو عورتوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ہر فرد کے حقوق ادا کیے ورنہ سمیتا سے شادی کرنے کے بعد نادرہ کا گھر چھوڑ دینا اور علیحدگی اختیار کرنا کوئی چھوٹا واقعہ نہ تھا۔ اس چھوٹے سے واقعے سے اس کا گھر اور یہاں تک کہ اس کی اپنی زندگی بھی تباہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اس نے کمال مہارت سے اپنی زندگی اور گھریلو سکون کو برقرار رکھا۔ ایسی صلاحیت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔

لیکن اس کامیاب کوشش میں صرف راج ببر کو ہی سہرا نہیں باندھا جا سکتا۔ سمیتا بھی اس میں برابر کی شریک تھی۔ وہ ایک تو گھریلو ٹینشن اور پریشانی میں مبتلا تھی اور دوسری طرف فلمی مصروفیات تھکا دینے والی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ خوش رہنا بھی جانتی تھی اور دوسروں کو خوش رکھنا بھی۔ وہ بہت لڑتی تھی۔ بات بات پر جھگڑا شروع کر دیتی تھی لیکن اس لڑائی جھگڑے میں بھی محبت کا ایک پہلو چھپا ہوا ہوتا تھا۔ مثلاً سمیتا اور راج کے بچے کی آمد آمد تھی۔ ایک دن میں اور ارونا ڈیسائی سمیتا کے گھر پہنچے۔ فلم انڈسٹری میں ہڑتال چل رہی تھی اور ہڑتال کا ہیڈ کوارٹر سمیتا کا گھر بنا ہوا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی سمیتا نے پوچھا۔ ”تم نے کالی پٹی بازو پر کیوں نہیں باندھی؟“

میں نے کہا۔ ”میرا دل کالا ہے کیا یہ کافی نہیں؟“

”کیا کیا بکتے رہتے ہو اپنے بارے میں۔ اچھے خاصے شریف آدمی ہو۔ چلو شرافت سے پٹی باندھو۔“ اور میں نے یہی کیا۔

دروازے پر چھوڑنے آئی تو ایک قصہ سنانے لگی۔

”کل کی بات ہے دوپہر کو تھک کر میں بیڈ روم کی طرف گئی اور وہاں جا کر لیٹ گئی۔ راج ببر اور مہیش بھٹ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اچانک بچے کے رونے کی آواز آئی۔ میں نے حیرت سے آس پاس دیکھا پھر اپنے جسم پر نظر ڈالی کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ اتنے میں راج ببر اور مہیش بھاگے بھاگے آئے۔ انہوں نے بھی پہلے ادھر ادھر اور پھر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ میں نے بھی

معصومیت سے ادھر ادھر دیکھا اب ہم تینوں پریشان کہ اگر بچہ ہوا نہیں تو رو کون رہا ہے۔ راج اور کیش بھاگے بھاگے باہر گئے۔ دروازہ کھولا تو نوکرانی اپنی گود میں بچے کو لے کر کھڑی تھی۔ اب راج خوامخواہ نوکرانی پر بگڑے جا رہے تھے۔ ”خبردار! جو اس طرح بچے کو لے کر آئیں تم نے تو ہمارا ہارٹ ہی فیل کر دیا تھا۔“ اس بے چاری کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس کی خطا کیا ہے۔“

قصہ سننے کے بعد جب ہنس چکے تو میں نے کہا۔ ”اچھا سین بنتا ہے۔ اسے میں کسی فلم میں ڈالتا ہوں۔“

”خبردار! تم اسے کسی فلم میں نہیں ڈالو گے۔ شبانہ اعظمی کہیں کے۔“

”میں اور شبانہ اعظمی؟ تمہارا دماغ تو درست ہے؟“

اور کیا، شبانہ کا اپنے میاں سے جھگڑا ہو رہا ہو۔ مارا ماری ہوئی ہو، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں تو اچانک وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اپنا چہرہ دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔ ”اگر فلم میں ایسی سچویشن ہو تو اس میں اپنے چہرے پر میں ایسے ہی ایکسپریشن لاؤں گی۔“

میں لاجواب ہو کر چل دیا۔

تھوڑے ہی دن بعد میں محبوب اسٹوڈیو کے کمپاؤنڈ میں کھڑا تھا کہ سامنے سے کار میں آتی سمیتا پاٹل نظر آئی۔ میں نے دور سے ہی ہاتھ ہلا دیا۔

وہ کار سے نکل کر غصے میں میری طرف بڑھی اور بولی۔ ”اب تمہیں بھی سستی پبلسٹی چاہیے۔ اپنا نام اخباروں میں چھپا ہوا دیکھنے کی خاطر تم بھی گھٹیا حرکتیں کرو گے؟“

”ایسا کیا کیا ہے میں نے؟“

”تم نے دیویانی چوبل سے جا کر نہیں کہا کہ تمہیں حاملہ سمیتا کی تصویریں اچھی نہیں لگتیں؟“

میں نے ڈر کے مارے فوراً اعتراف جرم کر لیا۔ ”کہا تو تھا مگر میں کیا کرتا تصویریں مجھے واقعی اچھی نہیں لگی تھیں مگر اس میں پبلسٹی والی بات کہاں سے آ گئی؟“

”اب اس نے چھاپ دیا ہے یہ سب کچھ تمہارا نام لے کر۔ بے شرم کہیں کے۔“ وہ بگڑتی ہوئی چلی گئی۔

مجھے واقعی دیویانی پر بہت غصہ آیا۔ ذاتی گفتگو کو آرٹیکل کے لیے استعمال کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

میں بھاگا بھاگا گیا۔ ”اسٹار اینڈ اسٹائل“ خریدا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ دیویانی نے آخر کیا کیا ہے۔ دیکھا تو اس کے آرٹیکل میں اس بات کا کہیں ذکر تک نہ تھا۔

کچھ دن بعد میں سمیتا سے ملا تو بولا۔ ”تم نے آرٹیکل والی بات جھوٹ کیوں کہی تھی؟“

وہ بڑے اطمینان سے ہنس کر بولی۔ ”تو تم سے جھگڑا کیسے کرتی؟ کس بات پر کرتی؟“

ایک بار سورج سنیم ایک فلم کی کہانی سنانے اس کے گھر گیا۔ سنانے سے پہلے اس نے کہا۔ ”کہانی بہت بوگس ہے لیکن تم سن لو۔“

وہ کہانی سننے کے بعد بولی۔ ”تم آدمی سچے ہو۔ کہانی واقعی بہت بوگس ہے اور میں بوگس کہانی میں کیوں کام کروں؟“

سورج چلا آیا۔ رول کے لیے ایک اور اداکارہ سائن ہو گئی تو سمیتا بہت حیران ہوئی اور سورج سے کہنے لگی۔ ”وہ لڑکی تو اچھی خاصی سمجھ دار ہے۔ اسے تم نے کیسے منا لیا۔“

سورج بولا۔ ”میں نے اس سے وہی بات کہی تھی جو تم سے کہی تھی لیکن یہ اضافہ کر دیا تھا کہ کہانی تو اچھی نہیں ہے لیکن پروڈیوسر کی ضد ہے کہ یہی بنائے گا لیکن فلم فلور پر نہیں جائے گی۔ تم سائننگ کے پیسے رکھ لو۔ سو وہ مان گئی۔“

”تو یہ بات تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہی تھی؟ تم دوست میرے ہو یا اس کے؟“ لیجیے صاحب جھگڑا پھر شروع ہو گیا۔

فلم ”ٹھکانا“ کے لیے سائن تو وہ بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن اس کے رول کی شوٹنگ بہت بعد میں شروع ہوئی۔ اس نے سیٹ پر ہی مجھے بہت تفصیل سے کہانی سنانے کے لیے کہا۔ کہانی سننے کے بعد اس نے ہمارے باہمی تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے جھگڑا شروع کر دیا۔

”کہانی تو بہت اچھی ہے لیکن میرا رول کوئی خاص نہیں۔ میں تو یہ فلم چھوڑ رہی ہوں۔ خیر آج آ گئی ہوں تو شوٹنگ کیے لیتی ہوں لیکن کل سے نہیں آؤں گی۔“ اس نے مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

اتنے میں اس فلم کا پروڈیوسر راج گرو ور ہماری طرف آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے کہا۔ ”دیکھو سمیتا! راج میں مذاق کی حس بالکل نہیں ہے تم یہی بات کہو گی تو وہ رونا شروع کر دے گا۔ بربادی کی داستانیں لے کر بیٹھ جائے گا۔“

یہ کہہ کر میں اٹھ کر اس طرح سمیتا کے سامنے کھڑا ہو گیا کہ وہ راج کو نظر نہ آئے۔ سمیتا نے مجھے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ہٹو سامنے سے۔ میں واقعی اسے روتا دیکھنا چاہتی ہوں۔“

اب یہ کھیل شروع ہوگیا کہ سمیتا دائیں طرف ہوتی تو میں بھی دائیں طرف ہو جاتا اور وہ بائیں طرف ہوتی تو میں بھی بائیں طرف ہو جاتا۔ راج گروور پریشان ہو کر بولا۔

''یہ کیا تماشا ہے؟''

سمیتا نے اچانک مجھے سامنے سے ہٹایا اور چلائی۔

''راج گروور یہ نہیں چاہتا کہ میں تمہاری رونی صورت دیکھوں لیکن میں کہے دیتی ہوں کہ میں یہ فلم......''

میں نے سمیتا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ہنس دی اور راج گروور رونے سے بچ گئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وقت بہت سے دنوں کی پرواز طے کر گیا اور ایک دن مجھے یہ اطلاع ملی کہ سمیتا نے 28 نومبر 86ء کو بمبئی کے برج کینڈی اسپتال میں ایک چاند جیسے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ سب کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اس خبر نے خوشی سے سرشار کر دیا اور میں سیدھا اسے مبارک باد دینے پہنچ گیا اور بولا۔ ''سمیتا ماں بن کر کیسا محسوس کرتی ہو؟''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''اگر تم عورت ہوتے تو شاید میرے جذبات و احساسات کو زیادہ اچھی طرح محسوس کر سکتے۔ پہلے تو میں نے ماں کے روپ کو صرف دیکھا اور سنا تھا یا اپنی کچھ فلموں میں ماں کا مصنوعی رول کیا تھا لیکن آج اس تجربے سے گزر کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ادھوری عورت تھی اور اب مکمل ہو گئی ہوں۔ ہاں میں ماں بن گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ زمانے بھر کی مسرتیں اور سکون میرے قدموں میں ڈھیر ہو گیا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں کہ اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔''

''کیا تم نے بیٹے ہی کی آرزو کی تھی؟''

کہنے لگی۔ ''راج کو معلوم ہے مجھے بیٹی کی آرزو تھی لیکن بھگوان بہتر جانتا ہے۔''

''فلم ''ڈانس ڈانس'' کے سیٹ پر میں نے تمہیں بڑی دلیری سے ڈانس کرتے دیکھا تھا حالانکہ اس وقت صرف ایک ماہ رہ گیا تھا۔ اتنا بڑا رسک لینے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اب میں اتنی بے پروا بھی نہیں ہوں کہ الٹے سیدھے اسٹیپ لیتی۔ اس ڈانس سے پہلے میں نے اپنی لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ لے لیا تھا۔''

''لیکن میں نے تو سنا تھا کہ تمہیں جڑواں بچوں کی خواہش تھی۔''

وہ میری بات پر زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''او مائی گاڈ! یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟ فی الحال تو مجھے ایک ہی بچے کی تمنا تھی اور وہ مجھے مل گیا۔ یوں بھی میں فیملی پلاننگ پر یقین رکھتی ہوں۔ اگر زندگی رہی تو بھی اپنے بچوں کی تعداد دو سے آگے نہیں بڑھنے دوں گی۔ یعنی ہم دو، ہمارے دو۔''

میں نے بات کا موضوع بدل دیا اور چند لمحوں بعد ہی اٹھ کر واپس آگیا۔

☆......☆

''ٹرن......ٹرن......ٹرن ٹرن۔''

ٹیلی فون کی زوردار آواز نے میرے خیالات کا تانا بانا توڑ دیا اور میں ایک لمحے میں ہی ماضی سے حال میں آ کھڑا ہوا۔ گھبرا کر گھڑی کی طرف نظر ڈالی تو رات کے تین بجنے والے تھے۔ ''اف مائی گاڈ! اتنا سارا وقت آنکھوں ہی آنکھوں میں نکل گیا اور مجھے احساس تک نہ ہوا۔'' میں نے خود کلامی کی اور فون کی طرف بڑھ گیا۔ غالباً مہندر کسی اور کمرے میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔

''ہیلو......کون مہیش! ہاں بولو۔''

''وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔'' وہ غم سے چور لہجے میں اتنا ہی کہہ سکا اور فون کا رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھ پر گویا غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں۔ میں ادھ موا سا ہو گیا۔ سارا وجود بے جان سا محسوس ہوا مجھے قطعی اس بری خبر کی امید نہیں تھی۔ سمیتا جس کے نام کے معنی ہی ''ہولے ہولے مسکراتی ہوئی'' تھے یوں اچانک سب کو بے بس و بے یار و مددگار چھوڑ جائے گی، مجھے گمان بھی نہ تھا۔ اب کیا ہوگا؟ میں کیا کروں؟ کافی دیر تک کچھ سمجھ میں نہ آیا اور گیلی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے ڈالنے کمرے سے اٹیچ باتھ روم میں چلا آیا۔

مہندر کو سوتے سے اٹھا کر اطلاع دی اور سیدھا جسلوک پہنچ گیا۔

اسپتال کا ہر کونا آہ و فغاں کرتے لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہر شخص دہاڑے مار مار کر رو رہا تھا۔ علاقائی پولیس لوگوں کے ہجوم پر کنٹرول کرنے سے قاصر تھی۔ بڑی مشکلوں سے بچتا بچاتا میں لاؤنج میں پہنچا۔ وہ فلمی اداکاروں اور دیگر لوگوں کا جم غفیر تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی ہر دل رو رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ ایسی صورت میں، میں کس سے کیا کہتا اور کیوں کر کہتا۔

ابھی میں دیوانگی کے عالم میں ڈوبا لاؤنج کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ میری نظر جیہ بچن پر پڑی۔ وہ چار چھ لوگوں کے درمیان کھڑی روتے

ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔ میں بھی اسی سمت بڑھ گیا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

درحقیقت نئی دہلی میں کچھ دنوں پہلے ہی ایک طبی کانفرنس ہوئی تھی جس میں شرکت کے لیے دماغ کے امریکی ماہر ڈاکٹر بیٹس دہلی آئے ہوئے تھے۔ چونکہ مرنے سے چند گھنٹے قبل سمیتا کے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا تھا اس لیے ڈاکٹر بیٹس ہی ایسے فرد تھے جن سے اُمید تھی کہ وہ دماغ کو پھر سے چلانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جیہ بچن کے توسط سے ان سے فون پر بات ہوئی اور انہیں فوراً بمبئی آنے پر آمادہ کیا گیا۔ ڈاکٹر بیٹس 13 دسمبر کی رات دہلی سے ساڑھے دس بجے ایئر انڈیا کی فلائٹ سے روانہ ہوئے مگر جہاز دہلی سے تاخیر سے روانہ ہوا اور وہ صبح تین بجے بمبئی پہنچ سکے۔ ان کے بمبئی پہنچنے سے پہلے رات بارہ بج کر چالیس منٹ پر سمیتا پاٹل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گئی۔

بعد ازاں جیہ بچن ہی کی معرفت مجھے معلوم ہوا کہ سمیتا کا بے جان جسم دو بجے کے قریب نائر اسپتال کے بریفلے کرے میں منتقل کر دیا گیا ہے کیوں کہ آخری رسومات کے لیے سمیتا کی دو بہنوں ڈاکٹر انیتا دیش مکھ اور گیتا پاٹل اور بہنوئی جنک جیٹھ ملانی کا انتظار کیا جا رہا ہے جو امریکا میں ہیں۔

☆......☆

دو گھنٹے بعد ہم تمام لوگ نائر اسپتال کے لاؤنج میں پہنچ چکے تھے۔ جن میں سمیتا پاٹل کی میک اپ ڈریسر اور دوست مایا بھی سرفہرست تھی۔ مایا سمیتا پاٹل کے مرنے سے چند گھنٹوں پہلے تک اس کے ساتھ تھی۔ میں نے جب سمیتا کا ذکر اس سے کیا تو وہ کہنے لگی۔ ”12 دسمبر کی شب سمیتا سو رہی تھی کہ بچے نے رونا شروع کر دیا۔ وہ نوکروں کو گھر میں رکھنے کے خلاف تھی لہٰذا اس خیال سے کہ بچے کی آواز سے کہیں راج ببر بے آرام نہ ہو جائے وہ خود ہی اٹھی اور بچے کو گود میں لے کر سلانے کی کوشش کرنے لگی لیکن بچے نے اور زور سے رونا شروع کر دیا جس پر سمیتا کو خیال آیا کہ چونکہ اسے بخار ہے اس لیے بچہ بھی الجھن محسوس کر رہا ہے۔ اس نے بچے کو نرم کپڑے میں لپیٹا اور تھپکنا شروع کر دیا۔ بچہ مطمئن ہو کر سو گیا۔

صبح سمیتا نے راج ببر کو اٹھایا کیوں کہ اس دن راج ببر کو بہت کام ”ہوپ 86 شو“ کے سلسلے میں کرنا تھے۔ اس شام بمبئی کے برلے بورن اسٹیڈیم میں فلمی دنیا کے ورکرز کی امداد کے لیے ہوپ 86 کا زبردست شو منعقد ہونے والا تھا اور راج ببر اس شو کا کنوینر تھا۔

راج کے جانے کے بعد سمیتا نے غسل کرنے اور اپنے بال شیمپو کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے بچے کی پیدائش کے بعد سمیتا کے بال بہت گرنے لگے تھے اور وہ اس سلسلے میں بہت زیادہ متفکر تھی۔ راج ببر اکثر اس کو چھیڑا کرتا تھا کہ اگر تمہارے بال اسی رفتار سے گرتے رہے تو پروڈیوسر تمہیں فلم میں سائن کرنا بند کر دیں گے۔

غسل کے بعد سمیتا کو کچھ تھکن کا احساس ہوا اور جب میں اس سے ملنے آئی تو مجھے وہ بہت ڈپریسڈ محسوس ہوئی پہلے تو اس نے مجھے بھی ساری باتیں بتائیں پھر بولی۔ ”مایا! میرے لیے دعا کرو کہ میں جلد اچھی ہو جاؤں۔“

میں اس کے موڈ سے اچھی طرح واقف تھی لہٰذا میں نے ڈپریشن سمجھتے ہوئے اس سے کہا۔ آخر تم اتنی پریشان کیوں ہو۔ محض معمولی سا بخار ہے جلد اتر جائے گا۔“

پھر میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”یہ گودھرائی کی کیسٹ صرف آدھے گھنٹے کی بنی ہوئی ہے (گودھرائی ایک ہندوستانی رسم ہے جو بچے کی پیدائش سے قبل ہوتی ہے)۔

سمیتا نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے یہ اس وقت مکمل ہو جائے گی جب میرے بچے کے نام رکھنے کی تقریب ہو گی۔“

یہ عجیب بات تھی کہ سمیتا کے بچے کی پیدائش کو پندرہ روز ہو چکے تھے لیکن ابھی تک اس کا نام نہیں رکھا گیا تھا۔ وہ کہتی تھی۔ ”جب تک مجھے کوئی مناسب نام نہیں ملے گا میں نہیں رکھوں گی۔“

اس وقت اس کی کسی سہیلی کا فون آگیا۔ غالباً ان کے درمیان بچہ ہی موضوع بحث تھا کیوں کہ سمیتا نے جواب دیا تھا کہ تم دیکھنا میرا بیٹا بہت بڑا آدمی بنے گا۔

”ساری مائیں ایسا ہی کہتی ہیں۔“ اس کی دوست نے کہا ہوگا۔

”ہاں مگر کس ماں کا چھ دن کا بچہ اتنی معصومیت سے پلکیں جھپکا کر اور گردن موڑ کر دیکھتا ہے؟“ سمیتا نے فوراً ہی پُرجوش ہو کر اپنی سہیلی کو جواب دیا تھا۔

شام ہوتے ہوتے سمیتا خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کرنے لگی۔ اس کے والدین جو ساتھ ہی رہتے تھے انہوں نے سمیتا کی حالت دیکھ کر فیملی ڈاکٹر کو فون کر دیا اور راج ببر کو بھی اطلاع دے دی گئی لیکن فیملی ڈاکٹر کے آنے سے قبل

ہی اسے خون کی الٹی ہوئی اور پھر ناک سے بھی خون آنے لگا۔ راج ببر اور گھر کے سب لوگ گھبرا گئے مگر امید کا دامن کسی نے نہیں چھوڑا تھا۔ اچانک پھرتے ہوئی اور سمیتا کی طبیعت غیر ہونے لگی۔ اسی وقت ایمبولینس منگوائی گئی اور اسے جسلوک اسپتال لے جایا گیا۔ ایمبولینس میں راج ببر، سمیتا، میں اور اس کے والدین بھی تھے۔ سمیتا اس وقت تک ہوش میں تھی اور اس کا سر راج ببر کے بازو پر تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔ ''میری وجہ سے تم شو بھی پورا نہیں کر سکے۔ میں کتنی منحوس ہوں۔ دیکھو نا تم نے اس شو کے لیے رات دن اتنی محنت کی اور میرے سبب تم شو میں بھی شامل نہ ہو سکے۔''

راج ببر نے اسے سمجھایا کہ وہ ایسا نہ سوچے۔ ''بمبئی کے شو میں نہیں گئے تو کیا ہوا، کلکتہ کے شو میں ساتھ ہی چلیں گے۔''

سمیتا نے کہا۔ ''آپ لے چلیں گے مجھے؟''

اور راج ببر نے فوراً جواب دیا۔ ''کیوں نہیں؟''

پھر اچانک راج کا چہرہ دیکھ کر وہ بار بار پوچھنے لگی۔ ''تم اداس کیوں ہو؟''

یہ سمیتا کے آخری الفاظ تھے کیوں کہ اس کے چند لمحوں بعد ہی اس کے ہوش جاتے رہے تھے۔ اس کی ناک اور منہ سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی خون جاری ہو گیا تھا۔

ابھی وہ اتنا ہی کہہ سکی تھی کہ سمیتا کے والد کی چیخوں نے پورے اسپتال کو لرزہ دیا۔ بیک وقت کئی آدمی انہیں مضبوطی سے پکڑے ہوئے برفیلے کمرے سے باہر لا رہے تھے اور وہ ہوش و حواس سے بیگانا ہو کر چلا رہے تھے۔ ''میری بیٹی کو ڈاکٹروں کی غفلت نے مارا ہے، اس کی صحیح تشخیص ہی نہیں ہو سکی، اس کا علاج شروع ہی سے غلط ہوا ہے میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ میں نہیں چھوڑوں گا کسی کو......!''

دراصل اپنے بیٹے کی پیدائش کے بارہویں روز جب سمیتا کو بہت تیز بخار ہو گیا تو ڈاکٹروں نے سمیتا کا خون اور پیشاب ٹیسٹ کرنے کے بعد کہا کہ سمیتا کو فصلی بخار ہے۔ اگر ڈاکٹر فلو کا علاج نہ کر کے سمیتا کو اسی روز اسپتال میں داخل کر لیتے تو شاید یہ حادثہ نہ ہوتا۔ ڈاکٹر دوا تک نہ بدل سکے اور آخر وقت تک سمیتا کو سلائن واٹر کا انجکشن لگاتے رہے لیکن اس کی حالت نازک سے نازک تر ہوتی گئی حالانکہ اسے 22 بوتل خون دیا جا چکا تھا مگر وہ خون جسم قبول نہیں کر رہا تھا اور لوگوں کا عطیہ خون ناک، منہ اور آنکھوں کے ذریعے باہر آ رہا تھا۔

سمیتا کی موت کی وجہ دماغی بخار بتائی گئی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اس بخار کے باعث دماغی نس پھٹ گئی تھی جس سے سمیتا جانبر نہ ہو سکی۔

☆......☆

15 دسمبر 1986ء کی صبح سات بجے سمیتا کے جسدِ خاکی کو کارٹر روڈ باندرہ میں وسنت بلڈنگ کی تیسری منزل پر لے جایا گیا جہاں شادی کے بعد سے وہ راج ببر کے ساتھ رہ رہی تھی۔ سمیتا کو اس کے گھر والوں نے دلہن کی طرح سجایا۔ اسے سنہری بارڈر والی سرخ ساڑی پہنائی گئی۔ ماتھے پر بڑی سی بندیا لگائی، مانگ سیندور سے بھری گئی جس پر سونے کا ٹیکہ آویزاں تھا۔

صبح ساڑھے دس بجے کے قریب سمیتا پاٹل کی ارتھی کو لے جانے والا ٹرک شیواجی پارک کے لیے روانہ ہوا جہاں سمیتا کی ماں اور بہنیں زار و قطار رو رہی تھیں۔ وہیں نادرہ ببر کا بھی برا حال تھا۔ ٹرک میں راج ببر، سمیتا کے والد شیواجی راؤ پاٹل، بہنوئی دیش مکھ اور جیٹھ ملانی، لیش چوپڑا، لیش جوہر اور روی چوپڑا وغیرہ سوار تھے۔ شہر کے مختلف راستوں سے گزرتا ہوا یہ ٹرک ساڑھے گیارہ بجے شیواجی پارک پہنچا جہاں ہزاروں لوگ آخری رسومات میں شرکت کے لیے صبح سویرے ہی سے جمع ہو گئے تھے۔

ہیما مالنی، شبانہ اعظمی، نوتن، پران، پرکاش مہرہ، راج کمار، سنجے دت، فرح، ریکھا، آشا پاریکھ، مہیش بھٹ، آتما رام، راجیش کھنہ، ونود کھنہ، نصیر الدین شاہ، اوم پوری، نمی، ششی کپور، مینا کشی، شمشادری، شیام بینگل، بی آر چوپڑا، راما نند ساگر نے ارتھی پر پھول چڑھائے اور وداع کرنے کے لیے شمشان گھاٹ (وہ جگہ جہاں ہندو رسم کے مطابق مردے کو جلایا جاتا ہے) تک جانے والوں میں سمیتا کے ان دیکھے ہزاروں قدر دانوں کی زبردست بھیڑ میں سماجی اور سیاسی ہستیاں بھی بڑی تعداد میں موجود تھیں۔

دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ راج ببر نے چتا کو آگ دکھا کر سمیتا کو آگ کے شعلوں کے سپرد کر دیا۔ جب چتا کے شعلے بھڑک اٹھے تو پورا شیواجی پارک شمشان گھاٹ سمیتا امر رہے کے نعروں سے گونج اٹھا لیکن یہ نہیں جان پایا کہ کسی کے کہے یہ لفظ کہ بچہ نادرہ کو دے دیا جائے گا۔ دماغی دباؤ کا سبب بن کر زندگی چھین لے گا۔ غلط فہمی کیا کیا نہیں کرا دیتی ہے۔

نومبر کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے گیارہویں مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

قارئین، نومبر گریگورین سال کا گیارھواں مہینا ہے۔ عیسوی تقویم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ماہ و سال کو ناپا جاتا ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ کے سن پیدائش سے متعلق مختلف آرا پائی جاتی ہیں، اس لیے اس کیلنڈر میں وقت کے ساتھ تبدیلیوں ہوتی رہیں۔ سولہویں صدی میں پوپ گریگوری نے اس تقویم میں آخری قابلِ ذکر تبدیلی کی تھی، اسی لیے اسے گریگورین تقویم بھی کہتے ہیں۔ پرانی رومی تقویم میں یہ نواں مہینا ہوتا تھا، نوم (novem) لاطینی زبان میں نو کو کہتے ہیں۔ اسی لیے یہ نومبر کہلایا۔

ہمارے لیے نومبر شعرا کا مہینا ہے۔ اس خطے کے تین عظیم شعرا، جنھوں نے اپنے سماج پر گہرے اثرات مرتب کیے، اسی ماہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلا نام تو سندھ دھرتی کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کا ہے۔ اس خطے کے کونے کونے میں ان کے لازوال گیت سنائی دیتے ہیں۔ اس صوفی کے اشعار نے احکامات خداوندی کو عام فہم مگر پُراثر انداز میں لوگوں تک پہنچایا۔ ”شاہ جو رسالو“ ایک شاہکار ہے۔ سندھ میں قرآن اور حدیث کے بعد شاہ جو رسالو معتبر ترین تصنیف ہے۔ سندھی لوک ساز ایکتارا ان کی ایجاد۔ شاہ لطیف نے 18 نومبر 1689 کو ہالا کے ایک سادات گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ 1752 میں 63 سال کی عمر میں انھوں نے جہان فانی سے کوچ کیا۔ گو ان کے انتقال کو ڈھائی سو سال بیت چکے ہیں، مگر ان کا پیغام آج بھی زندہ ہے۔

اس فہرست میں دوسرا نام شاعر مشرق علامہ اقبال کا ہے۔ پاکستان ان ہی کے خواب کی تعبیر ہے۔ اس عظیم تخلیق کار نے امت مسلمہ میں نئی روح پھونکی۔ وہ فقط ایک فلسفی اور قانون داں نہیں تھے، بلکہ ایسے صوفی تھے، جس نے اسلام کی عملی روایات سے استفادہ کیا۔ وہ 9 نومبر 1877 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ دنیا کی چند بڑی درس گاہوں سے اکتساب فیض کیا۔ سیاست میں قدم رکھنے کے بعد مسلم قومیت کا اصول ان کے سامنے واضح ہورہا تھا۔ الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس وہ تاریخی خطبہ دیا، جو خطبہ الٰہ آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ اقبال ہی کی کوششوں کے طفیل قائداعظم ہندوستان لوٹے اور ان کے خواب نے تحریک پاکستان کی صورت تعبیر کی سمت پیش قدمی شروع کی۔

تیسرا نام ہے فیض احمد فیض کا، جن سے ایک عہد منسوب۔ 13 فروری 1911 کو سیالکوٹ میں پیدا ہونے والے فیض احمد فیض کے کتنے ہی اشعار زبان زد خاص و عام ہوئے، گیتوں میں ڈھل گئے، مظلوم کی پکار بن گئے۔ وہ پکے

کمیونسٹ تھے۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی سہیں۔ ان کی کلیات ''نسخہ ہائے وفا'' کا شمار اردو میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتب میں ہوتا ہے۔ انھیں بین الاقوامی شہرت ملی۔ لینن ایوارڈ سمیت کئی اہم اعزازات سے نوازے گئے۔ مغرب میں انھیں ''نیرودا آف اردو پوئٹری'' کہا جاتا تھا۔ 20 نومبر 1984 کو ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔

اس کے علاوہ ممتاز عالم دین، سید سلیمان ندوی، سب سے پہلے لفظ پاکستان استعمال کرنے والے چوہدری رحمت علی، اردو کے عظیم افسانہ نگار، احمد ندیم قاسمی، خوشبو کی شاعرہ پروین شاکر، منفرد شاعر شکیب جلالی، راجا گدھ جیسے معروف ناول کی مصنفہ بانو قدسیہ، چاکلیٹی ہیرو وحید مراد، پاکستان کے پہلے صدر اسکندر مرزا، پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی کے بانی سجاد ظہیر اور جنرل حمید گل کا تعلق بھی ماہ نومبر ہی سے تھا۔ منفرد شاعر شکیب جلالی کا بھی 32 سال کی عمر میں 12 نومبر 1966 کو انتقال ہوا۔ نظریات کے لیے جان قربان کرنے والے حسن ناصر کو بھی 13 نومبر 1960 کو شہید کیا گیا۔

چلیں، اب اپنی توجہ ان شخصیات پر مرکوز کرتے ہیں جن کا ان صفحات میں اب تک تفصیلی تذکرہ نہیں آیا۔

☆ محمد حسن عسکری

ایک رجحان ساز قلم کار، ایک روایت شکن نقاد، ایک پورا عہد۔ بیسویں صدی کے اردو ادب کی تفہیم انھیں پڑھے بغیر ممکن نہیں۔ انتظار حسین انھیں اردو کا پہلا حقیقی تنقید نگار ٹھہراتے ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ تنقید ہی ہے۔ فکشن نگار بھی وہ باکمال تھے۔ ان کے افسانے ''حرام جادی'' اور ''پھسلن'' اپنے موضوع اور تکنیک کے باعث ماسٹر پیس تصور کیے جاتے ہیں۔ گو انھوں نے فقط گیارہ افسانے لکھے، مگر اردو فکشن پر اپنی چھاپ چھوڑ گئے۔

محمد حسن عسکری 5 نومبر 1919 کو ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ (بعض کتابوں کے مطابق بلند شہر اتر پردیش میں پیدا ہوئے) ان کا تعلق ایک تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ ان کے والد محمد معین الدین ریاست شکارپور کے مالیاتی امور سے متعلق تھے۔ شکارپور ہی کے ایک اسکول سے حسن عسکری نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ہائی اسکول کا مرحلہ بلند شہر سے طے ہوا۔ میرٹھ کالج کے وہ طالب علم رہے۔ پھر 1938ء میں الہ آباد یونیورسٹی کا رخ کیا جس کا شمار ہندوستان کی بڑی درس گاہوں میں ہوتا تھا۔ وہاں کئی نامور اساتذہ سے اکتساب فیض کیا، جن میں ستیش چندر دیب اور فراق گورکھپوری بھی شامل تھے، جنھوں نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہیں سے 1942 میں انگریزی میں ماسٹرز کیا۔

اب وہ دہلی پہنچے۔ یہیں ان کی ادبی زندگی حقیقی معنوں میں شروع ہوئی۔ پہلے پہل انھوں نے افسانے لکھے۔ ان کا شہرہ آفاق افسانہ ''پھسلن'' جریدے ''نیا ادب'' میں 1941 میں چھپا۔ اس کے بعد ان کا فسانہ ''چائے کی پیالی'' منظر عام پر آیا، جس کا خاصا چرچا ہوا۔ 1943 میں ان کے آٹھ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ''جزیرے'' شائع ہوا۔ افسانہ ''حرام جادی'' اسی میں تھا۔ اس مجموعے کا اختتامیہ ایک قابلِ مطالعہ شے تھی، جس میں انھوں نے فکشن سے متعلق اپنی رائے کو بھرپور انداز میں قلم بند کیا۔ ان کی روایت شکن سوچ نے کھلبلی مچا دی۔ یہ مضمون آج بھی متعلقہ ہے۔ دوسرا مجموعہ ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' کا سن اشاعت 1947 تھا۔ یہ ان کے افسانوی سفر کا اختتام تھا۔

تنقید کی سمت بھی رجحان اسی زمانے میں پیدا ہوا۔ مضامین شائع ہوئے، تو لوگوں کو اندازہ ہوا کہ یہ نوجوان افسانہ نگار فکشن پر کتنی گہری نظر رکھتا ہے۔ کرشن چندر اور عظیم بیگ چغتائی پر لکھے ان کے مضامین سے تنقیدی سفر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ادبی جریدے ''ساقی'' سے وابستگی ان کے سفر میں اہم موڑ ثابت ہوئی۔ وہ ہر ماہ ''جھلکیاں'' کے عنوان سے مضامین لکھا کرتے۔ ان کی بصیرت، وسعت اور ذہانت نے سب ہی کو متوجہ کیا۔ البتہ ترقی پسند حلقوں میں ان کے افکار سے بے چینی پھیل گئی۔ ان کی مخالفت شروع ہوگئی، جو آنے والے کئی برس جاری رہی۔ ان کی فکر ترقی پسند نظریات سے متصادم تھی۔

پھر وہ پاکستان آگئے۔ پہلے لاہور میں قیام کیا۔ پھر کراچی پہنچے۔ وہ درس و تدریس سے متعلق رہے۔ یہاں بھی وہ ''جھلکیاں'' کے عنوان سے مضامین لکھتے رہے۔ سلسلہ 50 کی دہائی کے وسط تک چلا۔ انھوں نے پاکستانی ادب کا تصور پیش کیا جو مقبول بھی ہوا اور متنازع بھی ٹھہرا۔ ساتھ ہی تراجم کی جانب بھی خصوصی توجہ دی، جس کے طفیل فلابیئر کے

"مادام بواری" اور ہرمن میلوں کے "موبی ڈک" جیسے شاہکار اردو کے قالب میں ڈھلے۔ انھوں نے استاں دال کے "سرخ وسیاہ" اور والٹیر کے "کاندید" کو بھی کمال مہارت سے اردو روپ دیا۔ اسی زمانے میں تنقیدی مضامین کے مجموعے "انسان اور آدمی" اور "ستارہ یا بادبان" کے نام سے چھپے۔ ایک مجموعہ ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

آخری برسوں میں مذہب کی جانب ان کا رجحان خاصا بڑھ گیا تھا۔ ان کی فکر بھی تبدیل ہوئی۔ تصوف میں ان کی دلچسپی تحریروں سے بھی جھلکنے لگی۔ وہ قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ کررہے تھے کہ لحۂ آخر آن پہنچا۔ 1978 میں کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی حسن عسکری کے فکشن سے متعلق کہتے ہیں۔ "اس کی کہانیاں پڑھتے وقت تمام حواسوں کے دروازے کھلے ہونے چاہییں... اب سے ایک عرصے بعد جب بھی نئے افسانے کے تجزیاتی دور کا تجزیہ کیا جائے گا، محمد حسن عسکری کا نام پیش پیش ہوگا۔"

وقت نے ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ پر تصدیق کی مہر ثبت کردی ہے۔

☆ میرا جی

گو وہ شخص چار عشرے ہی جی سکا، مگر اردو شاعری پر اپنے ان مٹ نقوش چھوڑ گیا۔ انتظار حسین نے اپنے ایک کالم میں انھیں یوں یاد کیا۔ "اردو شاعری میں جدیدیت کو صحیح معنوں میں متعارف کرانے والا اور نظم آزاد کو سب سے بڑھ کر قائم کرنے والا تو وہی ہے۔ کل اِسی شہر لاہور میں اس کے اثر میں شاعروں کا ایک پورا گروہ جدیدیت کے نام پر پروان چڑھا تھا۔ حلقہ ارباب ذوق اسی مکتبہ فکر کی نمائندگی کرتا تھا۔"

یہ کہانی ہے میرا جی کی۔ ایک عجیب وغریب اور پُراسرار کردار۔ بظاہر ایک دیوانہ، ایک ملنگ، مگر حقیقتاً ایک نابغہ روزگار شخص۔ کسی زمانے میں کہا جاتا تھا کہ ان کی شاعری پر جنس غالب ہے، مگر آج ناقدین متفق ہیں کہ جدید نظم کی تفہیم کے لیے جو کاوشیں انھوں نے کیں، ان ہی سے اِس صنف کو درست شناخت ملی۔ نظم کی موجودہ شکل کا سہرا جن صاحب کے سر ہے، ان میں راشد کے ساتھ میرا جی بھی شامل۔ انھوں نے اردو نظم کی مصرع سازی کی طرف خاصی توجہ دی اور نئے لکھنے والوں کو سکھایا کہ مصرع کہاں توڑنا چاہیے، کہاں سے نیا مصرع شروع ہونا چاہیے۔ وہ ترقی پسندوں کی فکر کو محدود خیال کرتے تھے۔ ان کا اپنا شعری افق بہت وسیع تھا۔ مطالعے نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو گہرائی عطا کی۔ انھوں نے خود کو زمین سے جوڑا اور قدیم ہندوروایات سے اپنے لیے موضوع چنے۔ ایک انوکھا اسلوب وضع کیا۔ غزل کے میدان میں وہ میر کے قائل تھے۔ ان کا مشہور شعر ہے۔

میر ملے تھے میرا جی سے باتوں سے ہم جان گئے
فیض کا چشمہ جاری ہے حفظ ان کا دیوان کریں

ان کا اصل نام ثنااللہ ڈار تھا۔ وہ 25 مئی 1912 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ کچھ کتابوں میں جائے پیدائش گجرات درج ہے۔ اپنے والد منشی مہتاب الدین کی دوسری بیوی کے باطن سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے ایک بھائی محمد اکرام اللہ کامی بھی شعروادب سے شغف رکھتے تھے۔ کچھ عرصے اس میدان میں متحرک بھی رہے۔

ان کے اجداد کشمیر کے ایک گاؤں کاروٹ سے ہجرت کر کے ضلع گوجرانوالہ میں آباد ہوئے۔ والد کو ملازمت کے سلسلے میں مختلف شہروں میں قیام کرنا پڑتا۔ یوں انھیں بلوچستان، پنجاب اور سندھ کے مختلف علاقوں میں وقت گزارنے کا موقع ملا۔ 1932 میں انھوں نے ایک بنگالی لڑکی میرا سین کو دیکھا، تو اس کے گرویدہ ہوگئے۔ اسے اس کی سہیلیاں میرا جی کہا کرتی تھیں۔ اس کے عشق میں ثنااللہ ڈار بھی میرا جی ہوگئے۔ کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ میرا سین ایک خیالی محبوبہ تھی۔ عشق کے مرض کے باعث وہ میٹرک پاس نہ کرسکے۔ ہومیو پیتھک کی تعلیم حاصل کی، مگر اسے روزگار کا ذریعہ نہیں بنایا۔ جوگی بن گئے۔ کانوں میں بالیاں، گلے میں مالا، بال بڑھا لیے۔ اوور کوٹ پہنے رہتے۔ کثرت سے شراب پینے لگے تھے۔ بقول محمد حسن عسکری۔ "جب انھوں نے دیکھا کہ دوست انھیں افسانہ بنا دینا چاہتے ہیں تو بے تامل افسانہ بن گئے، اس کے بعد ان کی ساری عمر اس افسانے کو نبھاتے گزری۔"

البتہ اس دیوانگی میں بھی ادب سے ان کا رشتہ نہ ٹوٹا۔ شعر کہتے رہے، جن میں ہندی کا رنگ جھلکتا۔ نظم کو اپنا میدان

بنایا۔ انگریزی ادب کی خاصی جانکاری تھی۔ تراجم بھی مسلسل کرتے رہے۔ تنقیدی بصیرت بھی تھی، جن کا اظہار حلقہ ارباب ذوق، لاہور میں پڑھے جانے والے مضامین سے ہوتا۔ انھوں نے اس حلقے کی شان بڑھائی۔

وہ مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی پرچے "ادبی دنیا" سے وابستہ رہے، گو ان کے والد نے کاروباری سلسلے میں مولانا پر مقدمہ دائر کر رکھا تھا۔ اس پرچے کے ذریعے ان کے افکار بڑے پیمانے پر ادبی حلقوں تک پہنچنے لگے۔ ان کی نظمیں اور گیت پھیلتے چلے گئے۔ تنقیدی بصیرت کا اولین اظہار بھی اسی پرچے سے ہوا۔ وہ بڑا پُرآشوب دور تھا۔ ہندوستان تقسیم کے عمل سے گزر رہا تھا۔ زندگی کے آنے والے برس دہلی اور ممبئی میں گزرے۔ دہلی میں پرچے "ساقی" سے ان کی وابستگی رہی۔ بمبئی کی فلمی دنیا میں پاؤں جمانے کی کوشش کی، کچھ دوست میسر آئے، مگر کامیاب نہ ہوئے۔ ادھر ایک رسالہ "خیال" شروع کیا، جس کی اٹھان اچھی تھی، مگر اب انھیں کئی روگ لگ گئے تھے۔ قسمت نے بھی ساتھ نہیں دیا۔ اس دوران گھر لوٹنے کی خواہش تھی، مگر مالی مسائل کی وجہ سے ٹلتی رہی۔ ادھر انھوں نے سخت غربت دیکھی۔ امراض نے بھی گھیر لیا۔ پھر مسلسل شراب نوشی۔ بالآخر 3 نومبر 1949 کو ممبئی کے ایک اسپتال میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے پاکستانی اور مسلمان ہونے کی وجہ سے ممبئی کے اخبارات نے خاصا تعصب برتا اور ان کی موت کی خبر شائع کرنا گوارا نہیں کی۔ ان کی تدفین میں فقط پانچ افراد شریک ہوئے۔

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بھول گیا

☆ وقار یونس

وہ فقط ایک کھلاڑی نہیں تھا، پورا عہد تھا۔ خوف کا عہد۔ اس کا سامنا کرنے والے پر لرزا طاری ہو جاتا کہ اس کی نظریں عقاب سی تھیں اور رفتار کسی چیتے کے مانند۔ جب وہ دوڑتا ہوا اپنے دشمن کی سمت آتا، تو وقت تھم جاتا۔ وہ جست لگا کر اسے دبوچ لیتا۔ اور پھر اگلے ہی پل وہ فضا میں پرواز کرتے ہوئے جشن منا رہا ہوتا۔ کسی فاتح کی مانند۔ اسے علم تھا کہ وہ انوکھا ہے۔ نہ تو پہلے اس جیسا کوئی فاسٹ بالر گزرا، نہ ہی پھر کوئی آئے گا۔

مگر عظیم وقار یونس فقط خوف کی علامت نہیں تھا۔ وہ کشش اور وجاہت کا نمونہ بھی تھا۔ اس کا طویل رن اپ دھڑکنیں تیز کر دیتا۔ اس کی پھرتی آنکھیں خیرہ کر دیتیں۔ اس کی نپی تلی، تیز رفتار گیندیں گرویدہ بنا لیتیں۔ مخالف ٹیم کے بلے باز اس سے ضرور خوفزدہ رہتے، مگر شائقین اس سے محبت کرتے تھے۔ لڑکیاں اس کے سپنے دیکھا کرتیں، لڑکے اس کے جیسا بننے کی آرزو کرتے۔ اپنے تیز رفتار اسپیل سے اس نے آسٹریلیا، انگلینڈ، جنوبی افریقا کی پچوں پر قہر ڈھائے۔ برائن لارا، سچن ٹنڈولکر، اسٹووا... کتنے ہی عظیم بلے باز اس کا شکار بنے، کتنوں کو اس نے خاک چٹائی۔ اس کی ہوا میں گھومتی ہوئی گیند کھیلنا مشکل تھا۔ جب وہ اپنے عروج پر ہوتا، ہر دیوار ڈھے جاتی اور فتح پاکستان کی جھولی میں آن گرتی۔

وقار یونس کے ریکارڈز پر نظر ڈالیں تو انسان عش عش کر اٹھے۔ فقط 87 ٹیسٹ میچز میں 23.56 کی متاثر کن اوسط سے 373 وکٹیں۔ 22 بار اننگز میں پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ انجام دیا۔ 5 بار ٹیسٹ میچز میں وقار یونس کی بل کھاتی گیندوں نے دس وکٹیں لیں۔ اس باصلاحیت کھلاڑی نے 262 ون ڈے مقابلوں میں پاکستان کی نمائندگی کی اور 416 وکٹیں لے اڑا۔ 36 رنز کے عوض 7 وکٹیں ان کی بہترین کارکردگی ٹھہری۔ تیرہ ون ڈے مقابلوں میں انھوں نے پانچ یا اس سے زاید وکٹیں لیں۔ یعنی اس منفرد کھلاڑی نے اپنے کیریر میں لگ بھگ 800 کھلاڑیوں کو پویلین کی راہ دکھائی۔ بدقسمتی سے بعد کے کیریر میں انھیں ساتھی کھلاڑیوں اور بورڈ کی سیاست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ان اور آؤٹ ہوتے رہے۔ اس کی وجہ سے ان کی کارکردگی پر فرق پڑا، ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ ہزار کا ہندسہ عبور کر جاتے۔

وقار یونس 16 نومبر 1971 کو صوبہ پنجاب کے علاقے وہاڑی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بہاول پور سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اوائل کی زندگی کا کچھ حصہ شارجہ میں گزرا، جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ پاکستان لوٹنے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج وہاڑی کے طالب علم رہے۔ گو بچپن ہی سے کرکٹ کا شوق تھا مگر جب عمر پختہ ہوئی تب ان کی اصل صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں۔ لمبا قد تھا، رن

اپ اچھا تھا۔ ان میں اچھا فاسٹ بولر بننے کی تمام خصوصیات تھیں۔ 1987 میں انھوں نے اپنے کیریر کا باقاعدہ آغاز کیا۔ وہ مختلف کلبوں سے کھیلتے رہے۔ مقابلہ سخت تھا اور مواقع کی کمی تھی۔ شومئی قسمت، اسی زمانے میں ایک حادثے میں انھیں اپنے ایک ہاتھ کی انگلی سے محروم ہونا پڑا لیکن ہمت نہ ہاری اور جلد جلد کرکٹ میں لوٹے۔

ابھی فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلتے ہوئے چند ہی ماہ ہوئے تھے... صرف چھ میچز میں انھوں نے شرکت کی تھی کہ عمران خان کی ان پر نظر پڑی۔ جب انھیں نیشنل ٹیم کے لیے لگنے والے کیمپ سے بلوایا گیا، تو خوشی سے پہلے یہ حیرت تھی، جس نے انھیں آن لیا۔ بے شک وہ باصلاحیت تھے، محنتی تھے، مگر نیشنل کیمپ تک رسائی میں تو برسوں لگ جاتے ہیں۔

انھوں نے توجہ مرکوز کی۔ سوچا، موقع ملا ہے تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔ پوری تیاری سے کیمپ پہنچے۔ وہاں پہنچ کر خبر ملی کہ جن پارکھ نے انھیں پرکھا تھا، یعنی عمران خان... ان کی طبیعت ناساز ہے۔ وہ کیمپ میں موجود نہیں تھے۔ نوجوان وقار یونس عمران خان کے مداح تھے (اس زمانے میں ان کا طوطی بولتا تھا) وہ تھوڑے مایوس ہوئے، مگر قدرت ساتھ تھی۔ ویلز کپ کے مقابلے جاری تھے۔ یونائیٹڈ بینک اور دہلی الیون کا مقابلہ تھا۔ سلیم جعفر زخمی ہوئے تو انتظامیہ نے وقار کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ عمران ٹی وی پر میچ دیکھ رہے تھے، انھوں نے وقار کو دیکھا، تو خود اسٹیڈیم پہنچ گئے۔

اگلے روز وہ اس نوجوان سے ملے۔ وقار اپنے ہیرو کو سامنے دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ عمران کی بھاری آواز سنائی دی۔ "تیاری کرلو، تم اگلے ماہ شارجہ جارہے ہو۔"

کیا وہ خواب تھا یا حقیقت؟ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ مگر یہ طے تھا کہ قدرت اس پر مہربان تھی۔ عمران خان کی سرپرستی میں وقار نے جو سفر شروع کیا، اس کی منزل عظمت کی چوٹی تھی۔ اس وقت وسیم اکرم نے بھی ٹیم میں جگہ بنالی تھی۔ مستقبل میں وسیم اور وقار دہشت کی علامت بننے والے تھے۔

16 نومبر 1989 کرکٹ کی تاریخ کا ایک انتہائی اہم دن تھا۔ ایک سبب تو یہ تھا کہ دو روایتی حریف پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ پھر اس ٹیسٹ میں دو ایسے کھلاڑیوں نے اپنے کیریر کا آغاز کیا، جو مستقبل میں لیجنڈ کہلانے والے تھے۔ ایک تو تھے وقار اور دوسرے تھے سچن ٹنڈولکر، جو آنے والے عشروں میں اپنے طلسماتی بلے سے ہر ریکارڈ کو تہس نہس کرنے والے تھے۔

اس میچ میں وقار نے چار کھلاڑیوں کو پویلین کی راہ دکھائی۔ سچن تو ان کا شکار بنے ہی، کپل دیو کو بھی انھوں نے ہی آؤٹ کیا۔ ان کی تیز رفتاری اور وجیہہ شخصیت نے ناظرین کو بڑا متاثر کیا۔ جلد وہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ پاکستان کو فتوحات دلانے میں ان کا کردار بڑھنے لگا۔ انھیں وکی اور بورے والا ایکسپریس کہہ کر پکارا جانے لگا۔ پاکستان کی طرف سے بولنگ کا آغاز وسیم اور وقار کرتے۔ ان کے خطرناک اسپیل کے بعد مخالف ٹیم کو سنبھلنے کا کم ہی موقع ملتا۔ بدقسمتی سے 1992 کا ورلڈ کپ وہ نہیں کھیل سکے، مگر وہ جلد ٹیم میں واپس آئے۔ اب ان کی رفتار پہلے سے تیز تھی۔ 1994 میں انھوں نے نیوزی لینڈ کے خلاف شان دار ہیٹ ٹرک کی۔ 1996 کے ورلڈ کپ میں ان سے بہت امیدیں تھی، مگر بھارت کے خلاف میچ میں وہ توقعات پر پورے نہیں اتر سکے۔ آنے والے دنوں میں ان کے اور کپتان وسیم اکرم کے درمیان فاصلے بڑھنے لگے۔ انجریز نے بھی انھیں پریشان رکھا۔ 1999 میں شعیب اختر کی آمد ہوئی، تو وقار کا اثر ماند پڑنے لگا۔ ورلڈ کپ سے قبل ہندوستان کے دورے میں پہلے دو ٹیسٹ مقابلوں میں ان کی پرفارمنس اچھی نہیں رہی۔ ادھر شعیب کو موقع ملا تو انھوں نے دو جادوئی گیندیں پھینک کر سچن ٹنڈولکر اور راہول ڈریوڈ کو آؤٹ کیا اور ٹیم میں اپنی جگہ پکی کرلی۔ ورلڈ کپ میں شعیب اختر کو ان پر ترجیح دی گئی۔ لگتا تھا، ان کا کیریر تمام ہوا، مگر ان میں کرکٹ باقی تھی۔ وہ پوری قوت سے لوٹے۔ البتہ 2000 میں بال ٹمپرنگ کے الزام میں انھیں پابندی کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ عرصے بعد انھیں کپتان بنا دیا گیا۔ البتہ ان کی کارکردگی میں تسلسل کا فقدان تھا۔ ناقدین کہتے تھے کہ ان کی ٹیم میں جگہ نہیں بنتی۔ 2003 ورلڈ کپ میں پاکستان نے بدترین پرفارمنس کا مظاہرہ کیا اور پہلے ہی راؤنڈ سے آؤٹ ہوگئی۔ اس شکست کے بعد ٹیم سے ان کی چھٹی ہوگئی۔ کچھ عرصے انتظار کرنے کے بعد انھوں نے اپریل 2004 میں ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیا۔ ان کا کیریر فقط 15 برس پر محیط تھا جس میں انھوں نے متعدد ریکارڈ بنائے، درجنوں بار پاکستان کو فتح دلائی۔ وہ اپنے وقت کے تیز ترین بولر تھے مگر انھیں اس طرح الوداع نہیں کہا گیا جیسے ایک حقیقی ہیرو کو کہنا چاہیے۔

فقط دو سال بعد کرکٹ بورڈ نے انھیں پھر یاد کیا۔ انھیں بولنگ کوچ کی ذمے داری سونپی گئی تھی مگر جنوری 2007 میں بورڈ سے اختلافات کے باعث وہ ٹیم سے الگ ہوگئے۔ انھوں نے اس وقت کے کپتان انضمام پر بھی کڑی

تنقید کی۔ جنھوں نے بولنگ کوچ کے لیے مشتاق احمد کو ترجیح دی تھی۔ 2009 میں جب کپتان اور بورڈ تبدیل ہوگیا تو انھیں بولنگ کوچ کے طور پر پھر یاد کیا گیا۔ اگلا برس خوش خبری لایا۔ انھیں ہیڈ کوچ مقرر کردیا گیا تھا۔ انھیں 2010 کے ٹی 20 ورلڈ کپ کے لیے پاکستانی ٹیم کو تیار کرنا تھا، جو تجربے کار کھلاڑیوں سے محروم تھی۔ ان کی کوششوں سے پاکستانی ٹیم نے سیمی فائنل تک رسائی حاصل کی جہاں ایک سنسنی خیز مقابلے میں اسے آسٹریلیا کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ ایشیا کپ میں بھی کارکردگی ٹھیک ٹھاک رہی۔

انگلینڈ کے متنازعہ دورے میں وقار ہی کوچ تھے، جب پاکستان کے تین کھلاڑیوں (سلمان بٹ، محمد عامر اور محمد آصف) پر اسپاٹ فکسنگ کا الزام لگا۔ پاکستان کی بڑی سبکی ہوئی۔ اس واقعے کے بعد پاکستان ٹیم کا مورال گر گیا اور کارکردگی میں گراوٹ آگئی۔ وقار کی کوچنگ میں پاکستانی ٹیم جلد سنبھل گئی۔ ورلڈ کپ مقابلوں میں کارکردگی خاصی اچھی رہی۔ سیمی فائنل تک رسائی حاصل کی۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا مگر زیرزمین لاوا گردش کررہا تھا۔ وقار یونس اور کپتان میں دوریاں بڑھ رہی تھیں۔ بالآخر اگست 2011 میں وقار نے استعفیٰ دے دیا۔ اس عرصے میں وہ مختلف کلب کی ٹیموں کی کوچنگ کرتے رہے۔

2014 میں انھیں ایک بار پھر بورڈ سے بلاوا آیا۔ وقار یونس کو ہیڈ کوچ بنا دیا گیا تھا۔ انھوں پھر موقع ملا مگر ماسوائے ٹیسٹ کرکٹ کے، کسی فارمیٹ میں پاکستان اچھا پرفارم نہیں کرسکا۔ 2016 کے ٹی 20 ورلڈ کپ میں عبرت ناک شکست کے بعد انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔

انھوں نے اپنے کیریر کے دوران آسٹریلوی نژاد پاکستانی ڈاکٹر فریال سے شادی کی تھی جن سے ان کے دو بچے ہیں۔ ان کی رہائش آج کل آسٹریلیا میں ہے۔ وہ کومنٹیری اور کرکٹ ایکسپرٹ کے طور پر بھی ٹی وی پر دکھائی دیتے ہیں۔

☆جون ایلیا

اب مری کوئی زندگی ہی نہیں
اب بھی تم مری زندگی ہو کیا

غزل ان کا بنیادی حوالہ ضرور ہے مگر اکلوتا حوالہ نہیں۔ نظمیں بھی خوب کہیں۔ ممتاز ادیب اور ان کے رفیق اسد محمد خاں کے نزدیک یہ نظم ہی تھی، جہاں وہ اوج پر نظر آتے۔ ویسے ان کی علمیت کا بھی ایک زمانہ معترف تھا۔ عالم فاضل آدمی تھے۔ مشکل سے مشکل موضوع ان کے سامنے پانی ہوجاتا۔ بڑے بڑے ماہر لسانیات ان کا دم بھرتے۔ پھر کثیر اللسان تھے۔ اردو اور انگریزی کے ساتھ عربی، فارسی، پہلوی، سنسکرت یہاں تک کہ عبرانی پر بھی خوب گرفت تھی۔ ادبی جراید کی ادارت میں نام کمایا۔ ان کے اداریے آج بھی توجہ کا محور ہیں۔ انداز تحریر انوکھا تھا۔ وہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت تھے۔ مذاہب اور ثقافتوں پر بات کرتے تو فلسفی معلوم ہوتے۔ کراچی کی شناخت تصور کیے جاتے۔ اس شہر پر ان کی شخصیت، علمیت اور شاعری نے گہرے اثرات چھوڑے۔ کراچی میں موجودہ نسل کے بیشتر شعرا پر ان کا واضح اثر نظر آتا ہے۔ ان کا خاندان کیا تھا، ستاروں کی جھرمٹ اور ہر ستارہ سورج تھا۔ اپنا نظام شمسی رکھتا تھا۔ معروف صحافی اور ادیب رئیس امروہوی اور فلسفی سید محمد تقی ان کے بھائی تھے۔
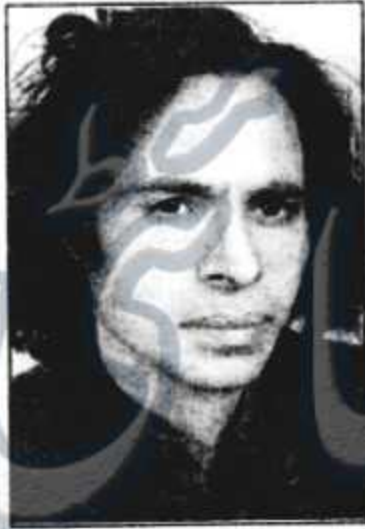
ہمارے ممدوح جون ایلیا 14 دسمبر 1937 کو امروہہ، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کے گھرانے کا بڑا نام تھا۔ گھر میں ہر طرف کتابیں پھیلی رہتیں۔ اسی علمی و ادبی فضا میں پروان چڑھے۔ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کے والد علامہ شفیق حسن ایلیا کو فن اور ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ شاعر بھی باکمال تھے۔ علم نجوم میں بھی دلچسپی تھی۔ بڑے بھائی مطالعے میں غرق رہتے۔ جون ایلیا نے بھی اسی راہ کا چناؤ کیا۔ ان معنوں میں علم کی جستجو وراثت میں ملی۔ والد کی پرورش کا بھی بڑا کردار رہا۔ کچھ بڑے ہوئے تو شعر کہنے کی جوت جاگی۔ آٹھ برس کے تھے، جب انھوں نے پہلا شعر کہا۔ ان کی شہرہ آفاق کتاب "شاید" کے پیش لفظ میں انھوں نے اس واقعے کا یوں تذکرہ کیا:

"میری عمر کا آٹھواں سال میری زندگی کا سب سے زیادہ اہم اور ماجرا پرور سال تھا۔ اس سال میری زندگی کے دو سب سے اہم حادثے پیش آئے۔ پہلا حادثہ یہ تھا کہ میں اپنی نرگسی انا کی پہلی شکست سے دوچار ہوا، یعنی ایک قتالہ لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا۔ دوسرا حادثہ یہ تھا کہ میں نے پہلا شعر

کہا۔"

اور وہ شعر کچھ یوں تھا:

چاہ میں اس کی طمانچے کھائے ہیں
دیکھ لو سرخی مرے رخسار کی

ان کا شمار حساس بچوں میں ہوتا تھا۔ ہر وقت اپنے خیالوں میں گم رہتے۔ انھوں نے اپنے تخیل میں کردار تراش رکھے تھے۔ ایک خیالی محبوب، جسے انھوں نے صوفیہ کا نام دیا۔ ابتدائی شاعری میں مکالماتی فضا نظر آتی ہے۔ تاریخ کے ساتھ سیاست کے مضمون میں بھی انھیں دلچسپی تھی۔ متحدہ ہندوستان میں اس وقت آزادی کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ انگریز کو قابض کے روپ میں دیکھا جاتا تھا۔ ان حالات نے جون پر بھی اثرات مرتب کیے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم امروہہ سے حاصل کی۔ وہ وہاں سید المدارس کے طالب علم رہے جو معتبر مذہبی مرکز تصور کیا جاتا تھا۔ زبانوں میں اوائل سے دلچسپی تھی۔ خدا نے صلاحیت سے بھی نوازا۔ عربی اور فارسی تو مدرسے ہی میں سیکھ لی، دھیرے دھیرے انگریزی، پہلوی، سنسکرت اور عبرانی پر بھی عبور کر لیا۔

اس زمانے میں ترقی پسندی کا شہرہ تھا۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کا لیفٹ کی جانب خاصا رجحان تھا۔ وہ بھی کمیونسٹ نظریات سے متاثر تھے۔ تقسیم کے زیادہ حق میں نہیں تھے۔ بعد میں ان کی تحریروں سے بھی اس فکر کا اظہار ہوا مگر انھوں نے آخر اس واقعے کو قبول کر لیا۔ 1957 میں انھوں نے پاکستان ہجرت کی۔ ساحلی شہر کراچی ان کا مسکن ٹھہرا۔ اسی شہر میں انھیں ستارہ بن کر دمکنا تھا۔ ان کے بڑے بھائی علمی و ادبی حلقوں میں شناخت رکھتے تھے، جون ایلیا کی ان حلقوں تک رسائی قابلِ فہم ہے مگر جس عنصر نے انھیں قبولیت اور پھر مقبولیت عطا کی، وہ ان کا نیا آہنگ، تنوع اور جدید لہجہ تھا، جس نے سب کو چونکا دیا۔

کوئی مجھ تک پہنچ نہیں پاتا
اتنا آسان ہے پتا میرا

انھوں نے تواتر سے غزلیں اور نظمیں کہیں، مضامین اور مقالے لکھے، تحقیق بھی کی، مگر وہ اپنی تحریریں شائع کروانے کے معاملے میں اتنے متحرک نہیں تھے۔ ادبی جرائد اور مشاعروں کے ذریعے ان کا کلام اردو دنیا کے کونے کونے میں پہنچ گیا۔ ہندوستان میں ان کا چرچا ہوتا۔ ادھر دبئی، لندن اور نیویارک جیسی اردو کی نئی بستیوں میں ان کی مداح سرائی ہوتی۔ فلسفہ، منطق، اسلامی تاریخ، صوفی روایات، سائنس جیسے موضوعات پر بھی انھیں گرفت تھی۔ ان علوم کا نچوڑ ان کے کلام میں بھی نظر آیا، جس نے انھیں ہم عصروں سے ممتاز کر دیا۔ ان کے گرد عقیدت مندوں کا حلقہ تھا، مگر وہ مجموعے کی اشاعت کے معاملے کو ٹالتے رہے۔ کچھ لوگ اس تاخیر کو ان کی نرگسیت ٹھہراتے ہیں، کچھ کڑا انتخاب۔ سبب جو بھی رہا ہو، قارئین کو طویل انتظار کرنا پڑا۔ پہلا شعری مجموعہ "شاید" جب شائع ہوا، عمران کی 60 برس تھی۔ مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ بیسٹ سیلر ثابت ہوا۔ مباحثوں کا موضوع بن گیا۔ ناقدین اس کتاب کی اشاعت کو اس دہائی کا اہم ترین واقعہ ٹھہراتے ہیں۔ ایک نسل کو اس مجموعے نے دیوانہ بنا دیا تھا۔ ان کا دوسرا مجموعہ "یعنی" ان کی وفات کے بعد 2003 میں شائع ہوا۔ تیسرے مجموعے کا عنوان "گمان" تھا۔ ان کی پُراسرار شخصیت اور طرزِ حیات نے نوجوانوں پر گہرا اثر چھوڑا۔ سیاہ چشمہ، مشاعروں میں بال جھٹکنا، زانو پیٹنا، اپنی سرمستی... وہ ایک سماں باندھ دیتے تھے۔ اس انداز کو اوروں نے بھی اپنایا۔

غزل گوئی کے ساتھ وہ تراجم بھی کرتے رہے، مگر ان کا بڑا حصہ دستیاب نہیں۔ وہ انشاء کے مدیر رہے۔ وہیں ان کی ملاقات معروف ادیب اور کالم نگار زاہدہ حنا سے ہوئی، جن سے انھوں نے شادی کر لی۔ اس شادی سے ان کے ہاں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہوا۔ 80 کی دہائی میں ان کی طلاق ہو گئی۔ اس کے بعد تنہائی کا شکار رہے۔ صحت گرتی گئی۔ حضرت علی سے انھیں خصوصی عقیدت تھی۔ اپنے سید ہونے پر فخر تھا۔ خیالات کا بھرپور انداز میں اظہار کیا کرتے تھے مگر بدلتے حالات اور بڑے بھائی رئیس امروہوی کے قتل کے بعد وہ کچھ محتاط ہو گئے تھے۔ طویل علالت کے بعد 8 نومبر 2002 کو کراچی میں ان کا انتقال ہوا۔

کیا کہا عشق جاودانی ہے
آخری بار مل رہی ہو کیا

نامور شاعرہ، فہمیدہ ریاض نے ان کی موت کے بعد اپنے مضمون میں انھیں کچھ یوں یاد کیا۔ "بھائی جون طیش کھاتے رہتے تھے۔ علم کی بے قدری پر، انسانی اقدار کی بے حرمتی پر، جہالت کی مکمل حکمرانی پر، ایسی تمام باتوں پر جن پر کئی عشروں سے اب کسی کو غصہ نہیں آتا۔ کسی اندرونی طاقت کے اجالے سے وہ یوں پوری طرح زندہ تھے کہ موت کا تو خیال تک ان کے قریب نہ پھٹکتا تھا۔ ایسا تو انھوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ دمے کے دورے میں ان کے سانس کی ڈوری ٹوٹے گی تو پھر نہ جڑے گی۔"

☆ مشتاق محمد

کرکٹ رگوں میں لہو بن کر دوڑتی۔ پورا خاندان اسپورٹس کا دلدادہ تھا۔ دادا اور والد جونا گڑھ میں کلب کرکٹ کھیلا کرتے تھے۔ ماموں بھی یہی شوق رکھتے تھے۔ بڑے بھائیوں نے بھی یہی راستہ چنا۔ ایک معنوں میں ان کا اس کھیل کی سمت آنا طے تھا۔

یہ مشتاق محمد کا تذکرہ ہے، جو 22 نومبر 1943 کو جونا گڑھ میں پیدا ہوئے۔ 1959 سے 1979 تک انھوں نے کرکٹ کے میدانوں میں اپنے جلوے بکھیرے اور محمد برادران کی حکمرانی کو قائم رکھا۔ سیدھے ہاتھ سے وہ کمال کی بلے بازی کرتے تھے۔ ان کی لیگ اسپن بولنگ کے بھی چرچے تھے۔ وہ ایک حقیقی آل راؤنڈر تھے۔ اپنے وقت کے بہترین آل راؤنڈر میں سے ایک۔ انھوں نے 57 ٹیسٹ میچز میں 39.17 کی متاثر کن اوسط سے 3643 رنز بنائے، جن میں دس سنچریاں بھی شامل تھیں۔ اس فارمیٹ میں انھوں نے 79 وکٹیں حاصل کیں۔ پانچ وکٹوں کا کارنامہ تین بار انجام دیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر کارآمد تھے۔ وہ دنیا کے پہلے کھلاڑی تھے، جس نے ایک ٹیسٹ میچ میں سنچری اسکور کرنے اور پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ دو بار انجام دیا۔ بعد میں اوروں نے یہ سنگ میل عبور کیا، مگر پاکستان میں وہ اب بھی اکلوتے ہیں۔

اس زمانے میں ون ڈے کرکٹ کا چلن بھی عام ہونے لگا تھا۔ اس فارمیٹ میں بھی مشتاق جلوہ گر ہوئے۔ انھوں نے 10 مقابلوں میں شرکت کی۔ ایک نصف سنچری کی مدد سے وہ 209 رنز ہی بنا سکے۔ وکٹ ان کے حصے میں آئی۔ اس زمانے میں ٹیسٹ ہی کو اصل کرکٹ گردانا جاتا تھا۔ ون ڈے کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔

ان کے والد شیخ اسماعیل انڈین آرمی میں کپتان تھے۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کاروبار کی سمت آگئے۔ جونا گڑھ میں ان کا ہوٹل اور پیٹرول پمپ تھا۔ قدرت نے ساتھ دیا۔ مالی حالات خاصے مستحکم تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں کو پُرآسائش زندگی دی۔ اس کہانی میں ان کی والدہ امیر بی کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ وہ اسپورٹس کی شیدائی تھیں۔ جونا گڑھ لیڈیز کلب کی فعال رکن تھیں۔ بیڈمنٹن اور کیرم کے مقابلوں میں کئی ٹرافیاں جیتیں۔ کرکٹ کی بھی خوب سمجھ رکھتی تھیں۔ جب ان کے بچے کرکٹ کھیلتے، تو وہ میدان میں موجود ہوتیں۔ اگر کوئی غلط شاٹ کھیل کر آؤٹ ہوتا تو اسے ڈانٹ پڑتی۔ ایک معنوں میں وہی مشتاق محمد کی پہلی کوچ ٹھہریں۔

جونا گڑھ کا شمار ہندوستان کی پُرامن اور پُرسکون ریاستوں میں ہوتا تھا۔ ہندو مسلمان مل جل کر رہتے۔ البتہ جب تحریکِ پاکستان شروع ہوئی تو ایک آزاد وطن کا خواب جونا گڑھ کے مسلمانوں کی آنکھوں میں بھی بس گیا۔ قیام پاکستان کے بعد ان کا خاندان ہجرت کر کے کراچی آگیا۔ لانچ میں سوار ہو کر خاندان پاکستان پہنچا۔ یہ سفر آسان نہیں تھا۔ ادھر معاشی مسائل منتظر تھے۔ کچھ روز یہ خاندان بھیم پورہ کے ایک مندر میں ٹھہرا۔

جونا گڑھ میں سب کچھ تھا، یہاں بے سروسامانی کے ساتھ آئے، مگر خدا ان کے خاندان پر مہربان تھا۔ محمد خاندان کا ستارہ چمکنے والا تھا۔ وہ پانچ بھائی تھے، جن میں سے چار (وزیر محمد، حنیف محمد، صادق محمد اور مشتاق محمد) پاکستان کے لیے نہ صرف ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے والے تھے، بلکہ اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک نئی تاریخ رقم کرنے والے تھے۔ اعزازات ان کے قدموں میں ڈھیر ہوئے، نشانِ سپاس سے ان کے شیلف سج گئے۔ (محمد برادران میں دوسرے نمبر کے بھائی رئیس محمد نے بھی کرکٹ کھیلی، ایک ٹیسٹ میں وہ بارہویں کھلاڑی بھی رہے۔ بعد اسی خاندان سے شعیب محمد نے ٹیسٹ اور ون ڈے میں اپنا سکہ جمایا)

بچپن ہی سے کرکٹ کا جنون تھا۔ پڑھائی سے جوں ہی فرصت ملتی، بیٹ اور بال اٹھا لیتے۔ چھت پر ٹینس بال سے پریکٹس کیا کرتے۔

حنیف محمد کے کارہائے نمایاں اور بین الاقوامی شہرت کے پیشِ نظر آج یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی مشتاق محمد نے آسانی سے کرکٹ ٹیم تک رسائی حاصل کر لی ہوگی، مگر یہ خیال درست نہیں۔ انھیں کڑے مراحل سے گزرنا پڑا۔ سب سے پہلے اپنے عظیم بھائی کے معیار پر پورا اترنا تھا۔ پھر سلیکٹرز کو متاثر کرنا تھا، جن میں سے چند شاید محمد برادران کے مخالف بھی ہوں، وہ نہیں چاہتے ہوں کہ وزیر محمد اور حنیف محمد

کے بعد اس خاندان کا تیسرا بیٹا بھی ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے کا اعزاز حاصل کرے، مگر صلاحیت کے سامنے کون بندھ باندھ سکتا ہے۔

انھوں نے اپنے فرسٹ کلاس کیریر کا آغاز 13 برس کی عمر میں کیا۔ اپنے پہلے مقابلے میں انھوں نے 87 رنز کی شان دار اننگز کھیلی اور 28 رنز کے عوض پانچ وکٹیں لے اڑے۔ پورے کراچی میں خبر پھیل گئی کہ محمد خاندان کی کان سے ایک اور ہیرا برآمد ہوا ہے۔ اخبارات میں بھی اس نوجوان کی، جس کی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں، پرفارمینس کا تذکرہ ہوا۔ پرفارمینس میں تسلسل رہا۔ جلد انھوں نے کراچی کی ٹیم تک رسائی حاصل کر لی۔ آنے والے برسوں میں پی آئی اے کا حصہ رہے۔ مستقبل میں کاؤنٹی کرکٹ میں نارتھ ہمپشائر ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے والی تھی، مگر ابھی وہ پاکستان میں ہونے والے فرسٹ کلاس میچز میں صلاحیتوں کا لوہا منوانے میں جٹے تھے۔

26 مارچ 1959 کو لاہور میں پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان سیریز کے تیسرے ٹیسٹ میچ کا آغاز ہوا تو گیارہ کھلاڑیوں میں مشتاق محمد بھی شامل تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف 15 سال 124 دن تھی۔ وہ ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے والے دنیا کے سب سے کم عمر کھلاڑی تھے۔ مشتاق محمد کا یہ ریکارڈ ایک طویل عرصے تک ناقابل شکست رہا۔ بالآخر 24 اکتوبر 1996 کو پاکستان ہی کے ایک اور کھلاڑی حسن رضا نے 14 سال 228 دن کی عمر میں پہلا ٹیسٹ کھیل کر ان کا یہ ریکارڈ توڑ دیا۔ مشتاق محمد کا ریکارڈ تو بن گیا، مگر یہ کوئی اچھا آغاز نہیں تھا۔ اس ٹیسٹ میچ میں مشتاق محمد نے پہلی اننگ میں 14 اور دوسری اننگ میں 4 رنز بنائے، بطور بالر انھوں نے چھ اوورز کرائے اور وکٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

اس پرفارمینس کے بعد اگلے موقع کے لیے انھیں کچھ انتظار کرنا پڑا۔ البتہ ان کی واپسی متاثر کن رہی۔ جلد وہ ٹیم کا مستقل حصہ بن گئے۔ آنے والے دنوں میں انھوں نے کئی کارہائے نمایاں انجام دیے۔ کئی میچوں میں پاکستان کی فتوحات میں کلیدی کردار نبھایا۔ اپنے چھٹے ٹیسٹ میچ میں روایتی حریف بھارت کے خلاف انھوں نے 101 رنز کی یادگار اننگز کھیلی۔ اس وقت ان کی عمر 17 سال اور 78 دن تھی۔ اس سے قبل کبھی اتنے کم عمر کھلاڑی نے سنچری اسکور نہیں کی تھی۔ یہ ریکارڈ اگلے چالیس برس قائم رہا۔ بنگلہ دیش کے محمد اشرفل نے یہ ریکارڈ توڑا۔ 1962 میں انگلینڈ کے خلاف بھی مشتاق کی کارکردگی متاثر کن رہی۔ البتہ اس کے بعد انھیں اگلی سنچریوں کے لیے طویل انتظار کرنا پڑا۔ ہاں اس عرصے میں وہ مسلسل وکٹیں لیتے رہے۔ اپنے کیریر کے آخری برسوں میں انھوں نے آسٹریلیا کے خلاف 121 رنز داغے، جسے کچھ ناقدین ان کی بہترین اننگز ٹھہراتے ہیں۔ ڈبل سنچری انھوں نے نیوزی لینڈ کے خلاف اسکور کی۔ وہ میچ میں ڈبل سنچری اسکور کرنے اور پانچ وکٹیں لینے والے اپنے وقت کے دوسرے کرکٹر تھے۔

1976 میں پاکستانی ٹیم کا کپتان مقرر کیا گیا۔ یہ بڑا اعزاز تھا۔ 1979 تک یہ عہدہ ان کے پاس رہا۔ انھوں نے 19 ٹیسٹ میچز میں پاکستان کی کپتانی کی۔ اس عرصے میں انفرادی کارکردگی بہت اچھی رہی۔ بالخصوص ویسٹ انڈیز کے خلاف وہ اپنے اوج پر نظر آئے اور کالی آندھی کو حیران کن شکست سے دوچار کیا۔ 1978 میں پاکستان اور بھارت آٹھ سال کے طویل وقفے کے بعد ایک دوسرے کے مدمقابل آئیں تو بھارتیوں کے پاس مشتاق کی حکمت عملی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ سیریز پاکستان نے 0-2 سے جیت لی۔

کاؤنٹی کرکٹ میں ان کی کارکردگی حیران کن رہی۔ ان کی صلاحیتیں اپنے جوبن پر نظر آئیں۔ ادھر انھوں نے کئی ریکارڈز بنائے۔ وہ پہلے پاکستانی کھلاڑی ہیں جس نے اپنے فرسٹ کلاس کیریر میں پچیس ہزار رنز اسکور کیے۔ نارتھ ہمپشائر کی فتوحات میں ان کا کردار کلیدی تھا۔ وہ اس کے کپتان بھی رہے۔ البتہ بعد میں ان کے اور ٹیم انتظامیہ کے درمیان جنم لینے والی صورتِ حال نے انھیں ٹیم سے الگ کر دیا۔ انھوں نے کیری پیکر سیریز میں بھی حصہ لیا، جس نے حقیقی معنوں میں ون ڈے کرکٹ کو متعارف کروایا اور کرکٹ کو ایک منافع بخش تفریحی کھیل بنا دیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مشتاق محمد مختلف حیثیتوں میں کرکٹ سے منسلک رہے۔ وہ کومنٹری کرتے نظر آئے۔ بطور کوچ بھی ان کی صلاحیتوں سے وقتاً فوقتاً استفادہ کیا گیا۔ وہ 1999 میں جاوید میاں داد کے سبکدوش ہونے کے بعد کرکٹ ٹیم کے کوچ بنے۔ ان کی کوچنگ میں ٹیم نے فائنل تک رسائی حاصل کی۔ بعد میں وہ کرکٹ بورڈ میں عہدے دار رہے۔ انھوں نے امریکا کی کرکٹ ٹیم کی کوچنگ بھی کی۔

دنیائے کرکٹ میں باپ، بیٹے اور بھائی کی جانب سے ٹیسٹ میں ڈبل سنچریاں بنانے کا ریکارڈ بھی اسی قابل احترام خاندان کو حاصل ہے۔ مشتاق محمد بھی اس اعزاز کا حصہ

بنے۔ ایک طرف حنیف اور شعیب محمد نے ڈبل سنچریاں بنائیں تو ادھر انھوں نے 201 رنز کی یادگار اننگز کھیلی۔ حنیف محمد اور شعیب محمد کی اننگز میں عجب مماثلت تھی۔ دونوں نے 203 رنز بنائے تھے۔ اور دونوں ہی ناٹ آؤٹ رہے۔

ان کا ایک کمال اور تھا۔ آج ریورس سوئپ تیز رفتار کرکٹ کا حصہ ہے۔ دیکھنے میں یہ عجیب نہیں لگتی کیونکہ ہم اس کے عادی ہوگئے ہیں، مگر اب سے چار عشروں قبل جب مشتاق محمد نے یہ عجیب و غریب شاٹ پہلی بار کھیلی، تو لوگ چونک اٹھے۔ 70 کی دہائی میں انھوں نے یہ شارٹ ایجاد کی تھی۔ ان کے بھائی حنیف محمد بھی یہ شارٹ کھیلا کرتے تھے۔

☆ فواد خان

ان کا اولین حوالہ تو گائیکی تھا۔ ایک نوجوان سنگر کے طور پر وہ ابھرے، بعد میں ایک ماڈل کے طور پر اسکرین پر نظر آئے۔ یہاں بھی کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ مگر یہ اداکاری کا میدان تھا، جو انھیں شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔ ٹی وی ڈراموں نے یکدم انھیں ایک سپر اسٹار بنا دیا، پہلے ”ہم سفر“ اور ”پھر زندگی گلزار ہے“ جیسے بلاک بسٹر ڈرامے۔ فواد خان لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ کہا جانے لگا کہ یہ نوجوان پاکستانی فلم انڈسٹری کا مستقبل ہے مگر قسمت ان پر اتنی مہربان تھی کہ پاکستان کی چھوٹی فلم انڈسٹری کے بجائے انھیں میسر آئی، یعنی بالی وڈ۔

انڈین فلم کرنا ایک بڑی کامیابی تھی، مگر ان کی کامرانیوں کا زینہ یہیں تمام نہیں ہوتا۔ انھیں ابھی اور اوپر جانا تھا۔ ماضی میں علی ظفر بطور لیڈ انڈیا میں فلم کرکے نام اور عزت کما چکے تھے، مگر فواد کی اداکاری اور شخصیت نے وہاں سنسنی پھیلا دی۔ کرن جوہر سمیت بڑے بڑے پروڈیوسر انھیں کاسٹ کرنا چاہتے تھے۔ ادھر ایشیا کی پُرکشش ترین شخصیات کی فہرست میں وہ ترقی کرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ رتھک روشن اور شاہ رخ خان کو پچھاڑ دیا۔ یوں لگنے لگا تھا کہ جلد یہ پاکستانی ہندوستان میں سپر اسٹار کا درجہ حاصل کرلے گا۔ گو آج پاک بھارت کشیدگی کی وجہ سے امکانات کچھ گھٹے گئے ہیں، مگر امید کی جارہی ہے کہ صورتِ حال معمول پر آنے کے بعد ان کے دروازے پر ہندوستانی پروڈیوسرز کی لائن لگ جائے گی۔

فواد خان 29 نومبر 1981 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا تعلق لاہور سے تھا۔ زندگی کے ابتدائی چند برس مڈل ایسٹ میں گزرے، جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ گلف وار کے زمانے میں یہ گھرانہ برطانیہ میں مقیم تھا۔ وہ پندرہ برس کے تھے، جب ان کا خاندان لاہور میں سیٹل ہوگیا۔ موسیقی میں انھیں بچپن سے دلچسپی تھی۔ راک میوزک ان کا انتخاب تھا۔ گٹار بجانے کے شوقین۔ لاہور گرامر اسکول کے وہ طالب علم تھے، جہاں اپنے ہم خیال طالب علموں سے جلد دوستی ہوگئی۔ بعد میں انھوں نے NUCES لاہور سے کمپیوٹر انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ تھیٹر کی دنیا بھی انھیں پکار رہی تھی۔ 1999 میں جب وہ اسکول کے طالب علم تھے، انھوں نے ایک غیر معروف گروپ کے ساتھ پرفارم کیا۔ امیتابھ بچن کے وہ مداح تھے۔ قد بھی اچھا تھا۔ ان ہی آواز میں باتیں کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ مشق بعد میں کام آئی۔

اسی زمانے میں انھوں نے ایک بینڈ Entity Paradigm بنایا۔ دراصل یہ دو بینڈز کا ملاپ تھا۔ احمد بٹ نے Entity اور فواد نے Paradigm کے نام سے بینڈ بنا رکھے تھے۔ 1994 سے 2000 تک یہ علیحدہ ہی رہے، مگر پھر ایک ٹی وی پراجیکٹ کے سلسلے میں یہ دونوں فنکار اکٹھے ہوئے، تو انھوں نے مل کر ایک گیت گایا۔ اس کے بعد ہی انھوں نے بینڈ بنانے کا سوچا، جس کا البم 2003 میں ”ارتقا“ کے نام سے مارکیٹ میں آیا۔ اس کا گانا راہ گزر چارٹس میں ٹاپ پوزیشن پر رہا۔

ایک زمانے میں پاکستان میں میوزک انڈسٹری اوج پر تھی، مگر پھر یکدم اس پر گراوٹ آنے لگی۔ ویڈیو اور البم ریلیز کرنے کا سلسلہ تھم گیا۔ فواد بھی اپنے بینڈ سے الگ ہوگئے۔ انفرادی حیثیت ان کی گائیکی کو زیادہ توجہ نہیں ملی۔ ماڈلنگ وہ کرتے رہے۔ اسی زمانے میں محبت کے تجربے سے گزرے، جو شادی پر منتج ہوا۔ 12 نومبر 2005 کو صدف خان سے رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شادی کے بعد ہی ان کی خوش قسمتی کا سفر شروع ہوا۔ انھوں نے اپنی بیگم کے ساتھ فیشن ڈیزائننگ کا تجربہ کیا اور ایک اپنا برانڈ لانچ

کیا۔

وہ ایکٹنگ بھی کرتے رہے۔ معروف ہدایت کار شعیب منصور کی نظران پر پڑی، جو پاکستانی انڈسٹری کی خستہ حالی کے باوجود ایک معیاری فلم بنانے کا ارادہ باندھ بیٹھے تھے۔ اور یہ فلم تھی "خدا کے لیے" اس کے لیے انھوں نے فواد کو کاسٹ کیا۔ 2007 میں ریلیز ہونے والی اس بلاک بسٹر فلم میں انھوں نے سرمد کا یادگار کردار نبھایا۔ اس فلم کا چرچا ہندوستان، امریکا اور برطانیہ میں بھی ہوا۔ فواد خان کو اس وقت بھی ہندوستان سے آفر ہوئی تھی، مگر وہ کردار اتنے جان دار نہیں تھے۔ پھر اس وقت دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی عروج پر تھی۔

فواد اب انجم شہزاد کے سفری ڈرامے "ست رنگی" میں نظر آئے۔ 2010 وہ ڈرامے "داستان" میں جلوہ گر ہوئے، تو پہلے اس وجیہہ اداکار کو سنجیدگی سے لیا گیا۔ اب انھیں ایک ماڈل کے بجائے ایک فن کار کے طور پر دیکھا جارہا تھا۔ آنے والے برس وہ "پیار کا پاگل پن" اور "اکبری اصغری" میں نظر آئے۔ 2011 میں ان کا ستارہ چمکا، جب انھوں نے "ہمسفر" میں ماہرہ خان کے مدمقابل اشعر کا یادگار رول کیا اور لاکھوں افراد کو گرویدہ بنالیا۔ اس کے لیے انھوں نے بہترین اداکار کا لکس ایوارڈ حاصل کیا۔

اگلے برس پر "زندگی گلزار ہے" ٹیلی کاسٹ ہوا، تو جیسے تہلکہ مچ گیا۔ صنم سعید کے ساتھ ان کی جوڑی نے دھوم مچا دی۔ ڈراما سپرہٹ ثابت ہوا۔ کتنے ہی ایوارڈز ان کی جھولی میں آن گرے۔ اس کی شہرت بیرونی دنیا میں بھی پہنچی۔ یہ مڈل ایسٹ، یورپ اور انڈیا کے چینلز سے ٹیلی کاسٹ ہوا۔ انڈیا میں اس نے سماں باندھ دیا۔ ہندوستان کے مختلف چینلز سے چھ بار نشر ہوا۔ اسی نے فواد خان کو پڑوسی ملک میں موضوع بحث بنادیا۔

انھوں متعدد آفرز ہوئیں۔ انھوں نے سکسینا گھوش کی فلم "خوبصورت" کا انتخاب کیا، جس میں سونم کپور ان کے مدمقابل تھیں۔ فلم نے اچھا بزنس کیا، تو اس کی وجہ فواد خان ہی ٹھہرے، جنھیں دیکھنے کے لیے نوجوان نسل نے تھیٹر کا رخ کیا۔ پاکستان اور مڈل ایسٹ میں بھی یہ بہت مقبول ہوئی۔ پھر وہ "کپور اینڈ سنز" میں نظر آئے۔ اس فلم کو شان دار رسپانس ملا۔ ناقدین اور ناظرین نے فواد خان کی اداکاری کو جی کھول کر سراہا۔ یہ طے ہوگیا کہ ان کا مستقبل روشن ہے۔ جس وقت یہ سطریں لکھی جارہی ہیں، ان کی "فلم اے دل ہے مشکل" ریلیز ہونے کو ہے۔ جو معروف ہندوستان ڈائریکٹر کرن جوہر کا پراجیکٹ ہے۔

اگرچہ آج حالات کشیدہ ہیں، پاکستانی اداکاروں پر ہندوستان میں پابندی لگ چکی ہے، مگر فواد خان کے مانگ میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ وہ پاکستان میں بھی کچھ پراجیکٹس پر کام کررہے ہیں۔ خبریں ہیں کہ فلم "وار" کے ہدایت کار کامران لاشاری "مولا جٹ" کا دوسرا پارٹ بنارہے ہیں، جس میں فواد کلیدی کردار نبھائیں گے۔ اگرچہ فواد نے کئی کامیابیاں حاصل کرلیں ہیں، مگر ماہرین کا خیال ہے کہ ابھی اس ستارے کو مزید چمکنا ہے، بلاشبہ ان کا مستقبل درخشاں ہے۔

موسیقی سے وہ کنارہ کش ہوچکے ہیں، اب اداکاری ان کی کل وقتی مصروفیت ہے۔ وہ سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

☆ شیخ رشید

ان کے بغیر پاکستان کی موجودہ سیاست کا تذکرہ ادھورا ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں ان جیسا دلچسپ اور شوخ آدمی پاکستانی سیاست میں نہیں گزرا۔ بلا کے پُراعتماد ہیں۔ پیش گوئیوں کے بے تاج بادشاہ سمجھے جاتے ہیں۔ گذشتہ تین برس سے ٹی وی چینلز پر چھائے ہوئے ہیں۔ سگار ہاتھ میں لیے اینکر پرسنز کے سوالوں کے جواب دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی چینل میں نہیں بیٹھتے۔ ہمیشہ اکیلے ہوتے ہیں۔ ایک گھنٹے کے پروگرام میں حکومت کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، تبدیلی کے امکانات کا ذکر کرتے ہیں اور ان تاریخوں کا اعلان کرتے ہیں، جب حکومت ڈھے جائے گا۔ آج کل وہ تحریک انصاف کے قائد عمران خان کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ گو کسی زمانے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے۔ کچھ حلقوں کا خیال ہے کہ عمران خان کی احتجاجی تحریک کو فکری بنیاد انھوں نے ہی فراہم کی۔

شیخ رشید کی شہرت کا ایک حوالہ لال حویلی بھی ہے، جو پنڈی کی پہچان ہے۔ اور پنڈی ان کا آبائی حلقہ ہے۔ وہاں سے انھیں شکست دینا ناممکن نہیں، تو مشکل ضرور ہے۔ مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ عوامی آدمی ہیں۔ سڑک پر، کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ناشتا کرلیتے ہیں، عام لوگوں میں گھل مل جاتے ہیں، بہت سے ووٹرز کو ان کے نام سے جانتے ہیں۔ ملتے ہیں ان کے بال بچوں کا پوچھتے ہیں۔

ان کے حالات زندگی پر نظر ڈالنے سے قبل ان کی شہرت کا ایک اور حوالہ بھی سن لیجیے۔ گو عمر 65 برس ہو گئی ہے، مگر شیخ صاحب اب تک غیر شادی شدہ ہیں۔ یہ موضوع بھی زیر بحث رہتا ہے۔ اسکینڈلز بھی بنتے ہیں۔ کبھی کبھار مخالفین یہ بھی کہتے نظر آتے ہیں کہ انھیں شادی کر لینی چاہیے۔ جہاں تک شیخ صاحب کا تعلق ہے، وہ یہی کہتے ہیں کہ ان کی اولاد نہیں ہے، کوئی وارث نہیں، سو کبھی کرپشن کرنے، غیر ملکی اکاؤنٹ میں پیسے جمع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

شیخ صاحب پاکستانی عوام کو درپیش مسائل سے بخوبی آگاہ ہیں کہ وہ خود 6 نومبر 1950 کو پنڈی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کرسچن ہائی اسکول کے طالب علم رہے۔ میدان سیاست میں طالب علمی کے زمانے میں قدم رکھ دیا تھا۔ ساٹھ کی دہائی میں ایوب خان مخالف تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پھر گورڈن کالج راولپنڈی کا رخ کیا۔ ادھر کالج کی طلبہ یونین کے صدر منتخب ہوئے۔

1973 میں پنجاب یونیورسٹی سے انھوں نے ایل ایل بی کیا۔ عملی سیاست میں آنے سے قبل کچھ عرصے مختلف صنعتی اداکاروں سے منسلک رہے۔ تعلیمی سلسلہ بھی جاری رکھا۔ 1982 میں پنجاب یونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ اس زمانے میں پنڈی کی طلبا سیاست میں ان کا ڈنکا بجا کرتا۔ ایم اے کے بعد وہ اصغر خان کی جماعت تحریک استقلال کا حصہ بن گئے، مگر یہ تعلق زیادہ عرصے قائم نہیں رہا۔

میونسپل کارپوریشن راولپنڈی ان کی پہلی منزل تھی۔ 1984 میں بلدیاتی کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ یہ تجربے پنڈی کی سیاست میں قدم جمانے میں معاون ثابت ہوا۔ 1985 میں انھوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فورم سے عام انتخابات میں حصہ لیا اور قومی اسمبلی کی نشست جیتنے میں کامیاب رہے۔ یہ غیر جماعتی انتخابات تھے۔ وہ محمد خان جونیجو کے زمانے میں آزاد پارلیمانی گروپ کے سب سے فعال رکن تھے، جس کے سربراہ فخر امام تھے۔ 1988 کے عام انتخابات میں اپنی شعلہ بیانی اور پرزور عوامی خطابات کے بل پر وہ پیپلز پارٹی کے امیدوار جنرل ٹکا خان کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ البتہ وفاق میں حکومت پی پی نے بنائی اور محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بنیں۔ اپنے کاٹ دار اور ذو معنی تبصروں کے باعث وہ مخالفین کے لیے ناپسندیدہ ٹھہرے، مگر ان کے سیاسی سفر میں گراوٹ نہیں آئی۔

1990 کے انتخابات میں بھی وہ پنڈی سے فاتح رہے۔ اب ن لیگ کی حکومت بنی اور میاں محمد نواز شریف نے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔ نواز شریف کے اوّلین دور میں شیخ رشید صاحب پہلے مشیر اطلاعات و نشریات، پھر وزیر صنعت و حرفت مع اضافی چارج سیاحت و ثقافت مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں میاں صاحب کے بہت قریب تھے۔ وہ تصاویر بھی موجود ہیں، جس وہ میاں صاحب کے گال پر بوسہ لے رہے ہیں۔ 1993 کے انتخابات میں بھی پنڈی نے ان پر اعتبار کیا۔ پی پی پھر حکومت میں تھی۔ انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں محترمہ اور ان کے حواریوں پر تنقید جاری رکھی۔ یہ شوق انھیں مہنگا پڑا۔ لال حویلی میں کلاشنکوف رکھنے کے جرم میں وہ گرفتار رہے۔ کچھ ماہ جیل رہے۔

1997 میں لگاتار تیسری بار انھوں نے پنڈی فتح کیا۔ وہ میاں نواز شریف کی کابینہ میں بطور وزیر شامل ہوئے۔ پرویز مشرف نے جب میاں صاحب کا تختہ الٹا، تو مسلم لیگ ن بکھرنے لگی۔ کچھ ارکان الگ ہو کر ق لیگ کا حصہ بن گئے۔ اوائل میں تو وہ ن لیگ کے ساتھ ہی نظر آئے، مگر پھر خبریں آنے لگیں کہ ان کے اور ن لیگ کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ انھوں نے آزاد امیدوار کے طور پر پنڈی سے الیکشن لڑا اور زبردست کامیابی حاصل کی، جس کے بعد وہ ق لیگ کی حکومت کا حصہ بن گئے۔ اس دور میں وہ ہر محاذ پر پرویز مشرف کی حمایت کرتے نظر آتے۔ پہلے وہ وزیر اطلاعات اور پھر وزیر ریلوے بنے۔ البتہ وقت تیزی سے بدل رہا تھا۔ وکلا تحریک نے پرویز مشرف کو کمزور کیا۔ 2008 کے انتخابات میں ق لیگ کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ شیخ رشید کے مدمقابل مخدوم جاوید ہاشمی تھے، انھوں نے بری طرح شکست کھائی۔ وہ ان ابتدائی ق لیگی رہنماؤں میں سے تھے، جنھوں نے ٹی وی پر آ کر شکست تسلیم کی۔ گو انھوں نے پرویز مشرف پر تنقید نہیں کی، مگر ق لیگ سے الگ ہو کر عوامی مسلم لیگ نامی ایک نئی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ کچھ عرصے

خاموش رہنے کے بعد 2010 میں وہ پھر سیاست میں سرگرم ہو گئے۔ پنڈی کے ایک حلقے سے ضمنی انتخابات میں حصہ لیا، مگر مسلم لیگ ن کے شکیل اعوان کے ہاتھوں انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یوں لگتا تھا کہ ان کا کیریر ختم ہو جائے گا، مگر عمران خان کا ساتھ ملنے کے بعد ان کی ساکھ بہتر ہونے لگے۔ وہ ان کے جلسوں میں تقریر کرتے اور مسلم لیگ، بالخصوص شریف خاندان کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے۔ 2013 کے انتخابات میں تحریک انصاف کی حمایت ان کے کام آئی اور وہ الیکشن جیتنے میں کامیاب رہے۔ گو شیخ رشید کے مزاج میں اب پہلی جیسی شوخی نہیں رہی، مخالفین پر بھی متنازعہ جملہ نہیں کستے، مگر جوش و خروش سے آج بھی بھرپور ہیں۔ اور یوں لگتا ہے یہ سلسلہ 2018 تک جاری رہے گا۔

☆ وقار الملک (کرشن چندر)

انھیں اردو کا محسن کہا جا سکتا ہے۔ خود تو ادب عالیہ تخلیق کر کے اس خوبصورت زبان کی ترویج کی ہی، ان کے خاندان نے اس نیک عمل میں اپنا حصہ ڈالا۔ ان کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ نے اردو افسانوں کو ایک نئے اسلوب سے متعارف کروایا۔ ان کی بہن سرلا دیوی نے بھی معیاری فکشن لکھا۔ ان کے بہنوئی ریوتی شرن شرما نے اردو ڈرامے اور اسٹیج کو زندہ کیا تھا۔ الغرض کرشن چندر کا پورا خاندان اردو کا عاشق تھا۔ اسی عشق کا نتیجہ ہے کہ آج اردو پڑھنے والے اس قلم کار سے محبت کرتے ہیں۔

اور پھر ان کی زندگی کا ایک اہم پہلو اور ہے۔ انھوں نے زندگی کے آخری برسوں میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ دراصل انھوں نے اردو کے معروف ادیب رشید صدیقی کی صاحب زادی سلمٰی صدیقی سے شادی کی تھی، جو خود بھی ادیبہ تھیں۔ ان سے شادی سے قبل کرشن چندر مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کا اسلامی نام وقار الملک تھا، جو انھوں نے خود منتخب کیا۔ سلمٰی صدیقی نے اپنی مختصر آپ بیتی "بیت گئی جیسی بیتی" میں انکشاف کیا، یہ ان کے بچپن کے دو دوستوں (وقار اور ملک) کے ناموں کو یکجا کر کے بنایا گیا تھا۔ ان کا نکاح 7 جولائی 1961 کو نینی تال میں ہوا۔ نینی تال کی مسجد کے امام نے نکاح پڑھایا۔

گو وہ دہلی میں بھی رہے، لکھنؤ میں وقت گزرا، لیکن جس شہر سے کرشن چندر کو عشق تھا، وہ لاہور تھا۔ وہ لاہور سے محبت کرتے تھے اور زندگی کے آخری دنوں میں ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح ایک بار پھر لاہور پہنچ جائیں۔ انھوں نے بیگم کو بھی وصیت کی تھی کہ اگر حالات ناقابلِ برداشت ہو جائیں، تو وہ پاکستان چلی جائیں، جہاں کرشن کے دوست اور چاہنے والے انھیں پورے احترام اور محبت سے اپنا لیں گے۔

اردو کا یہ ممتاز فکشن نگار 23 نومبر 1914 کو وزیر آباد، ضلع گجرانوالہ میں پیدا ہوا۔ ان کے والد گوری شنکر چوپڑا ڈاکٹر تھے۔ (کچھ ویب سائٹس کے مطابق انھوں نے راجستھان کے علاقے بھرت پور میں آنکھ کھولی تھی، جہاں ان کے والد ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے) گھرانے میں تعلیم کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ ابتدا ہی میں فارسی اور اردو سے ناتا جڑ گیا۔ پھر اس زمانے میں اردو کا چلن تھا۔ وہی دفتری زبان تھی۔ یہ تو تقسیم کے بعد ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط کا رواج ڈالا گیا۔ کرشن کا بچپن جموں کشمیر کے شمال میں واقع ریاست پونچھ کے سرسبز علاقے میں گزرا۔ اس زمانے میں ان کے والد مہاراجا پونچھ کے طبیب خاص تھے۔ اس علاقے نے ان کے ذہن پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ ان کا ناول "شکست" کشمیر ہی کے پس منظر میں ہے۔ اسی طرح ایک اور مقبول ناول "مٹی کے صنم" بھی ایک نوجوان کے کشمیر میں بیتے دنوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس علاقے کی جھلک ناول "غدار" میں بھی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں بھی ہمیں کشمیر کا حسن اور وہاں کا کرب نظر آتا ہے۔ ناقدین کے مطابق ان کے ابتدائی افسانوں میں رومانویت کا عنصر کشمیر کے حسن اور پنجاب کی ہریالی کی دین تھا، مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے، ان کے قلم میں پختگی آتی گئی۔ سماجی معاملات ان کی تخلیق میں در آئے اور حقیقت پسندی کی فضا بنتی چلی گئی۔

قابل طالب علم تھے۔ 1929 میں ہائی اسکول کا مرحلہ طے کیا۔ انگریزی پر انھیں گرفت حاصل تھی۔ فارمین کرسچن کالج میں وہ کالج میگزین ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ 1935 میں انگریزی میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ 1932 میں ان کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ 1936 میں ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس ہوا، جس کی صدارت پریم چند نے

کی۔ اس واقعے نے اردو ادب پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ کرشن چندر بھی اپنی کہانی کی رومانوی فضا سے نکل آئے۔ اب وہ معاشی، سیاسی اور سماجی خامیوں کی نشان دہی کرتے نظر آتے۔ مذہبی تعصبات، آمرانہ نظام اور تیزی سے اُبھرتا دولت مند طبقہ ان کے افسانوں کا موضوع بن گیا۔ ان کا قلم زندگی گزرنے کے اعلیٰ ترین معیارات تک رسائی کی کوشش میں جتا تھا۔ زبان پر انھیں گرفت تھی۔ کہانی بیان... کرنے کا ہنر ان کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔ وقت کے ساتھ انھیں پڑھنے والوں کا ایک حلقہ پیدا ہوگیا۔ ان کے فکشن کی اثر پزیری بڑھتی گئی۔ ان کے افسانے ”کالو بھنگی“، ”مہالکشمی“ اور ”ایک گدھے کی سرگزشت“ ماسٹر پیس قرار پائے۔ ان کے ناولوں کا چرچا بھی ہونے لگا۔ شہرت کے میدان میں انھوں نے اپنے ہم عصروں کو شکست دے دی تھی۔

تقسیم کے واقعے نے انھیں شدید متاثر کیا۔ اس کے اثرات ان کی کہانیوں پر واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔ بٹوارے سے جڑے قصے ان کے قلم کی قوت سے ”اندھے“، ”لال باغ“، ”امرتسر“ اور ”پشاور ایکسپریس“ جیسی کہانیوں میں ڈھلے، جن میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کی آرزو جھلکتی ہے۔ ان کے خیالات اتنے پُراثر ہیں کہ سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں۔ ادب کے ساتھ ساتھ انھوں نے فلمی دنیا میں بھی نام کمایا۔ کئی یادگار فلموں کے اسکرپٹ لکھے۔ ”من چلی“، ”شرافت“، ”دل کی آواز“، ”دو چور“، ”دھرتی کے لال“، ”دو پھول“ میں ان کے قلم کا جادو جھلکتا ہے۔

بقول گوپی چند نارنگ ”کرشن چندر اردو افسانے کی روایت کا ایک ایسا لائق احترام نام ہے، جو ذہنوں میں برابر سوال اٹھاتا رہے گا۔ ان کا نام پریم چند کے بعد تین بڑے افسانہ نگاروں میں آئے گا۔“ رومانوی افسانے گو انھوں نے بعد کے برسوں میں کم کم لکھے، مگر انھیں پڑھنے والا ایک بڑا حلقہ موجود ہے۔ ”زندگی کے موڑ پر“ اور ”بالکونی“ میں رومانوی عنصر تو ہے، مگر یہ قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ اس موضوع پر حسن عسکری نے یوں روشنی ڈالی۔ ”تھوڑی دیر کے لیے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ افسانے رومانی ہیں، تب بھی کرشن چندر کی رومانیت دوسروں سے کافی مختلف ہے۔ وہ رومان کی تلاش میں ہجرت کر کے مالدیپ نہیں جاتا، بلکہ یہ کوشش کرتا ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں رومان کے امکانات ہیں یا نہیں۔ درحقیقت یہ افسانے رومانی نہیں ہیں، بلکہ رومان کے چہرے سے نقاب اٹھاتے ہیں۔

ان کے ناولوں پر بات کرنے کے لیے الگ مضمون درکار۔ البتہ ایک کا تذکرہ ضروری ہے۔ یہ تھا ناول ”ایک گدھے کی سرگزشت“ جس نے انھیں اردو ادب میں ایک نئی شناخت عطا کی۔ اس میں طنز بھی تھا اور مزاح بھی۔ ایک نقاد کے مطابق کرشن چندر نے ایک گدھے کا سہارا لے کر اس وقت کے حکمرانوں کو کچھ اس انداز میں نشانہ بنایا ہے کہ وہ زخمی تو ہوتے ہیں، لیکن مصنف پر کسی طرح کا الزام عائد نہیں کر پاتے۔ یہ ناول ”شمع“ میں قسط وار شائع ہوا۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے ختم ہونے کے بعد قارئین کے اصرار پر اس کا دوسرا حصہ ”گدھے کی واپسی“ بھی لکھا گیا۔ اس کا تیسرا حصہ بھی آیا۔ تینوں ہی ناولوں نے بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔ کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔

اس عظیم تخلیق کار کا 8 مارچ 1977 کو ممبئی میں انتقال ہوا۔ یہ اردو کے لیے ایک عظیم سانحہ تھا۔ اردو کے اس عاشق کا آخری دم تک قلم سے ناتا رہا۔ موت سے کچھ گھنٹے قبل انھوں نے ”ادب برائے بطخ“ کے نام سے ایک مضمون شروع کیا تھا۔ ان کی آخری رسومات کے موقع پر قرآن خانی ہوئی۔ ان کی بیوہ سلمیٰ صدیقی نے کہا تھا کہ انھیں دفن کیا جائے کہ وہ مسلمان تھے مگر بیٹوں کی مداخلت پر ان کی رسومات ہندو مذہب کے مطابق ادا کی گئیں۔

☆ غلام مصطفیٰ جتوئی

سیاست ان کی گھٹی میں تھی۔ جدی پشتی سیاست داں تھے۔ بٹوارے سے پہلے ہی ان کے خاندان کو سندھ کی سیاست میں اہم مقام حاصل ہوگیا تھا۔ انھوں نے خاندانی گدی سنبھالی۔ اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔ ایک زمانے میں ہم نے انھیں پیپلز پارٹی کے پلیٹ فورم سے متحرک دیکھا۔ ان کا شمار بااثر شخصیات میں ہوتا تھا۔ بعد میں انھوں نے نیشنل پیپلز پارٹی قائم کی۔ ایک موقع پر وہ نگراں وزیراعظم رہے۔ بعد میں ان کے بیٹوں نے سیاست میں قدم رکھا اور اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ سندھ کی سیاست میں

بہت کم شخصیات نے وہ مقام حاصل کیا، جو غلام مصطفیٰ جتوئی کو حاصل تھا۔

غلام مصطفیٰ جتوئی 14 اگست 1931 کو ضلع نواب شاہ کے علاقے نیو جتوئی میں پیدا ہوئے۔ ان کے حالات زندگی کھنگالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دادا خان بہادر امام بخش خان جتوئی تقسیم سے قبل تین بار ممبئی قانون ساز اسمبلی کے ممبر رہے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے گھرانے کو علاقائی سیاست میں خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ وہ قابل طالب علم تھے۔ پہلے کراچی گرامر اسکول میں کچھ وقت گزارا۔ پھر 1952 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ چلے گئے، تاہم خاندانی مسائل کی وجہ سے لوٹنا پڑا۔ اسی زمانے میں سیاسی سفر شروع ہوا۔ نوابشاہ کے ڈسٹرکٹ بورڈ کا چیئرمین بننا پہلی کامیابی تھی۔ وہ اس عہدے پر فائز ہونے والے سب سے کم عمر شخص تھے۔ 1958 میں مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، تو یہ واضح ہو گیا کہ ان کا مستقبل روشن ہے۔ 1965 میں بھی الیکشن میں کامیابی حاصل کی۔ بھٹو صاحب کی آمد کے بعد سندھ میں فضا بدلنے لگی۔ نوجوان ان کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ جتوئی صاحب کو بھی ان کے نعرے نے متاثر کیا۔ 1969 میں پیپلز پارٹی کا حصہ بن گئے۔ اس نوزائیدہ جماعت نے حیران کن کامیابی حاصل کی۔ بھٹو کی کابینہ میں سیاسی امور، پورٹ اینڈ شپنگ، کمیونی کیشن، قدرتی وسائل، ریلوے اور ٹیلی کمیونی کیشن کی وزارتیں سنبھالیں۔ وہ بھٹو کے قریب سمجھے جاتے تھے۔ اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ 1973 میں وزیر اعلیٰ سندھ کا عہدہ سنبھال لیا۔ کہا جاتا کہ ان ہی کے دور میں سندھ میں سب سے زیادہ ترقی ہوئی۔ 1977 تک اس عہدے پر رہے۔ مارشل لا لگنے کے بعد انھوں نے ایم آر ڈی کی تحریک میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس دوران گرفتار ہوئے، مشکلات برداشت کیں۔ البتہ حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ انھوں نے پی پی سے علیحدگی اختیار کر لی اور نیشنل پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ کئی بڑے لیڈروں نے اس جماعت میں شمولیت اختیار کی۔ ایک زمانے میں لگتا تھا کہ یہ جماعت سندھ کی سیاست ٹیک اوور کر لے گی، مگر محترمہ کی وطن واپسی سے حالات بدلنے لگے۔

1988 میں وہ اسی جماعت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، جس کے پلیٹ فورم سے وہ وزیر اعلیٰ بنے تھے۔ پی پی کے خلاف اسلامی جمہوری اتحاد بنایا گیا، تو انھیں مرکزی عہدہ ملا۔ رکن قومی اسمبلی منتخب ہونے کے بعد اپوزیشن لیڈر کے

گیلیلیو، نیٹ ورک

(Network ,Galileo)

یورپی خلائی سیاروں کا عالمی نیٹ ورک۔ یہ منصوبہ 2007ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور اس پر یورپی یونین کا ۱۱ ارب یورو خرچ ہوا۔ اس میں تیس سیارے شامل ہیں اور منصوبے کی تکمیل پر یورپی یونین کی خلائی صنعت کو فروغ حاصل ہوا اس منصوبہ کی منظوری مارچ 2002ء میں دی گئی تھی۔

مشتری

2 مارچ 2001ء کو اس سیارے کے مزید گیارہ چاند دریافت ہوئے جس سے اس کے چاندوں کی تعداد 28 جب کہ پورے نظام شمسی کے کل چاندوں کی تعداد 91 ہے۔ نو دریافت شدہ چاندوں کا حجم چار سے آٹھ کلومیٹر ہے۔

مرسلہ: نوازش، کراچی

روپ میں نظر آئے۔ بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت برطرف کیے جانے کے بعد ملک کے نگران وزیر اعظم بنے۔ بعد میں پی پی ہی کی قیادت میں نواز شریف کے خلاف شروع ہونے والی تحریک میں حصہ لیا۔ کچھ برس بعد وہ غیر فعال ہو گئے۔ وقت کے ساتھ انھیں بیماریوں نے گھیر لیا۔ 20 نومبر 2009 کو لندن میں انتقال کر گئے۔

شوبز کی نگری اور نومبر

پاک و ہند کی کئی ممتاز شوبز شخصیات کی یادیں ماہ نومبر سے جڑی ہیں۔ یا تو اس ماہ ان کی سالگرہ منائی جاتی ہے یا برسی۔ چلیں، خوابوں کی اس نگری کی معروف ہستیوں پر بھی سرسری نظر ڈال لیں۔

☆ شباب کیرانوی

انھیں پاکستانی فلمی تاریخ کا سب سے بڑا فلم ساز کہا جاتا ہے۔ 75 کے قریب فلمیں پروڈیوس کیں۔ نصف درجن

فلموں کی ہدایت کاری کا فریضہ انجام دیا۔ ان کے طفیل ہمیں کئی یادگار گیت ملے۔ انھوں نے انڈسٹری کو انسانیت، سنگدل، دامن اور چنگاری، میرا نام ہے محبت، کیلی، نوکر، آئینہ جیسی کامیاب فلمیں دیں۔ طبقاتی تفریق کے خلاف آواز اٹھائی۔ اقدار کی اہمیت اجاگر کی۔ مضبوط مشرقی عورت کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ان کی ہدایت کاری میں ننھا، علی اعجاز، رنگیلا اور منور ظریف کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آئیں۔ انھیں یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انھوں نے انڈسٹری کو نئے چہرے دیے۔

یہ شباب کیرانوی کا تذکرہ ہے، جنھوں نے 1925 میں اتر پردیش میں آنکھ کھولی۔ صحافت سے کیریر شروع کیا۔ "جلن" ان کی پروڈیوس کردہ پہلی فلم تھی۔ "ثریا" سے بطور ہدایت کار کیریر اپنا سفر شروع کیا۔ ان کی فلم "مہتاب" بلاک بسٹر فلم تھی۔ اس کے بعد انھوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اپنا اسٹوڈیو بنا کر کئی یادگار فلمیں بنائیں۔ ایم اشرف ان کی فلمیں موسیقی دیا کرتے تھے۔ یہ جوڑی کامیابی کی علامت تھی۔

5 نومبر 1982 کو ان کا انتقال ہوا۔ ادب بھی ان کا ایک حوالہ تھا۔ شعری میدان میں وہ احسان دانش کے شاگرد تھے۔ "موج شباب" اور "بازار صدا" کے نام سے شعری مجموعے شایع ہوئے۔ ناول بھی لکھے۔ کچھ حلقے ان پر بھارتی فلمیں چربہ کرنے کا الزام عائد کرتے ہیں۔

☆شفیع محمد شاہ

شفیع محمد شاہ کا شمار 80 اور 90 کی دہائی کے اہم ترین فنکاروں میں ہوتا ہے۔ اپنے تیس سالہ کیریر میں وہ اردو اور سندھی کے 50 ڈراما سیریلز اور سو سے زاید ٹی وی پلے میں جلوہ گر ہوئے۔ ان کی شخصیت بڑی باوقار تھی۔ ایک خاص نوع کا ٹھہراؤ تھا۔ 1985 میں انھوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کی جانب سے بہترین اداکار کا ایوارڈ اپنے نام کیا۔ وہ شاہ جی کے نام سے معروف تھے۔ انھوں نے 1949 میں کنڈیارو میں آنکھ کھولی۔ ریڈیو حیدرآباد سے بطور صداکار اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ ریڈیو کے ڈراموں نے خود کو دریافت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ جام شورو سے گریجویشن کرنے کے بعد وہ کیریر بنانے کے لیے کراچی آگئے۔

پی ٹی وی کے ڈرامے "تیسرا کنارہ" انھیں شہرت کی بلندیوں پر لے گیا۔ آنے والے برسوں میں انھوں نے چاند گرہن، دائرے، آنچ، بند گلاب اور محبت خواب کی صورت جیسے مقبول ڈرامے کیے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر وڈیرے اور سائیں کے کردار کیے۔ یہ بات شاید درست ہو، مگر وہ ورسٹائل تھے۔ جتنی خوبی سے سنجیدہ کردار کیے، اتنی ہی عمدگی سے رومانوی اور مزاحیہ کردار بھی نبھائے۔ ناظرین کے ساتھ ناقدین بھی ان کے قائل ہوگئے۔ جس ڈرامے میں وہ کام کرتے، وہ مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیتا۔ ان کے گھر کے باہر ہدایت کاروں کی لائن لگ گئی۔ انھوں نے فلمیں بھی کیں۔ وہاں بھی خود کو منوایا۔ کئی نوجوان فنکاروں کی انھوں نے رہنمائی کی۔

بعد کے برسوں میں سیاست میں بھی حصہ لیا۔ وہ پی پی کے پلیٹ فورم سے متحرک رہے۔ 2002 کے انتخابات میں بھی حصہ لیا۔ سماجی سطح پر بھی فعال تھے۔ 17 نومبر 2007 کو ان کا کراچی میں انتقال ہوا۔

☆امجد خان

پشاور نے پاک و ہند کی فلم انڈسٹری کو کئی سپر اسٹار دیے۔ پہلے دلیپ کمار (یوسف خان) نے راج کیا، پھر پشاور سے دہلی جانے والے ایک شخص کے بیٹے شاہ رخ خان نے اپنا سکہ جمایا۔ راج کمار اور ونود کھنہ کا تعلق بھی پشاور ہی سے تھا۔ یہی معاملہ حسن کی دیوی مدھوبالا کا تھا۔ اس طویل فہرست میں ہندوستانی تاریخ کے سب سے بڑے ولن امجد خان کا نام بھی شامل ہے، جو 12 نومبر 1940 کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ اس کلاکار نے 130 فلمیں کیں۔ "شعلے" اور "مقدر کا سکندر" کو ان کی اداکاری نے امر کردیا۔

ایکٹنگ کی صلاحیت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ اپنے وقت کے معروف اداکار ذکریا خان المعروف جے انت (Jayant) کے صاحب زادے تھے۔ تعلیم انھیں ممبئی لے گئی۔ تھیٹر سے انھوں نے اپنا کیریر شروع کیا۔ ''نازنین'' ان کی پہلی فلم تھی، جو 1951 میں ریلیز ہوئی۔ شروع میں انھیں شدید جدوجہد کرنی پڑی۔ چھوٹے موٹے رول ہی مل سکے۔ 1975 میں فلم ''شعلے'' میں گبر سنگھ کے رول کی پیشکش ہوئی۔ اس فلم نے انھیں راتوں رات سپر اسٹار بنا دیا۔ ان کا شمار ہر دلعزیز اداکاروں میں ہونے لگا۔ فلم قربانی، چکر پے چکر، لاوارث اور کالیا سمیت کتنی ہی فلموں میں انھوں نے یادگار رول کیے۔ بعد میں انھوں نے مزاحیہ رول بھی کیے۔ 27 جولائی 1992 کو اس شان دار اداکار کا انتقال ہوا۔

☆ پرویز ملک

گو انھوں نے فقط چند فلمیں بنائیں، مگر تمام سپرہٹ ثابت ہوئیں۔ ناظرین کو ان فلموں نے گرویدہ بنا لیا، ناقدین بھی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان کا نام معیار کی علامت بن گیا۔ ہر طرف ان ہی کا ڈنکا بجتا۔ یہ ذکر ہے 60 اور 70 کی دہائی کے معروف ہدایت کار پرویز ملک کا۔ ہیرا اور پتھر، ارمان، احسان، پہچان، تلاش، پاکیزہ، انتخاب، ہم دونوں، قربانی اور غریبوں کا بادشاہ جیسی یادگار فلمیں بنانے والے یہ باصلاحیت ہدایت کار سن 1937 میں کراچی میں پیدا ہوا۔ فلمی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد معروف ڈسٹری بیوٹر اور وحید مراد کے والد مالک نثار مراد کی سرپرستی نے ان کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں کلیدی

کردار ادا کیا۔ پرویز ملک نے امریکا سے فلم میکنگ کی تربیت حاصل کی۔ 1963 میں پاکستان لوٹنے کے بعد ایک میگزین ایسٹرن فلم میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہو گئے۔ وحید مراد سے ان کی دوستی تھی۔ وہ ان کے اسٹوڈیو سے منسلک ہو گئے۔ اس جوڑی نے ''ہیرا اور پتھر'' اور ''احسان'' جیسی کامیاب فلمیں بنائیں۔ ان کی فلم ''ارمان'' نے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ بعد میں اختلافات کی وجہ سے وہ وحید مراد سے الگ ہو گئے۔ انھیں تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ 18 نومبر 2008 کو ان کا انتقال ہوا۔

☆ نیرہ نور

پاک و ہند کی موسیقی میں غزل گائیکی کو نمایاں مقام حصہ ہے۔ اس صنف کے اہم ناموں میں نیرہ نور بھی شامل ہیں۔ انھیں ایک سادہ، کم گو اور شرمیلی فن کار کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ وہ 3 نومبر 1950 کو آسام میں پیدا ہوئیں۔ ان کے اجداد کا تعلق امرتسر سے تھا۔ ان کے والد مسلم لیگ کے فعال رکن تھے۔ تقسیم کے کچھ عرصے بعد یہ خاندان پاکستان آن بسا۔ گائیکی کی صلاحیت نیرہ نور میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ کانن دیوی اور بیگم اختر سے وہ بہت متاثر تھیں۔

پی ٹی وی نے ان کی شہرت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انھوں نے غالب، ناصر کاظمی، ابن انشا اور فیض احمد فیض کے کلام کو اتنی خوبصورتی سے گایا کہ سامعین عش عش کر اٹھے۔ ''اے جذبۂ دل گر میں چاہوں''۔ ''پھر ساون رت کی پون چلی تم یاد آئے''۔ ''اے عشق ہمیں برباد نہ کر''۔ ''جلے تو جلاؤ گوری'' جیسے یادگار گیت ان ہی کی جادوئی آواز میں ریکارڈ ہوئے۔ ''وطن کی مٹی گواہ رہنا'' جیسا مقبول ملی نغمہ انھوں نے ہی گایا۔ ایک جانب انھوں نے مہدی حسن جیسے کلاکار کے ساتھ اپنی آواز ہم آہنگ کی، دوسری طرف احمد رشدی کا ساتھ دیا۔ فلموں میں بھی ان کی سریلی آواز سنائی دی۔ اب وہ گائیکی سے کنارہ کش ہو چکی ہیں۔

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا آٹھواں حصہ

میں دوبارہ اس ہال نما کمرے میں آیا، ٹانگیں میز پر تھیں اور آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر سوچوں میں گم ہوگیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میرے لیے اندر جا کر مختلف مقامات پر کارڈ کو پنچ کرنا نہ ہوتا تو میں یہیں کہیں کوئی بندوبست کرکے سوجاتا مگر کیا یہ ویکن ہٹ والوں کی کارستانی تھی یا فیکٹری والوں کی یا دونوں کا مک مکا تھا کہ سیکیورٹی گارڈ کو چین سے سونے نہیں دینا اور اسی نتیجے میں مجھے وقفے وقفے سے فیکٹری کے مہیب سکوت میں چھلانگ لگانی تھی۔ کافی مشین ساتھ لگی تھی۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا، اسی لیے گرم کافی کا مگ بھرا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے گھونٹ بھرنے لگا۔ مجھے اس مقام پر اپنی تنہائی سے خوف آرہا تھا۔ ایسے محسوس ہورہا تھا کہ کسی پامال کھنڈر ہم رکاب برفانی طوفان میرے خوف میں اضافہ کررہا تھا۔ میں نے پہلا راؤنڈ لگانے کا فیصلہ کیا اور ڈرتے قدموں سے میں نے فیکٹری کے سناٹے میں اپنا قدم رکھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ سب مشینیں سکوت کے عالم میں کھڑی جیسے میرا ہی انتظار کررہی ہیں۔ اور مجھے اپنے درمیان پاکر چپکے سے ایک دوسرے کو اشارے کرتی ہیں کہ شکار آرہا ہے اور جیسے مجھے دیکھتے ہی چیخ و چلا کر اس کا تراہ نکال دو۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے مجھے دیکھتے ہی چلنا شروع کردیں گی اس خوف نے ذہن میں پنجے گاڑ دیے کہ اب یہ کہیں چل ہی نہ پڑیں۔ میں اسی دہشت سے لرزیدہ پہلی پنچنگ (Punching) مشین پر آیا مگر جیسے ہی کارڈ پنچ کیا تو جیسے کوئی دھماکا سا ہوا۔ ایک زوردار آواز کہیں دور سے ابھری اور اس گونج نے مجھے سہا دیا۔ میں خوف سے اچھل پڑا۔ ایک قیامت کا شور برپا ہوگیا تھا۔ جیسے پوری کائنات کسی زلزلے سے لرز رہی ہے۔ سب مل کر مجھ پر قہقہے لگا رہے ہیں۔ میں ہر جانب پھٹی آنکھوں سے تکنے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ شور اچانک ختم گیا اور ایسا سناٹا چھایا کہ سوئی بھی گرے تو گونج سنائی دے، سانس کی آواز بھی سماعت شکن لگے۔ ایسے منجمد کردینے والے سکوت کے بعد ایسا قیامت کا شور اور پھر وہی سکوت، میں تو کانپ گیا تھا اور خوف کی تیز لہر پورے جسم میں دوڑنے لگی۔

میں ڈرا سہما کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ مذاقاً نہیں حقیقتاً لرزہ طاری ہوگیا تھا۔ کچھ دیر وہ شور جاری رہا تھا اور پھر آہستہ آہستہ دم توڑ گیا۔ سکوت چھاتے ہی میں نے سکون کا سانس لیا اور بھاگ کر دوبارہ آفس میں آبیٹھا۔ وہ سکوت برقرار رہا تو میں ایک سکون کی کیفیت اپنے پر طاری کرنے لگا اور پیر پھیلا کر کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ ابھی کمر سیدھی بھی نہ ہوئی تھی کہ وہی شور دوبارہ سے شروع ہوگیا اور پھر سے وہی بے چینی رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ یہ کھیل تو صبح تک جاری رہا کہ میں جیسے ہی مطمئن انداز میں پیر پھیلاتا تو کان کے پردے بجنے لگتے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ وقفے وقفے سے بوائلر چلنا شروع ہوجاتا ہے۔ اتنی بڑی فیکٹری کا بوائلر اپنے حجم میں کتنا بڑا ہوگا، اس کا اندازہ آپ بھی لگا سکتے ہیں۔ مجھے تو اس کے شور وغوغے سے اندازہ ہوگیا تھا۔ بوائلر خاموش ہوا تھا تو وہی ابدی سکوت آنازل ہوجاتا تھا اور میں بھاگ بھاگ کر ہر مشین کی جانب جاتا اور کارڈ پنچ کرکے پھر دوڑ لگا دیتا۔ میں اس آسیب

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

زدہ ماحول میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا۔ واپس دفتر میں آتا تو سکون کا ذرا سانس ملتا تھا۔

میں سہما ہوا تھا اور اپنا ڈر کم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا سو اپارٹمنٹ کا فون ملایا۔ سرجی نے فون ریسیو کیا۔ میری آواز سنتے ہی بولنے لگے۔ ''مزے ہو رہے ہیں؟''

''آپ کیا کر رہے ہیں؟'' ان کے سوال کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

جواب ملا۔ ''باہر کے موسم سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔''

میں پہلے تو گھبرایا کہ کہیں پھر سے وہ باہر تو نہیں نکل گئے اس لیے ذرا سختی سے پوچھا تو کہنے لگے۔ ''باہر جانے کی قسمت کہاں؟ سارے خواب آپ نے توڑ ڈالے۔ شہباز بھی اب کہتا ہے کہ باہر نکلے تو ندیم بھائی کو بتا دوں گا۔''

''شہباز سے بات ہوئی تو وہ روہانسی آواز میں خبر دے رہا تھا کہ اسے مقامی لائبریری میں سیکورٹی گارڈ کی شفٹیں ملی ہیں اور کل سے وہ لائبریری جا رہا ہے۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''صبح سرجی کو کیئرن سینٹر لے جانا ہے اور ان کی بھی رجسٹریشن کروانا ہے تاکہ ان کی بھی Resume بنانے اور انٹرویو دینے کی تیاری ہو جائے۔''

یہ سن کر کہنے لگا۔ ''یہ سیاپا مجھ سے نہیں سنبھلتا...... آپ خود لے جانا۔''

میرے اصرار پر وہ بمشکل راضی ہوا۔ تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔

میری وہ رات دھیمے دھیمے کٹتی رہی۔ میں ہر گھنٹے بعد ایک لمبی دوڑ لگا کر ایک مشین سے دوسری مشین پر جاتا اور کارڈ پنچ کر کے واپس آفس میں بند ہو جاتا۔ دھیرے دھیرے رات کی تاریکی شیشے سے باہر ہلکی روشنی میں بدلنے لگی۔ برفانی جھکڑ تھم کر وہیں منجمد ہو چکے تھے۔ سات بجنے کو تھے اور اب مجھے سپروائزر کا انتظار تھا۔ جب ساڑھے سات بج گئے تو میں بے چین ہونے لگا۔ ایک ڈراؤنا خیال آیا کہ اگر سپروائزر نہیں آیا تو کیا ہوگا؟ یہ چابیوں کا بھاری گچھا مجھ سے کہاں سلجھے گا۔ ورکرز کے لیے لاک کیسے کھولوں گا؟ میرے اندر وہم کے طوفان اٹھنے لگے تھے۔ میں اپنے ذہن سے یہ وہم جھٹکتا مگر وہ کسی گندے خیال کی مانند پھر اپنا وار کر دیتے۔ میں گھبرا گیا اور اسی گھبراہٹ میں باہر نکل کر گیٹ کو دور سے تکنے لگا۔ باہر منجمد کر دینے والی سردی نے ارد گرد جیسے برفانی دیواریں بنا ڈالی

تھیں۔ اگر میں اندر سے گلاس میں بھرا پانی فضا میں اچھالتا تو وہ وہیں فضا میں برف بن جاتا۔ میں چند منٹ کے لیے بھی یہ سردی برداشت نہ کرسکا اور دوڑ کر دوبارہ آفس میں آگھسا اور شیشے سے پار دیکھنے لگا کہ شاید سپروائزر آرہا ہو۔

پونے آٹھ بجے تو میرا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا۔ ایک خیال یہ آیا کہ چابیاں گیٹ کے قریب پھینک کر بھاگ جاؤں مگر یہ سب کرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں نے سپروائزر کو فون کیا تو وہ کسی جناتی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ انگریزی میں بات کررہا تھا لیکن میرے پلے کچھ نہ پڑا کہ وہ کیا اول فول بک رہا ہے۔ بس یہ سمجھ میں آیا کہ پہلے الارم ڈی کوڈ کرو اور پھر لاک کھول لو۔ میں تالا تو کھول سکتا تھا اگر ہر چابی کے بارے میں علم ہوتا مگر الارم ڈی کوڈ کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ الارم کے پینل کہاں کہاں لگے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے کچھ سمجھاتا رہا اور میں اس کی منتیں کرتا رہا اور مزے کی بات یہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھ نہیں رہے تھے۔

مجھے کیا پتا تھا میں ایک شدید مصیبت میں پھنسنے والا ہوں۔ تبھی میں نے دیکھا کہ گیٹ پر ورکرز کا ہجوم جمع ہورہا ہے۔ وہ اندر آنے کے لیے بے چین ہیں۔ ایک تو سرد ہوا کے جھکڑ پھر گزرتا ہوا وقت۔ کام گھنٹوں کے حساب سے لیا جاتا ہے، اس لیے وہ جتنی جلدی اندر آئیں گے ان کے لیے وہی فائدہ مند ہے۔ گیٹ نہ کھلنے کی وجہ سے ان کا نقصان ہورہا تھا لیکن گیٹ کھلے تو کیسے، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس لیے اب میں باقاعدہ رونے والا ہوگیا تھا۔ میں گیٹ کے قریب پہنچا اور ایک آخری کوشش کی۔ میتول انداز میں لاک کو کھولنے کی کوشش کی۔ کوشش کامیاب ٹھہری۔ گیٹ کھل گیا۔ سب کسی سیلاب کی مانند اندر داخل ہونے لگے۔ وہ آٹھ دس نہیں درجنوں میں تھے۔ وہ سب بیک وقت کچھ بولے چلے جارہے تھے اور میں اپنی تمبو نما جیکٹ میں کھڑا سردی سے کپکپا رہا تھا۔ سب مل کر مجھے گھور رہے تھے اور میں ہاتھ میں چابیوں کا گچھا کسی کشکول کی طرح پکڑے ان سب کو رحم طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ایگزیکٹیو کے دفاتر ساتھ جڑی عمارت میں تھے۔ گاڑیاں گیٹ میں سے داخل ہوئیں اور لمبے کوٹ پہنے یہ لوگ مجھے ایک نظر دیکھ کر اپنے دفاتر کی جانب بڑھ گئے۔ ایک تو یہ سب کم بخت وقت کے اتنے پابند تھے کہ ایک ساتھ ہی ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا۔ اب میں چابیاں لیے اس ٹھنڈ میں کبھی ایک دروازے پر قسمت آزمائی کرتا اور کبھی دوسرے دروازے پر۔ کوئی میری مدد کو آگے بڑھتا اور گچھا لے کر وہ بھی قسمت آزمائی کرنے لگتا مگر میری طرح ناکام ہورہتا تو اس کی جگہ کوئی اور لے لیتا۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے کہ ایک گورا آگے بڑھا۔ اس نے میرے بازو کو پکڑا اور مجھے کھینچنے کے انداز میں آگے لے چلا۔ اس کے اس انداز نے مجھے مزید دہلا دیا۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ مجھے اس کوتاہی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ سزا تو ملے گی ہی۔ نوکری تو گئی ہی گئی۔

وہ میرا بازو پکڑ کر مجھے اس عمارت میں لے چلا جہاں ان کے افسران بیٹھتے تھے۔ جیسے جیسے وہ کمرا نزدیک آرہا تھا میرے دل کی دھڑکن بڑھتی جارہی تھی۔ کئی روشن کمروں سے گزار کر وہ مجھے لے کر نسبتاً بڑے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے کی بہت لمبی میز کے سامنے لے جا کر مجھے کھڑا کردیا۔ میز کے پار ایک ریوالونگ چیئر پر ایک گورا بیٹھا تھا۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ میرے عجیب و غریب حلیے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔ مسکراہٹ نے کچھ تقویت بخشی۔ کچھ حوصلہ ملا۔ میرے چہرے پر برستی یتیمی نے اسے بھی گھائل کردیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نرمی آگئی تھی۔ میں نے اپنی ساری انگریزی دماغ میں یکجا کی اور اس کے سامنے سارا احوال گوش گزار کردیا۔ جس میں سپروائزر کے نہ آنے سے لے کر شدید سردی کا بھی ذکر تھا۔

اس نے پوچھا۔ ”کیا تم کو یہاں کے نظام کی ٹریننگ دی گئی تھی؟“

میں نے جواب دیا۔ ”مجھے تو کل یہ کہا گیا تھا کہ رات کو یہاں ڈیوٹی پر جانا ہے اور میں صرف ڈیوٹی کا ٹائم پوچھ کر رات کو یہاں پہنچ گیا تھا۔ کچھ باتیں مجھے مسٹر رانے بتائیں اور کہا کہ سپروائزر آکر فیکٹری کو اَن لاک کرے گا۔“

وہ ڈائریکٹر آپریشن تھا۔ اس نے میری سرگزشت سنی اور کہا۔ ”تم پریشان مت ہو کیونکہ تمہاری ٹریننگ ہی نہیں ہوئی ہے۔“

پھر وہ مجھے ہمراہ لیے چلا۔ ایک ایک دروازے تک آیا۔ پہلے الارم ڈی کوڈ کیے۔ پھر کچھ لاک کھولے اور عملے کو فیکٹری میں داخل کیا۔

اس نظام کی ایک خاصیت جس کی ایک جھلک میں نے آج دیکھی تھی اور تفصیل سے آگاہی بعد میں ہوئی، وہ یہ تھی کہ آپ کہیں بھی جاب کے لیے کسی بڑی کمپنی میں جاتے ہیں تو پہلے چند دن آپ کی مکمل ٹریننگ کے ہوتے ہیں گو اس کام کا

آپ کو پہلے سے کتنا ہی تجربہ نہ ہو۔ ایک مکمل کلاس روم ہوتا ہے۔ آپ کی پوسٹ کے متعلق ایک ٹریننگ مینوئیل ہوتا ہے۔ ایک ایک کام کی تفصیل بتائی جاتی ہے۔ آپ کے سوالوں کے جواب دیے جاتے ہیں۔ ایک حصہ ختم ہوتا ہے تو پھر آپ کے دستخط ٹریننگ شیٹ پر لیے جاتے ہیں۔ جب تک آپ دستخط نہیں کرتے، وہ اگلے اسٹیپ پر نہیں بڑھتے۔ اس میں آپ کے حقوق، کام کی نوعیت، فرائض اور آپ کی جاب کے تمام مراحل شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضرورت کمپنیوں کی اپنی بھی ہوتی ہے مگر ان اداروں کی زیادہ ہوتی ہے جو ان کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ آپ کو کہیں جاب ملی اور آپ پریشان ہونا شروع ہو گئے کہ یہ سب کام میں کیسے کروں گا اور اس کمپنی کا تکنیکی نظام اگر مختلف ہوا تو میں اپنی جانب سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں گا۔ اگر ٹریننگ نہ ہو تو آپ مکمل طور پر دوسروں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اور وہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں یہ انہی پر منحصر ہوتا ہے۔ آج میری ٹریننگ نہ تھی اور میں بچ گیا۔ ورنہ وہ ایک سیکنڈ بھی نہ لگاتے اور میں اپنی جاب سے ہاتھ دھو چکا ہوتا۔

میری جاب آٹھ بجے تک تھی اور اب ساڑھے نو بج رہے تھے۔ پھر اس نیک دل انسان نے کسی کو حکم دیا کہ مجھے گھر تک ڈراپ کر آئے۔ نہ اس نے کچھ غصہ دکھایا اور نہ ذرا سا بھی بوکھلایا۔ نہایت ہی متانت سے چلتا اور بات کرتا رہا تھا۔ حالانکہ ان کا ہزاروں ڈالر کا نقصان ہو چکا تھا۔ میں اس کے رویے کو دیکھ کر خود بھی تھم سا گیا تھا۔ ایک بات سمجھ میں آرہی تھی کہ مشکل وقت میں گھبرا جانے سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ دماغ کو ٹھنڈا رکھنا پڑتا ہے۔ یہ میرے لیے کینیڈا میں ایک اور سبق تھا۔

میں سخت تھک چکا تھا۔ رات بھر کا جاگنا اور صبح کی دوڑ دھوپ نے میری ساری طاقت نچوڑ کر رکھ دی تھی۔ بستر پر نڈھال ہو کر گرا تو وردی سمیت سو گیا۔

آج رات بھی اسی فیکٹری میں ڈیوٹی تھی اور ذہن میں یہی خیال تھا کہ اگر کل صبح سپروائزر نہ آیا تو پھر میرا کیا بنے گا۔

سو کر اٹھا تو دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ سرجی بیٹھے سامنے کی دیوار کو مسلسل تکے جا رہے تھے۔ شہباز کارپٹ پر ہمیشہ کی طرح دراز تھا اور اپنے منہ سے غوں غوں کی آوازیں نکال رہا تھا۔ ان آوازوں کا مطلب یہ تھا کہ آج پھر اسے ڈپریشن کا دورہ پڑا ہے اگر کوئی بات کرتا تو پہلے اپنے آپ کو اور پھر پورے کینیڈا کو گندی گالیاں دینے لگتا تھا اور ایک آدھ خان قیصر کو بھی جڑ دیتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ تم خان کو کیوں گالیاں دیتے ہو تو کہتا کہ خود گھر کا کھانا زہر کر رہا ہے اور کبھی ہمیں یہ پوچھتا بھی نہیں۔ سرجی کی عجیب منطق تھی کہ خان اس لیے کھانا نہیں لاتا کہ باہر سردی بہت ہے۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

جواب میں وہ کہتے۔ "سردی میں کھانا تو جم جاتا ہے ناں۔"

شہباز بولا۔ "تو ہم گرم کرلیں گے۔"

دوبارہ منمناتے۔ "پھر وہ ذائقہ بھی تو نہیں رہتا ہے۔"

شہباز اپنے چہرے کی زردی اپنے پر لپیٹے بولا۔ "سرجی! آپ بہت عجیب باتیں کرتے ہیں۔ ان کا آپس میں کوئی سر پیر بھی نہیں ہوتا۔"

سرجی نے ذہانت سے بھرا جواب دیا۔ "جب تم عجیب حالت میں کارپٹ پر ڈھیر سے پڑے ہوتے ہو تو ہم نے کبھی کوئی اعتراض کیا؟"

شہباز نے جھنجلا کر کہا۔ "اگر آپ اتنے شریف نہ ہوتے اور میں بھی اتنا بزدل نہ ہوتا تو سرجی آپ کا قتل میرے ہاتھوں ہی ہوتا۔"

"تو میرا کیا جاتا، خود ہی پھانسی لگتے اور یہاں پھانسی نہیں لگاتے بلکہ بجلی والی کرسی سے باندھ دیتے ہیں۔" سرجی اب ٹل گئے تھے۔

میں نے کہا۔ "کوئی منہ سے خیر کی باتیں نکالو۔ یہ کیا منحوس باتیں شروع کر دی ہیں؟"

وہڈ وروال کا پردہ کھسکا کر باہر کی برف سے دل پشوری کر کے پھر بولے۔ "ہم تو مذاق کر رہے تھے۔ اللہ مجھے لمبی عمر دے۔" پھر خود آمین کہہ کر خاموش بیٹھ گئے۔

ہماری یہ بحث جاری رہتی کہ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور سب چونک کر فون کی جانب دیکھنے لگے۔

سرجی نے لپک کر فون اٹھایا۔ کچھ دیر سنتے رہے اور پھر کچھ دیر چھت کی جانب دیکھ کر کچھ سوچا اور میری جانب دیکھ کر بولے۔ "لگتا ہے آپ کا فون ہے۔"

میں انہیں گھورتے ہوئے اٹھا اور فون لیا تو آگے ویکن ہٹ سے کوئی کہہ رہا تھا کہ آج رات آپ اس فیکٹری نہیں جائیں گے کیونکہ کلائنٹ کو آپ کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خاصا دل برداشتہ ہوا اور پوچھا کہ میرا کیا قصور تھا؟ وہ اپنا ملبا مجھ پر ڈال رہے تھے اور پھر وہ سوری کرنے لگا کہ غلطی ہماری تھی کہ ہم نے بغیر ٹریننگ کے آپ کو وہاں بھیج دیا۔

ان کی سوری کہنے سے میں ذرا مطمئن ہوا۔ فون بند

کرنے سے پہلے اس نے کہا۔ ”اگلا شیڈول میں آپ کو کل دوں گا۔“

میں خود اب اس فیکٹری میں جانا نہیں چاہتا تھا، اسی لیے میں شہباز کی طرح کارپٹ پر آرام سے دراز ہوگیا۔ سرجی سارا ماجرا سن کر شہباز کو دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ہر کوئی اپنے گناہ دوسروں کے سر تھوپنا چاہتا ہے۔“

شہباز پھر بپھر گیا۔ ”اب میں نے کیا کہا ہے؟“

یہ کہہ کر سرجی کچن کی جانب افطاری کا بندوبست کرنے چل دیے۔

”دو دن سے جلیبیوں کی شکل بھی نہیں دیکھی۔“

آج رات کو فراغت تھی۔ افطاری کے بعد سرجی نے یہ دھماکا خیز اعلان کیا کہ آج ان کی سالگرہ ہے۔ شہباز ایک جھٹکے سے اچھلا۔ ”او، یہ سانحہ آج ہی کے دن رونما ہوا تھا؟“

سرجی کچھ شرمندہ سے کھڑے تھے، بولے۔ ”نہیں! وہ تو میں کئی سال پہلے ہی ظہور پذیر ہوگیا تھا۔“

شہباز نے مصنوعی حیرت سے سرجی کو دیکھا۔ ”آپ کا ظہور پذیر ہونا بھی تو کسی سانحے سے کم نہیں ہوگا۔“ پھر مجھے مخاطب کرکے بولا۔ ”آج سرجی کچھ دعوت دیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو جلیبیوں پر ہی ٹرخا دیں گے۔“

آخر سرجی نے فیصلہ دیا۔ ”آج موسم پھر مستانہ ہو رہا ہے، آئس کریم کے مزے لیں گے۔“

”تیرا بیڑا غرق ہو جائے سرجی، ہم اس سردی سے مرنے والے ہوگئے ہیں اور آپ کے لیے یہ موسم مستانہ ہو رہا ہے۔“ شہباز بپھر گیا۔

ہم افطاری اور کھانے کے بعد چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ فیصلہ ہوا کہ وال مارٹ (Walmart) چلتے ہیں۔ جمال کی بیٹی پیدا ہوئی تھی اور مجھے اس کے لیے کوئی گفٹ بھی خریدنا تھا اور وہیں سرجی کی سالگرہ کا جشن بھی ہم نے منانا تھا یعنی کہ آئس کریم کھانی تھی۔

ہم اسٹاپ پر کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ سردی کی شدت میرے رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ آسمان ہمیشہ کی طرح دھواں دار تھا، سرد ہوا کے تھپیڑے مجھ پر کوڑوں کی طرح برس رہے تھے اور ہم آئس کریم کھانے جا رہے تھے۔

وال مارٹ دنیا کی سب سے بڑی ریٹیل چین ہے۔ ہر شہر میں اس کے کئی اسٹور ہیں اور ہر اسٹور میں ایک دنیا آباد ہے۔ قیمتیں نہایت ہی ارزاں ہوتی ہیں۔ ہزاروں قسم کی روز مرہ کی اشیاء سے بھرا یہ اسٹور ہر وقت متوسط طبقے کے لوگوں سے بھرا رہتا ہے۔ الیکٹرونک، کپڑوں، میک اپ کے سامان اور کیا کیا چیز یہاں دستیاب نہیں ہے۔ فوٹوگرافی، پرنٹنگ، گاڑیوں کے ٹائر، کیمپنگ کا پورا سامان، فارمیسی، ریسٹورنٹ، فاسٹ فوڈ، بیڈروم، ڈرائنگ روم کا سامان، فرنیچر، پینٹنگز کے علاوہ ہر چیز یہاں موجود ہے۔ ہم آنکھیں پھاڑے اپنے اردگرد دیکھ رہے تھے۔ اتنا وسیع و عریض اسٹور میں نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک چلتے چلتے ٹانگیں دکھنے لگتی تھیں۔ مدد کرنے کو عملہ ہر لحظہ تیار تھا۔ لائنوں میں شیلفوں کی دیواریں کھڑی تھیں اور ہر شعبے کے لیے علیحدہ حصہ مختص تھا۔ مجھے ایک شولڈر بیگ بھی خریدنا تھا۔ سرجی مصر تھے کہ کسی کی مدد لیتے ہیں اور میں کہہ رہا تھا کہ خود ڈھونڈ لیں گے۔ شہباز پیچھے ہاتھ باندھے چاروں طرف گھوم رہا تھا۔

سرجی یہ کہہ کر کہیں غائب ہوگئے۔ ”کسی حسین لڑکی کو ڈھونڈ لاتا ہوں کہ ہماری بیگ ڈھونڈنے میں مدد کرے۔“

شہباز بڑبڑایا تھا۔ ”کہیں سیاپا ہی کھڑا نہ کردے۔“

اتنے میں وہ ایک سیاہ فام اور حد درجہ موٹی لڑکی کے ساتھ بندھے چلے آرہے تھے۔ ”تیرا بیڑہ غرق سرجی۔ یہ کس حسینہ کو پکڑ کر لا رہا ہے۔“ شہباز پھر جھنجلا اٹھا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ کس حسینہ کو لے آئے ہو؟“

فرمانے لگے۔ ”ماشاء اللہ اس میں کیا کمی ہے؟ اور آپ لوگوں کو خوب صورتی کی قدر ہی نہیں۔ جو کشش سانولی رنگت میں ہے گوری میں کہاں؟“

”مگر تمہیں ملی کہاں سے؟“

”ایک دو پر ٹرائی کی مگر انہوں نے سنا ہی نہیں۔ یہ پیچھے ٹرالیاں سیدھی کر رہی تھی۔ میرے کہنے پر چلی آئی۔“ سرجی بتلا رہے تھے اور اسی دوران وہ لڑکی ہمیں مسلسل غصے سے گھور رہی تھی۔

وہ لڑکی اپنی نیلی شرٹ سے باہر نکلی جا رہی تھی اور سرجی اس کے پہلو سے لگے کھڑے تھے۔ وہ بیزاری سے ہم کو دیکھ رہی تھی۔ آخر میں نے اپنا مدعا بیان کیا اور اس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی سرجی نے بھی وہی اشارہ دہرایا اور اس کے ہمراہ چل پڑے۔ ہم دونوں بھی مسکراتے ہوئے ان دونوں کے پیچھے چل پڑے۔ اس نے مختلف بیگ دکھائے۔ سرجی تقاضا کرتے تھے کہ کوئی اور ماڈل کا دکھاؤ۔ اس کی بیزاری عروج پر تھی اور بولی۔ ”سب اس ریک میں رکھے ہیں۔ آپ خود پسند کرلیں۔“

بولے۔ ”آپ اپنی پسند کا دکھائیں۔“

تپ کر کہنے لگی۔ ’’کیا میرے لیے خرید رہے ہیں؟‘‘
شرما کر بولے۔ ’’آپ کہیں تو آپ کے لیے بھی خرید لیتے ہیں اور آج میری سالگرہ بھی ہے۔‘‘
وہ اپنی جاب کی وجہ سے خاموش ہو رہی ورنہ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ آج سرجی کو پیس کر رکھ دے گی۔
اتنے میں ایک بیگ سرجی کو میرے لیے پسند آ گیا۔ بائیس ڈالر اس کی قیمت تھی اور سرجی دام کم کروانے لگے۔ شہباز نے کہا۔ ’’سرجی! یہاں ٹیگ پر اس ہی چلتی ہے۔‘‘
سرجی نے جواب دیا۔ ’’کچھ دوستی تو بنانے دو۔‘‘
اب سرجی آپے سے باہر ہو رہے تھے تو میں نے سختی سے ان کا بازو پکڑا۔ میری مضبوط گرفت کو محسوس کرتے ہی ان کے جذبات پانی پانی ہو گئے۔ اس کے بعد میں نے اس کو چلتا کیا اور جمال کی بیٹی کے لیے کھلونا خریدا۔ پھر چیک ان پر آ کر ادائیگی کی تو دیکھا کہ سرجی سر اٹھا اٹھا کر اس لڑکی کو تلاش کر رہے تھے۔
اب ہم وال مارٹ میں موجود ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے سرجی کی سالگرہ کی خوشی میں آئس کریم کا آرڈر دے رہے تھے۔ سرجی پھر ضد پکڑ گئے کہ اس کلموئی موٹی لڑکی کو بھی میں اپنی سالگرہ کی خوشی میں دعوت دیتا ہوں۔ بمشکل یہ کہہ کر انہیں روکا کہ بغیر کسی تعلق کے اگر آپ نے دعوت دی تو یہ پولیس کو بلا لیتی ہیں۔ یہ کہہ کر آئس کریم کا آرڈر دے دیا کہ یہ حسین لڑکیاں اندر سے بہت سنگر ہوتی ہیں۔
دن بھر کے تھکے ہارے پرندوں کی طرح ہم بھی اپنے گھونسلے یعنی اپارٹمنٹ میں آئے اور آتے ہی نیند نے ہمیں جکڑ لیا۔ سحری کے لیے میں پہلے اٹھا اور پھر اپنے دونوں ساتھیوں کو جگایا۔ سحری میں رات کا بچا ہوا سالن ہم نے خمیری باس والی روٹیوں سے کھایا۔ شہباز افسردہ سا لگ رہا تھا۔ چائے کا گھونٹ بھرتے سرجی نے اس سے پوچھا۔ ’’آپ اداس کیوں ہیں؟ اب تو پرمٹ بھی مل چکا ہے اور آج لائبریری میں جاب بھی ہے۔‘‘
وہ خاموش رہا۔ پانی اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ ہم دونوں پریشان ہو گئے کہ اللہ جانے کیا ماجرا ہے۔ اس نے ایک ہچکی سی لی اور بولا۔ ’’یارو! کل عید ہے۔‘‘
میں یہ سن کر سکتے میں آ گیا۔ ایسا لگا کہ کل عید نہیں موت ہے۔ کل زندگی تمام ہو جائے گی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی چھت مجھ پر آ گرے گی۔ ’’کل عید ہے۔‘‘ یہ ایک فقرہ نہیں بلکہ کرب کا پتھر تھا جو مجھ پر کسی بھاری چٹان کی طرح آ گرا تھا۔ سرجی پہلی بار پتھریلی آنکھوں سے تکنے لگے۔ شہباز خاموش تھا۔ ایک سکوت سا اتر آیا تھا۔ وقت وہیں ٹھہر کر تڑاخ سے ٹوٹ گیا تھا اور اس کی کرچیاں ہمارے گرد بکھری تھیں۔
چائے کے مگ دسترخوان پر بہت دیر سے پڑے تھے اور ہم خالی نگاہوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے اور پھر اپنی اپنی سوچوں کے دریا میں اترتے چلے گئے۔ ہر ایک کی اپنی یادیں ہوتی ہیں جو گزشتہ عیدوں سے جڑی ہوتی ہیں۔ کئی ایک خوشیاں جو پردیس میں آ کر ایک کسک کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔
میں سالوں پر محیط پچھلی یادوں میں کھو گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اپنے بستر پر دراز، تکیے سے چہرہ ڈھانپے ماضی کے سنہری لمحے یاد کرنے لگا۔ پہلے اپنے بچپن کی عید کو یاد کرنے لگا۔ ہم سب اکٹھے رہتے تھے۔ یعنی چچا اور میرے والد صاحب۔ ایک ہی گھر میں بائیس افراد۔ لڑکے ماشاء اللہ آٹھ تھے۔ کچھ بڑے تھے۔ ہم سب ایک کمرے میں اکٹھے ہوتے اور اپنی عید کی تیاریاں ڈسکس کرتے۔ عید سے پہلے میری شاپنگ ہوتی تھی۔ سب سے پہلے ایک عدد بٹوا۔ میری تمام تر خوشیاں اسی کے اندر بند ہوتی تھیں۔ میں دن میں کئی بار اس خالی بٹوے کو کھول کر اس کی ہر ایک پاکٹ میں جھانکتا اور ان ایک دو اور پانچ روپے کے نوٹوں کو تصور میں اس کے اندر تلاش کرتا جنہوں نے عید کے دن ممکنہ طور پر ان پاکٹس میں رکھے ہونا تھا۔
تکیے کے نیچے خالی بٹوا نہ تھا بلکہ میرے خواب اور تمام تر خوشیاں اسی میں ہوتی تھیں۔ ایک شلوار قمیص کا جوڑا، میری کل کائنات ہوتا تھا۔ بازار ساتھ تھا اور ایک تختے پر بیٹھا درزی اس کی سلائی کرتا۔ پھر جوتے لیے جاتے اور جوتوں کا ڈبہ میں روز کھول کر دیکھتا۔ عید والی رات ہماری ایک تقریب ہوتی، جس کو ہم میٹنگ کہتے تھے۔ اس میں ہم اپنے جوتے، کپڑے، رومال اور بٹوے لے کر آتے۔ بستر پر بیٹھ کر ہم جوتے ٹرائی کرتے مگر پاؤں زمین پر نہیں رکھتے کہ کہیں مٹی نہ لگ جائے۔
پھر اپنے کپڑے اور دوسری چیزیں باقاعدہ نمائش کے لیے رکھتے۔ میری لٹھے کی شلوار ہوتی اور ساتھ میں کوئی کرتہ ہوتا۔ کسی کی کوئی چیز کسی اور سے زیادہ ہوتی تو باقی اس سے دل ہی دل میں حسد کرتے۔ رات گئے ہماری میٹنگ ختم ہوتی۔ نہ ٹی وی تھا اور نہ کوئی دوسری مصروفیات۔ تمام تر خوشیاں اسی میٹنگ میں ہوتیں۔ رات ماں مجھے اپنے ساتھ سلاتی اور میرا بٹوا میرے سرہانے ہوتا اور میں اپنی تمام تر خوشیاں جمع کر کے پھر

سے اسی بٹوے میں رکھ لیتا۔ دوسری چارپائی پر والد صاحب سوتے تھے۔ وہ صبح نماز کے لیے اٹھتے اور پھر قرآن پاک پڑھتے تو میں جاگ جاتا۔ میں چادر لپیٹتا ہوا باہر بھاگتا۔ والدہ صاحبہ باورچی خانے میں سویاں بنا رہی ہوتیں۔ میں گلی میں دوڑا چلا آتا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ عید کس طرح میری گلی میں آتی ہے اور یہ گلی کیسے دکھتی ہے۔ عید کا آسمان کیسے ہوتا ہے۔ لوگ کیسے عید کے دن نظر آتے ہیں۔ کیا ان کے خدوخال وہی ہوتے ہیں یا پہلے سے مختلف ہوتے ہیں۔ میں ہر ایک کو دیکھتا اور حیرت ناک طور پر سب چیزیں عام دنوں سے مختلف نظر آتیں۔ آسمان، زمین، فضا اور ہوا۔ یہ سب وہ نہ ہوتیں جو کل تھیں۔ سامنے بازار تھا۔ عید کی خاص نشانی ایک اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ چاچا فرازو، جو عام دنوں میں گنڈیریاں بیچتا تھا، وہ عید والے دن بازار میں زمین پر کڑاہی چڑھا کر کباب اور پکوڑے لگاتا تھا۔ میں صبح ہوتے ہی یہی دیکھنے نکلتا کہ چاچا فرازو نے کڑاہی لگائی ہے یا نہیں۔ چاچا فرازو کی کڑاہی اس بات کی علامت ہوتی کہ آج عید ہے۔ یہ میرے لیے ایک طرح کا عید کا چاند ہوتا۔

چاچا فرازو محلے کا ایک بزرگ تھا اور سب کا چاچا تھا۔ گلی کے کونے پر ایک کچی سی دکان میں مغل پکوڑے والا تھا۔ وہ بھنگ پیتا اور پکوڑے بناتا۔ میں اکثر اس کے لیے بھنگ گھوٹتا۔ وہ اس کے معاوضے میں، میرے پکوڑوں پر کھٹائی زیادہ ڈالتا۔ عید کے دن مغل پکوڑوں والا چاچا فرازو کو ذرا ترچھی نظروں سے دیکھتا کیونکہ اس کے سامنے ایک اور چولہے کے نیچے آگ جل رہی ہوتی جس میں چاچا فرازو کے پکوڑے تلتے ہوتے تھے۔ گلزار مٹھائی والا عید کی رات اور ایک دن پہلے بنائی جانے والی مٹھائی کو تھالوں پر سجائے اپنی دکان کے سامنے کھڑا مطمئن دکھائی دیتا۔ خوشی لہروں کی مانند گلی کی ہوا میں تیرتی پھرتی۔ عید کی نماز قصبے سے باہر صرف ایک جگہ پر ہوتی۔ کھجوروں کے باغ کے بعد عیدگاہ تھی۔ ہم تیار ہو کر نئے نکور بنتے۔ خالی بٹوا میری جیب میں رہتا۔ ہم سب مل کر نماز کے لیے جاتے تو ساتھ چادریں اٹھا لیتے۔ وہی چادریں عیدگاہ کی کچی زمین پر بچھا کر نماز پڑھتے کیونکہ صفیں کم تھیں اور ہر کوئی اپنی چادر لے آتا۔ نماز کے بعد عید ملنے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوتا۔ پورا علاقہ ایک دوسرے کو عید کی جھپیاں ڈالتا۔ گھر آتے تو ماں دودھ میں بھیگی سویاں تیار کر چکی ہوتی، جس میں چھوارے تیر رہے ہوتے۔ سب کو اپنی اپنی پلیٹ میں سویاں ملتی تھیں۔ یہ مرحلہ ختم ہوتا تو ہم عیدی کے لیے منتظر ہو جاتے۔ والد صاحب سے پانچ روپے ملتے اور سب عیدیاں ملا کر بارہ سے پندرہ روپے ہو جاتے۔ بٹوے کی چھوٹی جیب میں سکے ہوتے اور چند نوٹ بڑی پاکٹ میں ہوتے۔ پھر دوپہر کو لڑکوں کا ایک بڑا گروپ میلے پر جاتا۔ ایک کے بعد ایک جھولا۔ بیچ میں ریڑھی والوں سے چاول چھولے کھاتا۔ پھر کسی اور ریڑھی سے شربت پیتا، چینی کے لچھے کھاتا، ایک لمبی ڈانگ پر لپٹی پلاسٹک نما ایک مٹھائی جو میری پسندیدہ اس لیے تھی کہ وہ ایک آنے میں ملتی تھی۔ مٹھائی والا اس کو ڈانگ سے کھینچ کر اتارتا۔ پھر اسے ایک موٹے تیلے پر، کبھی اس کو چڑیا، کبھی مور یا کوئی پرندے کی شکل بنا کر دیتا۔ ہم پہلے اسے دیکھ کر خوش ہوتے اور پھر کھا کر۔ شام ڈھلنے سے پہلے ہم اداس چہرے لیے گھر آتے، کیونکہ آج عید کا پہلا دن ختم ہو رہا ہوتا۔ گھر کی در و دیوار تک ویران لگتیں۔ عید کا دوسرا دن ذرا پھیکا ہوتا تھا، کیونکہ وہی کپڑے دوبارہ پہننا پڑتے، جو کل اس وقت کھونٹی پر استری ہوئے لٹکتے تھے اور جوتے بھی میلے سے مٹی مٹی ہو جاتے تھے، جو آج صبح نئے نکور تھے۔ کیا عیدیں ہوتی تھیں، خوشیوں بھری۔ وقت گزرتا گیا اور جوانی آدھمکی۔ رگوں میں خون کی رفتار ایک طیارے کی مانند تیز اور پُرشور ہو گئی مگر چاچا فرازو کو میں عید کی صبح اسی خوشی سے دیکھنے نکلتا جیسے بچپن میں مگر چاچا فرازو اب ذرا بوڑھا لگنے لگا تھا مگر عید کا احساس بوڑھا نہ ہوا تھا۔ اب چاند رات کو رات گئے گھر لوٹتے۔ اب جوتوں والی میٹنگ گھر کے بستر پر نہ ہوتی بلکہ چاند رات کے جلوس میں ہوتی۔ پورا شہر رات گئے کلاں بازار میں آجاتا۔ جوگہ چوک سے توپوں والے گیٹ تک انسانوں کا ایک سمندر ہوتا۔ کسی کے ہاتھ میں نئے جوتوں کے لفافے یا نئے کپڑے ہوتے اور چہروں پر عید کی شادمانی ہوتی تھی۔ شادی ہوئی، بیٹی آنگن میں اتری تو عید اور طرح سے آنے لگی۔ جتنی خوشی باہر ہوتی، اس سے زیادہ روح کے اندر ہوتی۔ شور ہوتا اور ہنگامہ برپا ہوتا مگر آج ٹورنٹو میں مجھے ایک اداسی نے جکڑ رکھا تھا۔ میری بیٹی، بیوی، بہنیں اور بھائی ہزاروں میل دور تھے۔ بقول ناصر کاظمی

میرے گھر کی در و دیوار پر ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

مجھے سب یاد آ رہے تھے، جو ہمراہ تھے اور جو بچھڑ چکے تھے۔ میں دل سے سب کو عید مبارک کہہ رہا تھا۔ اتنے میں ساتھ والے میٹرس پر لیٹے شہباز کے منہ سے ایک ماتم کرتی سسکی نکلی اور سرجی آج مفتی کے میٹرس پر نہیں بلکہ بازو سر تلے رکھے کارپٹ پر سوتے تھے۔

آج شہباز کو لائبریری جانا تھا۔ وہاں اس کی سیکیورٹی کی جاب تھی۔ مجھے اور سرجی کو کہیں بھی نہیں جانا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ آج فیملی کی اسپانسر کے فارم مکمل کرتا ہوں تا کہ سترہ سو ڈالر کی فیس لگا کر انہیں جلد از جلد پوسٹ کر دوں۔ اپارٹمنٹ میں خاموشی تھی۔ ہم سب اپنی ذات میں اکیلے اور لاتعلق تھے۔ کسی کا کسی سے بات کرنے کو جی نہ کر رہا تھا۔

میں نے فارم کارپٹ پر بچھائے کہ فون بج اٹھا۔ ویکن ہٹ سے میرے لیے کال تھی۔ ڈیوٹی سپروائزر کہہ رہا تھا کہ آج شام چار سے رات بارہ بجے تک امیگریشن ہولڈنگ سینٹر میں شفٹ خالی ہے اور یہ بھی کہا کہ اگر آجاؤ گے تو کل اور پرسوں دن بارہ بجے سے رات بارہ تک دونوں شفٹیں تمہیں دے دوں گا۔ کل عید کا دن تھا اور میں زندگی میں پہلی بار عید سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ مجھے اس دن سے فرار چاہیے تھا۔ میں نے ہامی بھر لی۔ آج آخری روزہ تھا اور چاند رات تھی۔ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ میری سوچ گزری چاند راتوں اور عیدوں کا کھاتہ نہ کھول بیٹھے۔ مجھے کسی اور سوچوں میں مصروف رہنا تھا اور اس کا سب سے آسان حل یہی تھا کہ خود کو جاب پر مصروف کر لیا جائے۔

ڈکسن روڈ پر ٹم ہارٹن کافی شاپ سے ہولڈنگ سینٹر کی گاڑی نے مجھے اٹھانا تھا۔ وہاں دوسرے سیکیورٹی گارڈز بھی اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر ہولڈنگ سینٹر کی وین میں بیٹھ کر سب دس منٹ میں ایئرپورٹ کے سامنے واقع سینٹر پہنچ جاتے ہیں۔ اگر بس پر جائیں تو کرایہ لگتا ہے۔ ہولڈنگ سینٹر مسی ساگا میں آتا ہے جہاں میرا ٹرانسپورٹ کا کارڈ نہیں چلتا تھا۔ میں چار بجے سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ دو اور گارڈ بھی وہاں موجود تھے اور میری طرح یونیفارم میں ملبوس ٹم ہارٹن کے باہر سردی سے کپکپا رہے تھے۔ دونوں پاکستانی تھے۔ مجھ سے گرم جوشی سے ملے۔ ایک کا نام عظمت تھا۔ میں اس کا نام تبدیل کر کے لکھ رہا ہوں کیونکہ اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا، جو بعد میں بیان کروں گا۔ اسی لیے پردہ داری کی ضرورت آپڑی ہے۔ اس قصے کو سن کر آپ بھی میرے فیصلے سے متفق ہو جائیں گے کہ میں نے اس کا نام تبدیل کر کے اچھا ہی کیا۔ اس کے اوپر جو گزری اسے سنانے سے پہلے آج کے واقعات سنیں۔

ہولڈنگ سینٹر میں تنخواہ بھی دو ڈالر زیادہ تھی اور کام بھی آسان تھا اور اچھی بات یہ تھی کہ ہر وقت پندرہ سے بیس کا اسٹاف وہاں رہتا تھا اور جو پچھلے واقعات میرے ساتھ رونما ہو چکے تھے، ان کو دیکھتے ہوئے یہ لوکیشن بہت بہتر تھی۔ ہر وقت آپ کے آس پاس اسٹاف ہوتا ہے اور بیشتر سکھ اور پاکستانی تھے۔ آپس میں پنجابی اور اردو میں بات ہوتی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ڈکسن کا اسٹاپ ہمارے اپارٹمنٹ سے بہت قریب تھا۔

سینٹر کی گاڑی آئی اور ہمیں ایک ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ عظمت کہنے لگا کہ یہ ہولڈنگ سینٹر ہے یعنی غیر قانونی تارکین وطن کی جیل۔ اس ہوٹل کے دو فلور تھے اور دونوں امیگریشن ڈپارٹمنٹ نے کرایے پر لے کر اسے ہولڈنگ سینٹر میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہ ایک خوبصورت عمارت تھی۔ کسی آتے جاتے کو معلوم نہ تھا کہ یہ ہولڈنگ سینٹر ہے۔ مین لابی میں ایک اسٹور تھا جہاں پر سگریٹ، کافی، کولڈ ڈرنک، لاٹری کے ٹکٹ، کیک بسکٹ اور دوسرا سامان دستیاب تھا۔ سارا اسٹاف یہاں سے کچھ نہ کچھ خریدتا رہتا تھا۔ اندر جانے کا راستہ ہوٹل کے سائیڈ سے تھا۔ سیدھے ہاتھ پر پہلے ایک چھوٹا دروازہ آتا تھا جس پر کیمرے لگے تھے۔ یہ ان ملاقاتیوں کے لیے تھا جو قید میں بند لوگوں سے ملنے آتے تھے۔ ہم بھی یہی راستہ استعمال کرتے تھے۔ تھوڑا سا آگے جا کر تاروں سے الجھا ایک گیٹ تھا۔ وہاں بھی کیمرے نصب تھے۔ کیمرے سے آفس میں بیٹھا ہوا شخص گاڑی یا شکل دیکھ کر بٹن دبا کر وہ سلائیڈنگ گیٹ کھول دیتا تھا۔ وہاں داخل ہوتے ہی شفٹ سپروائزر اور دوسرے اسٹاف کا آفس تھا۔ اس ہولڈنگ سینٹر کے دو فلور تھے۔ پہلے فلور میں داخل ہوں تو ملاقاتیوں کے ہال اور سپروائزر کے آفس کے بیچ ایک لمبی لابی تھی۔ کارپٹ بچھے تھے اور ارد گرد کمرے تھے۔ ایک ڈاکٹر کا دفتر تھا جو روزانہ صبح آتا اور قیدیوں کا طبی معائنہ کرتا۔ اس کے علاوہ کینیڈا امیگریشن کا دفتر تھا۔ اسٹاف کے دو لنچ روم تھے اور قیدی عورتوں کو رکھنے کے لیے چند کمرے تھے۔ ہر کمرے کے باہر ایک کرسی رکھی تھی جہاں سیکیورٹی گارڈ بیٹھا رہتا اور ہر آدھے گھنٹے بعد قیدیوں کی حاضری لگا کر ایک لاگ بک میں اس کا اندراج کر دیتا۔ قیدیوں کے کمرے کسی تھری اسٹار ہوٹل کے کمرے کی طرح تھے۔ فرش پر خوبصورت قالین، اٹیچ باتھ، آرام دہ بستر، ٹی وی اور درجہ حرارت کنٹرول کرنے کا سارا سامان موجود تھا۔ قیدی بہت اچھی حالت میں رہتے ہیں۔ ان کے پاس صرف باہر جانے کی آزادی نہیں ہوتی ہے۔ دن میں ایک بار سب کو ہانک کر ایک گراؤنڈ میں لے جاتے ہیں۔ جہاں وہ باہر کی تازہ ہوا لیتے، باسکٹ بال کھیلتے اور ایک دوسرے کو گندی گالیاں بھی دیتے۔ نیچے والی لابی سے سیڑھیاں اوپر کی منزل کو

جاتی ہیں جو ایک بڑے ہال کے دروازے پر ختم ہوتی ہیں۔

میں اس ہال میں پہنچا تو چائے کا وقفہ تھا۔ اس ہال میں کئی گول میزیں اور کرسیاں لگی تھیں جہاں درجنوں قیدی بیٹھے کافی، چائے پی رہے تھے۔ اس کے ساتھ ایک کچن تھا جہاں سے ان کو کھانے پینے کے لیے وافر خوراک مہیا کی جاتی۔ ناشتے میں ابلے انڈے، ڈبل روٹی، جام، مکھن ملتا۔ لنچ پر چکن، پاستہ، چاول، آلو کے قتلے، کولڈ ڈرنک اور بہت کچھ ملتا ہے۔ کسی کیٹرنگ کمپنی کے پاس ٹھیکا تھا اور وہ ٹائم پر گرما گرم ٹرے گاڑی میں بھر کر لاتے۔ قیدی اپنی ٹرے لیے لائن میں لگ جاتے۔ جو کچھ انہیں مل جاتا۔ واپس اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر کھانا کھاتے اور ساتھ ٹی وی بھی دیکھتے رہتے اور ان کی باتوں کا شور فضا میں ہمیشہ رہتا۔ اس ہال میں ایک جگہ سگریٹ نوشی کی تھی۔ وہاں شیلف میں کتابیں لگی تھیں۔ اسے لائبریری کہا جاتا ہے۔ اس میں سگریٹ پینے والے شیشے کا دروازہ بند کر کے سگریٹ پیتے رہتے۔ میں نے وہاں پر موجود آدمی سے زیادہ کتابیں پڑھ لی تھیں۔ لائبریری کے ساتھ ایک کرسی میز لیے ہیڈ گارڈ بیٹھا رہتا اور ساتھ پڑی دوسری کرسیوں پر دوسرے گارڈ بیٹھے سب قیدیوں پر نظر رکھتے تھے۔

اس لائبریری سے جڑا ایک دروازہ لابی میں کھلتا۔ لمبی لابی کی دونوں جانب کمرے تھے اور ویسے ہی تھے جیسے نیچے کی لابی میں تھے۔ ایک لمبی لائن تھی۔ ہر جانب بارہ پندرہ کمرے تھے اور ہر کمرے میں دو بستر اور ہر بستر پر ایک قیدی۔ لابی میں دونوں جانب مختلف مقامات پر میزیں اور کرسیاں لگی تھیں جہاں گارڈ بیٹھے اونگھتے رہتے۔ دروازے کے ساتھ لابی کے کونے پر ہیڈ گارڈ بیٹھا سب پر نظر رکھتا۔ سلیٹی رنگ کے ہوٹل کی عمارت اندر سے بھی ایک شاندار ہوٹل ہی تھی مگر اسے ایک قید خانے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ میں اپنے پڑھنے والوں کو اس لیے یہ سب تفصیل سے بتا رہا ہوں کہ ان کے ذہن میں اس کا نقشہ آجائے کیونکہ یہاں بہت سی کہانیاں اپنے اپنے انداز میں بند تھیں اور جن میں سے کئی ایک کو میرے سامنے کھلنا تھا۔

عظمت مجھے اپنے ساتھ لیے جب اس ہال میں داخل ہوا تو وہاں شور برپا تھا۔ سب قیدی باتوں میں مصروف تھے۔ ان کے کافی یا چائے کے کپ میزوں پر رکھے تھے۔ کوئی بازو میز پر پھیلائے اور آنکھیں موندھے لیٹا تھا۔ کسی نے اپنے پاؤں کسی اور کرسی پر رکھے تھے اور چھت پر نظریں لگی تھیں گویا وہ سوچوں میں ڈوبا تھا۔ کوئی باہر کی کھڑکیوں سے لگے شیشے سے پار آتی جاتی ٹریفک کو خالی خالی نگاہوں سے تک رہا تھا۔ کوئی دیوار سے لگے فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ کچھ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور پھر خاموش نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے۔ قیدیوں میں پاکستانی، ہندوستانی، لاطینی، ایرانی، روسی، مشرقی یورپین، جنوبی امریکا کے باشندے تھے اور گارڈ پاکستانی، سکھ، انڈین اور ایرانی تھے۔ ایک دو گھانا اور فلپائن کے بھی تھے۔

سب گارڈ آپس میں خوش گپیوں میں مصروف تھے یا پھر ہیڈ گارڈ کے آگے بچھے جا رہے تھے۔ ہیڈ گارڈ اس وقت بیدی تھا۔ جی ہاں، اس کا نام بیدی تھا اور وہ راجندر سنگھ بیدی کی طرح سکھ تھا، مگر نہ تو وہ راجندر سنگھ بیدی کی طرح کا زیرک افسانہ نگار تھا اور نہ وہ ان کی طرح بھاری تن و توش کا تھا۔ ہاں قد برابر تھا یعنی چھ فٹ سے نکلتا قد تھا مگر دبلا پتلا وجود تھا اور آنکھوں میں چمک تھی۔ تھا تو سکھ پر مونا سکھ تھا۔ کلین شیو اور بال تراشے ہوئے تھے۔ یہ فرق بھی اسے راجندر سنگھ بیدی سے الگ کرتی تھی۔ عمر کوئی چالیس سے قدرے نکل گئی تھی۔ عظمت کے علاوہ ایک لاہور کا جمیل بھی تھا۔ ایک گرنام سنگھ تھا۔ اپنی کالی داڑھی اور مونچھوں سمیت، پگڑی باندھے مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

بیدی نے دو انگلیوں سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ جمیل نے قدرے ناراضگی میں آنکھوں سے سلام کیا اور باقی سب بے نیاز بیٹھے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ گرنام سنگھ نے اٹھ کر جپھی ڈالی اور پھر ایک اخبار پر جھک گیا اور میں ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر وہ سب دیکھنے لگا جو بیان کر چکا ہوں۔

بریک ختم ہوئی تو سب گارڈ اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی مستعد ہو گیا۔ سب قیدی ایک لائن بنا کر کھڑے ہو گئے۔ بیدی نے بلا کر مجھے انگریزی میں حکم دیا کہ میں لابی کے دروازے پر کھڑا ہو جاؤں۔ جب سب لائن سے گزریں تو ان کی گنتی کروں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جب سب کو باہر لنچ روم یا گراؤنڈ میں لے جاتے ہیں تو پوائنٹ پر گارڈ ان کی گنتی کرتا ہے اور پھر اپنے اپنے نمبر ہیڈ گارڈ کو بتا دیے جاتے ہیں۔ میں نے گنتی کی تو دو زیادہ نکلے۔ بیدی مجھے گھور رہا تھا۔ سب اپنے کمروں میں پہنچ گئے۔ بیدی نے مجھے لاگ بک دی کہ ہر کمرے میں جا کر ان کی گنتی کروں۔ ایک کالم میں کمرے کا نمبر، دوسرے میں تعداد اور گنتی کا ٹائم ڈالنا ہوتا اور آخری کالم میں اپنے دستخط۔ میں نے دوبارہ گنتی کی تو پہلے سے دو کم ہو کر چالیس رہ گئے اور پھر مجھے ایک پوسٹ پر کمرے کے باہر بٹھا دیا گیا۔

بیدی کا مجھے گھورنا اچھا نہ لگا تھا۔ اب میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ کس کے ساتھ کیسے چلنا ہے۔ جب تک مجھے اپنی فیلڈ کی جاب نہیں ملتی، مجھے یہیں مستقل جاب کرنی تھی، اپنی ذمہ داری بھی بااحسن سرانجام دینی تھی اور ان سب سے بڑھ کر اپنے وقار اور عزت کو بھی برقرار رکھنا تھا۔ جہاں زیادہ لوگ کام کرتے ہوں تو وہاں ہمیشہ ایک سرد جنگ رہتی ہے۔ بلاوجہ ایک دوسرے کو نیچا دکھایا جاتا ہے۔ ہولڈنگ سینٹر میں اسٹاف کی یونین بھی تھی اور بیدی اس کا عہدیدار بھی تھا۔ یہاں کی جاب کی ایک کشش بھی تھی، اسی لیے کمپنی کے سب گارڈ جو سینکڑوں میں ہوں گے وہ یہاں کام کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے یہاں اسٹاف میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے سرد مہری رہتی تھی۔ پھر اسی وجہ سے ہر نیا گارڈ ہیڈ گارڈ یا یونین والوں کو خوش رکھنے میں لگا رہتا تھا۔ اسی لیے سب بیدی کے آگے جھکے چلے جا رہے تھے۔

ہیڈ گارڈ کی مرضی ہوتی ہے کہ کسی سے بھی قیدیوں کی گنتی کرالے اور باقی سب اپنی کرسیوں پر بیٹھے یا تو اونگھتے یا اخبار پڑھتے رہیں۔ بیدی کی نظر عنایت مجھ پر آرکی تھی اور اسی لیے ہر آدھے گھنٹے بعد پوسٹ پر لگے فون سے مجھے حکم دیتا۔ ”اقبال! کیا آپ گنتی کریں گے؟“

کمروں کے دروازے بند کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میں ہر کمرے میں گھس کر بستر پر دراز قیدیوں کو دیکھتا اور لاگ بک میں نمبر ڈال کر دوسرے کمرے میں جا گھستا۔

پانچ منٹ میں گنتی مکمل ہو گئی اور میں پھر اپنی کرسی پر آبیٹھا اور سوچوں میں گم سا ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ ڈیرہ میں عید کی نماز کی تیاریاں شروع ہو چکی ہوں گی۔ چاندرات کا میلہ ابھی لپٹا ہو گا۔ نائیوں کی دکانوں پر شیو اور بال کٹوانے والوں کی لائنیں لگی ہوں گی جہاں منچلے اپنے کپڑوں اور جوتوں کے تھیلے پکڑے غنودگی کے عالم میں اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ لطیف اور شاہ جی کس طرح اور کس دل سے چاند رات کے لیے نکلے ہوں گے۔ کیا وہ یاد کر رہے ہوں گے کہ جو سالوں کا ساتھی تھا وہ دور کے ملک میں اپنی نوکری پر دل گرفتہ بیٹھا ہے۔ دل کر رہا تھا کہ کسی طرح سے اڑ کر پاکستان پہنچ جاؤں اور پھر پلٹ کر واپس نہ آؤں۔ آج جمال کو فون کیا تو بتا رہا تھا کہ یہاں عید کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ہر کوئی اپنے کام پر ہوتا ہے۔ اسکول کھلے ہوتے ہیں اور بچے جانتے تک نہیں کہ عید کس چڑیا کا نام ہے۔ پھر نصیحت کرنے لگا۔ ”جاب ملی ہے تو بس یہی کرو اور فضول باتیں نہ سوچو۔“

میں نے شکایت کی۔ ”کیا عید کی خوشی فضول بات ہے؟“

وہ بگڑ کر بولا۔ ”ہاں فضول بات ہے۔ یہاں کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ بس کام اور صرف کام ہوتا ہے۔“

میں نے بوجھل دل سے فون رکھ دیا۔ پھر سوچنے بیٹھ گیا کہ اگر یہاں عید نہیں ہوتی تو پھر خوشی زیادہ سے زیادہ کیا ہو گی۔ یہاں اگر کوئی خوش ہوتا ہو گا تو کب ہوتا ہو گا، یا کوئی یہاں کبھی خوش ہی نہیں ہوتا کیونکہ یہاں عید نہیں ہوتی اور اگر زندگی میں کوئی خوشی نہیں ہے تو پھر اس کا مطلب ہے یہاں تو کچھ بھی نہیں۔ میں اپنے فلسفے خود بنا رہا تھا اور ان پر اپنی جانب سے غور و غوض بھی کر رہا تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں بھی عید کا تہوار بڑی دھوم سے مگر کسی اور طریقے سے منایا جاتا ہے۔ نئے کپڑے، چاند راتیں، عید کی نمازیں، پارٹیاں......سب کچھ ہوتا ہے۔ بچوں سے لے کر بڑے سب یہاں خوشی مناتے ہیں۔

جمال اس دن مجھے جاب میں دل لگانے کے لیے کہہ رہا تھا کہ یہاں عید کا کوئی تصور نہیں......! پھر میں نے خاکوانی صاحب کو عید کی مبارک باد کے لیے فون کیا۔ انہوں نے بتایا۔ ”صبح تو ان کی جاب ہے اور شام میں ان کے گھر دعوت ہے۔“ مجھے بھی بلا رہے تھے اور بتا رہے تھے۔ ”عارف اور کنول بھابی اور ان کے بچے بھی دعوت میں ہوں گے۔“

میں پھر سوچنے لگا کہ یہ تو تیس سال سے یہاں آباد ہیں اور عید کے روز یہ بھی جاب پر جا رہے ہیں۔ میں اداسی میں ڈوبتا چلا گیا۔ عارف کو فون کیا اور مبارک باد دی تو اس نے پلٹ کر خیر مبارک بھی نہ کہا۔ کہنے لگا۔ ”میری اور کنول دونوں کی جاب ہے۔ ہم دونوں جاب کے بعد دعوت پر جائیں گے۔“

اس کے اس جواب پر مجھے غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ایک تو عید کا دن اور پھر اس دن بھی جاب پر جانا اور پھر کنول بھابی کی بھی جاب! میں نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھا لیے۔ ”یا اللہ! مجھے اتنا رزق دینا کہ میں خود اپنے کنبے کا بوجھ اٹھاؤں۔ یا اللہ! میری بیوی جو یہاں کسی سے دو لفظ بات بھی نہیں کر سکے گی۔ اسے یہاں کی جاب سے بچانا اور مجھے اتنا رزق دینا کہ میرے بچے سکون اور عافیت سے رہیں۔“ پھر زور سے آمین کہا اور مطمئن ہو گیا۔

اللہ نے میری یہ دعا قبول کرلی۔ اس پاک ذات کا بے حد شکر ہے کہ بیوی کو جاب کرنے کی ضرورت نہ ہوئی۔ شروع میں اس نے کافی شور کیا کہ اس پاس کی سب بیویاں جاب

کرتی ہیں، مجھے بھی کرنی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''سوچو بھی نہیں۔ یہ جاب پاکستان والی جاب نہیں کہ کسی اسکول میں بچوں کو پڑھایا یا نہ پڑھایا اور پھر گھر آ گئے۔ یہاں تو اسٹوروں، فیکٹریوں میں ابتدا میں جاب کرنی پڑتی ہے اور تم اس کی ہولناکیوں اور سختیوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔''

وہ تنک کر کہتی۔ ''آپ کیا مجھے کمزور سمجھتے ہیں؟''

میں سکون سے جواب دیتا۔ ''ہاں۔''

وہ خفا ہو جاتی اور میں اپنی جاب کو چلا جاتا۔

یہ بحث کئی ماہ جاری رہی اور آج سمیعہ بڑے فخر سے سب ملنے والوں کو بتاتی ہے کہ میں نے یہاں کوئی جاب نہیں کی۔

میں اپنی ذمہ داری کا بوجھ خود اپنے کاندھوں پر اٹھانا چاہتا تھا۔ خود ہی تگ و دو کر کے اپنا کنبہ، اللہ کی مدد سے، پالنا چاہتا تھا۔ میں ذاتی طور پر کبھی بھی عورت کی جاب کے خلاف نہیں رہا اور نہ ہونا چاہیے اگر ضرورت ہو تو بیوی گھر کا مالی بوجھ اپنی جاب سے بانٹ سکتی ہے اور اگر ضرورت نہ ہو اور گھر کے اخراجات عزت و آبرو سے پورے ہو رہے ہوں بیوی پر گھر اور بچوں کی تربیت کی جو ذمہ داریاں ہیں، اسے پورا کرنا اوّلین ترجیح ہے۔ باہر جاب کی سختیوں سے میں اچھی طرح آگاہ تھا۔ جو کچوکے روح اور جسم پر لگتے ہیں ان کا احساس اسے ہی ہوتا ہے جو گھر چلانے کے لیے نوکری کرتا ہے، چاہے وہ عورت ہو یا مرد۔ میں برداشت نہ کر سکتا تھا کہ میری بیوی بھی اس اذیت سے گزرے اور تو اور میں نے کبھی بھی اپنی جاب کی سختیوں اور مشکلات کا ذکر گھر میں نہیں کیا۔ جو گزرا اپنے پر سہہ گیا۔ میں اپنی فیملی کو ان دشواریوں اور تکلیفوں کا حصہ دار کبھی نہیں بنانا چاہتا تھا جو اکثر میں جھیلا کرتا تھا۔ اسی لیے میں بیوی کے جاب کرنے کے خلاف نہ تھا بلکہ اسے ان مصیبتوں میں ڈالنا نہ چاہتا تھا۔

بیدی دور سے بیٹھا مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے میرا کچھ سوچنا بھی برا لگ رہا تھا کہ پھر فون کر دیا۔ ''اقبال! مہربانی کر کے قیدیوں کی گنتی تو کر لو۔''

پچھلے دو گھنٹوں سے میں ہی گنتی پر لگا ہوا تھا۔ ہیڈ گارڈ بیدی اپنا چہرہ سپاٹ لیے مجھے مصروف رکھے ہوئے تھا۔ میں نے پھر سے لاگ بک بیدی سے لی اور ایک ایک کمرے میں جا کر قیدیوں کی گنتی کر کے اندراج کرنے لگا۔ ایک کمرے میں گیا تو بستر پر لیٹا اور چھت کو خالی نظروں سے تکتا ایک پولش قیدی پھٹ پڑا۔ ''کیا مصیبت ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد حاضری لگانے آ جاتے ہو۔''

میں نے سنی ان سنی کر دی۔ ایک اور کمرے میں گیا تو ایک کو کرسی پر بیٹھے اپنا منہ تکیے میں دیے پایا۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اسی حالت میں غم والم میں ڈوبا ہوا تھا۔

یہاں یہ صرف ایک کمرے میں قید ہیں، زندگی کی سب سہولتیں انہیں میسر ہیں۔ رسالے، اخبارات، میگزین، ٹی وی سب کچھ دسترس میں ہے، صرف آزادی نہیں ہے۔ حسرت سے ہمیں تکتے ہیں۔ اللہ دشمن کو بھی اس عذاب میں مبتلا نہ کرے، (آمین)۔ اچھا کھانا پینا اور آرام دہ بستر تک ان کے لیے موجود ہیں۔ پھر بھی یہ اتنے غمگین کیوں ہیں۔ بتا چکا ہوں کہ آزادی کی نعمت کم نہیں ہے۔ کھڑکیوں سے آسمان میں اڑتے پرندوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے خیالوں اور سوچوں میں کھوئے ہوتے ہیں اور ہمارا ہر آدھے گھنٹے بعد حاضری لگانے کے لیے کمرے میں جانا ان کی سوچوں اور خوابوں کو منتشر کرتا ہے۔ یہ عادی مجرم نہیں۔ ان کا قصور یہ ہے کہ اپنے وطن میں انہیں روزگار، عزت میسر نہیں۔ یہ بڑے جتن کر کے اور بھاری رقمیں دے کر فضائی اور سمندری راستوں سے کینیڈا میں داخل ہوئے ہیں اور انہیں اگر موقع ملا تو امریکا میں گھس جائیں گے۔ تمام عمر مزدوری کریں گے۔ عزت نفس ختم ہو چکی ہے۔ غلاموں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ نہ واپس جا سکتے ہیں اور نہ یہاں رہ سکتے ہیں۔ جب پکڑے جاتے ہیں تو سیدھا ہولڈنگ سینٹر پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں سے پھر زیادہ تر ڈی پورٹ ہو جاتے ہیں۔ سب لگا لگایا مٹی ہو جاتا ہے۔

ہم سب اپنے وطنوں میں بیٹھ کر کینیڈا، انگلینڈ اور امریکا کے خواب دیکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہاں زندگی کتنی کٹھن ہے اور خاص طور پر ان کے لیے جو غیر قانونی طور پر داخل ہوتے ہیں۔ یہ آزاد فضاؤں میں اڑنے والے پرندے تھے جو اب اس ہوٹل کے پنجرے میں پھڑپھڑا رہے تھے۔ کئی ایک جو ایئرپورٹ سے سیدھا یہاں لائے گئے تھے انہیں یہ خوف تھا کہ واپس بھیج دیے جائیں گے۔ جو فیکٹریوں، اسٹوروں، ہوٹلوں میں کام کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے وہ بھی اسی دہشت میں مبتلا تھے کہ کہیں ڈی پورٹ نہ ہو جائیں۔ کوئی یہاں آ کر ناخوش تھا اور کوئی واپس جانے کے خوف میں مبتلا تھا۔ انسان کسی حالت میں بھی راضی نہیں رہتا۔

ڈنر کا وقت ہوا تو ایک ایک کمرے میں جا کر اعلان کرنا پڑا۔ ''ڈنر ٹائم، ڈنر ٹائم۔''

سب بےزاری اور کاہلی سے اپنے اپنے جوتے پہننے

لگے۔ پھر جس طرح لائن میں اپنی گنتی کروا کر اندر داخل ہوئے
تھے، ایسے ہی سر جھکائے اس بڑے ہال میں جا بیٹھے۔ ایک
گارڈ کو اندر چھوڑ دیا گیا اور وہ ہیڈ گارڈ کی پوسٹ پر جم کر بیٹھ
گیا۔ جس کو اندر بٹھایا جاتا وہ ہیڈ گارڈ کا قریبی ہوتا کیونکہ اسے
ٹانگیں پھیلا کر کرسی پر اونگھنا ہوتا یا وہ اخبار پڑھتا رہتا۔ ہم باہر
ہیڈ گارڈ کی میز کے پاس دیوار سے لگی کرسیوں پر آ بیٹھے۔

اتنے میں کچن سے گرم کھانوں کی مہک اٹھی اور ہال
میں پھیل گئی۔ قیدی لائنوں میں اپنی اپنی ٹرے لیے کھڑے ہو
گئے۔ ایک ایک کر کے کچن میں جاتے اور ٹرے بھر لاتے۔
کولڈ ڈرنک یا پانی بھی ساتھ لا کر میزوں کے گرد بیٹھ کر اپنا ڈنر
کرتے۔ گرم کھانوں سے میری بھوک بھی چمک اٹھی۔ کچھ
گارڈ بھی کچن سے چکن فرائڈ لے کر نیچے لنچ روم میں جا بیٹھے۔
عظمت نے مجھ سے کہا۔ ”تم بھی چکن لے لو۔“

میں نے کہا۔ ”یہ حلال تو نہیں ہے۔“

وہ مسکرانے لگا۔ ”ابھی نئے ہو ناں، اسی لیے جھجک
رہے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ خود بھی کچن میں جا گھسا۔ جمیل منہ پر نا
راضگی سجائے بیٹھا رہا۔

کھانے کے بعد سب کو کافی دی گئی۔ کچھ سگریٹ پینے
لائبریری میں جا بیٹھے۔ میں شیشوں کے پیچھے دھواں بھرے اس
کمرے کو دیکھتا رہا جہاں شیلفوں میں کتابیں رکھی تھیں۔ میں
بھی سگریٹ پینے وہاں جا کھڑا ہوا۔ کوئی بیٹھا تھا اور کوئی سر کے
نیچے کتابیں رکھے فرش پر دراز تھا۔ کچھ کتابیں فرش پر بکھری
تھیں۔ کش لگا کر میں نے فرش پر رکھی ایک کتاب اٹھالی۔
کتاب کو کھولا تو کانپ گیا۔ یہ قرآن پاک تھا۔ میں اسے فرش پر
پڑا دیکھ کر لرز رہا تھا۔ آنسو میری آنکھوں میں اتر رہے تھے۔
طاقوں میں سجی یہ بابرکت کتاب کس طرح فرش پر پڑی تھی۔
میں نے اسے عقیدت سے چوما، نم آنکھوں سے لگایا اور پھر سب
سے اوپر شیلف میں پیچھے چھپا کر رکھنے کے بعد باہر نکل آیا۔

بیدی کی کرسی سے چپکا جمیل اپنا منہ اس کے کان کے
قریب رکھے کوئی کھسر پھسر کر رہا تھا۔ مجھے نخوت سے دیکھا تو
منہ اس کے کان کے اور قریب لے گیا تا کہ میں سن نہ سکوں۔
اس نے پاکستانی ہونے کے باوجود مجھ سے ابھی تک کوئی بات
نہ کی تھی۔ اسی دوران بیدی کا فون بجا تو جمیل ذرا پرے ہو
گیا۔ اس نے کچھ دیر فون پر ہوں ہاں کی۔ پھر ایک قیدی کو بلایا
اور مجھ سے بولا۔ ”اسے نیچے ملاقات کے لیے لے جاؤ۔“

وہ قیدی مشرقی یورپ سے تھا۔ جینز کے اوپر ٹی شرٹ
اور اوپر ایک ہلکی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ نیچے ملاقاتوں کا ایک
ہال نما کمرا تھا۔ اسی کے اندر شیشے سے بنا ایک اور بڑا کمرا تھا،
جس میں بہت سی کھڑکیاں سی تھیں۔ دونوں جانب مائیک
رکھے تھے۔ قیدی اپنے ملاقاتی سے اس مائیک پر بات کرتے
تھے۔ اس کمرے میں ایک جانب کاؤنٹر تھا جہاں ایک گارڈ
بیٹھا یہ ملاقاتیں کرواتا تھا۔ وہ قیدی ایک کھڑکی کے سامنے
رکھے اسٹول پر جا بیٹھا۔ دوسری جانب لمبا کوٹ پہنے اس کا
وکیل تھا۔ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے اور میں پیچھے دیوار
کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔

یہ ملاقات تمام ہوئی۔ میں اسے پھر اپنے ساتھ اوپر لایا
اور ہال میں چھوڑ کر کرسی پر آ بیٹھا۔ جمیل کی بات ابھی ختم نہ ہوئی
تھی اور وہ اپنا منہ بیدی کے کان کے قریب لیے کھڑا تھا۔ نو
بجے رات ڈنر کی بریک ختم ہوئی تو میں اندر لابی میں جانے لگا
تو بیدی نے کہا۔ ”اقبال! تم اب نیچے جاؤ۔“

نیچے سے مطلب یہ تھا کہ نیچے والی لابی میں جہاں
عورتیں قید تھیں۔ پانچ چھ کمرے قیدی عورتوں کے لیے تھے
جن کے ساتھ گارڈز کے دو لنچ روم بھی تھے۔

میں نیچے آ بیٹھا۔ یہاں عورتوں کے کمروں میں جا کر
حاضری لگانے کی اجازت نہ تھی۔ بس کھلے دروازے میں
کھڑے ہو کر اندراج کر لیا جاتا تھا۔ یہاں ان پانچ کمروں
کے لیے ایک ہی گارڈ ہوتا ہے۔ یہاں بہت خاموشی ہوتی
ہے۔ جب کوئی گارڈ لنچ روم میں آتا ہے تو محسوس ہوا کہ کوئی
اور بھی یہاں ہے۔ اس لمبی لابی کے ایک کونے پر یہ کمرے
تھے اور دوسرے کونے پر سپروائزر کا آفس تھا۔

میں کرسی پر آ بیٹھا۔ کرنے کو کچھ نہ تھا۔ بور ہو کر ٹہلنے
لگا۔ اتنے میں کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ میں ششدر
رہ گیا کہ کہیں کوئی چھوٹے بچے کو تو قیدی بنا کر نہیں رکھا گیا
ہے۔ اسی مخمصے میں کھڑا تھا کہ ایک جوان عورت نے کمرے
کے دروازے سے باہر جھانکا۔ عمر کوئی پچیس تیس سال ہو
گی۔ خاصی قبول صورت تھی۔ اس نے ایک بچے کو سینے سے
لگایا ہوا تھا۔ ٹائٹ ڈریس زیب تن تھا اور بچے کو چپ کروانے
میں لگی تھی۔ جو لباس اس نے پہنا تھا اور جتنی وہ خوش شکل تھی
اس پر سے نظر نہ ہٹتی اگر وہ ایک بے بس ماں نہ ہوتی......! یہ
سوچ کر میری نظریں جھک گئیں۔ وہ خالی فیڈر ہاتھ
میں تھامے تھی۔ کہنے لگی۔ ”بچے کے لیے دودھ چاہیے۔ پہلے
والا ختم ہو چکا ہے۔“ بچہ بھوک سے بلبلا رہا تھا۔ مجھے اپنے بچے
یاد آ گئے تو آنکھیں تر ہو گئیں۔

میں نے بیدی کو فون کیا تو وہ گھٹیا مذاق کرنے لگا۔ وہ رد،

عمل میں میرے کسی چست فقرے کا انتظار کر رہا تھا مگر میں
خاموش رہا۔ ایک ماں کی ممتا پر فقرہ کسنا مجھے زیب نہ دیتا
تھا۔ کچھ دیر میرے جواب کا انتظار کیا اور پھر "ابھی بھجواتا
ہوں" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ کھانا کا ایک گارڈ جس کا
نام ٹم تھا۔ وہ دودھ کا ایک ڈبہ لے آیا۔ وہ ڈبہ لے کر چلی
گئی۔ بچے نے رونا بند کر دیا اور میں پھر سے ٹہلنے لگا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر نمودار ہوئی اور اُمید طلب نظروں
سے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا اب کیا چاہیے؟ تو بولی" آفیسر!
آپ مجھ کو واپس تو نہیں بھیج دیں گے؟"

میرے ایک بار پوچھنے پر اپنی کہانی سنانے لگی۔" میرا
خاوند نکما اور شرابی ہے۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ مجھے مارتا بھی
تھا۔ اس کے گھر والے مجھ سے نفرت کرتے تھے۔ میں امید
سے ہوئی تو کہنے لگا کہ یہ بچہ ہمیں نہیں چاہیے۔ بچے کی وجہ سے
میں اپنا کام بھی جاری نہ رکھ سکتی تھی۔ مجھے اپنے بچے کی جان
جانے کا خوف تھا۔ اسی لیے رشتہ داروں سے پیسے ادھار لیے
اور ٹورنٹو پہنچ گئی۔ امیگریشن والوں کو اپنا پورا کیس سنایا۔ انہوں
نے مجھے یہاں بھیج دیا کہ تمہارے معاملات کا جائزہ لے کر
تمہیں پناہ دینے یا نہ دینے کا فیصلہ جج کرے گا۔"

میں اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوا۔ اپنے طور پر
ہمدردی کا اظہار کیا۔ وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ میں اسے کوئی طریقہ یا
راستہ بتاؤں گا۔ مجھے تو خود کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ سیاسی یا
ازدواجی پناہ ہوتی کیا ہے۔ میرا دل اتنا پسیجا کہ میں اسے کیا بتاتا
کہ ہم جس معاشرے میں پلے بڑھے ہیں اس میں صرف
ہمدردی بہنوں سے جتاتے ہیں۔ ہمارے لیے دو رشتے ہوتے
ہیں، ایک بہن اور ایک معشوق۔ معاشرے کی ستائی ہوئی اور کم
صورت ہمارے بہن کے خانے میں فٹ ہو جاتی ہے اور باقی
سوچوں میں گنگناتی ہیں۔ کوئی درمیان کا نارمل رشتہ یا تعلق ہم
نے نہ پالا اور نہ سوچا۔ یہ ہماری تربیت یا ماحول کا کرشمہ تھا کہ
ہم نے عورتوں کے بارے میں یہی دو رشتے رکھے
ہیں۔ ہماری کلاس میں جو لڑکی ذرا کم صورت تھی وہ سب لڑکوں
کی بہن تھی اور جو خوش شکل تھی وہ سب کی آنکھوں کا تارا۔ یہ
تارا اس وقت تک چمکتا جب تک کوئی اور روشن تارا طلوع نہ ہو
جاتا۔ پھر پہلے تارے کی چمک مدھم پڑ جاتی اور وہ پھر تمام عمر
ٹمٹمانے کی کوشش میں لگی رہتی۔ میں آج یہ لکھ رہا ہوں تو مجھے
اپنے آپ پر ہنسی آرہی ہے کہ میں نے ہمدردی میں آکر ایک
اجنبی عورت کو بہن بنا لیا تھا اور وہ مجھے حیرت سے دیکھتی رہی۔

وہ مجھے اپنی کہانی سنا چکی تو مجھے سمجھ میں نہ آیا کہ اب میں
کیا کہوں۔ اس کے کس کام آسکتا ہوں۔ دودھ تو پہلے ہی مہیا
کر چکا تھا، اب کیا کروں۔ وہ مسلسل کہہ رہی تھی کہ مجھے کوئی
طریقہ بتاؤ جس سے کینیڈا کی حکومت مجھے پناہ دے
دے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جب ان کو پناہ مل جاتی ہے تو
مفت کی رہائش اور بچے کا خرچہ ملتا ہے۔ اور ساتھ ہی بچے کی
نگہداشت کے صلے میں تنخواہ بھی ملتی ہے اور پھر وہ کیش پر کوئی
کام بھی ساتھ ساتھ کرتی ہیں یا کچھ اسٹرپ کلب میں ڈانس کر
رہی ہوتی ہیں۔

یہ میرا تجربہ تھا اور میں اس معاشرے اور نظام کا ایک
اور رخ دیکھ رہا تھا۔ ابھی حالات اور واقعات کھلنے تھے۔ کینیڈا
یا امریکا میں آنے اور پناہ لینے کے لیے کیا سے کیا منصوبہ بندی
ہوتی ہے؟ اس کا مجھے دھیرے دھیرے اندازہ ہونے لگا تھا۔

بارہ بجے رات کو میری شفٹ ختم ہوئی۔ اگلے دن ہفتہ
تھا اور مجھے اگلے دو دن بارہ بجے سے رات بارہ تک یہاں
جاب کرنی تھی۔ اب پیسے بننا شروع ہو گئے تھے۔ میرا پہلا
چیک آچکا تھا۔ میں نے نئے سال کے پہلے دن جاب کی تھی جو
سرکاری چھٹی کا دن تھا۔ اسی لیے مجھے دگنا معاوضہ ملا تھا۔ میں
بہت خوش تھا۔

سینٹر کی گاڑی نے سرد رات کے اندھیرے میں ڈکسن
پر اتارا۔ وہاں سے بس پکڑی اور اپارٹمنٹ پہنچا تو دونوں
صاحبان بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شہباز اپنی
لائبریری میں گارڈ کی ڈیوٹی کا احوال سنا رہا تھا۔ وہ سخت مایوس
تھا کہ نہ بیٹھنے کی اجازت تھی اور نہ سونے کی۔" یہ کیسی سیکیورٹی
کی جاب ہے۔ خان جھوٹ بولتا ہے کہ وہ جاب پر سو جاتا
ہے۔ میں میزوں کے گرد گھومتا رہا۔ لائبریری تھی مگر مجھے
کتاب پڑھنے کی بھی اجازت نہ تھی۔"

سرجی ترنم سے میری جانب دیکھ کر بولے۔" لائبریری
ہے تو کتاب کھولنے کی تو اجازت ہونی چاہیے؟" پھر شہباز
سے انہوں نے پوچھا۔" کیا لڑکیاں بھی پڑھ رہی تھیں؟"
جب شہباز نے یہ کہا کہ تقریباً ساری لڑکیاں ہی تھیں تو پھر
مست انگیز لہجے میں بولے۔" ماشاءاللہ بہت خوبصورت ہوں
گی۔ پھر بھی تمہارا دل نہ لگا؟"

صبح اٹھے تو کسی نے بھی کسی سے ذکر تک نہ کیا کہ آج
عید کا دن۔ میں نے اس سے پہلے اپنے گھر سے دور ایک بار
کراچی میں عید کی تھی جب میں فارمیسی کی ڈگری لینے کے بعد
نوکری کرنے کراچی گیا تھا۔ وہاں یہ ڈھارس تو تھی کہ اپنے
ملک میں ہوں۔ میرے کراچی آنے کے چند ماہ بعد عید

تھی۔ شروع میں اچھی تنخواہ نہ تھی اور میں اپنی ماں کے سامنے اس وقت تک نہ جانا چاہتا تھا جب تک اچھے پیسے نہ بنا لوں۔ پچھلے سال والد صاحب کا ایک موذی مرض سے انتقال ہوا تھا اور ہم کڑے وقت کی چکی سے گزر رہے تھے۔ میں اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ اس کے ہاسٹل میں رہائش پزیر تھا۔ وہ مٹھارام ہاسٹل تھا جہاں ہم رہتے تھے۔ آج کل رینجرز کا ہیڈ کوارٹر ہے اور جہاں ان دنوں کئی مشہور لوگ قید تھے۔ مکمل لکڑی سے بنے ہاسٹل کی دوسری منزل پر ہمارا کمرا تھا۔ عید آئی تو سب گھروں کو چلے گئے۔ پورے ہاسٹل میں، میں تنہا رہ گیا۔ شام کو میں جاب سے لوٹا تو گیٹ پر ہی اسے دیکھ کر دہل گیا تھا۔ مکمل تاریکی میں گھرا وہ ہاسٹل ایک بھوت بنگلے کا منظر پیش کرتا تھا۔ میں تادیر کھڑا سوچتا رہا تھا کہ کس طرح اندر داخل ہوں۔ میں ایک شدید خوف کی کیفیت میں گھرا تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہاسٹل کی کینٹین تھی اور اسے ہزارہ کا خوش حال خان چلاتا تھا۔ وہ کینٹین میں اکیلا کھڑا تھا اور اسے بند کرنے سے پہلے سامان لپیٹ رہا تھا۔ میں گیٹ پر کھڑا خوف کے عالم میں مکمل طور پر لکڑی سے بنی اور تاریکی میں ڈوبی ہاسٹل کو عمارت کو خوف کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ ایک تو پورے ہاسٹل میں، میں ہی تنہا انسان تھا اور پھر یہ دہشت ناک منظر جو مجھے اپنے سے دور نہیں بھگاتا تھا بلکہ اپنے پاس جیسے بلا رہا تھا۔ خوش حال نے مجھے سہمے دیکھا تو باہر چلا آیا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے ہمدردی تھی وہ مجھے تسلیاں دیتا ہاسٹل کے نچلے برآمدے تک چھوڑ آیا۔ میں اس وقت بمشکل.... اس کے برآمدے میں کھڑا تھا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ چاروں جانب کبھی رونے اور کبھی چیخنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ میں لکڑی کی چوڑی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ تختوں کی چرچراہٹ سے ڈر گیا۔ بھاگتا اپنے کمرے تک پہنچا، دروازے پر پڑا تالا کھولا اور اندر سے اپنے آپ کو بند کرکے تھرتھر کانپنے لگا تھا۔ بے وطنی کی چادر مجھ پر آپڑی اور میں اس کو اوڑھے تادیر بیٹھا اپنے آنسو پونچھتا رہا تھا۔ اتنے میں کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں دم سادھے خاموش بیٹھا رہا۔ دروازہ پھر سے کھٹکا اور میں پھر سے دہلا۔ ہمت کر کے دروازہ کھولا تو کوئی اجنبی نوجوان ایک بیگ کندھے سے لٹکائے کھڑا تھا۔ کہنے لگا کہ میرا دوست یہیں رہتا ہے اور میں اس سے ملنے آیا تھا مگر وہ عید کرنے جاچکا ہے اور اب میرے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ اسے اپنا مہمان بنا لوں تاکہ یہاں کی تنہائی اور ویرانی سے نجات تو ملے۔ میں اسے کمرے میں لایا۔ اس نے اپنا بیگ پچھلی بالکونی میں کہیں لٹکایا اور پھر پوچھا۔ ”کچھ کھانے میں ہے؟“ اب میں ذرا بہادری سے اسے باہر لایا۔ خوشحال جاچکا تھا تو میں اسے ساتھ پاکستان چوک لے آیا۔ کسی ہوٹل سے اسے کھانا کھلایا اور اب کی بار بڑی بہادری سے ہاسٹل کی جناتی عمارت میں اسے لے کر داخل ہوا۔ میں اس کا نام تک نہ جانتا تھا اور نہ میں نے اس سے کبھی پوچھا۔ دوسرے دن چاندرات تھی۔ ہم دونوں ناظم آباد میں چاند میلہ دیکھنے گئے۔ رات گئے اسٹالوں پر گھومتے رہے۔ میں آگے تھا اور وہ میرے پیچھے۔ اتنے میں شور ہوا اور جو میں نے مڑ کر دیکھا تو بہت سے دکاندار مل کر اس کی ٹھکائی کر رہے تھے۔ اس نے شاید کوئی چوری کی تھی یا کسی شریف زادی کو چھیڑا تھا۔ میں ڈر گیا۔ خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگا اور اب دوبارہ مٹھارام کی روح کے سامنے کھڑا تھا۔ اب پہلے سے زیادہ خوف کے عالم میں اپنے کمرے تک پہنچا۔ اندر اس لڑکے کا بیگ رکھا تھا۔ وہ رات گزر گئی اور دوسرے دن عید تھی۔ وہ لڑکا نہ آیا۔ میں اس تنہائی اور اذیت میں یہ دن کاٹ رہا تھا۔ نہ کوئی دوست اور نہ کوئی ساتھی۔ جاب سے بھی عید کی چھٹیاں تھیں۔ یہ میں جانتا ہوں کہ کس طرح سے وہ وحشت ناک دن میں نے گزارے تھے۔ دن کو فلمیں دیکھتا اور رات جاگ کر گزارتا تھا۔ میرا کزن ایک ہفتے بعد آیا تو میں نے اسے سب ماجرا سنایا۔ اس لڑکے کا بیگ کھول کر دیکھا تو چند جوڑے کپڑوں کے تھے۔ ہاں وہ مجھ سے کچھ رقم بھی ادھار لے گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے تہیہ کیا کہ کوئی عید بھی پردیس میں نہیں گزاروں گا مگر آج میں پھر سے پردیس میں بیٹھا اپنی عید کا دن کاٹ رہا تھا مگر اس بار کچھ ساتھی بھی ہمراہ تھے۔

آج کے دن ہم میں سے کوئی یہ سوچنا بھی نہ چاہتا تھا کہ آج عید ہے۔ سرجی کہیں سے سویاں ڈھونڈ لائے تھے۔ دودھ میں ان کو بھگویا اور اوپر چھوارے ڈال کر پیالوں میں بھر کر لے آئے۔

شہباز چلا اٹھا۔ ”سرجی! یہ سویاں میرے سامنے نہ لاؤ۔ بہت ڈپریشن ہے۔“

پھر اس نے اپنے لیے آٹھ سلائیس گرم کیے اور چار انڈوں کا آملیٹ بنایا۔ سرجی سویوں کے پیالے دھڑا دھڑ پینے لگے۔ مجھے گیارہ بجے نکلنا تھا۔ میں نے ایک چائے کا کپ پیا۔ دو آلو ابالے، انہیں المونیم فائل میں لپیٹا۔ یہ میرا آج کے دن کا لنچ بھی تھا اور ڈنر بھی۔

میں وقت سے پہلے ہی گھر سے نکل آیا۔ اپنے شہر میں چچا

فراز و عید کے دن پکوڑوں اور قیمے کے کبابوں کی کڑھائی لگایا کرتا تھا۔ اس وقت اس کی یاد اس شدت سے آئی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ بچپن سے جوانی تک کے ایام رہ رہ کر ذہن کے پردۂ اسکرین پر رقصاں تھے۔ کبھی ڈیرا یاد آتا تو کبھی بھکر، کبھی لاہور تو کبھی کراچی۔ عید ہوتی تو ہم دوست مل کر بھکر جاتے اور وہاں سینما ہال میں فلمیں دیکھتے، بھکر کے بازاروں میں گھومتے، رات کسی سستے ہوٹل میں بسر ہوتی، سونے سے پہلے فلم پر سیر حاصل تبصرے ہوتے اور کبھی کبھار آپس میں لڑائی بھی ہو جاتی تھی اور دوسرے دن جب اپنے گھر ڈیرہ پہنچتے تو ہمیشہ کی طرح مار پڑتی اور آج اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ یہ سرد ہوائیں میرے اندر ایک طوفان اٹھا کر رہیں گی۔ یا پھر یہ بھی میری طرح اکیلی سنسانی تنہائی سے گھبرا کر کسی کی تلاش میں بے چین ہو کر چل رہی ہیں۔ برف اڑاتی ہوئی اپنے اردگرد کسی کو تلاش کر رہی ہیں۔

میں اس تیز جھکڑ میں اکیلا، سر جھکائے اور اپنے کندھے سے بیگ لٹکائے چلتا رہا۔

عید کا دن میرے لیے ہمیشہ بہت اہم رہا ہے۔ آج یہ اپنی حیثیت کھو رہا تھا۔ میں تنہا اور اداس تھا۔ میرے آس پاس، آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میں اس دن کو انسانوں کے درمیان رہ کر مناتا چلا آیا تھا اور آج انسانوں سے دور بھاگ رہا تھا۔ غم کے بگولے شدت سے میرے وجود کے اندر سے اٹھتے اور مجھے اپنے ساتھ اڑائے چلے جاتے تھے۔ آنسوؤں کے موتی آنکھوں سے ٹپک رہے تھے۔ میں انہیں صاف بھی نہ کر رہا تھا کیونکہ ان کا گرم لمس مجھے زندہ رکھے ہوئے تھا۔ کیا وہ عجیب دن تھا، کیا وہ عجیب لمحے تھے جب گہری اداسی مجھے آسودہ رکھتی تھی۔ ماں یاد آئی تو دل زیادہ بوجھل ہو گیا۔

کاش آج میں پردیس میں نہ ہوتا
کاش آج میں اپنے دیس میں ہوتا
اور آج بھی میری ماں نے
مجھے گلے لگا کر
عید مبارک کہا ہوتا......

میں خیالوں میں کھویا اپنے آپ سے لڑتا ہوا ڈکسن تک جو تقریباً ایک میل کا فاصلہ ہے، پیدل چلا آیا۔ میرے پاس ٹرانسپورٹ کا پاس بھی تھا اور بسیں بھی گزر رہی تھیں، پر میں اکیلا رہنا چاہتا تھا۔

ڈکسن کی کافی شاپ کے اندر عظمت بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو اٹھ کر گلے سے لگ گیا۔ بہت دیر لگا رہا۔ میں نے بھی الگ نہ کیا۔ سسکی لیتے ہوئے عید مبارک کہا اور علیحدہ ہو کر خالی نظروں سے خلاؤں میں گھورنے لگا۔ ہم دونوں گم صم بیٹھے تھے کہ اتنے میں سینٹر کی وین کا دھیما ہارن سماعت سے ٹکرایا۔ ہم آنسو صاف کرتے ہوئے باہر آئے۔ وین میں سوار ہوئے جو ہمیں ڈھو کر چل پڑی۔

آج ہیڈ گارڈ ”بڈی“ تھا۔ فلپائنی بڈی کا قد چھوٹا، جسم موٹا، پپوٹے سوجے ہوئے اور چہرے کی کھال لٹکی ہوئی تھی۔ نام کوئی اور تھا مگر پکارا اور متوجہ بڈی کے نام سے ہوتا تھا۔ مجھے دیکھا، پھر غور سے اپنی چھوٹی آنکھوں کو پورا کھول کر پھر دیکھا اور پھر بے غرض ہو کر جھٹکے کھانے لگا۔ ہم کسی قریبی دوست کو یار کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور یہاں بڈی کہتے ہیں۔ اپنے نام کی بھول بھلیوں میں کسی کو بھٹکنے سے بچانے کے لیے یہ سب کا بڈی بن گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ جاب پر بیئر پیتے پکڑا گیا تھا اور پھر سے گارڈ بنا دیا گیا تھا۔ آج بھی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ میں اس کے قریب لنچ روم میں ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ ساتھ ایک اور سردار جی گارڈ کی وردی پہنے بیٹھے اخبار پڑھتے کراہ رہے تھے۔ خود ہی اپنا تعارف کرایا، گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ زندگی کے ساٹھ سال گزار چکا ہے۔ اس کا بیٹا بھی سینٹر کی وین چلاتا ہے جس میں ایئرپورٹ سے امیگرنٹس کو پکڑ کر لاتے ہیں۔

گرنام سنگھ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ آج اس نے مجھ سے سوال و جواب کیا۔ باتوں کا سلسلہ چلا تو ہم ایک دوسرے پر عیاں ہوتے گئے اس نے بتایا کہ وہ انڈین آرمی میں لیفٹیننٹ کرنل تھا۔ پہلا سکھ تھا جو مجھ سے انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ یہ تو میں جان چکا تھا کہ اس کی انگلش بہت ہی کمزور ہے پر وہ باز نہ آیا۔ بات ایسے کرتا جیسے کسی نئے رنگروٹ سے مخاطب ہو۔ چہرے پر مصنوعی سنجیدگی سے وہ اور زیادہ دلچسپ لگنے لگا تھا۔ میں نے سردار جی کہا تو وہ برا مان گیا اور بولا۔ ”میں گرنام سنگھ ہوں اور مجھے گرنام سنگھ کے نام سے پکارو۔“

یہ سن کر میں نے ”سردار گرنام سنگھ چلے گا“ تو کچھ دیر سوچ کر بولا:

”تمہارے لیے چلے گا۔“ میرا قہقہہ نکلا اور اونگھتا ہوا بڈی اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔

آج بیدی نہیں تھا تو جمیل فارغ بیٹھا تھا۔ گرنام سنگھ کو مجھ سے بے تکلف ہوتے دیکھ کر وہ بے تاب ہو رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ مجھ سے بدزن کیوں ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنے دوست عظمت کو یہاں مستقل لگوانا چاہتا ہے اور اب مجھے کباب میں ہڈی سمجھ رہا تھا۔

گرنام سنگھ نے بڑی مشکل سے انگلش میں پوچھا۔ ''آج تمہاری عید ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو ایک بار پھر گرم جوشی سے مصافحہ کر کے عید مبارک کہا۔ میں گرنام سنگھ کے کان کے قریب ہو کر بولا۔ ''سردار گرنام بھائی! میرے ساتھ پنجابی، اردو، ہندی میں بات کریں تاکہ ہم دونوں کی خلاصی ہو۔''

وہ کافی دیر تک ہنستا رہا اور پھر اپنی داڑھی میرے کان کے قریب لا کر پنجابی میں بولا۔ ''مزہ آئے گا تمہارے ساتھ کام کرتے ہوئے۔'' پھر وہ بہت دیر تک مسکراتا رہا۔

وہ یہاں کی یونین کا سرکردہ عہدیدار بھی تھا۔ اسی لیے اکڑ کر رہتا تھا۔ لنچ روم میں بیٹھ کر اخبار پڑھنا ممنوع تھا مگر وہ پڑھتا تھا اور کسی کی ہمت نہ تھی اسے روک سکے اور تو اور امیگریشن ڈیپارٹمنٹ والے بھی اس سے کنی کتراتے تھے۔

لنچ بریک ختم ہوا تو سب قیدی لائن میں لگ کر گنتی کروانے لابی میں جانے لگے۔ لابی کے شروع میں جہاں ہیڈ گارڈ بیٹھا رہتا تھا، وہاں لابی ذرا سی گھوم کر ایک کونے پر تمام ہوتی تھی۔ وہاں دو کمرے تھے اور ایک پوسٹ تھی، جہاں گرنام سنگھ سب کی نظروں سے اوجھل بیٹھا رہتا تھا اور تو اور وہ دونوں کمرے بھی خالی رکھواتا تھا تاآنکہ باقی سارے کمرے بھر نہ جائیں اور وہ اکیلا خاموش بیٹھا اخبار پڑھتا رہے۔ آج میں لابی میں تھا اور گرنام سنگھ اوجھل تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک کونے میں دبکا بیٹھا ہے۔

لابی کے آخر میں 33 نمبر پوسٹ تھی اور میں آج وہاں بیٹھا تھا۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ ہمیشہ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ ایک پاکستانی اندر بند تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے میرے لیے ٹی وی پر کوئی چینل لگا دیا جہاں عید کی نماز خبروں میں دکھائی جا رہی تھی۔ جو ذہنی دباؤ گرنام سنگھ سے بات کر کے دور ہوا تھا وہ پھر عود کر آیا۔ لوگ عید کی نماز پڑھ کر ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ وہ مسجد نہ تھی بلکہ کوئی بڑا ہال تھا جو آج کے دن کرائے پر لیا گیا تھا۔

میں یہ سب دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا کہ آج میں عید کی نماز بھی ادا نہ کر سکا۔ مگر ادا کرنا چاہتا تو کر سکتا تھا مگر میرے اندر اتنی ہمت نہ تھی کہ اس جلاوطنی کی عید کو میں اپنی آنکھوں سے اپنے ہاتھوں مرتے دیکھوں۔ اس لیے میں نے مسجد سے اپنے آپ کو دور رکھا۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ میں اتنا جذباتی کبھی نہ ہوا تھا جتنا آج ہو رہا تھا۔ آج عید تھی اور میں ایک ہوٹل نما جیل میں بیٹھا ڈیوٹی دے رہا تھا۔ میرے بچے پاکستان میں تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ اس وقت نہ جانے کیا کر رہے ہوں گے۔

بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی اور نہ کام نہ کاج، اب وقت کتنا مشکل ہو رہا تھا۔ ڈنر کا وقفہ ہوا تو ہم باہر آ بیٹھے۔ گرنام سنگھ میرے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ جمیل ساتھ بیٹھا کن اکھیوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ وہ بے چین لگ رہا تھا۔ آخر پہلی بار مخاطب ہوا۔ ''اس سینٹر میں جاب تمہیں کسی سفارش سے ملی ہے؟''

اس کے سوال پر میں حیران تھا۔ میں نے بلا سوچے سمجھے گرنام سنگھ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہہ دیا۔ ''اس سے میری دوستی تھی اور اس کی ہی سفارش پر مجھے یہاں جاب ملی ہے۔''

گرنام سنگھ ہکلانے لگا مگر میں نے اسے ٹھوکا لگایا تو خاموش ہو گیا۔

جمیل نے گرنام کا نام سنا تو جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔ میں اب بے لگام بول رہا تھا۔ ''یہی گرنام ہی میرے پیچھے پڑا رہا کہ یہاں آجاؤ۔ سارے ہی نکمے بیٹھتے ہیں۔ کوئی کام نہیں ہوتا بس مفت کی تنخواہ ملتی ہے اور تم بھی سب کی طرح عیش کرو۔'' میں نے بات جاری رکھی۔ ''تم تو بالکل نکمے رہتے ہو اور سارا کام صرف ہیڈ گارڈ کے لیے کرتے ہو۔ کیا تمہیں اس کی تنخواہ علیحدہ سے ملتی ہے؟''

دراصل جمیل کا رویہ میرے ساتھ کل سے خراب تھا۔ وہ مجھے گھورتی نظروں سے دیکھتا تھا۔ جب میں اس کی جانب متوجہ ہوتا تو نخوت سے منہ پھیر لیتا تھا۔ یہ ایک قسم کا اشتعال تھا جو وہ مجھے دلانا چاہتا تھا۔ میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''اور کوئی سوال ہے تو ابھی پوچھ لو کیونکہ میں روزانہ ٹیسٹ نہیں دیتا۔''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

اس دن کے بعد وہ ٹھیک تو ہو گیا مگر ہر وقت اسی تاک میں رہتا کہ کسی طرح میری یہاں سے چھٹی کروا دے۔ میں خود ہی بعد میں ویکن ہٹ چھوڑ گیا تھا اسی سبب اس کے ارادے بھی کامیاب نہ ہوئے۔

کچھ لوگ آپ کو اپنا حریف سمجھنے لگتے ہیں اور آپ سے ہر وقت خوف زدہ رہتے ہیں اور یہی خوف ان کو عجیب و غریب حرکتیں کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ دوسروں کو پست ثابت کرنے پر تل جاتے ہیں۔ جمیل کے بارے میں میری یہ رائے ایک دن میں نہیں بنی تھی۔ کئی ماہ میں نے ہولڈنگ سینٹر میں کام

کیا اور میرے جاتے ہوئے بھی وہ میرے ساتھ کوئی نارمل اور متوازن رویہ نہ اپنا سکا۔ مجھے اب بھی کوئی گلہ نہیں، میں تو یہ سب بھول گیا تھا۔ اب سفرنامے کے لیے ڈائری کھولی تو سب کچھ ذہن کے پردے پر دوبارہ سے چلنے لگا۔

خیر جناب! ڈیوٹی کر کے اپارٹمنٹ پہنچا تو وہاں محفل لگی تھی۔ خان قیصر گھر سے بریانی، چکن روسٹ اور کباب بنوا کر لایا تھا۔ شاید میرا ہی انتظار ہو رہا تھا۔ دسترخوان سجا تھا۔ سرجی نے کپڑے سے کھانے ڈھانپ رکھے تھے تاکہ میرے آنے پر سب مل کر شروع کریں۔ موضوع تھا کہ اس بار سردی زیادہ نہیں پڑی ہے۔ یہ خان کا نقطہ نظر تھا۔ شہباز کہہ رہا تھا کہ اس سے زیادہ پڑ بھی جاتی تو ہمیں اسی طرح ہی اپنے آپ کو ڈھانپ کر نکلنا تھا۔

سرجی نے کہا۔ ”سردی تو وہ ہوتی ہے جس میں بندے کی قلفی جم جائے تو تب مزہ آتا ہے۔“

میں نے بالآخر آج ان سے پوچھ ہی لیا۔ ”سرجی! آپ کو برف باری، ٹھنڈ اور برفانی ہواؤں سے آخر اتنا پیار کیوں ہے؟“

سوچ کر بولے۔ ”ہر عقل مند کو ہوتا ہے۔“

”کیا ہم میں کوئی عقل نہیں ہے؟“ شہباز نے پوچھا۔

”اگر عقل ہوتی تو بف باری (برف باری) پر ہر وقت لعنتیں بھیجتے؟“ اور اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”اللہ کسی پر لعنت بھیجنے والے کو جہنم میں بھیجے گا۔“

خان قیصر کا مخصوص قہقہہ اپارٹمنٹ کے در و دیوار ہلا گیا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ”اس بف باری پر لعنت بھیجتے ہوئے کیا اس کا دل دکھتا ہے جو اللہ کو ناپسند ہے؟“ کہنے لگے۔ ”بف باری کا دل نہیں دکھتا پر مجھے تو گھاؤ لگتے ہیں۔“ اب کی بار میری قہقہے لگانے کی باری تھی۔ مجھے بے تحاشا ہنستے دیکھ کر کہنے لگے۔ ”انہی لعنتوں کی وجہ سے یہ نحوست آئی ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”کون سی؟“ تو کہنے لگے۔ ”اس بار زیادہ پڑی بھی نہیں۔“ اب ہم تینوں کے قہقہے گونجنے لگے اور سرجی اداس ہو کر بیٹھے رہے۔

میں نے بھی ہولڈنگ سینٹر میں کسی کو یہی کہتے سنا تھا کہ اس بار وہ شدت سردی میں نہیں جو پچھلی بار تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”پچھلے سال درجہ حرارت کیا تھا؟“

بتایا گیا۔ ”درجہ حرارت منفی پچاس تک گر گیا تھا اور سڑکوں اور عمارتوں کے کناروں پر برفوں کے پہاڑ تھے۔ اس بار تو منفی تیس کے آس پاس درجہ حرارت جا رہا ہے۔“

میرا ایک دوست کینیڈا کے صوبے مینی ٹوبا میں رہتا ہے جہاں دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں۔ شہر کے چاروں جانب ویرانہ ہے۔ سردیاں اپنی تمام تر قوت کے ساتھ آسمان سے ٹپکتی ہیں۔ برف اتنی پڑتی ہے کہ اسے ہٹایا ہی نہیں جاتا۔ سٹی کے پاس اتنا فنڈ نہیں ہوتا کہ صبح برف ہٹائیں اور شام کو پھر اس سے زیادہ پڑ جائے۔ کاروں کے ٹائروں کے گرد زنجیریں لپیٹ کر گاڑیاں نکلتی ہیں۔ مال میں بھی لوگ گاڑی کو اسٹارٹ رکھ کر اندر جاتے ہیں کیونکہ اگر گاڑی بند ہو تو واپسی پر برف بن چکی ہوتی ہے۔ جہاں گاڑی پارک کرتے ہیں تو ساتھ بجلی کا سوئچ ہوتا ہے جس سے تار لگا کر بیٹری کو زندہ رکھا جاتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”تو کاروبار، جاب اور روزمرہ کی زندگی تو ختم ہو جاتی ہوگی۔“

”رتی برابر بھی فرق نہیں پڑتا۔ کاروبار زندگی پوری آب و تاب کے ساتھ سارا سال جاری رہتا ہے۔“ کئی پاکستانی وہاں شفٹ ہو چکے ہیں کیونکہ وہاں اگر آپ کچھ عرصہ رہتے ہیں تو صلے میں حکومت آپ کو یہ معاوضہ دیتی ہے کہ آپ اپنے کسی بھی جاننے والے چند افراد کو کینیڈا بلوا سکتے ہیں۔ جو دو گئے تھے اب وہ دس لوگ ہیں۔ یہ سب بتانے کا مقصد یہ تھا کہ سردیاں یہاں کے معمولات میں کوئی رخنہ نہیں ڈالتیں۔ لوگ گرمیوں کے انتظار میں یہ دن کاٹ لیتے ہیں۔ وقت کا پہیا چلتا رہتا ہے۔ آدمی رک جاتا ہے مگر یہ نہیں تھمتا۔

خان ہماری بے رنگ عید پر عید کا رنگ چڑھانے کے لیے گھر سے کھانے بنوا لایا تھا اور ہم سب مل کر اس سے انصاف کر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”خان نے یہ مہمان نوازی کر کے ہمیں وطن کی یاد بھلا دی ہے۔“

وہ کہنے لگا۔ ”جب بھابی آئیں گی تو میں انہیں بتاؤں گا کہ میرے ایک بار کھانا لانے پر یہ آپ کو بھی بھول گیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”روز کھانا لایا کرو اور پھر ہر روز ہی اس کو بتانا۔“

اسی دوران شہباز اور سرجی کے درمیان کبابوں پر چھینا جھپٹی شروع ہو گئی۔

رات کافی ڈھل چکی تھی۔ باہر کی ہواؤں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ سرد جھکڑ جو برفوں سے لپٹے تھے وہ ڈور وال کے شیشوں سے ٹکرا کر واپس لوٹتے اور پھر زیادہ قوت سے پلٹ آتے۔ مجھے کل بارہ بجے پھر جاب پر جانا تھا۔ میں سونا چاہتا تھا مگر سب اپارٹمنٹ کے گرم ماحول میں بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ سرجی چائے بنانے لگے اور شہباز اپنا بھاری بھرکم وجود

سنبھالتا زور زور سے ڈکراتا رہا اور خان نے کمی کمی والی ہنسی سے ماحول کو جگائے رکھا۔

میں نے خان کی موجودگی کا فائدہ اٹھایا اور اپنی فیملی کے اسپانسر کے کاغذات مکمل کرنے لگا، مجھے انہیں جلد سے جلد بھیجنا تھا۔ فیس جتنے ڈالر میرے پاس تھے، ادا کرنے کے بعد میرے پاس چند سو ڈالر رہ جاتے مگر اب میری جاب شروع ہو چکی تھی۔ میرا عقیدہ پختہ ہو چکا تھا کہ بچے اپنے ساتھ میرا رزق بڑھا ئیں گے۔

صبح اٹھا تو بارہ گھنٹے جاب کی تھکاوٹ دور نہیں ہوئی تھی اور کچھ دیر بعد وہی بارہ گھنٹے کی جاب پر جانا تھا۔ میری فراغت تو ختم ہو چکی تھی مگر اب کاہلی لوٹ آئی۔ انسان کتنا ناشکرا واقع ہوا ہے۔ جب کوئی کام نہ تھا تو اپارٹمنٹ کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ اب جب جاب ملی تو اپارٹمنٹ سے نکلنے کو دل نہ کرتا تھا مگر مجھے کرنی تھی۔ کینیڈا ہر آنے والے کو ایک رگڑا ضرور لگاتا ہے اور میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر کے یہاں آیا تھا۔ ایک جدوجہد میری منتظر تھی۔ مجھے اپنے پاک رب پر پورا بھروسا تھا کہ میں سرخرو ہوں گا۔

صبح انڈوں اور سلائس سے ناشتا کیا۔ دو آلو ابالے، انہیں بیگ میں رکھا اور اپنی ڈیوٹی پر ہولڈنگ سینٹر پہنچ گیا۔ لنچ کا ٹائم تھا اور سب قیدی میزوں کے گرد اداس بیٹھے تھے۔ بڈی ہیڈ گارڈ کی کرسی پر آنکھیں موندے قیدیوں کو دیکھ رہا تھا۔ سب گارڈ دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں پر بیٹھے بارہ بجے دن کی شفٹ ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ رات بارہ بجے سے دن بارہ بجے تک کی خونخوار ڈیوٹی ادا کر کے ادھ موئے بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھا تو انہوں نے اپنی کرسیاں چھوڑ دیں اور ہم ان پر براجمان ہو گئے۔

اب میں سب قیدیوں کو دیکھ رہا تھا۔ پاکستانیوں نے اپنی میز سنبھال رکھی تھی۔ انڈین بھی ان کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ مشرقی یورپ والے اپنے گروہ لے کر الگ بیٹھے کسی اجنبی زبان میں بات کر رہے تھے۔ روس کے لوگ علیحدہ گم صم بیٹھے تھے۔ جنوبی امریکا کے لوگ ہسپانوی زبان میں باتیں کم کرتے اور میزوں پر سر رکھے اونگھتے زیادہ تھے۔ میں نے پوری دنیا کے لوگوں کو یہاں یکجا دیکھا یا پھر اقوام متحدہ میں دیکھا۔ ہر ایک کا اپنا انداز تھا مگر مشترک بات یہ تھی کہ یہ سب ایک ہی کھانا کھاتے، ایک ہی جیسے حالات سے لڑ رہے تھے اور تمام کے تمام شدید ڈپریشن کا شکار تھے۔ زبان، نسل، رنگ مختلف تھا مگر سب ایک ہی گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہاں یہ بات صادق آتی تھی کہ تمام انسان برابر ہیں۔

جب کسی کو اگلے چند دن میں ڈی پورٹ ہونا ہوتا تو وہ اس سے بچنے کے لیے بہت ہی دلچسپ حرکتیں کرتا۔ ہم بیٹھے تھے کہ چیک ری پبلک کا ایک قیدی دل پکڑے دھڑام سے فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔ میں حیران و پریشان اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باقی سب بیٹھے رہے اور بڈی نے اسے غصے بھرے چہرے سے دیکھا۔ مجھے ان کی بے حسی پر غصہ آرہا تھا۔ گرنام سنگھ نے اخبار لپیٹا اور مجھے بیٹھ جانے کو کہا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ بے چارہ تڑپ رہا ہے اور آپ لوگ اتنے سکون سے بیٹھے ہیں؟“

وہ کہنے لگا۔ ”کل اس نے ڈی پورٹ ہونا ہے اور آج یہ ڈراما کر رہا ہے تاکہ اس کو اسپتال لے جا کر داخل کر دیا جائے اور وہ کل ڈی پورٹ ہونے سے بچ جائے۔“

اس کو یوں تڑپتا نہیں چھوڑ سکتے تھے کیونکہ یہ ڈاکٹر کو فیصلہ کرنا تھا کہ کچھ ہوا ہے یا نہیں۔ بڈی نے سپروائزر کو فون کیا۔ سینٹر کی وین اسٹارٹ ہوگئی۔ اسے اٹھایا گیا تو وہ اپنے دل کو تھامے کراہ رہا تھا۔ بڈی نے مجھ سے کہا۔ ”میں اس کے ساتھ اسپتال جاؤں۔“

میں نے دل میں سوچا کہ یہ بھی تماشا دیکھ لیتے ہیں۔

اس کو ہتھکڑی لگانی تھی۔ مجھے کہا گیا۔ ”لگاؤ۔“

میں نے کہہ دیا۔ ”میری ٹریننگ نہیں ہے۔“

ان کم بختوں نے کھڑے کھڑے مجھے سکھلا دیا۔ مجھ سے یہ کام نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے کسی سے کہا۔ ”آپ لگا دیں، میں بعد میں کھول لوں گا۔“

مجھ سے کہا گیا۔ ”کھولنی نہیں ہے۔ اگر بیڈ پر لیٹتا ہے تو ایک ہاتھ بیڈ کے پائپ سے باندھ دینا ہے۔“

وہ قیدی متواتر کراہے چلا جا رہا تھا۔ اسے وین میں لادا اور اسپتال کی ایمر جنسی پہنچ گئے۔

کینیڈا میں اسپتال میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ایسا ہی تھا جیسے پاکستان میں کوئی اچھا اسپتال ہو سکتا ہے۔ یہاں حکومت اپنے شہریوں کو مفت علاج مہیا کرتی ہے۔ ایمر جنسی میں پہلے ان مریضوں کو دیکھا جاتا ہے جن کی حالت نازک ہو۔ باقی بیٹھے گھنٹوں انتظار کرتے ہیں۔ اگر کسی کی ٹانگ ٹوٹ جائے یا کوئی زخم آجائے اور ان کی زندگی کو کوئی خطرہ نہ ہو تو وہ ایمر جنسی میں گھنٹوں پھنسے رہتے ہیں۔ پہلے ان کی طرف توجہ ہوتی ہے جن کے مرنے کا خطرہ ہو۔ بعد میں اپنے لوگوں سے معلوم ہوا کہ اگر اسپتال جاؤ تو دل تھام کر کراہنا شروع کر دو۔ فوراً

ہاتھوں ہاتھ لیے جاؤ گے۔ بعد میں اپنی دوسری تکلیفیں بھی بتانا شروع کر دیں۔ وہ آپ کی چال جان بھی جائیں تو بھی علاج سے انکار نہیں کر سکتے۔

ہمارا قیدی مریض ہمارے اندر جاتے ہی عملے کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ سیکیورٹی کی وردی میں آپ دور سے پولیس والے لگتے ہیں اور مریض ہمیں دیکھ کر راستہ بناتے جا رہے تھے۔ قیدی صاحب سر سے گنجے اور پچاس کے.... قریب ہوں گے، ہاتھ دل پر تھا اور چیخیں چھت سے ٹکرا رہی تھیں۔ ڈاکٹروں نے ضروری ٹیسٹ کیے۔ ٹھوکا بجایا مگر اندر سے خالی ڈھول کی طرح کچھ نہ نکل سکا۔ میں اس کے سرہانے کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ ہتھکڑی سے بیڈ کے پائپ سے بندھا ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ دل پر تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ "تم آئے کیسے اور ماجرا کیا تھا؟"

وہ کچھ دیر چھت کو گھورتا رہا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "میرے گھر کو پولیس والوں نے جلا دیا تھا۔ میری گاڑی بھی انہوں نے چرا لی تھی۔ میری جان لینا چاہتے تھے۔ مجھے وہاں خوراک بھی میسر نہ تھی۔ بیوی نے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔ بچے دشمن کی طرح پیش آتے تھے۔"

میں خاموش رہا۔ وہ یہاں پناہ لینے کے لیے جواز بنا رہا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا اصل مسئلہ کیا ہے۔ اگر بیوی نے ناطہ توڑ لیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کینیڈا کی ٹکٹ کٹوا لیں؟ اگر بیویوں کے ستانے پر سیاسی پناہ ملے تو کینیڈا تو بے چارے شوہروں سے بھر جائے۔ اور پولیس کیوں تنگ کر رہی ہے؟ کچھ تو کیا ہوگا یا کرنے کا ارادہ ہوگا۔

ایک دو گھنٹے اس کی دیکھ بھال ہوتی رہی۔ درد کا ٹیکہ لگا اور وہ سکون میں چلا آیا۔ ڈاکٹر مجھے ذرا دور لے گیا اور کہا۔ "سب ٹھیک ہے، یہ حیلے بہانے زیادہ کر رہا ہے۔"

ہم اسے واپس لائے، اسی حالت میں جیسے لے گئے تھے۔ اس سے کہا گیا کہ تم کل ڈی پورٹ نہیں ہو رہے، جب تک تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہو جاتی تو وہ خوش ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دوسرے دن اسے باندھ کر جہاز میں بٹھا دیا گیا تھا۔

واپس آئے تو ہال میں ویسے ہی مجمع لگا تھا جیسے چھوڑ گیا تھا۔ اب ڈنر کا وقفہ تھا۔ شام ڈھل رہی تھی۔ آج پھر سے برف پڑ رہی تھی اور تند ہوائیں برف کو لیے گھوم رہی تھیں۔ ہال کے شیشوں سے باہر دیکھا تو سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔

چھٹی کا وقت تھا اور باہر گاڑیوں کو آتا جاتا صرف میں ہی نہیں سب قیدی دیکھ رہے تھے۔ گاڑیاں دھند میں اوجھل تھیں مگر روشنیوں کا سیلاب تھا جو بہے چلا جاتا تھا۔

باہر کی سردی سے بے پرواہ بڑی اپنے آپ میں تنہا اور خفا ہو کر بیٹھا تھا۔ گرنام سنگھ آج اندر بیٹھا آرام کر رہا تھا۔ سب ہال میں آجاتے تو ایک گارڈ اندر بند ہو کر بیٹھا رہتا۔ دو گھنٹے اندر متواتر اونگھنا یا کوئی کتاب پڑھنا بہترین مشغلہ ہوتا تھا۔ سب گارڈ اسی وجہ سے ہیڈ گارڈ سے بنا کر رکھتے تا کہ ایک تو قیدیوں کی حاضری لگانے کا کام اسے نہ دیں دوسرا یہ کہ وقفے میں انہیں اندر بٹھایا جائے۔

میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ بڑی نے مجھے جمیکا کے ایک سیاہ فام قیدی کے ساتھ لگا دیا کہ اس کی ملاقات آئی ہے اور اسے نیچے ملاقاتیوں کے کمرے میں لے جاؤں۔

اسے میں نیچے لے کر جا رہا تھا، تو وہ بولا۔ "میں کل ڈی پورٹ ہو رہا ہوں مگر جلد واپس آجاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "کیسے واپس آؤ گے؟"

کہنے لگا۔ "میں دس سال سے یہاں غیر قانونی ہوں۔ جاب سے واپس آ رہا تھا کہ دھر لیا گیا۔ میں نے یہاں شادی بھی کر لی تھی۔ ایک پانچ سالہ بیٹی بھی ہے۔ میری بیوی کینیڈا کی شہری ہے۔ میں جاؤں گا اور وہ مجھے اسپانسر کر کے دوبارہ بلا لے گی۔"

پانچ سالہ بیٹی کا سن کر مجھے اپنی بیٹی قندیل یاد آ گئی۔ وہ بھی پانچ سال کی تھی۔ میرا دل اڑا اور پاکستان پہنچ گیا۔ قندیل میرے سینے پر بیٹھ کر اپنے ننھے منے ہاتھوں سے میرے کان مروڑنے لگی۔ کبھی اپنا ننھا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیتی اور کبھی جھک کر مجھے پیار کرنے لگتی۔ اولاد بھی کیا نعمت ہے۔ اندر دوڑتے خون کے ساتھ آپ کے جسم میں رواں رہتی ہے۔

اسی دوران ہم ملاقاتیوں کے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔

میرے ذہن میں تھا کہ بیوی بھی سیاہ فام ہوگی مگر شیشے کے پار دیکھا تو ایک خوبصورت گوری بیٹھی اس کی راہ تک رہی تھی۔ آس پاس اس کے رشتہ دار بھی کھڑے تھے اور گود میں ایک گندمی رنگ کی بچی تھی جس کے نین نقش ماں اور باپ کے تھے۔ آنکھیں باپ کی تو ناک اور ہونٹ ماں کے۔ باپ کو دیکھا تو تڑپ کر مچلنے لگی۔ ماں اسے تھام رہی تھی اور وہ دونوں بازو پھیلائے باپ کو لپکتی۔

میں دم بخود تھا۔ سنا تو تھا کہ یہاں انسانی رشتے دم توڑ جاتے ہیں مگر یہاں تو محبتوں کا بے کراں سمندر ٹھاٹیں مار رہا

تھا۔ بیوی نم آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔ دو مختلف نسلوں میں اتنی زیادہ محبت اور بے قراری......! یہاں کے رشتوں کے بارے میں جو فلسفہ میں اپنے دماغ میں لیے آیا تھا وہ دھواں بن کر اڑنے لگا۔ ایک نیا آئینہ میرے سامنے تھا جس میں پیار، دھیان، دلبری اور لگن تھی۔ بچی نے باپ کو دیکھ کر چلّانا شروع کر دیا۔ میں نے ڈیوٹی پر بیٹھے گارڈ سے کہا کہ اس روتی بچی کو اندر بلا لو تا کہ ملک بدر ہونے سے پہلے اپنے باپ کے گلے تو لگ سکے۔ اس نے میری جانب دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اسٹیل کا مضبوط دروازہ کھول کر باہر سے بچی کو اٹھا لایا اور باپ کی پھیلی بانہوں میں دے دیا۔ جو رقت آمیز منظر تھا وہ میں نہ دیکھ سکتا تھا کچھ آہیں اور سسکیاں تھیں جو میرے کانوں کے پردے چیر رہی تھیں۔ بچی اپنے باپ کو چومتی اور باپ اپنی بیٹی کو۔ ماں شیشوں سے باہر بیٹھی ان دونوں کو دیکھ کر مسلسل رو رہی تھی۔ وہاں سے بیوی نے فون کا ریسیور اٹھایا اور یہاں سے شوہر نے۔ باتیں ختم نہ ہوتی تھیں۔ ملاقات کا وقت ختم ہوا اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی باپ اور بیٹی کو جدا کرنا پڑا۔ جاتے جاتے باپ اشاروں سے بیٹی کو پیار کر رہا تھا اور بیٹی باپ کو خالی خالی نظروں سے تک رہی تھی۔ میں اسے واپس اوپر لا رہا تھا تو ہم دونوں خاموش تھے۔

جب میں پاکستان میں تھا اور کینیڈا، امریکا کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ میرا کزن طارق امریکا میں مقیم تھا۔ ایک بار پاکستان آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ”وہاں تو کسی بھی لڑکی کو روک کر دوستی کر لیتے ہوں گے۔“

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا تھا۔ ”وہ کیسے؟“ میں نے کہا۔ ”اتنی آزادی اور بے راہ روی اگر ہو گی تو یہ کیسے مشکل ہوتا ہوگا؟“

وہ کہنے لگا۔ ”کوئی کسی لڑکی کو چھونا تو در کنار روک بھی نہیں سکتا۔ یہ یہاں کے لوگوں کے خواب ہیں جو ادھر بیٹھ کر بنتے ہیں۔“

میں سوچ میں رہا تھا کہ جہاں وفا نہیں تو پھر یہ کیسے ناممکن ہے؟ میں جب کینیڈا آیا تو یہی میرے خیالات تھے مگر یہاں معلوم ہوا کہ میری سوچ سراسر ناقص تھی۔ یہاں کا رہن سہن مختلف ہو سکتا ہے مگر وفا میں یہ ہم سے پیچھے نہیں۔ شادی اپنی مرضی سے کرتے ہیں تو جب ساتھ چل نہ سکے تو راستے بدل لیتے ہیں۔

یہاں رہتے کئی سال ہو گئے اور کئی کہانیاں دیکھیں۔ ایک کہانی ذرا مختصر کر کے سناتا ہوں جو مجھے اس کہانی کے

حبیبہ کو ماڈل بننے کا بہت شوق تھا۔ انہیں کسی نے مشورہ دیا کہ وزن کم کرنے کے لیے چینی کے بغیر بلیک کافی پیا کریں۔ انہوں نے کھانا چھوڑ کر صبح، دوپہر، شام اسے ہی پینا شروع کیا۔ اس کی وجہ سے ان کی بھوک ختم ہو گئی۔ جب پیٹ میں مروڑ پڑنا شروع ہوئے تو انہوں نے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ الٹرا ساؤنڈ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی آنتیں سکڑ گئی ہیں۔ صورت حال کی درستگی کے لیے انہیں آپریشن کروانا پڑا تا کہ وہ دوبارہ کھانا پینا شروع کر سکیں۔

بعض ٹوٹکے یا گھریلو استعمال کی چیزیں بظاہر بے ضرر معلوم ہوتی ہیں تاہم ان کی مقدار، استعمال کرنے کا طریقہ یا اس سے متعلق دیگر احتیاطوں کو نظر انداز کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے انہیں استعمال کرنے سے قبل کسی معالج سے مشورہ ضرور کر لینا چاہیے۔

ہومیو پیتھی اور یونانی طب میں استعمال ہونے والی ادویات کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ضمنی اثرات سے پاک ہوتی ہیں۔ یہ دعویٰ 100 فیصد درست نہیں لہٰذا ان کی ادویات کو بھی ان شعبہ جات کے ماہر معالجین کے مشورے کے بغیر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

مرسلہ: ڈاکٹر نعمان اشرف۔ مانچسٹر (یو کے)

مرکزی کردار نے سنائی تھی۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک پاکستانی اپنی جوانی کے ایام میں امریکا وزٹ ویزے پر آیا۔ یہاں اسے ہر ایک کی طرح مستقل رہنے کی خواہش تھی۔ اس نے ایک امریکن لڑکی سے اپنی شدید محبت کا اظہار کیا۔ وہ اس کی چاہت سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ لڑکی اسے ٹوٹ کر چاہنے لگی۔ دونوں نے شادی کر لی۔ لڑکے کو گرین کارڈ مل گیا۔ لڑکی جاب کر کے گھر بھی چلاتی اور بچے بھی سنبھالتی تھی۔ ساتھ ساتھ شوہر کو یونیورسٹی میں داخلہ دلایا، اس کے خرچ بھی اٹھاتی رہی۔ وہ مکمل وفادار بن کر اپنے شوہر کی بن گئی اور آپے رانجھا ہو گئی۔ اسی دوران دو لڑکے پیدا ہوئے۔ لڑکی مسلمان ہو گئی تھی۔ حجاب کرنا شروع کر دیا۔ نماز، روزہ ادا کرنے لگی، اس نے اپنے آپ کو مکمل بدل ڈالا۔ کچھ عرصے بعد لڑکے کو امریکن پاسپورٹ مل گیا۔ اس کی تعلیم بھی مکمل ہو گئی تھی اور اچھی جاب بھی حاصل کر لی۔ کہانی اب شروع ہوتی ہے۔ لڑکے کو اچھی جاب ملی تو اس نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ یہاں کسی سے شادی کر کے اس کو چھوڑ دینا ایک معمول کی بات ہے۔ اس نے ایک اور گوری امریکن لڑکی کو پسند کیا، پہلی کے منہ پر طلاق ماری اور دوسری سے شادی رچالی۔ پہلے والی لٹ گئی۔ صبر کا گھونٹ بھرا اور اپنی

محبت کی نشانیاں بڑی محبت سے پالنے لگی۔ سال گزرتے رہے۔ شوہر تو وہ دوسری کا بھی نہ بن سکا اور پاکستان چلا گیا۔ لڑکے مسلمان بن کر جوان ہوئے۔ ایک لڑکا کار حادثے میں ہلاک ہوا تو ماں کی کمر ٹوٹ گئی۔ وہ وفا کی ماری بے وفا نہ تھی۔ اس کی لاش کو پاکستان بھجوایا تا کہ باپ اپنے ہاتھوں سے اسے قبر میں اتارے، جو یہ بھی بھول چکا تھا کہ میں اپنی کوئی اولاد پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ یہ داستان وہ میرے سامنے بیٹھی مجھے سنا رہی تھی اور اپنے بہتے آنسو اپنے دامن سے صاف کرتی جاتی تھی۔ اب اس کے چہرے پر وفا کی جھریاں تھیں۔ یہ جھریاں نہ تھیں بلکہ کئی کہانیاں تھیں جو وفا کے کٹھن راستے اس کے چہرے پر چھوڑ گئے تھے۔ اس کے لبوں پر کوئی شکوہ شکایت نہ تھا بلکہ آنکھیں اپنے شوہر کی محبت سے اب بھی چمک رہی تھیں۔

تب مجھے یہ معلوم ہوا کہ محبت کسی ایک علاقے کی میراث نہیں بلکہ یہ وہ پھول ہے جو کہیں بھی، کسی کی بھی چاہت کی سیرابی سے سر اٹھا لیتا ہے۔

میں بارہ گھنٹے کی جاب کے بعد اپارٹمنٹ پہنچا تو سرجی اور شہباز دونوں دوبارہ بیٹھے لوڈو کھیل رہے تھے۔ سرجی ہمیشہ کی طرح چھکے پر چھکا مارتے تو شہباز شور کرتا کہ وہ بے ایمانی کر رہے ہیں۔ سرجی نے پہلے ڈوروال کے پردے کھسکا کر باہر پڑتی برف کو کچھ دیر غور سے دیکھا اور پھر شور مچا کر شہباز سے کہنے لگے۔

"تمہارے سر کی قسم جو میں نے بے ایمانی کی ہو۔"

شہباز نے تنبیہ انداز میں اپنی انگلی اٹھا کر سرجی سے کہا۔ "یہ منحوس قسمیں اٹھانا بند کریں، جو آپ پچھلے دو گھنٹے سے اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔"

میں اپنا کھانا گرم کر کے ان کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ "یہ بچوں والا کھیل تم لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔"

سرجی پہلے ذرا جھکے اور پھر بولے۔ "بڑوں والے کھیل تو یہاں آکر بھول ہی گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ بڑوں والے کھیل تو بہت بڑے ہونے کے بعد ہی لوگ بھول جاتے ہیں اور آپ ابھی سے......" وہ میری بات میں چھپی کاٹ کو نہ سمجھ سکے۔ میں نے پھر کہا۔ "یہ کھیل بھولے رہو تو بہتر ہے اور جلد سو جاؤ کیونکہ صبح سب نے سات بجے اٹھنا ہے اور نو بجے کین سینٹر میں پہلی کلاس ہے۔"

سرجی کا بھی داخلہ ہو چکا تھا۔ وہ جلدی اٹھنے سے کترا رہے تھے تو میں نے سختی سے کہا۔ "آٹھ بجے ہم گھر سے نکل جائیں گے تو نکلیں گے۔"

انہوں نے بے دلی سے اپنا کھیل لپیٹا اور سونے چلے گئے۔ سرجی نے مفتی کے میٹرس پر جمپ لگائی اور لیٹ گئے اور ہم دونوں کمرے میں اپنے اپنے میٹرس پر ڈھیر ہو گئے۔ میں اپنے میٹرس پر لیٹا یہ سوچتا رہا کہ چند دن میں مفتی واپس پہنچ جائے گا تو پھر سرجی کو کس طرح سے اس اپارٹمنٹ میں ایڈجسٹ کروں گا۔ کیونکہ مفتی اپنے اپارٹمنٹ میں کسی دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتا تھا اور وہ کس طرح سرجی کو قبول کرے گا جبکہ ہم نے اس کی غیر موجودگی میں اسے یہاں رکھ لیا تھا۔ میں سرجی کو کہیں اور رکھنا نہ چاہتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ پہلے تو مفتی کو انسانیت کا واسطہ دوں گا اور اگر نہ مانا تو کوئی اور اپارٹمنٹ لے کر وہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔ اگر میں اور سرجی گئے تو شہباز بھی لازماً ہمارے ہمراہ جائے گا اور مفتی اکیلا اس اپارٹمنٹ کا کرایہ نہیں اٹھا سکے گا۔ سرجی کا میٹرس جب اپنے کمرے میں لگالیں گے تو مفتی کے اعتراض کا جواز بھی ختم ہو جائے گا۔ یہی سوچتا سوچتا میں نیند کی وادی میں چلا گیا۔

صبح بمشکل اپنے آپ کو کچی نیند سے اٹھا پایا۔ رضائی سے نکلا تو شہباز منہ کھولے خراٹے لے رہا تھا۔ کمرے کی ڈوروال کا پردہ کھسکا کر باہر دیکھا تو ساتھ لگی جھاڑیاں برف سے ڈھکی تھیں۔ باہر ابھی تاریکی تھی اور فضا دھند آلود ہو رہی تھی۔ ہوا کے زور سے درخت جھول رہے تھے۔ اس خراب موسم میں باہر نکلنا ایک جان جوکھوں کا کام تھا۔ میں بیزاری سے اٹھا۔ شہباز کو ٹھوکر مار کر بیدار کیا تو نیند میں بڑبڑانے لگا۔ "یار کیا سیاپا ہے۔ میں نے کہیں نہیں جانا۔ مجھے سونے دو۔"

میں نے اس کی رضائی کو کھینچا تو وہ اٹھ بیٹھا اور ہمیشہ کی طرح اپنے آپ کو گالیاں دینے لگا۔

میں نے سوچا کہ سرجی کو بیدار کر دیں۔ لیونگ روم میں جھانکا تو وہ پہلے ہی سے تیار ہو کر بیٹھے باہر کی سرد ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جس لباس میں ہم کو پہلی بار ملے تھے اسی کو زیب تن کیا ہوا تھا۔ نیلی جین کے اوپر نیلی اور سفید دھاریوں والی شرٹ پہنی تھی۔ اب بس فرق یہ تھا کہ اس پر لال ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

وہ شیشوں کے پار اپنی مست نظریں گاڑے ہوئے بولے۔ "آپ لوگوں کے ساتھ یونیورسٹی جا رہا ہوں۔"

میں چونک کر بولا۔ "آپ پہلے وہاں ایک بار جا چکے ہیں۔ وہ تین کمروں کا خیراتی سینٹر ہے، کوئی یونیورسٹی نہیں۔"

وہ ضد کرنے لگے کہ جہاں لڑکیاں پڑھتی ہوں تو وہ

یونیورسٹی ہی کہلائی جاتی ہے۔ بس اسی لیے نفیس لباس پہنا ہے کہ خواتین پر اچھا تاثر پڑے کہ ہم کوئی گئے گزرے نہیں ہیں۔"

دراصل میں اب سر جی کی حسن طبیعت دیکھ کر خود ہی انہیں چھیڑتا تھا اور ان کے جوابات سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ "چلو اگر یہ تاثر پڑ بھی گیا کہ آپ گئے گزرے نہیں ہیں...... تو پھر کیا ہوگا؟"

اس بار تو وہ ڈور وال کے پردے سے لپٹ کر بری طرح سے شرما گئے۔

"آپ ایسے پوچھ رہے ہیں جیسے کچھ جانتے بھی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "جانتا ہوں تو اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔" اور میری بات کا مطلب وہ نہ جان پائے۔

میں نے ان کے نفیس لباس کو ایک بار پھر دیکھا اور واش روم میں گھس گیا کہ اس سے پہلے کہ شہباز گھس جائے۔

ہم تیار ہوئے، انڈوں کو فرائی کیا اور ناشتا کرنے کے بعد بس اسٹاپ پر کڑکتی سردی میں کھڑے بس کا انتظار کرنے لگے۔

بس آئی تو لرزیدہ قدموں سے اپنے آپ کو کھینچتے ہوئے اوپر چڑھے۔ اس لیے کہ سرد ہواؤں، برفیلی جھکڑوں سے لڑتے لڑتے جسم پتھریلے سے محسوس ہونے لگے تھے۔ اس منجمد جسم کو ڈھو کر ہم بس کی سیٹ تک پہنچے اور پھر بس مطلوبہ مقام پر پہنچی تو سکڑے سمٹے ٹھٹھرتے ہوئے کمیونٹی سینٹر میں داخل ہوئے تو یہاں بھرپور رونق لگی ہوئی تھی۔ کچھ لڑکیاں تھیں جو آتے جاتے چہروں کو اچٹتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ سر جی لڑکیاں دیکھ کر میرے کان میں رازداری سے بولے۔ "دیکھا! یونیورسٹی والا ماحول نہیں ہے کیا؟"

اشوک سے مل کر ہم ایک بڑے ہال نما کمرے میں جانے لگے۔ روشن کمرے میں تین اطراف میزیں لگی تھیں اور ساتھ کرسیاں رکھی تھیں۔ چوتھی جانب ایک کرسی اور میز رکھی تھی۔ کرسی پر الزبتھ نے ہم سب کو مسکرا کر گڈ مارننگ کہا۔ گلابی اسکرٹ اور بلاؤز میں وہ چمک رہی تھی۔ یہی ہماری ٹیچر بھی تھی۔ ہم اس کو ایک بار انٹرویو دے چکے تھے اور بہت راضی بھی ہوئے تھے۔ آج ذرا زیادہ راضی ہو رہے تھے کیونکہ اس کے کانوں میں پڑے جھمکے ہوا میں، گڈ مارننگ کہتے ہوئے، جب ہلتے تو بھلے محسوس ہوتے تھے۔ سر جی اس کی جانب ہاتھ ملانے کے لیے لپکے تو میں نے ان کو بازو سے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ بولے۔ "کیا یہاں کا رواج نہیں ہے کہ صبح ہر ایک سے مسکرا کر اور گرم جوشی سے ملو؟"

میں نے کہا۔ "لگتا ہے گرم جوش نہیں بلکہ آپ دہک رہے ہیں، اس لیے ذرا ٹھنڈے پڑیں۔"

ہم بیٹھ گئے تو بوٹے قد اور تیکھے نین و نقش والی الزبتھ اٹھی اور ہماری میزوں کے گرد لہرانے لگی۔ اس کے ہونٹوں کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی فضا میں حرکت کر رہے تھے۔ یہاں خواتین جب بھی بات کرتی ہیں اور لوگوں کو اپنی جانب متوجہ رکھنے کے لیے اپنے ہاتھوں کو تھام کر نہیں رکھتیں۔ پہلے اپنا تعارف کروایا اور پھر ہم سب سے تعارف مانگا۔ کلاس میں سب تارکین وطن تھے جن کا تعلق پاکستان، چائنا، پولینڈ، ہنگری، ایران، افریقا اور روس سے تھا۔ مختلف تہذیبوں اور شکلوں کے لوگ بیٹھے اپنی ٹیچر کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر سب مختلف لہجوں میں اپنا تعارف کروانے لگے۔ ایک ایرانی لڑکی جس کا نام نسرین تھا۔ نیلی جین اور سفید شرٹ میں ملبوس تھی، اس کے بال اس کے کندھوں پر جھوم رہے تھے۔

"اس کی عمر کوئی اٹھائیس کے قریب ہوگی۔" یہ سر جی کا پہلا تبصرہ تھا۔

یوکرائن کی ایک جولیا اور دوسری مایا تھی۔ مایا خاموش سوئی سوئی اور افسردہ رہتی تھی۔ بقول شہباز "قسم لے لو، یہ نشہ کرتی ہے۔" ویسے مجھے بھی اس کی حالت اور حلیہ دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ یا تو رات کو نشہ کر کے سوتی ہے اور یا صبح ہی کو اپنا نشہ تازہ کرتی ہے۔ گوری رنگت، پتلے ہونٹ، آنکھوں کے گرد سیاہ ہلکے اور آنکھیں یا تو سوئی رہتیں یا کچھ تلاش کر رہی ہوتیں۔

ایک ایرانی رضا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے کلاس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور وہ زبردستی بیٹھا ہے۔ اس سے کوئی سوال کیا جاتا تو پہلے وہ یہ ضرور پوچھتا۔ "کیا اس کا بتانا لازمی ہے۔"

جب الزبتھ اثبات میں سر ہلاتی تو بمشکل جواب دیتا۔ انگلش میں سب ہی پیدل تھے اور ہم تینوں سب سے بہتر بولتے اور سنتے تھے۔ ایک معینک چینی لڑکی جس کا نام لوری تھا، وہ ہر وقت الزبتھ کی طرف متوجہ رہتی تھی اور اسے آس پاس کا کوئی ہوش نہ رہتا تھا۔ ایک اور چینی لڑکی ین تھی۔ پولینڈ کا لمبے قد کا صحت مند مارک بہت زندہ دل تھا اور پھر اس سے میری دوستی بھی ہوگئی۔

الزبتھ نے کہا۔ "اب سب باری باری ایک دوسرے کا انٹرویو کریں۔"

دراصل وہ ایک دوسرے سے گھل مل جانے کا موقع بھی دے رہی تھی اور ہمیں سکھلا بھی رہی تھی کہ یہاں ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کیسے کرتے ہیں اور ہم میں جتنی

بھی ہچکچاہٹ تھی وہ بھی ختم ہو جائے۔ مجھے رضا ملا۔ شہباز کے حصے میں ین آئی اور سرجی اپنا پارٹنر ڈھونڈتے ڈھونڈتے جمیکا کے ایک سیاہ فام مائیبو کے ہتھے چڑھ گئے۔ رضا کو نہ مجھ سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کلاس سے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی تکلیف کی حالت میں کیوں ہے تو کہنے لگا۔ ”میں دراصل سوشل سیکیورٹی لے رہا تھا اور ایک اسٹور پر کیش کا کام بھی کرتا تھا۔ ایک دن حکومتی کارندوں کے ہاتھوں پکڑا گیا۔ وہ کہتے تھے کہ جب کام کرو گے تو حکومتی امداد بند ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ مجھے کوئی اچھی جاب نہیں ملتی ہے تو انہوں نے مجھے یہاں ڈال دیا۔“ پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اب اگر میں یہاں سے بھاگتا ہوں تو امداد بند ہو جائے گی، ورنہ میری یہاں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”تم کینیڈا کب آئے تھے۔“ تو بڑے آرام سے بولا۔ ”کیا اس کا جواب دینا ضروری ہے؟“

میں نے کہا۔ ”بالکل ضروری نہیں...... بس یہ بتا دو کہ اتنی رنگین شرٹ کہاں سے لی ہے؟“ سپاٹ چہرے کے ساتھ بولا۔ ”یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔“ مجھے اب اس کی باتوں سے دلچسپی ہونے لگی تھی۔ میں نے کہا۔ ”جو تم نے مجھے پہلے اپنے بارے میں بتایا ہے وہ بھی تو تمہاری ذاتی باتیں تھیں؟“ اپنی جگہ سے ہلے بغیر بولا۔ ”جو بتایا اپنی مرضی سے بتایا اور ضروری نہیں کہ ہر بات آپ کو بتاؤں۔“

میں نے بڑے سکون سے کہا۔ ”بالکل نہیں۔“ پھر کچھ توقف کے بعد کہا۔ ”تم صرف اپنا نام بتاؤ۔ باقی میں جانتا ہوں کہ تم کس حالات میں ہو گے۔“ کہنے لگا۔ ”میں اپنا نام پہلے کلاس کو بتا چکا ہوں۔“ میں اسے زیادہ چھیڑنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر اس کو کسی اور موقع پر اٹھا رکھا۔

سرجی مائیبو سے سر جوڑے بیٹھے تھے۔ چند ایک کو چھوڑ کر سب کی انگریزی کمزور تھی۔ شہباز چینی لڑکی ین کو ایک دور کونے میں لیے پریشان بیٹھا تھا۔ ین حیرت اور بھرپور توجہ سے اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شہباز اپنا نام بتاتا تو وہ سمجھتی کہ یہ اپنی تعلیم بتا رہا ہے۔ وہ اپنی تعلیم بتاتا تو وہ اسے شہباز کا تجربہ سمجھتی۔ شہباز اس سے کچھ پوچھتا تو وہ اس کا منہ تکنے لگتی۔ شہباز نے میز پر اپنی کہنیاں رکھیں اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ تھام کر اس طرح بیٹھا کہ جیسے ڈیٹ پر آیا ہو۔ ین ذرا سہم گئی۔

میں اور رضا اب ایک دوسرے سے بے نیاز بیٹھے تھے اور میں شہباز کی حرکتوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ نسرین مارک کے چنگل میں تھی۔ مارک نے جب مجھے اپنی طرف متوجہ پایا تو میری طرف دیکھ کر اپنی بائیں آنکھ دبا دی۔

یہ مرحلہ ختم ہوا تو الزبتھ نے کہا کہ اب سب ایک دوسرے کا تعارف کروائیں گے۔ شہباز نے ین کا تعارف کرایا تو وہ حیرت سے منہ پھاڑے اپنا تعارف سن رہی تھی۔ بعد میں شہباز نے بتایا کہ اس نے سارا تعارف غلط کروایا تھا کیونکہ اسے انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں آتا تھا۔ شہباز خفا تھا کہ ین نے اس کی شان میں اپنے لب نہیں کھولے۔ میں نے رضا کے تعارف میں صرف یہی کہا۔ ”یہ رضا ہے اور جلد یہاں سے بھاگ جائے گا۔“

رضا نے کہا۔ ”Correct۔“

اسی طرح ہم سب ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان گئے۔

پھر کافی کا وقفہ ہوا۔ کمرے سے باہر بائیں جانب برآمدے کے ایک کونے میں کافی کی مشین لگی تھی۔ ساتھ کریم پاؤڈر اور چینی بھی تھی۔ کاغذ کے کپ میں کافی پینے لگے تو اسی دوران مارک آگیا۔ نہایت ہی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ انداز دوستانہ تھا اور ہم کچھ ہی دیر میں قہقہے لگا رہے تھے۔

کلاس پھر شروع ہوئی اور دو بجے تک الزبتھ نے کینیڈا کے سیاسی نظام اور مختلف پارٹیوں پر اپنا بھرپور لیکچر دیا۔ جب فارغ ہوئے تو مجھے یہاں کی سیاسی فضا کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ دو بجے چھٹی ہوئی تو سرجی کہنے لگے۔ ”ین نظر نہیں آرہی۔ ماشاء اللہ حسین بہت ہے۔“

میں نے کہا کہ کوئی چینی لڑکی کتنی حسین ہو سکتی ہے اس کا علم مجھے ہے پھر بھی اس کے لیے آپ مرے جا رہے ہیں۔“

وہ بحث کرنے کو پر تول رہے تھے کہ میں نے ان کا بازو پکڑا اور گھسیٹتا ہوا انہیں باہر لے آیا۔ وہ احتجاج کرتے رہے کہ شائد کافی مشین کے ساتھ کہیں کھڑی ہو گی، کہنے لگے۔ ”ذرا گھل مل لینے تو دو۔“

آج میری کوئی جاب نہ تھی۔ واپسی پر کچھ گروسری کی اور پھر واپس اپارٹمنٹ آکر اپنے اپنے کونوں میں دبک گئے۔ میں اسپانسر کے کاغذات کو دیکھنے لگا کیونکہ میں جلد از جلد انہیں بھیجنا چاہتا تھا۔

شام سے پہلے ہم نے مل کر آلو قیمہ بنایا ہی تھی کہ بلڈنگ کا سیکیورٹی گارڈ مائیکل آدھمکا۔ سیاہ فام اور بھاری بھرکم مائیکل جو بلڈنگ کا سیکیورٹی گارڈ تھا۔ رات کو اپنی تنہائی اور بوریت مٹانے ہمارے پاس آجاتا تھا۔ ہم اس کو کافی/

پلا دیتے اور وہ ہم سے اپنا دل کا بوجھ اتار جاتا۔ چند دن پہلے آیا اور مجھ سے سگریٹ مانگی۔ میں اپنے سوچوں اور خیالوں کو یکجا کیے بیٹھا تھا۔ میں نے کہا۔ ”آج سگریٹ نہیں ہے۔“

وہ چلا گیا تو مجھے اپنے رویے پر کافی شرمندگی ہوئی تھی۔ آج آیا تو میں نے پچھلی شرمندگی کم کرنے کے لیے اس کو گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔ وہ خاموش ہو کر میز کے ساتھ کرسی پر جا بیٹھا۔ پھر اپنی بھاری بھرکم جیکٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ شہباز بولا۔ ”یہ پھر سگریٹ مانگے گا۔“ پھر مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ”اس مفت خورے کو بالکل نہیں دینی۔ ورنہ تمہاری جان کبھی نہیں چھوڑے گا۔“

اسی دوران مائیکل نے اپنی جیکٹ کی جیب سے سگریٹ کی نئی ڈبیا نکالی اور میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔“

شہباز جو ابھی اپنی بات جاری رکھے تھا، وہ ایکدم خاموش ہو گیا۔ میں زمین میں گڑھ گیا۔ سرجی کچن کی جانب کافی بنانے کے لیے بھاگے۔ میں نے ڈبیا لینے سے انکار کر دیا۔ وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ ایک دوست کا تحفہ ہے۔ رکھ لو۔“ اس نے میرا سگریٹ نہ دینے کا بدلہ چکا دیا تھا۔ میں چوروں کی طرح سر جھکائے ہاتھ میں ڈبیا پکڑے خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے جیب سے دوسری ڈبیا نکالی اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر سلگالی۔

اس نے بات کا رخ موڑا اور کش لیتے ہوئے اپنے گھر کو یاد کرنے لگا۔ سرجی نے اسی دوران اس کے ہاتھوں میں گرم کافی کا مگ تھما دیا تھا۔ اس نے کافی کا گھونٹ بھرا اور طمانیت سے سانس لینے لگا۔ اس کو اطمینان میں دیکھ کر میں بھی پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ وہ خود بول پڑا۔ ”مجھے اپنے ملک واپس جانا ہے۔ یہاں جانوروں والی زندگی ہے۔ وہاں سکون ہے، خوشی ہے۔ یہاں ہر وقت بے چینی اور کھنچاؤ رہتا ہے۔“

شہباز بولا۔ ”نرا سیاپا ہے یہاں۔“

مائیکل پوچھنے لگا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے تو میں نے اسے سیاپا کا مطلب سمجھایا۔ پھر کہنے لگا۔ ”ہاں، یہاں بہت سیاپا ہے۔“

پھر کافی کا ایک اور گھونٹ بھر کر بولا۔ ”وہاں میری سولہ سالہ بیٹی بھی ہے۔ میں اسے بہت یاد کرتا ہوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”بیوی بھی وہیں ہے؟“

”میری بیوی نہیں ہے۔“ کہنے لگا۔

میں حیرت سے بولا۔ ”کیا بچی گود لی تھی؟“

کہنے لگا۔ ”نہیں میری اپنی ہے۔“

ہم تینوں حیرت کے بت بنے بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔ سرجی نے پوچھا۔ ”کیا اتنی جلدی مر گئی؟“

وہ ہنس کر وضاحت دینے لگا۔ ”بچی میری گرل فرینڈ سے ہے۔ ہم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔“

ہم ششدر بیٹھے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

دوسرے دن صبح میں ابھی نیند میں تھا کہ میرے نتھنوں سے کوئی عجیب وغریب خوشبو یا بدبو، جیسے پیٹرول سے نکلتی ہے، ٹکرائی تو میں ایکدم سے اٹھ بیٹھا۔ میری نیند اڑ گئی تھی۔ میں ادھر اُدھر سونگھنے لگا کہ کہیں کوئی کیمیکل گرا ہے۔ ایک تیکھی اور چبھتی ہوئی بو مسلسل آرہی تھی۔ میں گھبرا کر اٹھا اور باہر بھاگا کہ کہیں گیس تو لیک نہیں ہو گئی۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو سرجی واش روم میں کھڑے ہلکا ہلکا گنگنا رہے تھے۔ وہی بو واش روم سے نکل کر پورے اپارٹمنٹ میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں فلش صاف کرتے ہوئے، اس کا محلول نہ گرا دیا ہو۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا کلینرز کی بوتل فرش پر گرادی ہے؟“

فرمانے لگے۔ ”آج خوشبو لگا کر یونیورسٹی جاؤں گا۔“

ایک چھوٹے سے سینٹر کو ان کا یونیورسٹی کہنا مجھے سلگا دیتا تھا اور جب کہا کہ خوشبو لگائی ہے تو دیکھا کہ ردی پرفیوم کی بوتل ان کے ہاتھوں میں ہے اور جس میں ایک گلاس سے زیادہ پرفیوم بھرا ہوا ہے۔ یہ خوشبو اسی کی تھی۔ میں نے کہا۔ ”سرجی! اس نایاب چیز کو کم از کم صبح کے وقت مت لگایا کریں۔ جس سے مردے اٹھ کھڑے ہوں مگر میں تو پھر بھی سویا ہوا تھا۔ ہماری نیند کا تو خیال کرلیا کریں۔“

کہنے لگے۔ ”میں ہمیشہ صبح ہی لگایا کرتا تھا، مجھے یہ بہت پسند ہے اور مردے کہاں کھڑے ہو سکتے ہیں؟“ پھر منہ کھولے خراٹے لیتے شہباز کی جانب اشارہ کر کے بولے۔ ”یہ تو اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا، تو مردے کہاں کھڑے ہو جاتے ہوں گے۔“

یہ کہہ کر اس کیمیائی مادے کو اور چھڑکا اور شیشے میں اپنے آپ کو غور سے دیکھنے لگے۔ میں نے اس وقت بحث کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہو گیا۔ اس لیے کہ مجھے مستقبل کا علم کہاں تھا کہ سرجی کی یہ خوشبو کیا گل کھلانے والی ہے۔ اگر علم ہوتا تو بزور طاقت میں وہ پرفیوم کی شیشی ان سے لے کر انہی کے سر پر پھوڑ دیتا۔ اک ذرا سی بات نے کتنا بڑا افسانہ کھڑا کر دیا تھا جسے سوچ سوچ کر آج بھی پیٹ میں ہنسی سے مروڑ اٹھنے لگتے ہیں۔

(بقیہ آئندہ)

سراب

راوی : شہباز ملک

قسط نمبر: 115

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ منا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذھن ودل کو بھٹکاتا ھے۔ جذبوں کو مھمیز دیتا ھے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ھے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ھے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زروتکی کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروتکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروتکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے خشی دل جی کی آواز سنائی دی ”شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔“ ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ”کنور ہوشیار“ سادی کو لے کر چیمبر...... ”مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر خشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا۔ بیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا ”پاپا“ تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا.... ہم چلے جارہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زیبی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے کنپٹی دبا کر بے ہوش کردیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو ازسرنو تیاری کرانا شروع کردی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہوگیا اور اس نے زیر لب کہا ”اعلان جنگ“ میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کردیا۔ فوج اور رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا

تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنھیں اسلحہ کے طور پر استعمال کرسکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈ بھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ بھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا کچھ نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے ربیک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔

ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے کہ ایک ساشا ملی جو کیرٹ کی بیٹی تھی۔ کیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔

اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستہ نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کر دیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریناٹ کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریناٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی۔ جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈسک بچا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا مصنوعی رن وے بنا دیا تھا۔ بھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑکے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ مگر اس کی قسمت اچھی تھی کہ نچلی شاخوں میں اٹک گیا پھر ہم نے حملہ کر کے ہارن کو بھگا دیا۔ وہاں سے ہم واپس اسی عمارت میں آئے روبیر اندر کے حالات پتا کرنے چلی گئی ہم ابھی معبد پر نظریں جمائے کھڑے تھے کہ دیکھا کہ ایک ہاتھ گاڑی میں کسی عورت کی لاش کو باہر لایا جا رہا تھا۔ حالات سنگین ہو گئے تھے کیونکہ ایرٹ روبیر کی محبت میں باہر نکل گیا تھا۔ اسی وقت میدان میں کرنل اور باسو نکل آئے۔ وہ ہماری طرف آ رہے تھے انہیں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوا تھا مگر حوصلے سے کام لیا اور میں ایک باتھ روم میں چھپ گیا۔ کرنل پتا کرنے آیا تھا کہ قیدی عورت باہر کیسے نکلی۔ پہرے دار کو ڈانٹ کر وہ لوگ چلے گئے۔ میں روبیر کی تلاش میں معبد میں گھس گیا اور روبیر کو تلاش بھی کر لیا۔ اس دوران ڈیوڈ شا کی ایک گن بھی ہاتھ لگ گئی۔ میں گن کے ساتھ ایک کمرے میں مقید ہو گیا تھا کہ ڈیوڈ شا نے ایک گیس بم اندر پھینکا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ باسو مجھے کھینچ کر باہر لے آیا۔ میں ڈیوڈ شا سے بحث کر رہا تھا کہ شاہین اندر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ کچھ اور لوگ آ گئے ہیں۔ ان کے پاس بھی آتشی اسلحہ ہے اور وہ ہمارے آدمیوں کو مار رہے ہیں۔ ڈیوڈ شا باہر نکلا تھا کہ شاہین نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے چاقو سے اسے ختم کر دیا۔ ڈیوڈ شا لوٹا تو شاہین مر چکا تھا۔ ڈیوڈ نے باسو کو حکم دیا کہ مجھے گولی مار کر باہر آ جائے اسی وقت سلوپ کی طرف سے کسی نے باسو پر فائر کیا۔ باسو اسی کمرے کی طرف دوڑ گیا۔ میں سلوپ پر اترا، سامنے والی عمارت سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس عمارت میں سفیر تھا۔ سفیر نے بتایا کہ ہماری پوری ٹیم وادی میں آ چکی ہے۔ ہم سب کو راجا عمر دراز لے کر آئے ہیں اور سامیرا جلد حملہ کرنے والی ہے۔ میں نے اسے واپس سامیرا کے پاس بھیج دیا اور ریناٹ کو تہ خانے سے جبراً نکالنے کے لیے محل پہنچا۔ میں نے آگ لگانے والے روغن کے ڈرم منگوا لیے تھے کہ تہ خانے میں گرا کر ان سب کو خوف زدہ کروں گا لیکن عین وقت پر زینی نمودار ہو گئی۔ اس نے ہمیں گن کے نشانے پر لے لیا تھا۔ اس وقت سفیر امداد غیبی بن کر آ گیا۔ اس کے ساتھی نے زینی کو نشانہ بنا دیا۔ وہاں سے ہم نکلے اور سامیرا کی مدد کرنے میدان جنگ میں پہنچے۔ جنگ شروع ہوئی اور میں نے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ریناٹ کو شکست دے دی۔ اور برف والے سے استدعا کی کہ ہمیں واپس ہماری دنیا میں بھیج دیا جائے۔ راجا عمر دراز اسی دنیا میں رہ گئے۔ ہم سب برف والے کے غار میں جا کر سو گئے۔ آنکھ کھلی تو طلسمستان کے غار میں تھے۔ اس غار سے باہر نکل کر دیکھا۔ حد نظر تک برف ہی برف تھی۔ سفیر، عبداللہ اور وسیم کو غار میں چھوڑ کر میں راستہ تلاش کرنے باہر نکلا تو کچھ لوگوں نے قید کر لیا۔ قید کرنے والے ریاست خان کو کسی سے ملنا تھا۔ ہم نے پہچان لیا کہ وہ انڈین بندہ ہے۔ ریاست خان کو حقیقت کا پتا چلا کہ وہ نادانستگی میں انڈین کا ساتھ دے رہا ہے۔ وہ محب وطن تھا اس نے میرا ساتھ دیا اور اس بندے کی خوب دھنائی کی اور اسے انڈیا میں دھکیل دیا۔ پھر ہم سب پیدل کسی آبادی کی تلاش میں نکلے۔ ایک چھوٹی سی آبادی نظر آ گئی۔ وہ لوگ مہمان نواز تھے۔ انہوں نے ایک گاڑی جو نگر جا رہی تھی اس میں میرے ساتھیوں کو بھیج دیا کہ وہ جا کر نگر سے گاڑی لے آئیں۔ میں اسی آبادی میں تھا کہ امداد شاہ نامی بندے سے ملاقات ہو گئی جو گاڑی لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ لے لیا۔ ہم ریاست خان اور اس کے دستوں کے ساتھ چل پڑے۔ امداد شاہ نے دھوکے سے مجھے اور ریاست خان کو قید کر لیا اور تشدد کرنے لگا۔ مگر میں نے پہلے خود کو آزاد کیا اور پھر ان سب پر قابو پا لیا۔ امداد شاہ کو لے کر ہم آگے بڑھے۔ ریاست خان کو اسپتال میں داخل کرایا اور نئے سفر پر نکل پڑے۔ راستے میں کئی بار مرشد کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا مگر میں اس کے گھیرے سے نکلتا رہا۔ میں جلد سے جلد راولپنڈی پہنچنا چاہتا تھا راستے میں ایک ہوٹل میں رکا وہاں ایک آدمی کو سر پکڑے روتے دیکھا تو اس کے ساتھ اس کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

(اب آگے پڑھیں) ....

منیر الاسلام نے جو کچھ بتایا تھا اس نے میرے اندر ایک طوفان سا برپا کر دیا تھا۔ کبھی ہمارے معاشرے میں برتا جاتا تھا کہ گاؤں کی بیٹی سب کی سانجھی۔ خاص کر لڑکی کی شادی میں پورا گاؤں جمع ہو جاتا تھا لیکن اب پورا گاؤں جمع تو ہوتا ہے لیکن تماشا دیکھنے کے لیے۔ اس کی بیٹی کی شادی رک رہی تھی یہ ایک دکھ بھری بات تھی۔ اسی وجہ سے میں اس کے ساتھ چل پڑا تھا کہ اگر میں کچھ مدد کرسکوں تو مجھے خوشی ہوگی لیکن جب راستے میں شہزاد ڈرائیور نے کہا کہ کسی انجان آدمی کی بات پر آپ نے یقین کیسے کرلیا تو میں سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ اب تک میں یہی دیکھتا آیا تھا کہ مرشد نئے نئے روپ میں سامنے آ رہا ہے، اب تک جتنے بھی بندے پکڑے گئے وہ سب اس کے آدمی نکلے۔ کہیں یہ بھی اسی کا آدمی نہ ہو جو مجھے جال میں پھانسنے کے لیے لے جا رہا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی میرے ذہن میں کھچڑی سی پکنے لگی تھی لیکن میں نے یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ انسان کی موت اور اس پر آنے والی مصیبت کا وقت معین ہوتا ہے۔ نہ ایک منٹ پہلے نہ ایک منٹ بعد' تو پھر ڈرنا کیسا؟ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ جیب پر تھپکی دے کر پستول کی موجودگی کا احساس کرلیا تبھی شہزاد نے پوچھا۔ ”کیا سوچنے لگیں؟“ میں نے سوچا۔ اگر میری قسمت میں موت لکھی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے بچا نہیں سکے گی پر کہا۔ ”کچھ نہیں۔“ اور شہزاد کو آگے بڑھتے رہنے کا اشارہ دے دیا۔ گاڑی کچے راستے پر آگے بڑھتی رہی۔ بالآخر ہم اس گاؤں میں داخل ہو گئے۔

ایک گھر کے سامنے قنات لگی ہوئی تھی۔ ایک بس بھی کھڑی ہوئی تھی۔ پرانی سی کھٹارا بس۔ شاید اسی میں براتی آئے تھے۔ بہت سے لوگ دری پر بیٹھے لیٹے گپیں لگا رہے تھے لیکن ان کے چہروں پر وہ خوشی نہیں تھی جو براتیوں کے چہروں پر نظر آتی ہے۔ منیر کو دیکھتے ہی ایک شخص تیزی سے آگے بڑھا اور نزدیک پہنچتے ہی بولا۔ ”آپ کہاں چلے گئے تھے۔ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔ ناشتے کا بھی ابھی تک آپ نے کوئی انتظام نہیں کیا ہے۔ کیا ہمارے لوگ بھوکے جائیں گے۔“

منیر کی زبان پر تو قفل لگ گیا تھا وہ بولے تو کیا بولے شاید وہ اسی سوچ میں تھا کہ میں نے کہا فکر نہ کریں۔ ابھی انتظام ہو جائے گا۔ آپ اپنا تعارف تو کرائیں۔“

اس سے پہلے ہی منیر بولا۔ ”یہ لڑکے کے بڑے بھائی ہیں محمد کبیر خان۔

میں نے کہا۔ ”آپ جا کر آرام کریں، سب کچھ وقت پر حاضر کر دیا جائے گا۔“

وہ شخص واپس چلا گیا لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ بڑبڑاتا ہوا گیا تھا۔ میں نے منیر سے کہا۔ ”میں رقم دے رہا ہوں۔ جس نے کھانا پکایا تھا اسے بلوا لیجیے۔“

”اس کا تو انتظام ہے لیکن اصل مسئلہ جو ہے وہ کیسے حل ہوگا؟“

”برات آئی کہاں سے ہے؟“

”جی پنڈی سے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ان صاحب کے علاوہ بزرگ میں کوئی اور بھی ہے؟“

”جی نہیں... وہی بڑا ہے۔ اسی کے کہنے پر لڑکے نے بائیک کی ڈیمانڈ کی ہے۔“

”ان کو بلا لائیں۔“ میں نے کہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

اشارہ پاتے ہی وہ تیر کی طرح آیا۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”میں ان کا رشتے میں بھائی ہوں۔ اچھا یہ بتائیں کہ اس وقت تو نئی بائیک مل نہیں رہی۔“

”بھائی صاحب نکاح تو تبھی ہوگا جب وعدہ پورا ہو گا۔ یہ کام ان کو پہلے ہی کر لینا چاہیے تھا۔ وعدہ وعدہ ہوتا ہے۔ میرے بھائی کو زیرو میٹر چاہیے۔“

”ایک منٹ...... آپ کی رہائش کہاں ہے؟“

”جی میں ڈھوک علامہ اقبال کالونی میں رہتا ہوں۔“

میں نے موبائل نکالا اور سفیر کا نمبر ملایا۔ کافی دیر تک رنگ جاتی رہی۔ شاید وہ پوری طرح نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں مایوس ہو کر کال آف کرنے جا رہا تھا کہ ادھر سے سفیر کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ”آپ پہنچ گئے کیا؟“

”نہیں ابھی میں کافی دور ہوں۔ ایک کام کرنا ہے۔ کل صبح دکانیں کھلتے ہی ایک زیرو میٹر بائیک لے کر اس ایڈریس پر پہنچا دینا ہے۔“ پھر میں نے موبائل ان صاحب کی طرف بڑھا کر کہا۔ ”آپ اپنے گھر کا پتا اسے سمجھا دیں۔ اس کے علاوہ میری طرف سے ایک فریج اور ایک ایل ای ڈی بھی پہنچ جائے گی۔“

ان صاحب کے چہرے پر ہزار پاور کی چمک آگئی۔ وہ خوشی خوشی سفیر کو اپنا پتا سمجھانے لگے۔ پھر میں نے موبائل لے کر سفیر سے کہا۔ ”ایک ایل ای ڈی اور ایک بڑے سائز کا فریج بھی پہنچا دینا ہے۔“

"لیکن آپ پہنچ کب رہے ہیں؟ اور یہ سب کیا ہے؟"

"ایک لڑکی کو جہیز میں دینا ہے۔ برات لوٹ رہی تھی اسی لیے میں نے دخل دیا ہے۔"

"گویا اب یہ ایک نیا اکاؤنٹ کھل گیا۔" سفیر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اور بھی کچھ دینا ہے تو بتا دیں۔ میں اپنی طرف سے بھی کچھ دے دوں گا۔"

"یار بیٹی کی شادی ہے، جو دے سکتا ہے دے دینا۔ اب آرام سے سو جا۔" موبائل بند کرکے میں نے ان صاحب سے کہا۔ "اور ہاں آپ جس جس چیز کی فرمائش کریں گے میں پورا کرتا جاؤں گا لیکن یاد رکھیں اگر لڑکی کو کوئی تکلیف ہوئی۔ اس نے کوئی شکایت کی تو میں سود سمیت واپس لوں گا۔ یہ لیجیے کچھ نقد رقم بھی رکھ لیں۔ اگر اور چاہیے تو وہ بھی پنڈی میں مل جائے گا۔"

نوٹوں کی گڈی دیکھ کر اس کے چہرے پر لرزا سا طاری ہو گیا۔ اس کے خواب وخیال میں بھی نہیں ہوگا کہ اسے اتنا کچھ ملے گا اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا' بیٹے مجھے پنڈی پہنچنے دو۔ ایسا سبق دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔

وہ نوٹ جیب میں رکھ رہا تھا کہ میں نے اس سے کہا کہ لڑکے کو تو بلائیں۔

لڑکا بھی مہمانوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ اندر بھی نہیں گیا تھا۔ بھائی کے بلاتے ہی وہ اٹھ کر آ گیا۔ اس کے چہرے سے شرارت ٹپک رہی تھی، میں نے دل میں کہا' بیٹے ساری اکڑفوں نہ نکالی تو میرا نام نہیں۔ لیکن اس وقت تو مجھے کام نکالنا تھا اس لیے میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ "بیٹے یہ میرا نمبر ہے۔ پنڈی پہنچ کر مجھ سے رابطہ کرنا۔"

اس نے بھائی کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "جی ضرور۔"

دراصل اس نے بھائی کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ بات بن گئی ہے۔ ایسے لالچی لوگوں کو سزا دینا ضروری ہے تاکہ یہ سلسلہ دراز نہ ہو۔ قانون نافذ کرنے والے اگر اپنی ڈیوٹی بہتر انداز میں کریں تو قانون شکنی کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ سزا نہ ہونے کی وجہ سے ہی برائی پھیلتی ہے۔

اس کام کو انجام دے کر میں بہت حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ اتنا اہم مسئلہ میں نے چٹکی بجاتے حل کر دیا تھا اس وجہ سے منیر کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ قدم بہ قدم بچھا جا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "بھائی میاں جس کام سے میں آیا تھا وہ کر دیا۔ اب مجھے اجازت دو تاکہ میں باقی کا سفر بھی پورا کر سکوں۔ مجھے ابھی آگے بھی جانا ہے۔"

"صاحب جی ایسے کیسے جانے دوں۔ کھانا گرم ہو رہا ہے۔ دو چار نوالہ ہی صحیح کھائیں تو میری عزت افزائی ہو گی۔" وہ اتنے معصوم انداز میں بولا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا اور وہیں مہمانوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھتے دیکھ کر لڑکے کا بھائی کبیر بھی وہیں آ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "بھائی صاحب آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے کہ آپ بہت پیسے والے ہو۔ منیر سے کیا رشتے داری ہے؟"

"انسانیت کا رشتہ ہے۔ بیٹی سب کی سانجھی ہوتی ہے۔ اس کی بیٹی کی ڈولی اٹھ نہیں پا رہی تھی اس لیے میں آ گیا۔" میں نے پلاؤ کا لقمہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سر جی اس کے معنی ہیں کہ آپ بڑے دل والے ہیں۔"

"اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کا حکم دیا ہے لیکن ہم سب حسد ونفاق کے بیج بو کر گناہ کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں اور پھر اللہ سے اچھائی کی امید بھی لگائے بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کبھی نہیں چاہتا ہے انسانوں کا معاشرہ غلط رخ پر بڑھے۔ اگر کوئی غلطی کر رہا ہے تو اسے احساس دلائیں کہ وہ غلط کر رہا ہے۔ میری کوئی بیٹی نہیں ہے لیکن میں ایک باپ کا درد جانتا ہوں...... اسے جب یہ خبر ملی ہو گی کہ آپ لوگ برات واپس لے جا رہے ہیں تو سوچیں اس کے دل پر کیسی چوٹ لگی ہو گی۔ انسان کی خدمت بھی عبادت ہے اور میں نے وہی کیا۔"

میری تقریر پر اس نے سر جھکا لیا تھا۔ جو کام تیر ونشتر نہیں کر پاتے وہ میٹھے بول کر جاتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال ہند میں پھیلا اسلام ہے۔ یہاں نہ تو کسی بادشاہ نے بزور طاقت اسلام پھیلایا نہ سیاست کی بازی گری دکھائی، اولیا کرام آئے۔ انہوں نے شفقت ومحبت کا مظاہرہ کیا۔ لوگوں کے دلوں میں اپنا احترام پیدا کیا اور اسلام پھیلتا چلا گیا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ زبانِ شیریں' ملک گیری۔ میٹھے بول کا اپنا جادو ہے۔ میری اس چھوٹی سی تقریر نے اسے یاد دلا دیا ہوگا کہ اس کے سینے میں بھی دل ہے۔ اور شاید اسے بھی کسی نے کسی پریشانی سے کبھی نہ کبھی نجات دلائی ہو گی ورنہ اس کا سر اس طرح جھکتا نہیں۔

اسے فکر میں غلطاں دیکھ کر اس کے چہرے پر ابھر آئی پشیمانی کے عکس کو محسوس کرتے ہوئے میں نے ایک اور

چوٹ کی۔ ''ہر انسان کے شانوں پر کاتبین بھی ہیں اور وہ اس کے ہر عمل کا حساب لکھتے جا رہے ہیں۔ اس لیے کہ اپنے حصے کی آگ خود بندہ لے کر جہنم جائے گا۔''

''اور جہنم میں جو آگ جل رہی ہے اس کا کیا ہوگا؟'' ایک شخص جو بڑے غور سے پاس کھڑا میری باتیں سن رہا تھا اس نے کہا۔

''جہنم میں شاید آگ نہ ہو۔ کیونکہ اعمال انسان کے ساتھ ہوگا اور برے اعمال کی آگ اس کمی کو پورا کرے گی۔ اب یہی دیکھ لو۔ اگر یہ شادی نہ ہوتی تو کیا تم لوگ آتے؟ نہیں نا... یہ شادی تمہارے آنے کی وجہ بنی۔ اسی طرح جلانے کی وجہ خود اس کا اعمال بنے گا۔'' کہہ کر میں نے کبیر پر نظر ڈالی پھر کہا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ شرمندہ ہے۔ میں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ''اگر یہ شادی نہیں ہوتی اور برات واپس چلی جاتی تو کیا ہوتا؟ لڑکی کی شادی کرانا۔ شادی میں مدد دینا ثواب کا کام ہے۔ اور برات لوٹ جاتی تو ثواب خود بخود گناہ میں بدل جاتا۔ اس کی سزا بھی ملتی۔ مجھے تو حیرت ہے کہ ایسا کام کبیر صاحب نے کیسے کیا۔''

''یہ غلطی مجھ سے ہوئی ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔'' کبیر نے کہا۔ ''ایک شخص نے مجھے یہ ڈیوٹی دی تھی کہ میں کسی بھی حالت میں یہ شادی روک دوں۔ میں نے اس شخص سے کہا تھا کہ بات اتنی آسان نہیں ہے۔ اگر شادی سے انکار ہوگا تو لوگ مجھے برا کہیں گے۔ تب اس نے مجھے پانچ ہزار روپے دیے کہ یہ انعام ہے۔ اگر شادی رک گئی تو اور بھی دوں گا۔''

میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا کہ یہ کام کسی ایسے شخص کا ہے جو اس لڑکی کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے پاس رقم بھی وافر ہے جس کی وجہ سے وہ لوگوں کو خرید رہا ہے۔ یہ گاؤں ایسا نہیں تھا کہ یہاں کے لوگ معمولی معمولی باتوں پر دولت کی نمائش کریں۔ گاؤں کے حالات بتا رہے تھے کہ یہاں والے ترستی ہوئی زندگی گزار رہے ہیں جو ہمارے وطن کے نوّے فیصد گاؤں کا مقدر ہے۔ اس گاؤں میں صرف ایک آدمی ایسا ہے جو ایسی حرکتیں کرسکتا ہے۔ اور اس کا نام منیر نے لیا بھی تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ چودھری اس کی بیٹی میں دلچسپی لے رہا تھا۔ ان حرکات کی وجہ سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس نے یہ کھیل بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔

ایک باپ کے لیے بیٹی کی رخصتی حد سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بساط سے بڑھ کر انتظامات کرے۔ ایسی رخصتی ہو کہ لوگ یاد رکھیں۔ منیر نے بھی کچھ ایسا ہی سوچا ہوگا۔ اس سلسلے میں اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے ہوں گے۔ ایسے وقت چودھری خود آگے آیا ہوگا۔

اس نے منیر کو ادھار دینے کے وعدے پر شادی کے انتظامات پر اکسایا ہوگا۔ جب اس بے چارے نے اپنی تمام جمع پونجی شادی کی تیاری پر لگادی تو اس نے ادھار دینے سے منع کردیا۔ یعنی بیچ منجدھار میں لا کر چھوڑ دیا۔ ابھی منیر اس مسئلہ کا حل تلاش کر ہی رہا تھا کہ چودھری نے کبیر کو تلاش کیا اور اسے رقم دے کر پورا منظرنامہ تبدیل کردینے پر راضی کرلیا۔ عین وقت پر بے چارہ منیر بائیک کہاں سے دلا سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ برات واپس چلی جاتی پھر کچھ دن کے بعد لڑکی کو طلاق مل جاتی۔ غریب گھرانوں کی لڑکیوں کی شادی ایسے ہی مشکل امر ہے۔ طلاق یافتہ کے لیے تو بہت ہی مشکل۔ تب وہ چودھری آگے آتا اور لڑکی کو اپنے نکاح میں لے لیتا۔ اب مجھے اس چودھری پر غصہ آنے لگا تھا۔ میری ذہنی رو بہک اٹھی میں نے منیر سے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ کہ اس وقت چودھری کہاں ملے گا؟''

''صاحب جی! ابھی میری لڑکی گھر میں ہے۔ اگر اس نے کوئی ہنگامہ کھڑا کردیا تو مشکل ہوجائے گی۔'' منیر نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''جی ہاں جناب۔ گواہی کے لیے آپ مجھے بھی طلب کریں گے اور وہ میرا دشمن بن جائے گا۔ جو ہوگیا اسے بھلا دینا ہی مناسب ہے۔ اب فکر کی بات یہ ہے کہ میں اسے رقم کیسے واپس کروں؟'' کبیر افسردہ لہجے میں بولا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ اب چودھری سے نمٹنا میرا کام ہے۔ منیر صاحب کی وجہ سے اس وقت تو میں خاموش رہ جاتا ہوں۔'' میرے اس جملے نے کبیر پر جادو جیسا اثر دکھایا، وہ مطمئن ہوگیا۔

''آپ لوگ رخصتی کی تیاری کریں۔ مجھے بھی واپسی کی جلدی ہے۔'' میں نے کبیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ ڈرائیور کی جانب بھاگا۔ منیر گھر کے اندر چلا گیا۔ تاکہ جلدی جلدی رسم ادا کراسکے۔ شہزاد جو اب تک خاموش تماشائی بنا ہوا تھا اس نے کہا۔ ''صاحب جی میں بھی گاڑی نکالوں؟''

''بالکل۔ اب یہاں رکنے کا فائدہ؟''

عین اسی وقت منیر پریشانی کی حالت میں دوڑتا ہوا گھر کے اندر سے نکلا۔ وہ سیدھا میری طرف آرہا تھا۔ اس

کے چہرے سے عیاں تھا کہ کوئی انہونی ہوگئی ہے۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھا تاکہ اسے لوگوں سے دور ہی روک لوں اور وجہ پوچھ لوں۔

ابھی شامیانے سے وہ دور ہی تھا کہ میں نے اسے روک لیا اور پوچھا۔ ”کیا ہوا۔ اتنے پریشان کیوں ہو؟“

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ ”غضب ہوگیا۔ میں نے اپنی بیٹی کو آٹھ جماعتیں پڑھوا کر بہت بڑی غلطی کردی ہے۔“

”ہوا کیا، کھل کر بتاؤ۔“

”صاحب جی وہ فلم والیوں کی طرح تن کر کھڑی ہوگئی ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ اسے طلاق دلائی جائے۔ وہ اس بندے کے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہے۔“

”کیوں کیوں؟“ میں بھی الجھ گیا تھا۔ کہانی نے ایک نیا رخ لے لیا تھا۔ گاؤں کی ایک معمولی پڑھی لکھی لڑکی نے یہ ہمت کیسے کرلی، میں بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کہیں اس کے پیچھے کوئی عشق عاشقی کا چکر تو نہیں ہے میں اس رخ پر سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ یہ فلم ڈرامے، فیس بک انٹرنیٹ نئی پود کو بھٹکانے میں بہت بڑا کردار ادا کر رہی ہیں۔ جب سے موبائل میں نیٹ کا آپشن آیا ہے تو یہ رابطے کی سائٹس نے اور زیادہ مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ گاؤں گاؤں کے بچے استعمال کرنے لگے ہیں۔ شاید یہ اسی کا اثر ہے۔

”صاحب جی اب کیا ہوگا؟“ منیر نے رنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

”کیا میں اس سے بات کرسکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں کیوں نہیں۔ وہ آپ کی بھی بیٹی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”چلو!“ میں نے اشارہ کیا۔

وہ مجھے لے کر اندر کی جانب چلا۔ وہاں بیٹھے تمام لوگ منیر کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ عجوبہ ہو۔ صبح ہو چکی تھی اس لیے گاؤں میں چہل پہل نظر آنے لگی تھی کچھ ایسے لوگ بھی وہاں آکھڑے ہوئے تھے جو ابھی ابھی اپنے گھروں سے برآمد ہوئے تھے۔ میں ان لوگوں کا جائزہ لیتا ہوا منیر کے گھر میں داخل ہوگیا۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ دوسرے کمرے میں بچی کو دلہن بنا کر بٹھایا گیا تھا۔ وہ مجھے اس کمرے تک لے گیا۔ لڑکی نے شادی کا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اس کے گرد کئی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ میں نے قریب پہنچ کر کہا۔ ”بیٹی میں تمہارے لیے اجنبی ہوں لیکن اگر تم چاہو تو مجھے چچا کہہ سکتی ہو، اسی رشتے سے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”آپ وہی صاحب ہیں نا جنہوں نے بائیک دینے کا کہا ہے؟“ لڑکی نے جھکے سر کے ساتھ سوال کیا۔

”ہاں بیٹی!“ میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ”تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ اگر چاہو تو میں اس کمرے کو خالی کرادوں۔ تاکہ تم بلاجھجک اکیلے میں جواب دے سکو۔“

”جی نہیں۔ میں جو کچھ بھی کہنا چاہتی ہوں سب کے سامنے کہوں گی۔ اگر ان میں ہمت ہے تو میری باتیں سن سکتی ہیں۔“ اس نے ایک گہری سانس لی اور پھر کہا۔ ”زمانہ بدل رہا ہے۔ اب وہ حالات نہیں رہے کہ لڑکیاں اللہ میاں کی گائے کہلائیں۔ ہم بھی انسان ہیں۔ ہمارے سینے میں بھی دل ہے۔ دل میں ارمان ہے۔ ہماری بھی پسند نہ پسند ہے۔ میں اس لالچی لڑکے کے ساتھ کیسے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا خواب دیکھوں جس کے دل میں ایک اچھی بیوی کی نہیں زیرو میٹر بائیک کی خواہش ہو۔ نہیں میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ یہ کل کو کسی اور بڑی چیز کے لیے مجھے بیچنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔“

”اے لڑکی تو یہ کیا بول رہی ہے۔“ وہیں کھڑی ایک عورت نے اسے ڈانٹا۔

”خالہ مانے تو بیچ میں مت بول میں جو کہہ رہی ہوں یہ ان صاحب کو سمجھنے دے۔“ لڑکی نے جھنجلا کر جواب دیا۔

میں خالہ مانے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ان کے پیچھے کھڑے کبیر پر نظر پڑی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ بھی اندازہ لگا چکا تھا کہ اچھی آفت گلے پڑ گئی ہے۔ لڑکی گاؤں کی ضرور ہے لیکن وہ دسویں صدی کی نہیں ہے۔ میں نے کبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ سن رہے ہیں۔ یہ بہادر بچی کیا کہہ رہی ہے؟“

”جی جی اس کی زبان بہت تیز ہے۔ اس کا گزارہ شاید ہی ہمارے ہاں ہو۔“

”آپ جو کوئی بھی ہوں میں آپ کو نہیں جانتی لیکن اسلام کو جانتی ہوں۔ اگر آپ کو نہیں معلوم تو آپ کسی عالم دین سے معلوم کریں وہ آپ کو بتائے گا۔ اسلام کا پہلا حکم ہے کہ نکاح تبھی ہوسکتا ہے جب لڑکی راضی ہو۔ تاریخ پڑھیں صحابہ کرام کے دور میں کئی لڑکیوں کا ذکر مل جائے گا جنہوں نے اپنی رضا دی تب گھر والوں نے پیغام بھیجا یا قبول کیا۔ اسلام نے عورتوں کو شادی کے سلسلہ میں زیادہ اختیار دیا ہے۔ اسی اختیار کے تحت میں نے فیصلہ کیا ہے کہ

چند گھنٹے پہلے جو نکاح کے نام سے میرے ساتھ کھیل کھیلا گیا ہے۔ اسے ختم کیا جائے اور مجھے طلاق دی جائے۔ میں کسی بھی حالت میں ایسے لالچی شخص کا گھر بسا نہیں سکتی۔"

میں نے مڑ کر کبیر صاحب سے کہا۔ "آپ نے سن لیا.. لڑکی آپ کے ہاں جانے پر تیار نہیں۔"

"جی جی۔" کبیر نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔

"اس لیے آپ لڑکے سے کہیں کہ وہ ابھی اور اسی وقت لڑکی کو طلاق دے اور آپ اپنے براتیوں کو لے کر جا سکتے ہیں۔" میں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

"اور وہ بائیک؟ وہ روپیا۔"

"روپے آپ لے جا سکتے ہیں۔ میں دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا۔ میں سمجھوں گا کہ وہ رقم میری اس بیٹی کی جان کا صدقہ ہے۔ اب ایک منٹ کے اندر چل دیں۔"

"لیکن..." ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہاں کھڑے ہوئے ایک شخص نے جواب میں کہا:

"تم جاتے ہو یا اپنی خاطر داری کرا کر جاؤ گے۔ یہ ہمارے گاؤں کی عزت ہے۔ اس نے جو فیصلہ کیا ہے اس کو کوئی پسند کرے یا نہ کرے لیکن میں پسند کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہوں۔"

"بالکل یہ سچ کہہ رہی ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ لڑکی کی پہلے مرضی معلوم کرو پھر اس کی شادی کرو۔ اس کی مرضی نہیں ہے۔ اس لیے یہ شادی ہوئی ہی نہیں۔" ایک باریش شخص نے کہا جو اب تک خاموش تھا۔ "اس لڑکے سے کہو کہ ابھی اور اسی وقت وہ اسے طلاق دے اور میں اپنے بیٹے کی اسے دلہن بناؤں گا۔ میرا اسد لاہور میں ہے۔ وہ وہاں دکان کرتا ہے۔ اپنی دکان ہے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں ایک کپڑے میں بیٹی کو لے جاؤں گا۔"

"اگر یہ آپ کا فیصلہ ہے تو بھی میں اسے بھرپور جہیز دوں گا۔ آپ میرا نمبر رکھ لیں۔ جس دن نکاح ہوگا مجھے فون کر دیجئے گا۔ سب کچھ آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے پنڈی پہنچنا ہے۔" میں نے کہا اور مڑ گیا۔

اسی وقت لڑکی نے کہا۔ "انکل آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کیا۔ آپ ہی کی وجہ سے مجھے حوصلہ ملا ورنہ میں اس بے باکی سے کبھی اتنے بڑے مسئلہ میں بول نہیں سکتی تھی۔ اس لیے میری التجا ہے کہ نکاح کے وقت آپ ضرور آئیے گا۔"

"بالکل آؤں گا۔ نہ صرف میں بلکہ میرے ساتھ اور بھی بہت سارے لوگ ہوں گے۔ میرے تمام ساتھی۔" کہہ کر میں نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور باہر نکل آیا۔

باہر آکر دیکھا کہ ایک مولوی صاحب دری پر بیٹھے ہیں۔ تمام براتی جا چکے تھے۔ مولوی صاحب نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "یہ طلاق نامہ وہ لوگ دے گئے ہیں۔ اس پر گواہ میں آپ کے ڈرائیور کا نام بھی لکھ دیا ہے۔"

"تو جناب یہ کاغذ منیر صاحب کو دے دیں۔ میں تو پنڈی جا رہا ہوں۔" میں نے کہا اور ایمبولنس کی طرف قدم بڑھا دیا۔

شہزاد اسٹیئرنگ پر سر رکھے سو رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی اور چلنے کو کہا۔ وہ تو گویا منتظر تھا۔ فوراً چل پڑا۔ اب ہم دوبارہ سے پنڈی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ہم انسان بھی کتنے مجبور ہیں۔ کبھی قسمت کو شکست دے ہی نہیں سکتے۔ بڑی بڑی پلاننگ کر لیتے ہیں لیکن ہوتا وہی ہے جو قسمت میں لکھا ہو۔ اب ہمیں کہاں پتا تھا کہ ہم پنڈی جاتے جاتے ایک اتنا اہم کام سرانجام دے دیں گے۔ ہم تو قتل و خوں ریزی کی نیت سے پنڈی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مرشد سے ٹکرانا، اسے خاک میں ملانے کا منصوبہ تھا۔ ہمارا اور قسمت نے میرے ذریعہ ایک لڑکی کی زندگی سنوار دے۔

کچے راستے پر اچھلتی، جھٹکے کھاتی ایمبولینس میں بیٹھا میں بھی کچھ سوچ رہا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد جب ہم مین روڈ پر آئے تو سامنے وہی ہوٹل تھا جس پر ہم رات میں رکے تھے اور جہاں منیر کو افسردہ سا پایا تھا۔ میں نے ہوٹل دیکھ کر کہا۔ "کیوں نا ایک ایک کپ چائے پی لی جائے۔" دراصل مجھے یاد آ گیا تھا کہ شہزاد نے کہا تھا کہ وہ چائے کا دیوانہ ہے۔ اسے چائے نہ ملے تو وہ سر دردی میں گرفتار رہتا ہے۔

شہزاد خوش ہو گیا۔ اس نے ہوٹل کے سامنے ایمبولنس روک کر آواز دی۔ اس کی آواز پر ایک چھوٹا سا بچہ بھاگتا ہوا آیا اور چائے کا آرڈر لے کر چلا گیا۔

چائے پی کر ہم دوبارہ سے سفر پر چل پڑے۔ اب سڑک پر کافی ٹریفک نظر آنے لگی تھی۔ وہ اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا کہ موبائل کی گھنٹی گونجی۔ اتنی تیز گھنٹی تھی کہ میں بھی چونک گیا۔ شہزاد نے ڈیش بورڈ کے خانے سے موبائل نکالا اور کان سے لگا کر بولا۔ "ہیلو۔"

دوسری جانب کی بات سن کر وہ بولا۔ ”ارے نہیں ابھی ہم پنڈی سے بہت پیچھے ہیں۔ ایک گھنٹے سے زیادہ لگے گا وہاں تک پہنچنے میں۔ راستے میں ایک مسئلہ ہو گیا تھا ہم لوگ حل کرنے رک گئے تھے۔ یہ صاحب جی تو بڑے رحم دل ہیں۔ انہوں نے ایک لڑکی کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ واپس آکر پوری کہانی سناؤں گا۔ تم یقین نہیں کرو گی کہ صاحب جی کتنے بڑے دل والے ہیں۔“ دوسری جانب کی بات سن کر اس نے کہا۔ ”اچھا اچھا۔ تم سنبھال لینا۔ ان سے کوئی بہانہ کر دینا۔ میں دوپہر کے بعد ہی پہنچوں گا۔ تمہارے لیے کیا لیتا آؤں؟“

باتیں ختم کر کے اس نے موبائل کو دوبارہ سے ڈش بورڈ کے خانے میں رکھا پھر مجھ سے بولا۔ ”صاحب جی آپ گریٹ ہو۔ میں بتا نہیں سکتا کہ آپ کی عزت میرے دل میں کتنی بڑھ گئی ہے۔“

”میں انسان ہوں اس لیے دوسرے انسان کا دکھ درد مجھے اپنا سا لگتا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”نہیں سر آپ انسان سے بڑھ کر ہیں۔ مثل فرشتہ ہیں فرشتہ۔“

اس کی بات پر میں مسکرا کر رہ گیا۔ مگر بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ”غالب کا ایک شعر ہے۔“ ”آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔“ بھائی میرے آدمی ہی بن جاؤ... تو یہ بہت ہے۔“

”یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ میں تو آپ کا معتقد بن گیا ہوں۔ میری کوشش رہے گی کہ آپ سے رابطے میں رہوں۔“ اس نے ونڈ اسکرین پر نظریں جما کر کہا۔

پنڈی قریب آتا جا رہا تھا۔ میرا ایک سفر ختم ہونے کے قریب تھا۔ اب ایک اور مرحلہ قریب تھا جس کی کامیابی میری زندگی کی راہ کو بدلنے میں اہم کردار ادا کرتی۔ اب تک میں یہی سوچتا رہا تھا کہ کسی بھی طرح مرشد میرے راستے سے ہٹ جائے اور مجھے اپنی زندگی جینے دے لیکن وہ ایک ایسی کتے کی دم بن چکا تھا کہ جو ہزار سال نلکی میں رکھنے کے بعد بھی سیدھی ہونے کا نام نہ لے، وہ مجھے ہر گام پر ٹھیس پہنچا رہا تھا۔ اب میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اسے بھرپور سبق سکھاؤں گا۔ یہ جنگ آخری ثابت ہو یہی سوچ کر میں پنڈی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پنڈی جہاں سے میری زندگی نے کئی اہم موڑ لیے۔ جہاں کئی معرکے سر کیے۔ اب سب سے اہم معرکے کا گواہ بننے جا رہا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کامیابی کس کے مقدر میں ہے۔ اب یا تو وہ مکمل طور پر تباہ ہوگا یا میں اپنی جان دے دوں گا تا کہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔

لیکن یہ معرکہ کیسے سر ہو۔ میں کیا کروں کس طرح مرشد کو اس کی اوقات دکھاؤں اسی پر غور کر رہا تھا کہ شہزاد نے کہا۔ ”زیرو مائیل قریب آ رہا ہے۔ یہاں سے کس طرف مڑنا ہے۔“

”بس تم مجھے وہیں اتار دینا۔ میرے دوست وہاں موجود ہوں گے یا پھر آتے ہوں گے اس لیے کہ وہیں پر ان سے ملنے کی بات ہوئی ہے۔“

”جی اچھا۔ میں آپ کو اتار کر انتظار کروں گا یا چلا جاؤں۔“

”میرے خیال میں چلے جانا ہی بہتر ہے اس لیے کہ وہاں تمہاری بیگم منتظر ہوں گی۔ وقت برباد کرنے سے کیا فائدہ۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کچھ بھی ہو سر...... میں آپ کو زندگی بھر نہیں بھول سکتا.... اس لیے کہ جب آپ کو دیکھا تھا تو آپ کا ایک دوسرا روپ تھا لیکن جب آپ کا ساتھ ہوا تو پتا چلا کہ آپ کے سینے میں سونے کا دل ہے۔ کسی اجنبی کے لیے آپ کس طرح قربانی دیتے ہیں اس کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔“

”زندگی رہی تو ہم ملاقات کرتے رہیں گے۔ میرا نمبر تم محفوظ کر لو۔ جب موقع ملے مجھ سے رابطہ کر لینا۔ اگر نمبر بند ملے تو میسج کر دینا۔ جب بھی میں موبائل کھولوں گا۔ ٹیکسٹ میسج آ جائے گا۔“ میں نے کہا۔

دن پورے آب و تاب سے جلوہ گر تھا۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ ٹریفک آہستہ آہستہ پہلے سے بہت زیادہ نظر آ رہی تھی۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ اب ہم پنڈی کے بہت نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اور دن بھی نکل آیا تھا۔

”سر جی ایک بات بولوں۔“ شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں بولو۔“ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

”سر آپ کا اصل کام کیا ہے؟“

”لوگوں کی مدد کرنا۔ جو تم نے دیکھا۔“

”نہیں سر... اصل پیشہ بتائیں نا۔“

”فی الحال تو میں بیکار ہوں۔ ویسے دبئی سے مال لا کر بیچتا ہوں۔ کبھی پارٹی بُری بھی مل جاتی ہے جیسی ایک پارٹی سے سودا ہو کر بھی نہیں ہوا۔ الٹے وہ میری جان کا دشمن بن گیا۔ جس سے بچنے کے لیے میں تمہارے ہاں چھپا تھا۔“

"اس کے معنی یہ ہے کہ آپ کا کام غیر قانونی ہے اسی
لیے پارٹی بے ایمانی پر اتر آئی ہوگی۔ کیونکہ ایمانداری پر
پارٹی جھڑکتی نہیں ہے۔ کیا لاتے ہیں؟"
میں سمجھ گیا کہ وہ اندازہ لگانا چاہتا ہے۔ جو خود مرغا
بن رہا ہو اسے کون روک سکتا ہے۔ اس نے جب مجھے اسمگلر
سمجھ ہی لیا تو میں بھی اس کے خیال کو تقویت دینے کے لیے
بولا۔ "سونا لاتا ہوں۔"
"اوہ... اس کے معنی ہیں کہ آپ نے خاصی رقم
انوسٹ کر رکھی ہے اس لیے کہ سونے کی کھیپ لانے کے
لیے بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔"
"یہی کوئی ڈھائی کروڑ پھنسے ہوئے ہیں۔"
"اگر برا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں؟"
"بولو۔"
"ایسے کام میں فائیدہ تو بہت ہے۔ ایک پھیرے
میں لوگ اپنی رقم کئی گنا زیادہ کر لیتے ہیں لیکن اس میں
برکت بالکل نہیں ہوتی۔ اتنی ہی رقم اگر آپ کسی اچھے بزنس
میں لگا دیں تو وہ آپ کا وقار بلند کر دے گی۔"
"وقت آئے گا تو اس پر بھی سوچوں گا۔" میں نے
اس کا دل رکھنے کے لیے ایک اور جھوٹ بولا۔
باتوں کا سلسلہ چل پڑے تو وقت کا احساس ختم ہو جاتا
ہے۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ ہم زیرو مائیل کے قریب
پہنچ چکے تھے کہ مجھے احساس ہوا کہ اب اس سے آگے جانا
نہیں ہے۔ میں نے شہزاد کو مخاطب کیا۔ "بس بھائی اس
سامنے والی دکان کے سامنے مجھے اتار دو۔ یہیں پر میرا
دوست آئے گا۔"
"جی اچھا۔" کہہ کر اس نے میری بتائی ہوئی جگہ پر
گاڑی روک دی۔
میں نے نیچے اتر کر اس کا شکریہ ادا کیا اور
کہا۔ "زندگی رہی تو انشا اللہ ہم ضرور ملیں گے۔" کہہ کر میں
سامنے نظر آنے والے چائے کے ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔
شہزاد نے گاڑی موڑی اور واپسی کے سفر پر روانہ ہو
گیا۔ کچھ دیر تک میں اس کی جاتی ہوئی ایمبولنس کو دیکھتا رہا
پھر میں نے جیب سے موبائل نکالا اور سفیر کا نمبر ملایا۔ پہلی
ہی گھنٹی پر اس نے فون اٹھا لیا۔
"کہاں رک گئے۔ ہم سب انتظار میں بیٹھے
ہیں۔" اس نے چھوٹتے ہی سوال کر دیا۔ میں نے جواب
میں کہا:
"بھائی دم تو لینے دو۔ ابھی ابھی میں زیرو مائیل پر
اترا ہوں۔"
"آپ جس جگہ اترے ہیں اس کی نشانی
بتائیں۔ میں خود آرہا ہوں۔"
"ایسا کرو کہ مرجس کو بھیج دو۔ میں خود آجاؤں گا۔"
"ہم سب آرہے ہیں۔ استقبال کرنا ہی ہے تو ذرا
الگ انداز سے کریں۔" سفیر کے عقب سے وسیم نے چیخ کر
کہا' اس کے ساتھ عبداللہ کی بھی آواز سنائی دی کہ میں بھی
ساتھ آرہا ہوں۔
گویا سب کے سب آرہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے
دوست ہی ایسے دیئے ہیں کہ میں جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔
مجھے یقین ہے کہ مجھے پھانس بھی چبھے تو یہ سب بے چین ہو
جانے والوں میں سے ہیں۔ میں ابھی ان لوگوں کے بارے
میں سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل کی گھنٹی پھر سے بج اٹھی۔ نمبر نیا
تھا۔ ریسیور کر کے کان سے لگایا ہی تھا کہ ایک بندہ چائے کے
ہوٹل میں داخل ہوا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے
اطراف کا جائزہ لیا۔ پورے ہال پر نظر دوڑانے کے بعد وہ
سیدھا میری ٹیبل پر آیا اور بولا۔ "صاحب جی۔ میڈم آپ کو
بلا رہی ہیں۔"
"مجھے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"جی ہاں۔" اس نے سر ہلا کر کہا۔ "میڈم نے کہا
ہے کہ اندر شہباز صاحب ہیں انہیں باہر بلا لاؤ۔"
میں نے کال ریسیو نہیں کی اور کال کاٹ دی اس لیے
کہ ادھر سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں اس کے ساتھ باہر
کی جانب بڑھا۔ ابھی میں نے ہوٹل سے نکل کر سڑک پر
قدم رکھا ہی تھا کہ ایک ساتھ کئی لوگ مجھ سے چمٹ
گئے۔ ان کا انداز اناڑیوں جیسا تھا۔ وہ صرف چمٹے تھے کہ
میری ناک پر آکر ایک رومال جم گیا۔ میں نے دھیمی دھیمی
میٹھی خوشبو محسوس کرتے ہی سانس روک لی تھی کہ مجھ سے
چمٹنے والوں میں سے کسی نے کہا۔ "اس کے ساتھی آتے ہوں
گے۔ جلدی کرو۔"
اس کا کہنا ہی تھا کہ کسی نے ایک عجیب حرکت
کی۔ میری بغل میں انگلی ڈال کر گدگدانا شروع کر دیا۔ شاید
یہی وجہ تھی کہ میں نے جو سانس روکی تھی وہ ممکن نہ رہی اور
ایک بڑی سانس اندر چلی گئی۔ سانس کے اندر جاتے ہی
وہی ہوا جس کا اندازہ تھا۔ میرا سر چکرایا اور ہاتھ پیروں کی
قوت ختم ہو گئی۔ پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔
نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ مجھے جب ہوش آیا
تو میں ایک ایسے کمرے میں تھا جس کی چھت سلیب سے بنی

ہوئی تھی۔ میں نے ادھر سے نظر ہٹا کر داہنی جانب دیکھا۔ ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ معمولی انداز کی کرسی۔ میں نے اٹھنا چاہا تھا لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ میرے ہاتھ پیر نائلون کی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ جس کسی نے بھی باندھا تھا۔ بڑی استادی سے باندھا تھا۔ چارپائی کے ساتھ اس طرح باندھا گیا تھا کہ میں نہ ہاتھ ہلا سکتا تھا اور نہ پیر۔ چارپائی بھی جہازی سائز کی تھی۔ خوب بڑی سی۔ چارپائی پر بستر بھی نہیں تھا۔ اس کھردری چارپائی پر میں بے یارومددگار پیٹھ کے بل لیٹا سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں کتنا وقت گزرا اور اس وقت کیا بج رہا ہے۔ کمرے میں ادھر ادھر نظر ڈالی۔ بہت معمولی انداز کا سامان نظر آیا۔ دیوار پر نظریں دوڑائیں لیکن کوئی گھڑی نظر نہ آئی کہ میں ٹائم دیکھ سکتا۔ تبھی مجھے یاد آیا کہ میں نے سغیر کو کال کی تھی اور وہ سب لوگ وہاں آ گئے ہوں گے۔ مجھے نہ پا کر وہ سب پریشان ہوں گے۔ میرا ہاتھ جیب تک پہنچ نہیں سکتا تھا کہ ٹٹول کر میں دیکھ سکتا کہ جیب میں موبائل ہے بھی یا نہیں۔

ان لوگوں نے مجھے جس طرح باندھا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے میری مکمل تلاشی لی ہے اور جو کچھ بھی جیب سے نکلا ہوگا اسے مال غنیمت سمجھ کر رکھ لیا ہو گا۔ یعنی کہ انہوں نے موبائل بھی نہیں چھوڑا ہوگا۔ اب میں اس وقت تک کچھ نہیں کرسکتا تھا جب تک کہ کوئی آکر کھولتا نہیں لیکن میں نے اپنی کوشش بھی ترک نہیں کی۔ اسی طرح سے پیروں کو آگے پیچھے کرنے لگا۔ کہ شاید رسی کچھ ڈھیلی ہو جائے۔ رسی ڈھیلی کیا ہوتی پیروں کی جلد پر جلن ہونے لگی۔ شاید جلد چھل رہی تھی۔ میں نے پیروں کو کچھ دیر کے لیے آرام دیا اور کلائی کو موڑنے لگا۔ کبھی کلائی سیدھی کرتا اور کبھی کلائی کو ہلکا سا گھماتا۔ اس کام میں بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تب میں نے سر ڈال دیا اور کسی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ کچھ پل بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ آنے والوں کے پلان کا کچھ اندازہ ہوسکے۔

وہ تعداد میں دو تھے۔ انہوں نے اندر آتے ہی کہا۔ ”میں نے منع کیا تھا اسے اسپیشل ڈوز نہ دو پھر بھی انہوں نے اسے کلوروفارم کے بعد بھی انجکشن لگا دیا۔ اب یہ کم سے کم دو گھنٹے کیا پانچ گھنٹے تک زندہ لاش بنا رہے گا۔ اسے اٹھا اٹھا کر ڈھوتے رہنا ہمارا سر درد بن گیا ہے۔“

”اوئے تو ایسے بول رہا ہے جیسے یہ کام تو مفت میں کرتا ہے۔ تجھے پیسے ملتے ہیں پیسے۔ ایسے ہی تو یہاں نہیں آ گیا۔“ بولنے والا میری طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ میں کچھ حد تک مطمئن ہوگیا کہ وہ مغالطہ میں ہیں۔ ان کے خیال سے مجھ پر ان کی دوا اثر کر گئی ہے۔ شاید ایسا ہی ہوتا۔ اس لیے کہ میں بھی انسان ہوں۔ لیکن بھلا ہو حکیم قابوس کا کہ اس نے ایسی دوا استعمال کرائی کہ میرے اندر مدافعت کی لا محدود قوت پیدا ہوگئی۔ زخم جلدی بھرنے لگے۔ چوٹ اثر کھونے لگی۔ نشہ آور یا ضرر رساں ادویہ کا اثر جلد ختم ہونے لگا۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا کہ جو دوا دی گئی تھی اس کا اثر وقت سے پہلے ختم ہوگیا۔ لیکن میں نے انہیں احساس نہ ہونے دیا کہ میں ہوش میں آچکا ہوں۔ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ وہ شخص آہستہ آہستہ میرے قریب آگیا۔ میں نے احساسات کی نگاہوں سے اسے دیکھنا چاہا کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ میری پوری قوت سماعت اس کے پیروں کی چاپ پر مرکوز تھی۔ وہ میری چارپائی کے بالکل قریب آچکا تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے پیروں کی جکڑ کھل گئی ہے۔ میں نے پپوٹے اٹھا کر پلکوں کی جھری سے دیکھا۔ اس خفیف سے روزن میں اس کا پورا قد آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور وہ میرے پیروں میں بندھی رسی کو کاٹ رہا تھا۔ تبھی اس کے ساتھی نے کہا۔ ”دیکھ کہیں یہ ہوش میں نہ آجائے۔“

”اتنا آسان نہیں ہے۔ تم لوگوں نے ایکسٹرا ڈوز اسے دے دیا ہے۔ ڈھائی تین گھنٹے سے پہلے کہاں ہوش میں آنے والا ہے۔ ابھی تو صرف گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا ہی ہوا ہو گا۔“ اس نے پیروں کی رسی کاٹ کر سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

”یار کاشف، باس کا کہنا ہے کہ یہ بہت خطرناک آدمی ہے لیکن دیکھنے میں تو کینچوا لگ رہا ہے۔ کتنی آسانی سے ہم نے اس پر قابو پالیا تھا۔ پھر اتنی دور کا سفر بھی کرلیا اور وہ چوں بھی نہ کرسکا۔“

”اکبر بھائی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماہر تیراک اتھلے پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس وقت اس کا ستارہ گردش میں ہو۔ وہ کچھ نہ پایا اور ہمارا شکار بن گیا۔“ کاشف نامی شخص نے جواب میں کہا۔

اکبر اب میرے سرہانے کھڑا تھا اور وہ میرے ہاتھوں کی رسی پر چاقو چلا رہا تھا۔ میرے ہاتھ آزاد ہوگئے لیکن میں نے کسی قسم کا کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا کہ وہ سمجھتا کہ ہوش میں آچکا ہوں۔ نہ تو میں نے ہاتھ میں جنبش آنے دی اور نہ کوئی گہری سانس لی۔ وہ پوری طرح اطمینان سے میرے سرہانے کھڑا تھا کہ اس کے ساتھی نے پوچھا۔ ”اب

اس بےکار کو کیسے اٹھایا جائے۔ گاڑی تک پہنچانا ہے۔ پھر ڈرائیو بھی کرنا اگر اسے راستے میں ہوش آ گیا تو اسے دوبارہ سے سلانا بھی ہے۔"

"نہیں بھائی۔ یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ اسے ہوش آ جائے۔ اگر ہوش آ گیا تو میں اس کے سر پر موجود رہوں گا۔ دوبارہ سے رومال نکال کر ناک پر رکھ دوں گا۔"

"تو پھر چلو اس کے جنازہ کو اٹھاؤ۔" کہہ کر شاید وہ میری طرف بڑھا تھا۔

"نہیں میرے یار۔ تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے آنکھیں کھول کر کہا تھا۔

وہ دونوں ایسے چونکے تھے کہ جیسے مردے کو اٹھتے دیکھ لیا ہو۔ ان کی حیرت کا فائیدہ اٹھاتے ہوئے میں چارپائی سے نیچے اتر گیا تھا۔ سامنے اکبر تھا۔ میں اس پر نظریں رکھے ہوئے تھا۔ اور کاشف کو بھول گیا تھا۔ میری اس غلطی کا اس نے بھرپور فائیدہ اٹھالیا۔ وہ اچانک ہی مجھ پر جھپٹا تھا۔ میں اس افتاد کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔ بے خبری میں مارا گیا۔ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرتا چلا گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ ڈھیر ہوا تھا۔ نیچے میں تھا اور وہ تھا اور وہ کسی گینڈے کی طرح طاقتور تھا۔ اس نے مضبوطی سے میری دونوں کلائیاں تھام لیں اور گھٹی آواز میں اپنے ساتھی سے بولا۔ "اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے رسی لاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ میرے سینے پر کچھ اس انداز سے سوار ہوا کہ اس کا ایک مگدر نما گھٹنا میرے گلے پر آ ٹکا تھا۔ میں ذرا بھی حرکت کرنے کی کوشش کرتا تو خود ہی نقصان اٹھاتا۔

"جلدی کر بے وقوف۔" کاشف نے اکبر کو ڈانٹا۔ "ہمارے پاس وقت کم ہے۔"

"ابھی سے مایوس ہو گئے مائی ڈیئر۔" میں نے اس کے وزنی جسم کے نیچے دبا ہونے کے باوجود چہکنے کی کوشش کی۔ "ابھی تو موت کا فرشتہ بھی آنے والا ہے۔ اس کا انتظار نہیں کرو گے۔"

"فکر نہ کرو۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "سب سے پہلے تمہی کو فرشتہ اجل کے حوالے کیا جائے گا۔"

"خیر دیکھا جائے گا۔" میں نے آہستہ سے کہا کیونکہ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی جکڑ ڈھیلی ہو رہی ہے۔ اس بات کا فائیدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اچانک اپنی دونوں کلائیوں کو زوردار جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے نہ صرف میرے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے بلکہ میں نے اس کی گردن بھی پکڑ لی۔ اسے شاید اندازہ نہ تھا کہ میرا ردعمل اتنا شدید ہو گا ورنہ وہ پہلی فرصت میں مجھے بے ہوش کرنے کے لیے کلوروفارم کی پکار کرتا۔ پھر ہاتھ پاؤں باندھتا۔

میں نے اس کی گردن پکڑ کر خاصی قوت سے جھٹکا دیا تھا۔ وہ بائیں طرف لڑھک گیا تھا۔ پھر میں اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر گلا دبنے کی وجہ سے اس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ میرے ہاتھ ہی پکڑ سکتا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں۔ اس کا ساتھی اتنا احمق تھا کہ مجھے جس رسی سے باندھا گیا تھا اسے کٹا دیکھ کر نئی رسی لانے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ یا پھر اسے اپنے ساتھی کی قوت پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے ساتھی کی مدد کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔

بہر حال جو کچھ بھی تھا مگر اس وقت پانسا میرے حق میں تھا۔ اگر اس کا ساتھی واپس آ جاتا تو میرے لیے مشکل کھڑی ہو جاتی۔ یہی سوچ کر میں نے اپنے شکار کی گردن چھوڑ دی اور اس کی کنپٹی پر اچانک ہی پوری قوت سے گھونسا مارا۔ بس ایک ہی گھونسا کافی ثابت ہوا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔

میں نے یہ دیکھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔ یا صرف بے ہوش ہوا ہے۔ تبھی عقب میں آہٹ ہوئی تو میں چیتے کی سی پھرتی سے مڑا تھا اور دروازے کے بیچ میں کھڑے اکبر کو دیکھا۔

وہ حیرت سے منہ پھاڑے کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے مزید حیران ہونے کا موقع نہیں دیا اور اچھل کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اسے اس طرح دبوچ لیا جیسے باز کبوتر کو دبوچ لیتا ہے۔ اس اچانک افتاد پر وہ ایسے گھبرا گیا جیسے وہ کوئی ننھا سا بچہ ہو۔ اس کے منہ سے لایعنی آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ مگر اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس کے سر پر اپنے سر سے وار کیا پھر غراتے ہوئے کہا۔ "میں جکڑ ڈھیلی کر رہا ہوں۔ خبردار اگر چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو انجام بہت برا ہو گا۔ سیدھے جا کر دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔"

شاید وہ اپنے ساتھی کا انجام دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ جو شخص ایسے تن و توش آدمی کو پچھاڑ سکتا ہے وہ تو اس جیسے منحنی بندے کو پیس کر رکھ دے گا اسی لیے وہ بلا چوں چرا کیے دیوار کی طرف مڑ گیا اور ایک شریف بچے کی طرح دیوار سے ناک لگا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے جسم سے اس کے دہشت زدہ ہونے کا اندازہ ہو رہا تھا

کیونکہ وہ کانپ رہا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ ایسے بندے کو مجھے پھانسنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم لوگوں نے مجھے پہچانا کیسے تھا؟“

”ہمیں بتایا گیا تھا کہ شہباز نامی شخص کو اغوا کرنا ہے۔ پہچان کے لیے آپ کا نمبر دیا گیا تھا۔ ہوٹل پہنچ کر ہم نے مس کال دی۔ آپ کو فون اٹھاتے ہی پہچان لیا۔ مزید تحقیق کی ضرورت نہیں تھی اسی لیے باہر بلا لیا۔“

اس کا جملہ ختم ہوا تھا کہ میں نے پہلے اس کی تلاشی لی پھر اسی کی لائی ہوئی رسی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اسے فرش پر گرا دیا۔ اس سے نمٹ کر میں نے کاشف کی تلاشی لی اور اس کے ہاتھ پیر بھی باندھ دیے۔ ابھی اس کام سے فرصت پا کر میں اٹھ ہی رہا تھا کہ اچانک کسی نے عقب سے مجھ پر چھلانگ لگائی اور میری گردن کو دبوچ لیا۔ اس کی جکڑ ایسی تھی کہ میں چاہ کر بھی اپنی گردن موڑ نہیں پا رہا تھا۔ گردن پکڑنے والا نہ صرف بہت طاقتور تھا بلکہ اس کے ہاتھ بھی بہت مضبوط تھے۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اپنی گرفت بڑھا رہا تھا، میں سمجھ گیا تھا کہ اگر میں نے گردن چھڑانے کے لیے جھٹکا دیا تو گردن کا منکا ٹوٹ جائے گا۔ میں نے کہنی سے اس کے پیٹ پر وار کرنے کے لیے کہنی موڑنی چاہی لیکن اس میں بھی کامیابی نہیں ملی۔ وہ اس انداز سے کھڑا تھا کہ اس کا جسم میری کہنی سے دور تھا۔

میری سانس اب گھٹنے لگی تھی۔ کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر وہ اسی طرح میری گردن دباتا رہا تو میں بے ہوش ہو کر گر جاؤں گا۔ تبھی میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور لہرا کر گرنے کی اداکاری کی۔ اس میں رسک تھا۔ اگر وہ اداکاری کے باوجود میری گردن نہ چھوڑتا تو میں حقیقتاً بے ہوش ہو جاتا۔

مجھے گرتا دیکھ اس نے میری گردن چھوڑ دی مگر مجھے سنبھالا نہیں۔ میں پہلو کے بل گرا تھا۔ اس کے باوجود میری کمر میں خاصی چوٹ آئی تھی۔ گردن آزاد ہوتے ہی میری توانائی تیزی سے بحال ہونے لگی۔ حملہ آور بھی گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اوئے کاشف تو زندہ ہے یا مر گیا۔“

میں اب پھر سے فارم میں آ گیا تھا۔ میں نے دوبارہ سے اٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ ساتھ ہی ساتھ آواز لگائی۔ ”کاشف ابھی مرا نہیں ہے۔ پہلے تم مرو گے۔“

مجھے اٹھتا دیکھ اس نے پھر سے میری گردن پکڑنا چاہی۔ میں نے پھرتی سے قلابازی کھائی اور دور چلا گیا پھر اسپرنگ کی طرح اچھال بھری اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”تم بار بار میری گردن نہیں پکڑ سکتے۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”تیری تو ایسی گردن مروڑوں گا کہ تُو دوسری سانس نہیں لے سکے گا۔“ اس نے دونوں ہاتھ آگے کر کے چھلانگ لگائی تھی۔

میں نے بچنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی اور آگے بڑھ کر اس کی کلائی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ پہلی ہی کوشش کامیاب ٹھہری اور اس کی دونوں کلائیاں میری گرفت میں آ گئیں۔ میں نے جکڑ مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ ”خود کو سورما سمجھنا آسان ہے لیکن ثابت کرنا مشکل ہے۔“

”تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا اور نہ یہاں سے نکل سکتا ہے۔“

اس نے کرب کو چھپاتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے جھٹکے سے اسے گرا دیا پھر اس کے ہاتھ پر اپنا پاؤں رکھ کر کہا۔ ”تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ یعنی کس کے کہنے سے تم نے مجھے اغوا کیا تھا۔“ میں نے یہ سوال اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا۔

”کسی نے بھی ہمیں نہیں کہا... میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کیا ہے۔ یہ میرا شوق ہے یہی دھندا ہے۔ لوگوں کو اغوا کرتا ہوں پھر تاوان طلب کرتا ہوں۔“

میں نے اس کی دیدہ دلیری دیکھ کر کہا۔ ”لگتا ہے ابھی تک تم میں دم خم باقی ہے۔“ میرا انداز طنزیہ تھا۔ میں نے پیروں پر زور ڈال کر کہا۔ ”میں ابھی ساری اکڑ فوں نکال دوں گا۔ جلدی حقیقت بک دو کس کے کہنے پر تم نے مجھے اغوا کیا تھا۔“

اس میں کمال کی استقامت تھی۔ چہرے پر تکلیف کے آثار صاف ظاہر تھے لیکن وہ زبان کھولنے پر آمادہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے جواب میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں آپ کی بات کا جواب دے چکا ہوں۔“

”دیکھو میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ میں نے غراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہیں مار کر یہیں دفن کر دوں۔ تم نے شاید میرے بارے میں سنا نہیں ہے کہ میں کس قماش کا بندہ ہوں۔ جو پوچھ رہا ہوں سچ سچ بتا دو ورنہ میرے پاس بس یہی ایک آپشن رہ جائے گا۔“

"جو سچ ہے وہ میں نے بتا دیا آگے آپ کی جو مرضی۔ خواہ ماردیں یا زندہ رکھیں۔"

میں نے اس کی کلائی سے اپنا پیر ہٹا لیا اور پھر جھک کر اس کے بالوں کو پکڑا پھر کھینچتے ہوئے اس کے سر کو بلند کیا اور اسے دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ وہ بھی کمال کا بندہ تھا۔ اتنے مضبوط اعصاب کا تھا کہ اس پر مجھے ترس آنے لگا تھا۔ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "مجھے مارنے سے پہلے ایک سگریٹ ضرور پلا دینا۔"

میں نے نظر اٹھا کر ٹیبل کی طرف دیکھا جہاں مجھے سگریٹ کی ڈبی دکھائی دی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر سگریٹ کی ڈبی اٹھائی اور ایک سگریٹ نکال کر اسے سلگا لی۔ پھر اسے اس کے ہونٹوں میں دے دیا۔ اس نے دو تین گہرے کش لیے تو میں نے سگریٹ چھین لی پھر پوچھا۔ "ہاں اب بتاؤ۔ کس کے کہنے پر تم نے مجھے اغوا کیا تھا۔"

"کہہ تو دیا کہ یہ میرا پیشہ ہے۔ میں یہی کام کر کے اپنا گھر چلاتا ہوں۔"

اتنا سنتے ہی میں نے ایک ہاتھ سے اس کے بال کو پکڑ کر جھٹکا دیا پھر دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سگریٹ کو اس کی کان میں ڈال کر رگڑ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کے پیروں کی ایک انگلی پر جوتا رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ کان کے جلنے اور انگلی کے زخمی ہونے کے کرب سے وہ چیخ اٹھا۔ اس نے سر پیچھے کرنے کی کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہوسکا اس لیے کہ اب اس کے بال میری مٹھی میں تھے۔ میں نے بالوں کو دوبارہ جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔ "اب اگر زبان نہ کھولی تو تیرے دوسرے کان میں ایک اور سگریٹ بجھاؤں گا۔" کہتے ہوئے میں نے ڈبی سے ایک اور سگریٹ نکالا اور اسے سلگا کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ ڈھیٹ بنا مجھے ٹک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس وقت کمرے میں دو بندے اور بندھے تھے اور وہ دونوں خاموش پڑے تماشائی بنے ہوئے تھے۔

میں نے سگریٹ کے کش کھینچے اور پھر اسے اس کے دوسرے کان کے اندر ڈال کر رگڑ دیا۔ اس بار بھی وہ اپنی چیخ روک نہ سکا۔ میں نے پھر اس کے بال پکڑ کر جھٹکا دیا اور پوچھا۔ "اب تیری میں ہتھیلی کے پشت پر کی ایک نس کاٹوں گا۔ اس رگ کے کٹنے سے کس تیزی سے خون نکلتا ہے تو یہ جانتا ہوگا۔ فکر نہ کر اس کے بعد بھی تو نے اگر جواب نہ دیا تو ایڑی کے پیچھے والی رگ کاٹوں گا۔" پھر میں نے اس چاقو کو اٹھا لیا جس سے اس نے میرے بندھن کاٹے تھے۔ مجھے چاقو اٹھاتے دیکھ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "بتاتا ہوں۔"

"پہلے یہ بتا تیرا نام کیا ہے؟"

"میرا نام شاکر ہے۔ پنڈی میں رہتا ہوں۔"

"تجھے بھیجا کس نے ہے۔ اب یہ بھی بتا دے؟"

"مجھے... مجھے احمد سعید نے بھیجا تھا کہ آپ کو اغوا کر کے اس کے پاس لاؤں۔"

"یہ احمد سعید ہے کون۔ اس کا حدود اربعہ بھی بتا دو۔"

"وہ مرشد سائیں کا دست راست ہے۔ وہی ایسے کام کرنے والوں کا انچارج ہے۔"

"ہوں.... فاضلی کے بعد یہ کام اب وہ احمد سعید سے لے رہا ہے۔ اگر تمہیں معلوم نہیں تو سن لو کہ فاضلی کو میں نے ہی جہنم کا راستہ دکھایا تھا۔ میری وجہ سے ہی وہ جہنم کے سفر پر ہاتھ میں پہننے والے ایک کڑے کے ذریعہ روانہ ہوا تھا۔"

"آپ کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ آپ ایک خطرناک آدمی ہیں۔ بہت زیادہ احتیاط برتی جائے۔"

میں اس سے گفتگو میں اس قدر منہمک تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ خطرہ میرے سر پر پہنچ گیا ہے۔ اس بات کا پتا تب چلا جب میرے عقب میں دھم سے کوئی کودا تھا۔ آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں سرعت سے پلٹا تھا۔ ایک بندہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ ادھر کوئی دروازہ تھا نہیں ایک سیڑھی تھی جو شاید چھت پر جا رہی تھی لیکن وہ سیڑھیوں سے آیا نہیں تھا بلکہ کود کر اترا تھا۔ وقت بچانے کے لیے ایسا کیا ہوگا۔ اور اب وہ میری طرف بڑھ رہا تھا۔ سوچ بچار کا وقت نہیں تھا۔ میں اس کی طرف گھوم گیا۔

"یہاں سے ہم صرف کندھوں پر بھیجتے ہیں۔" اس نے زعم سے کہا۔ اور پھر مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جمناسٹک کا ماہر ہے۔ میں نے پھرتی سے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ اڑتا ہوا کاشف پر گرا تھا۔

"ارے واہ کیا اڑان بھری ہے۔ ذرا ایک بار پھر کوشش کرنا۔" میں نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

وہ جھلا کر کھڑا ہوا اور ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا میری طرف بڑھا، یہ انداز خاصا خطرناک تھا۔ وہ جسم کو نپے تلے انداز میں گھماتا ہوا تیر کی طرح آرہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے ہٹ جانے میں ہی عافیت جانی اور وہ اپنے ہی زور میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کا یہ داؤ بھی خالی گیا۔ فن

حرب کے ماہروں کا کہنا ہے کہ مقابلے کے وقت دماغ کو پرسکون رکھو ورنہ اپنا سکون کھو دو گے۔ میں نے اسی بات پر عمل کیا اور اسے طیش دلانے کی کوشش کی "بیٹے، کسی اچھے استاد سے ٹریننگ لے لیتے۔"

ابھی میرا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ میری کمر پر لات پڑی ساتھ ہی آواز سنائی دی۔ "یہ لات کیسی ہے استاد محترم۔"

میں کسی زخمی سانپ کی طرح پلٹا اور داہنے ہاتھ کا مکا اس کے سینے پر اور گھٹنے سے اس کے پیٹ پر ضرب لگائی۔ وہ کراہتا ہوا الٹ گیا۔ میں نے اس پر سے توجہ ہٹا کر ان دونوں بندھے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی۔ بس اتنی دیر ہوئی تھی جس کا اس نے فائدہ اٹھالیا۔ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو وہ مجھے چاروخانے چت کر دیتا۔ وہ ہوا میں اپنے جسم کو گردش دیتا ہوا میری طرف آیا تھا۔ میں برقی سرعت سے داہنی طرف ہٹ گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھی پر جا پڑا تھا جو پہلے ہی بندھا پڑا تھا۔ اب اسے موقع دینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ وہ بھی کم پھرتیلا نہیں تھا۔ وہ داہنی جانب سرک گیا۔ میں فرش پر اوندھے منہ گرا تھا۔ میں اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اس نے میری کمر پر لات جما دی۔ کمبخت کی لات اتنی زبردست تھی کہ میں کراہ اٹھا۔ اس نے پھر وار کرنا چاہا تھا کہ میں نے خود کو بچانے کے لیے داہنی جانب سرکنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس نے پلٹ کر پھر ایک کک ماری۔ جو میری پسلیوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ دوسری کوشش کرنے کے لیے اپنا پیر اٹھا ہی رہا تھا کہ میں نے اس کے پیر کو پکڑ لیا۔ اور زوردار جھٹکا دیا۔ وہ منہ کے بل فرش پر گرا، میرے لیے یہ وقفہ کافی تھا۔ میں پھرتی سے اٹھ گیا۔

اب بازی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے مشینی انداز میں اس کی دھنائی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ لہو لہان ہو گیا۔ میں نے آخری راؤنڈ شروع کرنے کی تیاری کر لی۔ میرا آخری راؤنڈ کھڑی ہتھیلی کا وار تھا اس کے بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا مگر اس کی قسمت خراب تھی۔ اس نے اسپرنگ کی طرح اچھال بھری اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی۔ میں تو پہلے ہی ہوشیار تھا۔ اسے دونوں ہاتھوں سے سنبھال لیا گویا اسے کیچ کر لیا پھر اسے اپنے ہاتھوں پر بلند کیا اور پوری قوت سے زمین پر دے مارا۔ فرش نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اس کے چہرے کا بھرتا بن گیا۔ اس کی فلک شگاف چیخ دور تک سنائی دی ہوگی۔ وہ بے ہوش ہو کر زمین پر اپنی گردن ڈالے پڑا تھا۔

میں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر سے سوال جواب کرنے کے لیے شاکر کے قریب چلا گیا۔ وہ اب بھی بے دم سا بیٹھا تھا۔ اس کے کان کی کیا حالت ہو گی مجھے اندازہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ احمد سعید کہاں ملے گا؟"

"وہ دوبارہ سے خانقاہ بنوا رہا ہے اس لیے وہیں دن رات رہتا ہے۔"

"میرا موبائل کس کے پاس ہے؟" میں نے کاشف سے پوچھا۔

"وہ اکبر کے پاس ہے۔"

میں نے اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ سچ بول رہا ہے؟"

اکبر نے سر ہلا کر ہاں کہا تو میں اس کی طرف بڑھتا چلا گیا اور اس کی جیب کی تلاشی لی۔ ایک بار پہلے بھی تلاشی لے چکا تھا دوبارہ لیا تو بھی موبائل نہیں ملا تب میں نے اس سے پوچھا۔ "موبائل کہاں ہے؟"

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میری بنیان میں پھنسی ہوئی ہے۔"

میں نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا۔ موبائل اس کے پیٹ پر تھا۔ اسے باہر نکال کر دیکھا۔ نیٹ ورک بھی تھا اور چارجنگ بھی فل تھی۔ میں نے سفیر کا نمبر ڈائل کیا۔ بیل جا رہی تھی لیکن کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ موبائل ایسی جگہ ہے جس سے دور وہ بیٹھا ہے۔ وقت برباد کرنے سے الجھن اور بڑھتی اس لیے میں نے شاکر کی گدی پر نپا تلا وار کیا اور وہ تیورا کر زمین پر ڈھے گیا۔ میں نے بنا کچھ سوچے سمجھے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے اس لیے کہ اب رکنا بیکار تھا۔

باہر آنے کے بعد میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ دور دور تک ویرانہ تھا۔ ایک سڑک نظر تو آ رہی تھی لیکن وہ سڑک کافی فاصلے پر تھی۔ اس سڑک پر کم کم صحیح لیکن ٹریفک چل رہی تھی۔ میں نے اسی جانب قدم بڑھا دیے۔ مجھے اس بات کی بھی فکر نہیں تھی کہ جن بندوں کو باندھ کر آیا ہوں ان کا حشر کیا ہوگا۔ اگر کہیں میرا ہاتھ زیادہ قوت سے پڑ گیا ہوگا تو وہ شخص جسے بے ہوش چھوڑ آیا ہوں وہ راہی ملک عدم ہو چکا ہو گا اور اگر ایسا ہو گیا تو ان دونوں کو کھولے گا کون، وہ تو اسی حالت میں بھوک پیاس سے مر جائیں گے۔

اس خیال نے میرے ذہن میں ہلچل مچا دی تھی کہ

میں نے خود پر قابو پایا اور خود سے کہا۔ ''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میرے خیال میں بے ہوش شخص کو ہوش آجائے گا اور وہ اٹھ کر ان کو کھول دے گا۔ مجھے اپنی سوچنی چاہیے۔ اگر ان کو موقع مل جاتا تو وہ مجھے مار دیتے پھر میں ان سے ہمدردی کیوں کروں اس لیے کہ دشمن پھر دشمن ہے۔ وہ بھی کمین فطرت کے دشمن ہیں۔

اس نئے خیال نے مجھے نئی سوچ دی اور میں مطمئن ہو گیا۔ میں نے سامنے والی سڑک کی طرف دیکھا۔ ایک دو ٹرک گزرے تھے کہ دور سے آتی ہوئی بس نظر آئی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کردی۔ مجھے ہر حال میں وقت سے پہلے سڑک تک پہنچنا تھا۔ تاکہ میں بس کو پکڑ سکوں۔ مجھے کوئی ڈر تو تھا نہیں کہ ان میں سے کوئی پیچھا کرے گا۔ اس لیے کہ جو ہوش میں تھے وہ بندھے ہوئے تھے اور جو کھلے ہوئے تھے وہ بے ہوش تھے۔ انہیں ہوش میں آنے کے لیے گھنٹا بھر چاہیے ہوگا۔ اس لیے میں آرام سے سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا کہ دور سے آتی ہوئی بس نظر آئی اور میں گویا ہوا میں اڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اتنی تیز چل رہا تھا کہ بتا نہیں سکتا۔ یہ میری تیز رفتاری تھی کہ سڑک تک پہنچنے تک بس کھڑی ہوئی تھی۔ ایک دو مسافر اترے تھے شاید اسی لیے بس رک گئی تھی۔

میں تقریباً دوڑتا ہوا بس میں سوار ہوا تھا۔ سوار ہونے کے بعد میں نے بس کا جائزہ لیا۔ تقریباً تمام سیٹیں بھری ہوئی تھیں صرف دو سیٹ خالی تھی۔ میں اس سیٹ کی طرف بڑھا۔ کنڈیکٹر نے سیٹ پر بیٹھنے سے پہلے ہی کرایہ مانگ لیا۔ تب مجھے خیال آیا کہ میرے پاس تو ان لوگوں نے رقم نامی کوئی چیز چھوڑی نہیں ہوگی۔ پھر بھی جیب میں ہاتھ ڈال دیا جیسے کرایہ نکال رہا ہوں۔ میں اس وقت کوئی ایسی ترکیب سوچ رہا تھا جس سے میں کنڈیکٹر کو مطمئن کرسکوں۔ کنڈیکٹر سر پر سوار تھا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے جیب کو ٹٹولا تو دل خوش ہوگیا اس لیے کہ جیب میں کچھ کاغذات انگلیوں سے مس ہوئے تھے۔ میں جیب میں کوئی کاغذ تو رکھتا نہیں تھا۔ ہوٹل سے نکلتے وقت بیرے کو سو کا نوٹ دیا تھا۔ اسی کا کھلا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے ہاتھ باہر نکالا۔ میرا اندازہ صحیح تھا۔ ان لوگوں نے میرا پرس تو نکال لیا تھا لیکن ستر اسی روپے جو بیرے نے واپس دیئے تھے چھوڑ دیا تھا۔ جب موٹی رقم ہاتھ آتی ہے تو چھوٹے نوٹ نظر انداز ہوجاتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا جس نے مجھے کنڈیکٹر کی گالیاں سننے سے بچا لیا تھا۔ میں نے رقم باہر نکالی اور پوچھا۔ ''بس کہاں تک جائے گی۔''

اپنا سوال میں نے انگریزی میں کیا تھا اس لیے کہ بس میں ایک انگریز جوڑے کو بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ وہ جوڑا عین اس سیٹ کے پیچھے بیٹھا تھا جہاں میں بیٹھا تھا۔ کنڈیکٹر نے صرف اتنا کہا۔ ''پنڈی۔''

شاید اس نے مجھے بھی غیر ملکی سمجھا تھا۔ میں نے پچاس کا نوٹ اس کی طرف بڑھا کر پوچھا۔ ''ہوجائے گا؟''

کنڈیکٹر نے کہا۔ ''ٹوئنٹی مور۔''

میں نے بیس کا آخری نوٹ بھی نکال کر اسے دے دیا۔ وہ تو آگے بڑھ گیا لیکن انگریز جوڑا میری طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ مرد نے مجھ سے پوچھا۔ ''کہاں سے آرہے ہو۔''

میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کردیا کہ وہ کہاں سے آرہا ہے۔ اس شخص نے جواب میں کہا۔ ''مری۔''

مجھے خوشی ہوئی کہ میں اسی راستے پر ہوں جس پر چلا تھا۔ اب میں کھڑکی سے باہر دیکھ کر یہ اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ اب ہم کہاں پر ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سی سڑک ہے۔ اس لیے کہ جو چھوٹی چھوٹی آبادیاں آئیں اور وہ گزر گئیں ان سے پہچان ہو نہیں پائی تھی۔ تبھی میری نظر سڑک پر دور بہت دور آگے کی طرف گئی اور میں چونک گیا۔ اس لیے کہ سڑک پر پولیس کی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سڑک کو بیریئر لگا کر بند کردیا گیا تھا۔ جو اس بات کی نشانی تھی کہ چیکنگ ہورہی ہے۔ دو تین گاڑیاں قطار میں کھڑی بھی تھیں۔

یہ اسنیپ چیکنگ نے زندگی عذاب کردی ہے۔ جہاں دیکھو چیکنگ لیکن یہ ضروری بھی ہے۔ اس لیے کہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ قانون شکنوں کو چیک کریں۔ ان کو سلاخوں کے پیچھے دھکیلیں اور عوام کو راحت دیں۔ اسلام دشمن طاقتیں جن کی نظروں میں پاکستان آنکھ کا شہتیر بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے زرخرید لوگوں کے ذریعہ عوام کو پریشان کرنے، ملک میں انتشار پھیلانے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں اور ناداستگی میں کچھ کم عقل لوگ زبان، فرقہ یا کسی اور بنیاد پر ان کی ہاں میں ہاں ملا کر انہیں کھلی راہ داری دے دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے حکومت کو حرکت میں آنا پڑتا ہے۔ اور قانون نافذ کرنے والے ادارے مشتبہ افراد کی کھوج میں لگ جاتے ہیں۔ اگر اس وجہ سے عوام کو کچھ

دشواری جھیلنی پڑتی ہے تو راحت بھی اسی میں مضمر ہے۔ میں اسی جانب نظریں جمائے ہوئے تھا کہ مجھے احساس ہوا جیسے میری سیٹ کی پچھلی طرف کوئی چیز نیچے کی طرف سرکی ہو۔ میں نے عادت کے مطابق فوراً احساس کی قوت سے پہلے اسے محسوس کرنے کی کوشش کی کہ کیا چیز ہے اور میں نے محسوس کرلیا کہ وہ کوئی پیکٹ ٹائپ کی چیز ہے۔ میں کچھ آگے کی جانب کھسک گیا کیونکہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ چیز میری سیٹ کے کور میں داخل ہوئی ہے۔ کچھ توقف کے بعد میں نے غیر محسوس انداز میں پیچھے کی طرف دیکھا۔ سیٹ کا کور کچھ اٹھا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ کسی نے پیچھے سے کچھ داخل کیا ہے۔ میرے پیچھے وہ غیر ملکی جوڑا تھا۔ ایسا کیا اندر رکھا گیا ہے یہ دیکھنا ضروری تھا لیکن میں کسی کو محسوس کرنے دینا نہیں چاہتا تھا۔ بس آگے کی طرف بھاگ رہی تھی۔ میں اپنے داہنے ہاتھ کو نیچے سے پیچھے کی جانب لے گیا اور اس پیکٹ کو ٹٹولا۔ وہ اب بالکل نیچے آچکا تھا۔

ابھی میں اس پیکٹ کو ٹٹول ہی رہا تھا کہ بس رک گئی اور دونوں دروازے سے ایک ایک پولیس والے اوپر آ گئے۔ انہوں نے بس کے اندر آتے ہی مسافروں کا جائزہ لینا شروع کیا پھر وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھے۔ میں حیرت میں آ گیا کہ وہ میری طرف کیوں آ رہے ہیں۔ سامنے والے دروازے سے اندر آنے والا میرے پاس سے گزرتا ہوا۔ اس غیر ملکی جوڑے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے انہیں اپنے سامان کی تلاشی دینے کے لیے کہا۔ انہوں نے انگلش میں اسے ڈانٹا تو سپاہی نے بغیر کچھ کہے اس کے ہاتھ کو پکڑا اور نیچے کی جانب کھینچنے لگا۔ مرد کو کھنچتے دیکھ کر عورت نے شور مچانا شروع کر دیا لیکن سپاہی پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اسی طرح کھینچتا ہوا اسے نیچے کی جانب لے چلا۔ بس کے تمام مسافر ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے۔ میں کھڑکی سے باہر ان دونوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ سپاہی اسے لے کر موبائل میں بیٹھے اپنے افسر کے پاس لے گیا۔ اس نے انگلش میں سوال جواب کیا اور پھر اس کے سامان کی تلاشی لی۔ لیکن اس میں سے ایسا کچھ نہیں ملا تب اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس کے کپڑوں کی تلاشی لینے لگا۔ جامہ تلاشی کے بعد اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں سمجھ گیا کہ مخبر نے انہیں کوئی ایسی اطلاع دی ہوگی جس کی وجہ سے انہوں نے اس جوڑے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اگر وہ معمول کے مطابق تلاشی لیتے تو پھر پوری بس کی تلاشی لیتے صرف ان دونوں پر ہاتھ ڈالنا یہ بتا رہا تھا کہ میرا اندازہ درست ہے۔ مرد کے بعد ایک لیڈی کانسٹیبل نے آڑ میں لے جا کر عورت کی تلاشی لی۔ لیڈی کانسٹیبل کی موجودگی نے میرے اندازے پر مہر ثبت کر دیا۔ میں نے اپنی سیٹ چھوڑ دی اور دیگر کئی مسافروں کی طرح نیچے اتر گیا۔

میں پولیس موبائل کی طرف بڑھ رہا تھا کیونکہ مجھے اپنی سیٹ کا کور یاد آگیا تھا۔ اس سیٹ کور میں کسی نے کچھ داخل کیا تھا اور میرے پیچھے یہی جوڑا تھا۔ مجھے آگے بڑھتے دیکھ کر ایک سپاہی نے روکا۔ مگر میں رکا نہیں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت تک افسر نے اس جوڑے کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ دونوں سر جھکائے ہوئے بس کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے نہیں لگ رہا تھا کہ انہیں اس بات کا افسوس ہے کہ پولیس نے انہیں تنگ کیا ہے۔ میں نے انہیں بس میں سوار ہونے دیا پھر افسر کے پاس جا کر کہا۔ ”سر کیا بتا سکتے ہیں کہ آپ نے اس غیر ملکی جوڑے کو کس لیے حراساں کیا؟“

”تم کیا ہمارے افسر ہو؟“ افسر تپا بیٹھا تھا۔ سوال کرتے ہی بھڑک اٹھا۔ میں نے اس کی حالت سے لطف لیتے ہوئے پوچھا:

”ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی مدد کر سکوں۔“

”اوئے تُو کیا خدائی فوجدار ہے۔ چل جا بس میں سوار ہو ایسا نہ ہو کہ میرا متھا گھوم جائے۔“

پتا نہیں اس کی عقل کہاں گھاس چر رہی تھی۔ میرے کھلے انکشاف پر بھی وہ احمق بنا رہا تب میں نے اس سے کہا۔ ”ہاں میں خدائی فوجدار ہوں۔ ابھی ابھی اسلام آباد سے ڈیوٹی پر آیا ہوں۔ ایک منٹ میں وردی اتر جائے گی۔“

میرے لہجے پر وہ چونک گیا۔ اس نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا پھر کہا۔ ”اوباؤ تو ہے کون۔“

”میں کون ہوں یہ بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تُو خود موبائل سے اتر اور جا کر بس کی تلاشی لے۔ سپاہیوں پر کام لاد کر خود عیش کر رہا ہے۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”اوئے تُو ہے کون؟“ وہ غصے میں بھرا موبائل سے کود کر نیچے اترا۔

”میں کون ہوں یہ تجھے بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تُو اوپر جا کر ان دونوں کے آگے والی سیٹ کے کور میں ہاتھ ڈال کر دیکھ۔ پھر آ کر بات کرنا۔ جو پوچھے گا وہ میں بتاؤں

گا۔"

اس نے ایک سپاہی سے کہا۔ "اوئے میدے اس باؤ پر نظر رکھ میں ابھی آتا ہوں۔"

وہ تو بس کی طرف چلا گیا اور سپاہی مجھ پر اس طرح رائفل تان کر کھڑا ہو گیا جیسے میں خونی مجرم ہوں۔ ابھی ابھی کسی کو قتل کر کے آ رہا ہوں۔

میری نظریں افسر پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ بس پر سوار ہو گیا تھا اور اب اس جوڑے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں اطمینان سے اپنی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ دیگر لوگوں کی طرح وہ اس افسر کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے۔ جب کہ افسران کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے شاید کوئی سوال کیا تھا پھر اس نے سامنے والی سیٹ کے کور میں ہاتھ ڈال دیا۔ اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے کے بعد جب اس نے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں پیکٹ تھا۔ اس نے پیکٹ کو وہیں کھڑے کھڑے کھولا اور پھر چونک کر اس نے غیر ملکی مرد پر ہاتھ ڈال دیا۔ مرد اور عورت دونوں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔ لیکن اس نے کوئی پروا نہیں کی اور اسے کھینچتا ہوا نیچے لے آیا۔ اسی وقت وہ عورت بس سے اتری اور سڑک کراس کر کے کھیتوں کی جانب دوڑ گئی۔ اسے بھاگتے دیکھ میں نے آواز دی۔ "اوئے احمقو اسے پکڑو۔"

میری آواز پر دو پولیس والے اس عورت کے پیچھے دوڑے اور کافی دور جا کر انہوں نے اسے بھی پکڑ لیا۔

میں اپنی جگہ کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ افسر انہیں ساتھ لے کر میری طرف آنے لگا۔ میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ مجھے اسی وقت شک ہو گیا تھا کہ وہ دونوں ڈرگ اسمگلر ہیں اور کسی سے ڈرگ خرید کر آ رہے ہیں۔ ناکا بندی دیکھ کر انہوں نے پیکٹ میری سیٹ کے کور میں ڈال دیا کہ اگر پکڑے گئے تو بھی الزام ان پر نہیں آئے گا۔ یہ تو ان کے ستارے کی خرابی تھی کہ وہ سیٹ میری تھی اور میں نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا مگر شور شرابہ کرنے کی بجائے خاموشی سے قانون کی مدد کر دی۔

افسران دونوں کے ساتھ میرے قریب پہنچ گیا پھر بولا۔ "او باؤ تیرا شکریہ کہ تو نے مدد کر دی لیکن تُو ہے کون۔ اب اپنا تعارف بھی کرا دے۔ ایسا کرتے ہیں کہ یہاں سے سیدھا تھانے چلتے ہیں۔ وہاں ایک ایک کپ چائے بھی پی لیں گے اور ایک دوسرے سے متعارف بھی ہو جائیں گے۔"

"میری ڈیوٹی کہیں اور ہے، میں واپس ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنے جا رہا ہوں۔"

میرا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ وہ مرعوب ہو گیا۔ اس نے یہی سمجھا کہ میں محکمہ خفیہ کا کوئی اعلیٰ افسر ہوں۔ اس نے جھک کر پوچھا۔ "کس محکمہ سے ہو؟"

"کچھ محکمے ایسے ہوتے ہیں جس کے بارے میں بتایا نہیں جا سکتا۔ ہمارا کام صرف مدد کرنا ہے۔ میں نے مدد کر دی۔ اب تم جانو اور تمہارا محکمہ جانے۔"

"باؤ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اس پارٹی کی مخالف پارٹی کے ہو جس سے اس نے مال خریدا اور تم نے اس کی سزا دینے کے لیے اسے پکڑوا دیا۔" وہ خود کو جیمس باؤنڈ کا نانا ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ تھانے چلتا ہوں اور اپنا تعارف کرانے کے بعد تمہارے ایس پی کو رپورٹ کر دیتا ہوں کہ تم نے ان دونوں کو چھوڑ دیا تھا یہ میری ذات تھی کہ میں نے تمہیں زبردستی بھیجا کہ جا کر سیٹ کے کور سے پیکٹ نکال لاؤ۔"

میری بات نے اسے گھبرا دیا کہ جیتی ہوئی بازی پلٹ جائے گی۔ اس کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھنے کی بجائے میرے سر بندھ جائے گا اور اس سے جواب بھی طلب کیا جائے گا کہ اس نے تلاشی صحیح طور سے کیوں نہیں لی۔ اسی لیے وہ نرم لہجے میں بولا۔ "نہیں سر آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں تو چائے پلانے کے لیے بلا رہا تھا۔"

"ایک کپ چائے مجھے دیر کرا دے گی اور افسران مجھ پر چڑھ دوڑیں گے۔ جانتے ہی ہو کہ ہمارے ڈپارٹمنٹ میں وقت کو کس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔"

"ہاں سر یہ بات تو ہے۔ بس ایک ریکوئسٹ ہے۔ میری فائل اوپر پھنسی ہوئی ہے۔ اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو میں زندگی بھر دعا دوں گا۔ میری ترقی ہو جائے گی سر۔ اوپر تک آپ لوگوں کی بات مانی جاتی ہے۔ بس ایک فون آپ کا، میری راہ کھول دے گا۔"

"اچھا اچھا اپنا نام اور فون نمبر بتاؤ میں آج ہی تمہارے افسران سے بات کر کے تمہیں فون کر دوں گا۔"

"یہ رہا میرا کارڈ سر۔ آپ اپنا نمبر دیں گے؟"

"ابھی نہیں میں شام تک خود فون کروں گا۔ وہ نمبر سیو کر لینا۔ ابھی جو نمبر استعمال میں ہے وہ عارضی ہے۔ رپورٹ کرتے ہی وہ سم جمع ہو جائے گی۔" میں نے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ٹالنے کے لیے ایک اور بہانہ کیا۔ پھر اس سے ہاتھ ملا کر واپس اپنی سیٹ پر آگیا۔ بس چل پڑی۔

اب بس کا ہر مسافر مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ سب بھی مجھے کوئی اہم افسر سمجھ رہے تھے۔ میں کھڑکی سے ٹیک لگائے باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ میرے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے جیب سے موبائل نکالا اور نمبر پر نظر ڈالی۔ نمبر نیا تھا۔ میں نے کال ریسیو کیا اور کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ دوسری جانب سے آتی آواز کو سن کر میں چونک گیا۔ یہ مکروہ آواز میں لاکھوں آوازوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ یہ آواز مرشد کی تھی۔ وہ دوسری جانب سے بول رہا تھا کہ بالآخر تم میرے آدمیوں کو دھوکا دے کر نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ کوئی بات نہیں میں اب منتظر ہوں کہ تم کب پنڈی پہنچتے ہو۔''

میں حیران ہو گیا تھا کہ وہ کس طرح میرا تعاقب کر رہا ہے۔ لگتا ہے اس کے آدمی مسلسل میرے تعاقب میں ہیں جو مرشد کو پل پل کی خبر دے رہے ہیں۔ ''خاموش کیوں ہو گئے۔ کچھ تو بولو۔''

''فکر نہ کرو جلد میں تم سے حساب کرنے آ رہا ہوں۔''

''ہاں مجھے بھی بے چینی سے تمہارا انتظار ہے۔ اب میں بھی یہ قصہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم میری خانقاہ تباہ نہ کرتے تو میں تمہیں معاف کر کے اپنے کاموں کی طرف توجہ دیتا لیکن تم نے مجھے تباہ و برباد کر کے سمجھا تھا کہ میں تباہ ہو جاؤں گا لیکن اب میں پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ہو چکا ہوں۔ اور اس کی نمائش تمہارے سامنے کر کے مجھے خوشی ہو گی۔ اسی لیے تمہیں اس شدت سے یاد کر رکھا ہے۔ اب کچھ ہی دیر ہے کہ تم میرے سامنے ہو گے۔''

اس کی یہ بات میرے لیے سوچ کے در وا کر گئی۔ میں فکر میں پڑ گیا۔ اس نے کال کاٹ دی تھی مگر میں بت مجسمے کی طرح موبائل کو اسی طرح سامنے کیے بیٹھا تھا۔ تبھی بس کی رفتار کم ہونے لگی اور بس رکتی ہوئی محسوس ہوئی میں ہوشیار ہو گیا۔ میں نے دوبارہ سے سفیر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری گھنٹی کے بعد سفیر نے کال ریسیو کر لی۔ اس نے چیختے ہوئے کہا۔ ''آپ کہاں رہ گئے ہیں۔ لگتا ہے ہم سب کو آپ ذہنی بیمار بنا کر چھوڑیں گے۔ ہم سب کتنا پریشان ہیں بتا نہیں سکتے۔''

''یہ باتیں بعد میں کر لینا۔ ایسا کرو کہ مری کے لیے جہاں سے بسیں چلتی ہیں وہاں پہنچو، میں اس وقت بس میں ہوں۔''

''اچھا اچھا آ رہا ہوں۔'' کہہ کر اس نے لائین کاٹ دی۔ اب میں ایک ہی بات سوچ رہا تھا کہ مرشد کو میری نقل و حرکت کا کیسے پتا چل رہا ہے، کیا اس نے میرے لیے کسی کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے جو صرف مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ میں نے آگے پیچھے ہر طرف دیکھ لیا لیکن پوری بس میں ایسا کوئی

مشتبہ شخص نظر نہیں آیا پھر میں راستے سے بس میں سوار ہوا تھا اور یہ سب کے سب پہلے سے بس میں سوار تھے۔ کیا کوئی دوررہ کر تعاقب کر رہا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا لیکن باہر بھی ایسی کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی جو پیچھے آرہی ہو۔ میں عجیب شش وپنج میں گھر گیا تھا کہ آخر وہ مجھے کس طرح بار بار ٹریس کر رہا ہے۔

اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور راستہ طے ہو رہا تھا مجھے ہوش تب آیا جب شہر بالکل نزدیک آگیا۔ جانی پہچانی سڑکیں اور مقامات نظر آنے لگے تھے۔ میں نے ذہن کو جھٹکا کہ اب جو بھی ہو۔ مرشد سے تو ٹکرانا ہی ہے تو پھر فکر کیسی۔ اسی خیال کے تحت میں نے ذہن کو موڑ لیا اور آتی جاتی سواریوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے دوبارہ سے موبائل نکالا اور سفیر کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی بیل پر ہی اس نے کال ریسیو کر لی۔ میں نے پوچھا کہ تم ہو کہاں تو اس نے کہا۔ ''بس ہم نکل رہے ہیں پانچ منٹ میں اسٹینڈ پر ہوں گے۔''

''ایسا کرو کہ رفیع یونیورسٹی کیمپس والی روڈ پر آجاؤ۔ وہیں جہاں سے کیمپس کے لیے مڑتے ہیں۔ میں وہیں کھڑا ہوں۔''

''او کے آپ وہیں انتظار کریں ہم بس اس کے قریب ہی ہیں۔ لیجیے پہنچ گئے۔''

اس نے جیسے ہی کہا بس اس مقام کے قریب سے گزر رہی تھی۔ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور ڈرائیور سے کہا۔ ''بھائی یہیں روک دو میں اتر جاؤں۔''

ڈرائیور کو کوئی سخت جملہ کہتا کہ اس نے سر پر لگے آئینہ میں مجھے دیکھ لیا اور نرم لہجے میں بولا ''باؤ فکر ہی نہ کرو۔ لو یہ روک دیا۔'' اس نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

بس رکتے ہی میں نیچے اتر گیا۔ بس آگے بڑھ گئی۔ ابھی میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ دور سے آتی ہوئی وہی گاڑی نظر آئی جس کا حلیہ بدلا گیا تھا۔ اس کا اگلا حصہ ہی اتنے شوخ کلر کا تھا کہ دور سے بھی پہچان میں آرہی تھی۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ دینا شروع کر دیا۔ گاڑی بالکل میرے نزدیک آکر رک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر مرجس تھا۔ اس کے برابر میں سفیر اور پیچھے والی سیٹوں پر عبداللہ وغیرہ تھے۔ سفیر نے اترنا چاہا تھا کہ میں نے منع کر دیا کہ نہیں میں تو پیچھے ہی بیٹھوں گا۔ اور اس طرف والا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ مرجس نے گاڑی بڑھا دی۔

''ہاں بھائی اب تو بتا سکتے ہیں کہ آنجناب کہاں رک گئے تھے۔'' سفیر نے پوچھا۔

''یقین کرو گے ایک نہیں دو بار اغوا ہوا ہوں تب جا کر تم لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان اغوا کاروں سے نمٹنے میں کچھ دیر تو ہونا ہی تھی۔

''ارے بھائی ایک کال تو کر سکتے۔''

''کال کرنے کی فرصت کسے تھی۔ اتنا الجھا ہوا تھا کہ چاہ کر بھی فون نہ کر سکا۔ پھر جب موقع ملا تو تم نے کال ریسیو نہیں کی۔''

''ہاں اس رات سو گیا تھا۔ صبح مس کال دیکھی لیکن جب ریٹرن کال کی تو آپ کا فون بند جا رہا تھا۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔ میں نے بھی جب موبائل آن کیا تو مس کال نظر آئی تھی۔''

''ان باتوں کو چھوڑو یہ بتاؤ کہ وہ گھر ہے کیسا جہاں ہم جا رہے ہیں۔ محفوظ تو ہے نا؟''

''بہت عمدہ ایک ایسا گھر مل گیا ہے جس کی تعریف الفاظ میں نہیں کر سکتا آپ خود دیکھ کر ہی کہیں گے کہ یہ بھی وسیم کی مہربانی ہے کہ ایک منٹ میں اس نے گھر کا مسئلہ حل کرالیا تھا۔''

میں نے وسیم کی طرف دیکھا جو مسکین صورت بنائے لاتعلق بنا بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''میرے شیر یہ تو بتاؤ کہ دیگر انتظامات کا حال کیا ہے؟ اس لیے کہ اس وقت مرشد جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا ہے۔ اس سے نمٹنے کے لیے کیا تیاری کی ہے؟''

''ہم تو آپ کے اشارے پر چلنے والے ہیں۔ آپ بتائیں کہ ہمیں کرنا کیا ہے؟'' وسیم نے کہا اور دوبارہ سے باہر دیکھنے لگا۔ عبداللہ اور مرجس بالکل خاموش تھے۔ جیسے وہ گاڑی میں رہتے ہوئے بھی نہ ہوں۔ میں وسیم کے سوال کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ مرجس نے ایک بنگلے کے گیٹ پر گاڑی روک کر ہارن دیا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔ سامنے ایک بڑی بڑی مونچھوں والا کھڑا تھا۔ دیکھنے سے ہی لگتا تھا کہ اس کا تعلق بلوچ قبائل سے ہے۔ میں نے ایک نظر میں اس کا جائزہ لے لیا تھا۔ مرجس گاڑی اندر لیتا چلا گیا۔ پھر پورچ میں کھڑی کر کے بولا ''گاڑی کی سروس کرانا ضروری ہے۔ اس لیے کہ ایک لمبے سفر پر چلی ہے لیکن آپ کی وجہ سے ہم سب پریشان تھے اس لیے میں بھی گاڑی کو سروس اسٹیشن نہیں لے گیا۔ اب اگر آپ کہیں تو میں اسے دے آؤں۔''

''یہ کام بھی ضروری تھا۔ اسے تو فوراً کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔

”اصل میں ہم سب اس لیے گاڑی کو کہیں لے کر نہیں جا رہے تھے کہ کب آپ کو ریسیو کرنے جانا پڑ جائے۔ اسی وجہ سے میں نے انتظار کرنا ضروری سمجھا۔“

”اب تم پہلا کام یہی کرو کیونکہ اسلحہ اور گاڑی ان دونوں کو میں ہمہ وقت کنٹرول میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تو پھر آپ آرام کریں میں اسے سروس کے لیے دے کر آتا ہوں۔ یوں بھی آج کہیں نکلنے کا پروگرام تو ہے نہیں اس لیے میرے خیال میں یہی بہتر وقت ہے۔“

”ہاں ہاں ضرور جاؤ۔“ میں نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

میں نے گاڑی سے اتر کر اطراف کا جائزہ لیا۔ بنگلے کے چاروں طرف یارڈ تھا۔ سامنے لان بنا ہوا تھا۔ برآمدہ ایک فٹ اونچا تھا۔ میں نے برآمدے پر قدم رکھا تھا کہ میری نظر اس کتے پر پڑی جو ایک پیڑ سے بندھا ہوا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ابھی تک اس نے بھونکا بھی نہیں تھا۔ میں نے وہیں سے اس کتے کا جائزہ لیا۔ وہ اعلیٰ نسل کا لگ رہا تھا۔ بھیڑیے جیسا قد تھا۔ اگر اسے کسی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک منٹ میں تکہ بوٹی کر دے۔ اس کے انداز سے ہی خونخواری جھلک رہی تھی۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے سفیر سے پوچھا ”یہ کتا تم نے لیا ہے؟“

”نہیں جناب یہ کتا بنگلے کے مالک کا ہے۔ وہ ان دنوں کینیڈا میں مقیم ہے۔ اس نے گھر کے ساتھ ایک کتا اور ایک چوکیدار بھی دیا ہے۔ چوکیدار کو دیکھ ... چکے ہیں اور اب کتے کو بھی دیکھ لیا۔ ویسے یہ کتا ٹرینڈ ہے۔ حس بھی بہت تیز ہے۔ باتوں کو فوراً سمجھ لیتا ہے۔ اگر ہم سب ساتھ نہ ہوتے تو یہ بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیتا۔“ سفیر نے کتے کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

میں نے اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ دروازہ پار کرتے ہی اچھی قسم کے فرنیچر سے سجا ڈرائینگ روم تھا۔ اس روم کو پار کر کے ہم ایک دوسرے کمرے میں پہنچے۔

کمرے کا جائزہ لیا۔ اپٹوڈیٹ بیڈ روم تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جس نے بھی بیڈ روم سیٹ کیا ہے کافی شوقین مزاج ہے۔ اس لیے کہ بیڈ روم کے فرنیچر ہی نہیں بلکہ دیواروں کے رنگ و روغن بھی خوبناک تھے۔ بڑا سا جہازی سائز بیڈ۔ ایک طرف قد آدم آئینہ جس میں بیڈ پر بیٹھے بیٹھے خود کو دیکھ کر سنوارا جا سکتا ہے۔ دیوار سے لگا صوفہ سیٹ۔ چھوٹے چھوٹے دو ٹیبل۔ دیواروں پر چار جانب رنگین لائیٹ جو چند سیکنڈ میں رنگ بدل دیتی اور ہر کونے میں اوپر کی طرف رنگین زیرو پاور کے چار بلب۔ ایک طرف فولڈنگ آرائیشی آڑ۔ میں نے خود کو بیڈ پر گراتے ہوئے کہا۔ ”بھائی وسیم تم نے گھر بھی خوب ڈھونڈا ہے۔ کس کا ہے؟“

”میرے ایک جاننے والے کے کزن کا گھر ہے۔ وہ اسٹیٹ ایجنسی کا کام کرتا ہے۔ جب میں نے اسے گھر کے لیے کہا تو اس نے پیش کش کی کہ اس گھر کو لے لیا جائے ...اور میں نے لے لیا۔“

”ہمارا کمرا ابھی تو دیکھیں۔ اس پر سفیر اور وسیم کا قبضہ ہے۔ برابر والا روم ہمیں دیا گیا ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔

چلو اس کا معائنہ بھی کر لیتے ہیں۔“ کہہ کر میں کھڑا ہو گیا۔

برابر والا کمرا بھی کم نہیں تھا۔ اسے بھی بھرپور انداز میں سجایا گیا تھا۔ امارت کا بھرپور مظاہرہ تھا۔ عبداللہ نے بتایا کہ اس کمرے میں وہ اور مرجس سوئے تھے۔ اب یہی ان کی تصرف میں رہے گا اسی نے بتایا کہ اس کے برابر والا کمرا میرے لیے مختص کیا گیا ہے۔ میں نے کہا۔ ”لگے ہاتھوں اس کمرے کا درشن بھی کر لیتے ہیں۔“

برابر والے کمرے میں آیا تو آنکھیں پھٹی رہ گئیں اس لیے کہ وہ کمرا کسی عشرت کدہ سے کم نہ تھا۔ دو طرف کی دیوار میں اس طرح آئینہ لگایا گیا تھا کہ پورا کمرا اس میں نظر آ رہا تھا۔ درمیان میں بیڈ تھا اور دو طرف دو صوفہ سیٹ تھے۔ انتہائی قیمتی۔ کھڑکی کے نزدیک قد آدم انتہائی مہارت سے بنا وینس کا مجسمہ تھا۔ دیواریں ہلکی گلابی رنگ کی تھیں۔ کمرے میں دو طرف دیوار میں عود دان فکس تھا جس میں یقیناً خوشبو رکھی جاتی ہوگی جس کی وجہ سے کمرا معطر رہتا ہوگا۔ بیڈ کے پینتانے کی طرف دیوار میں پچپن انچ کا ایل ای ڈی فکس تھا۔ ایک طرف پورٹیبل فریج تھا تو اس کے برابر ایک رولنگ ریک جس میں کئی ڈیزائین کی خوبصورت بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ بھری ہیں یا خالی یہ دیکھنے کی میں نے کوشش نہیں کی۔ اسی ریک میں تمباکو نوشی کے لیے کئی چیزیں رکھیں تھیں۔ جن میں سگریٹ اور سگار بھی تھا۔ برابر میں وارڈ روب تھا جس میں کپڑے ہی ہوں گے۔ اس لیے اسے کھول کر دیکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ بستر پر بیٹھ کر میں نے کہا۔ ”واقعی جس کا بھی کمرا ہے وہ شوقین آدمی لگتا ہے۔“

”اس میں شک نہیں ہے۔“ عبداللہ بولا۔ ”ایسے کمرے تو راجا صاحب کے بھی نہیں ہیں۔“

”میاں تو وہ بوڑھے ہیں اور یہ کمرا کسی جوان شخص کی

امارت کا اظہار کر رہا ہے۔‘‘ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
پھر باتوں کا رخ یکایک مڑ گیا اور مرشد زیر بحث آ گیا۔ میں نے کہا۔ ’’ایک بات سمجھ نہیں آئی ہے کہ مرشد مجھے اتنی آسانی سے کیسے ٹریس کر رہا تھا۔‘‘ کہہ کر میں نے فون کالز کے بارے میں بتایا۔
میری بات سن کر سفیر نے زور کا قہقہہ لگایا پھر مجھ سے کہا۔ ’’اپنا موبائل دیں۔‘‘
میں نے موبائل بڑھا دیا۔ اس نے سم نکال کر کہا۔ ’’اب مرشد کے ابا جان بھی ٹریس نہیں کر سکتے۔‘‘
’’یعنی؟‘‘ میں نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔
’’کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سامنے کی چیز نظر نہیں آتی، یہ اینڈرائڈ فون ہے۔ اس فون کا لوکیشن ایک بچہ بھی گوگل ارتھ سے ٹریس کر سکتا ہے۔ اب تو ایسے ایسے سوفٹ ویئر آ چکے ہیں جو بند موبائل کی لوکیشن بھی پتا کر لیتے ہیں۔ کچھ دنوں تک اس موبائل کو استعمال نہ کریں۔‘‘
میں اپنی بے وقوفی پر خود ہی ہنسنے لگا۔
ایک بار سویرا کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا تب موبائل نیا نیا مارکیٹ میں آیا تھا۔ سویرا کی شادی ہوئی نہیں تھی وہ کسی کے پاس گئی ہوئی تھی کہ میں نے اس کے موبائل پر کال کر لیا۔ وہ حیران تھی کہ مجھے یہاں کا نمبر ملا کیسے۔ دراصل اس کے ذہن میں لینڈ لائن ہوگا۔
گفتگو جب کافی لمبی ہو گئی تو وسیم بولا۔ ’’تو ایسا کریں کہ آپ یہاں لیٹ کر اپنی امارت کو یاد کریں۔ میں تو کمر سیدھی کرنے اپنے والے کمرے میں چلا۔‘‘
’’وسیم کبھی کبھی بات دماغ والوں کی کر جاتا ہے۔ آپ یقیناً تھکے ہوئے ہوں گے اس لیے آپ آرام کریں۔ میں بھی سونے کے لیے چلا۔ رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔‘‘ سفیر بولا۔
میں سمجھ چکا تھا کہ وہ لوگ صرف مجھے آرام دینے کے خیال سے کمرے کو خالی کر رہے ہیں تاکہ میں آرام کر لوں۔ کیونکہ میری آنکھوں میں انہوں نے آنسو دیکھ لیے تھے۔
اب خالی کمرے میں میں تھا اور میری سوچ تھی۔ میں گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے کے لیے لیٹ گیا۔
وقت کا کام ہے گزرنا، گزر جاتا ہے۔ زخم لگا کر، ٹیس دے کر بھی گزر جاتا ہے۔ اور ٹیس برسوں ستاتی ہے۔ مجھے بھی ستا رہی تھی۔ رولا رہی تھی۔ میں اوپر سے ہنس بھی رہا تھا اور اندر سے رو بھی رہا تھا۔ اس کمال ضبط سے کہ آنسو کبھی نہ آئے۔ ایسی حالت میں روتا تھا کہ سسکی بھی نہ ابھرے۔ آنکھیں نوحہ کناں تھیں۔ مگر اظہار سے گریزاں تھیں۔ دوسرے کتنا بھی ذلیل کر لیں، سب سے بڑی ذلت تو آدمی کا اپنی نظروں میں گر جانا ہے۔ میں بھی اپنی نظروں میں گر گیا تھا۔ بازو تھے، بازوؤں میں قوت بھی تھی مگر اسے کام میں نہیں لا پا رہا تھا۔ ہر موئے تن پھنک رہا تھا۔ لپٹیں سی اٹھ رہی تھیں۔ روم روم سے پکار اٹھ رہی تھیں۔ ایک ہی پکار تھی۔ انتقام انتقام۔ مرشد سے انتقام۔
میری مٹھیاں بھنچنے لگیں تھیں۔ رگوں میں لہو تیز ہو رہا تھا۔ گردش اتنی بڑھ گئی کہ دل بھی بے قابو ہونے لگا تھا اگر اس وقت مرشد سامنے ہوتا تو میں یقیناً اس کا گلا دبا چکا ہوتا۔ مگر وہ سامنے نہیں تھا۔ پتا نہیں کہاں ہوگا۔ مگر میں نے اسے سزا دینے کی ٹھان لی تھی۔ اس کھیل کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنا تھا اگر وہ پاتال میں بھی ہوتا تو میں اسے نہ بخشتا۔ کھینچ لاتا۔
مگر اسے ڈھونڈوں تو کیسے؟ تبھی دماغ نے کہا، بالکل ویسے جیسے پہلے ڈھونڈا تھا۔ ابھی میں سوچ و فکر کے سمندر میں غلطاں تھا کہ ایک خیال نے سر ابھارا۔ میں نے تیز آواز میں کہا۔ ’’سفیر کو بلاؤ۔‘‘
کچھ میرا انداز، کچھ میری آواز کی تیزی۔ مرجس جو کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ رک گیا پھر مڑا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔ میں پھر سے خیالات کے مد و جذر میں ڈوبنے ابھرنے لگا۔ رہ رہ کر میرے اندر طوفان سا اٹھنے لگا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں کچھ کر بیٹھوں۔ میں صرف ایک ہی نکتے پر سوچے جا رہا تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔ میری نظریں خود بہ خود ادھر اٹھ گئیں۔ دستک دوبارہ ہوئی۔
دستک ہاتھ اور پلڑے کے لمس سے پیدا ہوتی ہے۔ سماعت تک پہنچتی ہے۔ یاد دلاتی ہے، کوئی سائل ہے۔ اس وقت اس ساعت ایسا کون سا سائل ہے جو ملاقات کی بھیک مانگنے بے وقت آ گیا۔
میں خاموش رہ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ خالی الذہنی میں یہ تک بھول گیا تھا کہ میں نے خود ہی کسی کو بلایا ہے۔ میں مکمل طور پر خالی الذہن تھا اور اس عالم میں بس ایک کام یہی تو ہو سکتا ہے۔ میں اسی عالم میں بت بنا بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ جب تیسری بار دستک کی صدا بلند ہوئی تو میں نے بہ جبر پوچھا۔ ’’کون؟‘‘ میرا لہجہ غماز تھا کہ میں نے اس کی آمد کو پسند نہیں کیا ہے۔
’’میں ہوں۔‘‘ باہر سے جانی پہچانی آواز آئی۔ میرے ہر دکھ میں دکھی ہو جانے والے سفیر کی آواز نے دلاسے کا کام

جنگ آزما
ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر بن گئی تھی
میڈیکل ایڈ کے نام پر عالمی پیمانے پر ہونے
والے جرائم کی کہی ان کہی داستان، وہ نادانستگی
میں ایک بہت بڑے گروہ سے ٹکرا گیا تھا۔
ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی
بہت جلد
ماہنامہ
سرگزشت
کے صفحات پر
ملاحظہ کریں

کیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری دلی کیفیت جان کر ہی آیا ہیں تپتے صحرا میں پانی کی بوند بن کر۔

"دروازہ کھلا ہے۔" میں نے بلند آواز میں جواب دیا۔

سفیر اندر آیا۔ شفقت بھرے انداز میں مجھے دیکھا۔ اس کی نظریں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ گلے تھے شکوے تھے۔ حوصلے رکھنے کے ولاسے تھے۔ جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہو مگر کہنے سے گریزاں تھا۔ اس نے ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈالی اور سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک سکوت کی چادر تنی رہی پھر اس خاموشی کو اسی نے چاک کیا۔

سفیر نے میرے چہرے کو اپنی دونوں ہتھیلیوں کے کٹورے میں سنبھال کر کہا۔ "تو مرشد کو تلاش کرنا چاہتا ہے نا۔"

میں نے نظریں اٹھا کر سفیر کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس پتھر جیسے چہرے پر اس وقت شفقت کی چادر تنی ہوئی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھے جارہا تھا۔ میں نے دوبارہ سے اپنا چہرا اٹھا کر کسی ننھے بچے کی طرح کہا۔ "ہاں!"

"بس تو پھر تیاری کرلیں۔" سفیر نے الگ ہو کر مجھ پر نظر ڈالی۔ پھر مسکرا کر بولا۔ "یہ کون سا مشکل کام ہے۔"

"ہاں، مگر یہ اتنا آسان نہیں ہے کہ دوڑے اور بلی پکڑ لی، وہ یہاں نہیں ہے۔"

"پاتال میں بھی ہو تو ہم اسے کھینچ لیں گے۔ وہ نچے پر نچے دے رہا ہے پھر بھی ہم نے اس کا پیچھا چھوڑا؟ آخر دم تک اس کے پیچھے لگے رہیں گے، تجھے۔"

"ہاں!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہم نے اسے معاف کیا؟ ارے جب تک ہماری دلی آرزو پوری نہیں ہوتی ہم اس کا پیچھا کرتے رہیں گے۔"

بات غلط نہیں تھی۔ مرشد مسلسل چھپتا پھر رہا تھا پھر بھی ہم نے ہار نہیں مانی۔ مسلسل اس کے تعاقب میں لگے رہے۔ یہ تو اس کی قسمت تھی کہ ہر بار ہمیں جل دینے میں کامیاب ہو جاتا پھر بھی نہ سفیر و وسیم نے حوصلہ ہارا اور نہ میں نے۔ اس کی خانقاہ تباہ کر کے ہم نے سمجھا تھا کہ وہ تباہ ہو گیا مگر اب تو ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ ایک نئی قوت بن کر ابھر رہا ہے۔ اب اس کہانی کا خاتمہ کر دینا ہی بہتر ہے۔ لیکن کیسے کیا جائے اسی پر ہم غور کر رہے تھے کہ اب ہمیں مرشد کی خانقاہ میں سیدھے داخل ہو جانا چاہیے؟" کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ "اب کون آگیا؟" یہ سوچتے ہوئے میں نے دروازے کی طرف دیکھا اور اونچی آواز میں کہا۔ "اندر آجاؤ۔"

اجازت ملتے ہی دروازہ کھلا اور عبداللہ داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ایسی کیا بات ہوئی ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

"میرا بندہ ایک خاص خبر لے کر آیا ہے۔"

خبر کا سن کر میں کھڑا ہو گیا۔ پھر کہا۔ "چلو دیکھتے ہیں۔ یقیناً کوئی اہم بات ہوگی۔"

میرا اندازہ سو فیصد درست تھا کہ وہ کوئی اہم خبر لے کر آیا ہے۔ باہر والے کمرے میں وہ منتظر تھا۔ اس نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ "ایک بڑی خبر ہے۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔ میری نظریں اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ اس کا چہرہ جوش جذبات سے تمتما رہا تھا۔ اگر کوئی چھوٹی موٹی بات ہوتی تو وہ اس طرح بول دینے پر اتاولہ نظر نہ آتا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد اپنی بات کہہ دینے پر آمادہ ہے۔ اس کے چہرے پر جذبات کی سرخی پوری طرح پھیلی ہوئی تھی۔

"بولو" میں نے گونجدار آواز میں کہا۔

"مرشد کا قلعہ نما مکان میں اندر سے دیکھ آیا ہوں۔"

"ہوں۔" میں نے ہنکارا بھرا۔ میرے اندر میرے وجود میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ وقت کی اتنی لمبی مسافت کے بعد ایک بار پھر ہم مرشد کو گھیرنے کے لیے آمادہ ہو چکے تھے۔ پرانے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے۔ تمام حساب چکتا کرنے کا وقت آچکا تھا۔ اب آگے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کامیابی کسے ملتی ہے۔ کیونکہ اب وہ پہلے والا مرشد رہا نہیں۔ سفیر وغیرہ نے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق وہ بہت قوی ہو چکا ہے۔ اس کے سیاسی اختیارات تو تھے ہی کچھ اور طاقت بھی اس نے حاصل کر لی ہے۔ "تفصیل سے بتاؤ۔"

"گو کہ خانقاہ ابھی زیر تعمیر ہے لیکن اتنی چیکنگ اینڈ سخت انتظام رکھا گیا ہے کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا سب سے اہم بات یہ ہے کہ تمام دروازے الیکٹرونک پاور والے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟ یعنی وہ سب کسی خاص پہچان کسی خاص نشانی پر ہی کھلتے ہیں۔"

"ہم پھر بھی کبھی کبھار میں داخل ہوں گے۔ سب تیاری کرلیں۔ آج ہی۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

کہانی ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کریں

☆☆☆

بیت بازی

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

قندیل اثر.........فیصل آباد

حیا کے آنچل سرک رہے ہیں خوشی مناؤ
وفا کے آنسو ڈھلک رہے ہیں خوشی مناؤ

نسرین مشتاق.........جھنگ

حسنِ نظر فروز کی تابانیوں کے ساتھ
آئے تھے وہ بہار بداماں لیے ہوئے

ماہین فاطمہ شاہین.........لیہ

حسن اندر حسن راز زندگی
بحر ہستی میں تلاطم ہو بپا

محمد اشفاق.........سکھر

حسن فریاد ہے تاثیر دعا ہو جانا
وحدتِ عشق ہے بندے کا خدا ہو جانا

(ہادیہ ایمان، ماہا ایمان ڈاہرانوالہ کا جواب)

طلعت احسن عثمانی.........اسلام آباد

فانوس قمر زرد ہوا جاتا ہے
آفاق کا دل سرد ہوا جاتا ہے

(اشفاق علی کا جواب)

نجمی رحمٰن.........برٹ لیٹ یو ایس اے

راز ہے راز ہے تقدیر جہانِ یک و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

عبدالحکیم ثمر.........کراچی

یہ تو خواب ہے تعبیر نہیں پاؤں زنجیر گراں سے خالی
زندگی کیوں نہیں ہونے دیتی جسم کو سود و زیاں سے خالی

محمد ممتاز قادری.........شادی پور

یہ مصلحت ہے کہ وہ ہم سے دور رہتے ہیں
بسے ہوئے ہیں کہاں ہم کسی کو کیا معلوم

امجد علی عطاری.........کراچی

یا سحر آئی ہے انداز شب ہجر لیے
یا شب ہجر بہ انداز سحر آئی ہے

عباس جوکھیو.........ٹنڈو الہ یار

یگانگی ہے ظفر ورنہ میری کج کلی
نہیں مظاہرۂ دولت و نسب کے لیے

(ہما اختر مظفر گڑھ کا جواب)

رفیق احمد ناز.........ڈیرہ غازی خان

ابرِ کرم کہوں تجھے یا ابرِ ستم
تشنہ لب دریا تھے صحرا کو سیر کر گیا

(سید امتیاز حسن بخاری سرگودھا کا جواب)

ہما اختر.........مظفر گڑھ

یہ زندگی یہ زیست کا فانوس ہفت رنگ
اہلِ نظر کے واسطے اک عالمِ خیال

ابریز عالم.........مظفر گڑھ

یہ مرحلہ بڑا نازک ہے اہلِ دل کے لیے
عزیز تم بھی ہو اور زندگی بھی پیاری ہے

حسنین مصطفیٰ.........کامرہ

میں آنسوؤں کے علاوہ نہ لاسکا کچھ بھی
وہ اس لیے کہ وہاں بارشوں کا موسم تھا

نوشین جہاں.........کراچی

میں چلتا رہا مظہری اپنی دھن میں
بتوں نے بلایا خدا نے پکارا

اکبر عابدی.........کراچی

میری فغاں سے شکایت ہے سونے والوں کو
مرا گناہ یہی ہے کہ جاگتا ہوں میں

(قاضی شرف معرف حمیدی کراچی کا جواب)

فہد علی حمید.........کوئٹہ

اب کہاں ہم میں کوئی سالار باقی رہ گیا
جو دکھائے معجزہ ٹوٹی ہوئی تلوار سے

افسر علی افسر.........سکھر

اذاں دو قمر کعبہ دل میں جاکر
شب تار گزری سحر ہو گئی ہے

عنایت سیج .... کراچی

آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غمزدوں کو قرار آگیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آگئی جیسے پیغام دیدار یار آگیا

روزی ملک .... کراچی

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

رعنا حیات محمد .... گجرات

اس شب کا مقدر تو بدلنے کا نہیں ہے
یہ وقت مگر گھر سے نکلنے کا نہیں ہے

(نجمی رحمٰن برٹ لیٹ یو ایس اے کا جواب)

سارہ شفیق .... کراچی

اب شام سے ہی دل کا یہ در کھلنے لگا ہے
یادوں کا دشت میں بھی ٹھکانا تو نہیں تھا

افضل حیات .... شیخوپورہ

آسان کیا اس نے درپیش تھی جو مشکل
دشوار کیا ہم نے ہر رستہ با آسانی

عنایت تبسم .... مظفرگڑھ

اک پشیمانی کی پرچھائیاں سی چہروں پر لکھی تھی
اور ہر امید کے نام و نشاں خالی پڑے تھے

مہناز فرخ .... چنیوٹ

اے چاند کہاں جا کے چھپا دور افق میں
تاریک سا تاریک مرا قلب حزیں ہے

وحید نیازی .... لاہور

ایک لمحے کو گوارہ نہیں فرقت جن کی
کتنی جلدی انہیں انسان بھلا دیتا ہے

عینی نعیم .... گوجرانوالہ

ان کے کوچے سے مہکتی ہوئی آتی ہے فضا
میری الفت کا وہاں حال رقم ہوتا ہے

(زریں مجید کا جواب)

سید مسرت حسین رضوی .... کراچی

آؤ ہم پھر سے ایک ہو جائیں
زہر نفرت کا گھونٹ پی جائیں

اشفاق بشیر .... ملیر

اگر میں اس کو نہ ڈستا تو عین ممکن تھا
کہ میرا زہر کسی دن مجھی کو پی جاتا

اشرف عباس .... دبئی یو اے ای

اپنی ہی ذات میں پستی کے کھنڈر ملتے ہیں
اپنی ہی ذات میں ایک کوہ ندا رہتا ہے

اصغر علی .... سرگودھا

آندھی چلی تو نقش کفِ پا نہیں ملا
دل جس سے مل گیا وہ دوبارہ نہیں ملا

(عارف شہزاد ملیر کا جواب)

سید محمد حسین شاہ .... لطیف آباد

اس مرحلے کو موت بھی کہتے ہیں دوستو
اک پل میں ٹوٹ جائیں جہاں عمر بھر کا ساتھ

عارف حسن .... عمرکوٹ

اے سوز کی بھیک دینے والے سورج
کیا ہو گی چراغوں سے نیابت تیری

(افضل حیات کا جواب)

سیف اللہ .... ملک وال

ملیں نہ پھول تو تربت مسکرا دینا
سنا ہے پھول برستے ہیں مسکرانے سے

سعید احمد چاند .... کراچی

بدن کی آگ کو کہتے ہیں لوگ جھوٹی آگ
اس آگ نے مرے دل کو مگر گداز کیا

(عنایت تبسم مظفرگڑھ کا جواب)

نزاہت افشاں .... مہورہ

میرے نصیب میں بنجر زمیں کی رکھوالی
کنویں اداس میرے کھیت بے ثمر میرے

(اشفاق احمد کا جواب)

نجمی رحمٰن .... برٹ لیٹ یو ایس اے

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

بیت بازی کا اصول ہے۔ جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

"سفی دیکھو، چپ ہوجاؤ، مت روؤ۔" وہ ایک دم پریشان ہوگیا، اتنی دور سے اسے کیسے چپ کرائے۔

"آپ بہت خراب ہیں میرے ساتھ ہمیشہ ہی ایسا کرتے ہیں۔" سفینہ کو جانے کون کون سی باتیں یاد آنے لگیں، شکوہ کیا۔

"سفی جان۔" اس نے منانے کے لیے نرمی سے پکارا۔

"نہیں آپ کو مجھے دکھ دینا اچھا لگتا ہے نا؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"اچھا بابا سوری تم جانتی ہو کہ مجھے ہر بات برداشت ہے سوائے تمہارے رونے کے۔" وہ پیار سے بولا۔

"جائیں میں بات نہیں کرتی۔" سفینہ کے منہ سے سسکی نکلی۔

"پلیز...... جاناں میری خاطر۔ چپ ہوجاؤ نا۔" فائز کا بس نہیں چل رہا تھا، اڑ کر آئے اور اس کے آنسو اپنی پوروں سے چن لے۔

"اچھا تو پھر آئندہ کبھی ایسی بات کریں گے؟" سفینہ کا دھمکاتا لہجہ اسے ہمیشہ بہت بھاتا تھا، مسکراہٹ دبیز لبوں کو چھو گئی۔

"نہیں میری جان...... کبھی نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اپنی بات پر قائم رہیے گا۔" سفینہ نے بھی موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔

"اوکے...... جیسا تمہارا حکم مگر اب تم بالکل بھی نہیں رونا۔" فائز نے اقرار کیا اور بات ختم کرنا چاہی۔

"ڈر گئے نا۔" وہ شرارتی ہوکر ہنس پڑی۔

"ہاں ڈر گیا...... واقعی میں ڈر گیا کیوں میں اپنی محبت کی آنکھوں سے ٹپکتے آنسو برداشت نہیں کرسکتا۔" فائز نے اطمینان سے اعتراف کیا تو سفینہ کے اردگرد پھول سے کھل اٹھے۔

❁......❁......❁

کبھی پیار کے جھگڑے
کبھی محبت کی باتیں
وہ ہی آپ ہی کے قصے
وہ ہی آپ ہی کی باتیں
وہ ملا ہے مجھ کو اکثر
سر راہ چلتے چلتے
وہ ہی اجنبی نگاہیں، وہ ہی بے رخی کی باتیں
نا سمجھ سکا جہاں میں کوئی میرا درد پنہاں
میرے غم کو لوگ سمجھے میری شاعری کی باتیں
کوئی ہم کو یہ بتائے، یہ جنون نہیں تو کیا ہے؟
ملیں جب بھی ہم کسی سے کریں آپ ہی کی باتیں
میرے حال پہ وہ یوں ہی پچھلے مسکرائے
میں سنا رہا ہوں جیسے کسی اجنبی کی باتیں

نبیل نے گنگناتے لہجے میں محبت سے بوجھل ہوتی آواز میں شرمیلا کو منانا چاہا۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 نومبر 2016ء تک علمی آزمائش 131 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کررہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کرلیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)

92

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

علمی آزمائش۔ 131

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک گمی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 نومبر 2016ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

ملتان میں 3 جولائی 1952ء میں پیدا ہوئے۔ بائیں ہاتھ کے بیٹس مین اور لیگ بریک گگلی بالر تھے۔ 1985ء تک ٹیسٹ کرکٹ کھیلی۔ 2821 رنز بنائے جن میں 4 سنچریاں شامل ہیں۔ بہترین اسکور 125 ہے۔ 51 وکٹیں حاصل کیں۔ 20 کیچ پکڑے۔ پاکستان کے نامور کرکٹ کھلاڑی کہلاتے ہیں

علمی آزمائش 129 کا جواب

رعنا لیاقت علی خان شمالی ہند کے علاقے المورہ میں پیدا ہوئیں۔ نینی تال اور لکھنو سے تعلیم حاصل کی۔ تحریک پاکستان کے ایک سرکردہ رہنما کی محبت میں مذہب تبدیل کیا اور جب پاکستان کا قیام عمل میں آگیا تو پاکستان آکر عورتوں میں تعلیمی شعور بیدار کرنے کے لیے تن من دھن سے جت گئیں۔ لڑکیوں کو نیم عسکری تربیت حاصل کرنے پر زور دیا۔ مصنوعات دیہہ نامی انجمن بنا کر گاؤں دیہات کی عورتوں میں دستکاری کا شوق پیدا کیا۔ گورنر بھی رہیں۔ 1990ء میں انتقال ہوا۔

انعام یافتگان

1- اکبر علی خان۔ پشاور
2- ناہید بٹ۔ جہلم
3- مسز صدیقی اکرام۔ اسلام آباد
4- واحد علی خان نیازی۔ لاہور
5- فہیم برلاس۔ کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے انعام اللہ، وسیم اختر، فیض الحسن، خالق نیاز عبدل، نثار حسن، ارباب حسن، سید عباس، خالدہ یوسف، یاسین خان، ایم ناصر، اشتیاق محمد، دانش قریشی، مزمل صدیقی، عباس زیدی، توقیر ناصر، منیبہ حبیب، منیر الحسن، اکبر حیات، عنایت خان، مرزا سلیم، خادم حسین، صالح محمود، کامران خان، عباس خان، راغب الحسن، شجاع رضوی، طیب خان، اشرف اللہ خان، سید فرخ محمود، فیض محمد، دانش قریشی، محمد اختر، توقیر عباس اچکزئی، سلطان جونانی، ایاز سہیر، انیب الرحمن، زینت النسائی، وجاہت وکیل عثمان خان، شاہد

اقبال شاہد، محمد اختر، سلطان خان، فرحین سلطان، ناصر حسین، عارف اچکزئی، خادم حسین، نسرین عزیز، عبدالحکیم تھر، کیپٹن فواد خالد خان، امجد اسلام، نازو، ثمرہ، صاحب شاہ، شبینہ کوثر۔ لاہور سے عبدالجبار رومی، نغمہ نفیس، شاہد علی، عنایت علی، امداد اللہ، ڈاکٹر کامران آرزو، مسز احمد جمال، نگین بٹ، ظفر جتوئی، فہد اللہ، خادم علی، نوید اصغر، محمد اکرام، عباس علی، سرور جاوید، آصف خان، عبدالخالق، انیس الحسن، ظفر قاسم، نواب احسن، فاضل اختر، شیخ محمد، یاسمین محمد، فرحت مصطفیٰ، ناصر علی، زرینہ ایوب، چوہدری فضل اللہ، برکات اللہ، ذیشان علی، احمد صدیقی، ناظم حسین سید، راحیل عثمان، نیاز ملکانی، کائنات علی، تابش بلوچ، فرحت بٹ، جاوید عثمانی، ابرار رضوی۔ پشاور سے مظہر حسین غلام عباس طوری بنگش، فتح باری، نوازش علی سید، اکرام مصطفیٰ، باسط علی، شاہ زرولی، رضوان شاہ، قدرت خان، ملک نوروز علی، زاہد زرعلی، بخت آور خان، خرم پاشا، عنایت علی، محمد عرفان، وزیر محمد خان، عباس حسن زئی، گلفشاہ گل سید بخاری، نعمان شاہ۔ خانیوال سے محمد کاشف، حشمت علی بٹ۔ سرگودھا سے رفعت بانو (منشورہ فیکٹری)، سید امتیاز حسین بخاری، محمد امیر ماجد۔ ملتان سے رمیض احمد، گلفشان افسر، محمد معین چشتی، عنبرین چشتی، اشرف عبداللہ، اقبال انصاری، لبنیٰ ارشاد، نوید اصغر بخاری، محمد معین خضر حیات بھٹی، خواجہ محمد حسین، بابر سعید، محمد آصف، اشفاق حسن، اویس سلمان، حسین ارشاد، معین خان، اقبال حسن خان، سلطان فتح علی، ناصر گواچہ، توقیر عباس، فتح محمد حسن، رشید علی سید، آفاق حسن، راشد علی خان، امام بخش، انعام حسن، فصاحت انس، پیر ناصر شاہ بخاری، امداد شاہ، حنیف محمد، اسماعیل آفاق، غلام علی شاہ بخاری، برکات اللہ بخش، ارشاد کاظمی، نہال کاظمی، شیخ نہال احمد، سید فرحت عباس، مظہر حسین سید، فرقان اللہ۔ منڈی بہاؤالدین سے سیف اللہ، پیر محمد۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ۔ مظفر آباد آزاد کشمیر سے رفعت عباس، اسماعیل حیات، زرین مجید، زاہد شاہ، ملک زین، حکیم حسن خان، ابرار حسن، ضیاء الحسن، فرحت عباس، جاوید بٹ، کاظم حسن شاہ۔ اسلام آباد سے محمد ریاض راحیل، نیلوفر شاہین، عباس ممکری، نازش ممتاز، ایاز خان، افشاں زیاد، انور یوسف زئی، افشاں زیادہ، شیخ فتح یاب، صدیق بھٹی، ساغر علی، عبداللہ، عبدالاحد، خرم لودھی، فہد ملک، فیض بخش، شگفتہ مشتاق، یوسف حمد گل، عباس نیازی، ارشد خانم بتول کاظمی، جہانزیب خان، قیام حسین، ملائکہ احسن، وسعت اللہ، توصیف ہمدانی، مغیر خان۔ راولپنڈی سے محمد آصف محمود (گوجر خان)، ڈاکٹر سعادت علی خان (قاسم مارکیٹ)، عنایت اللہ، ککھر خان زادہ، وسیم الدین ہما انیم زرین زرولی، کاظم حسین، معین خان، بے بی فرحت اعجاز، قیام الدین، زرفشاں، ثمر متین، علی اسد، طیب حسن، غلام علی، آصف علی، نیلم خان، عباس مشہدی، عنایت بھٹو، زویا اعجاز۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے زہرا نوشین، شوکت علی ٹیچر (عارف والا)۔ فیصل آباد سے حامد امین صوفی ایڈووکیٹ۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے نوید احمد علیزئی، اعجاز احمد علیزئی۔ اٹک سے سید محمد حسین شاہ، سید تجمل حسین شاہ (جنڈ)، حیا علی، فلک خان اچکزئی، نعمان ملک۔ سیالکوٹ سے ممتاز علی، واحد حسن، ڈاکٹر حسین مصطفیٰ، کوکب سلمان، نعمت خان، اسد اللہ، اقبال کاظمی، کاوش بخاری، فریحہ سلطان، اختر عباس، امداد اللہ، حسین مرزا، اللہ بخش سولنگی، فیروز حسن۔ حیدرآباد سے مریم... کاشف، ناصر رند، وسیم چانڈیو، امامہ تجمل، شہاب علی، رفیق احسن، عبدالغفار، سید کاظم علی، نعمان فاروقی، بشیر اللہ اسدی، ساجد فاروق، فرحت علمان، نصیر بوترابی، بے بی پروین، زین انصاری، اختر ہاشمی، عنبرین فاطمہ، دانش فتح محمد، کاظم علی کاظمی۔ سانگھڑ سے عاشق حسین مغل (جام نواز علی)، رضوانہ اسحاق، ملک یاسر، عفت انصاری، ملک یاسر، عائشہ اعوان، منیر الدین، بدر اسحاق، عباس علی، عثمان پیرزادہ، بھیرو مل جسکانی، یحییٰ علی سید۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ (کچھی درہ)۔ ڈیرہ غازی خان سے محمد احسن جاوید، رفیق احمد ناز، ماریہ حسن، غلام علی، لبنیٰ فرید، اصغر نوید، معین احسن، ابرار حسن، برکات اللہ۔ میلسی سے محمد جہانگیر شاہ، شگفتہ پروین، مشتاق احمد، منیر فراست۔ بنگرام سے کاشف، عبید کاوش (بٹہ موڑی)، زین الاسلام۔ جہلم سے ملک شاہین۔ لودھراں سے محمد یار شاہد، حافظ احمد یار، مولوی بشیر قاسمی، حافظ الدین۔ شیخوپورہ سے سلمیٰ مہر، ثاقب علی، فہیم الدین قاسمی، کاظم شاہ، اسد بٹ، منیر چوہان۔ اوکاڑہ سے صاحب جان، اسماعیل شاہ، نذر محمد، عباس جنجانی، شبیر علی ڈرائیور، صالح الدین۔ لیہ سے امروز اسلم مغل، یمیں ناظر، اسلم شیخ، ظریف ابن علی، عبدالقادر، نعمانہ شیخ، رابعہ متین، زبیر اسلم پراچہ۔ کمالیہ سے زاہد طارق۔ خوشاب سے شمس الاسلام، حافظ فیروز محمد محسن۔ ہری پور ہزارہ سے طوبیٰ شاہ، نعمت اللہ، تہذیب حسین، مہ جبیں، الماس فاطمہ، نازش سلطان، اشرف الدین، شریف خان، رفیق ناز۔ بہاولنگر سے غلام یاسین، زرین اشفاق، ساجد شاہ۔ عثمان والا سے امتیاز محمد۔ بھکر سے محمد عارف قریشی۔ میرپور خاص سے معیز علی خان۔

بیرون ملک سے نجمی رحمن، برٹ لیٹ، امریکا۔ امداد اللہ خان پاکستانی (جدہ۔ سعودیہ)، ارشد علی ارشد (سعودہ عربیہ) انجینئر جنید مصطفیٰ (مانچسٹر یوکے)، ملک محمد ظفر عباسی (مانچسٹر یوکے) ظہیر الدین عباسی (اوسلو، ناروے)۔

انجام

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
وطن سے دور رہنے والوں کے دل وطن میں ہی رہ جاتے ہیں۔ اب ہمارا رابطہ وطن سے صرف اور صرف رسائل کی معرفت ہے یا نجی ٹی وی چینل کے ذریعہ ہے۔ سرگزشت آتے ہی ہمارے گروسری اسٹور سے مجھے فون آجاتا ہے۔ شکوہ ہے تو بس اتنا کہ تقریباً پندرہ بیس دن بعد ہمیں ملتا ہے جس کی وجہ سے ہم دیگر شعبہ کے لیے کچھ بھیج نہیں سکتے۔ پہلی بار ایک کہانی ارسال کی ہے۔ خود ہماری ہے۔ اس کے کئی کردار اب بھی پاکستان میں موجود ہیں۔

ثمینہ اصغر
مانچسٹر (یو کے)

ملک دین محمد سے ہماری دور پرے کی رشتے داری تھی۔ وہ ہمارے ہی گاؤں کا رہنے والا تھا اور وہیں اس کی تھوڑی بہت زمین بھی تھی جو ہمارے وسیع و عریض کھیتوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ میرے بابا علاقے کے بہت بڑے زمین دار تھے لیکن انہوں نے پڑوسی ہونے کے ناتے ملک دین محمد کے باپ اور اس کے گھر والوں کو ہمیشہ عزت دی۔ ہماری حویلی بہت بڑی تھی جہاں ہر وقت ایک میلہ سا لگ رہتا۔ ہمارا اپنا کنبہ بھی بہت بڑا تھا۔ باپ، ماں جی، میری دو بہنیں اور چار بھائی۔ دادی اور ایک چچا بھی ہمارے ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ چچا کی شادی ہو چکی تھی اور وہ زمین داری میں بابا کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ان کے تین بچے تھے جو گاؤں کے اسکول میں ہی پڑھ رہے تھے جب کہ چھوٹے چچا کو زمینداری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ شہر میں کوئی کاروبار کیا کرتے تھے۔ وہ سال میں ایک مرتبہ بیوی بچوں کے ساتھ گاؤں آتے تو ہماری حویلی کی رونق مزید بڑھ جاتی۔ سارے کزن مل کر خوب ادھم بازی کرتے۔ سارا دن کھیل کود اور شرارتوں میں گزر جاتا۔ رات کو کھانے کے بعد سب لوگ بڑے کمرے میں بیٹھ جاتے اور دیر تک گپ شپ چلتی رہتی لیکن بچوں کو دس بجے کے بعد جاگنے کی اجازت نہ تھی۔

میں اپنے بہن بھائیوں بلکہ کزنز میں بھی سب سے بڑی تھی۔ اس لیے ان سے زیادہ بے تکلف نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ چھوٹے چچا کا بیٹا اصغر مجھ سے صرف چھ مہینے چھوٹا تھا لیکن دیکھنے میں مجھ سے کافی بڑا لگتا۔ وہ بہت ذہین اور پڑھنے میں تیز تھا اور اس کی خواہش تھی کہ پڑھ لکھ کر بہت بڑا آدمی بنے اور اس مقصد کی خاطر وہ بیرون ملک جانے کے لیے بھی تیار تھا۔ وہ جب بھی گاؤں آتا تو ہم سب بہن بھائیوں اور کزنز کو پڑھائی پر توجہ دینے کی تلقین کیا کرتا۔ وہ یہی کہا کرتا کہ ہمارے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں لیکن تعلیم کے معاملے میں ہم بہت پیچھے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے خاندان بلکہ گاؤں کا ہر فرد اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلائے۔ وہ جب گاؤں کے بچوں کو کھیتوں میں محنت مزدوری یا گلیوں میں آوارہ گردی کرتے دیکھتا تو اسے بہت دکھ ہوتا اور وہ بابا سے کہا کرتا۔ ”تایا جی! ساری دنیا میں چائلڈ لیبر پر پابندی ہے لیکن ہمارے یہاں دس بارہ سال کے بچے بھی کھیتوں اور اینٹوں کے بھٹہ پر مزدوری کرتے ہیں۔ آپ ان کے والدین سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجیں۔“

مجھے شروع سے ہی پڑھنے کا شوق تھا لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ گاؤں میں لڑکیوں کا اسکول مڈل تک تھا۔ اس کے بعد

میری پڑھائی ختم ہوجاتی۔ بابا نے بڑی کوشش کی کہ اسے ہائی اسکول کا درجہ دلوا دیں لیکن سرکاری دفتروں میں ٹال مٹول کی پالیسی کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ بہرحال میں نے ضد کر کے انہیں اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ مجھے قصبہ کے گرلز ہائی اسکول میں داخلہ لینے کی اجازت دے دیں جو ہمارے گاؤں سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ بابا نے مجھے اسکول جانے اور واپس لانے کے لیے ایک ڈرائیور اور خادمہ کی ڈیوٹی لگادی۔ ڈرائیور تو مجھے اسکول چھوڑ کر واپس آجاتا لیکن خادمہ چھٹی ہونے تک وہیں اسکول کی کینٹین میں بیٹھی اونگھتی رہتی اور میرے ساتھ ہی واپس آتی۔

دین محمد کی ماں ہر دوسرے تیسرے روز میرے گھر آتی اور دیر تک ماں جی کے پاس بیٹھ کر باتیں کیا کرتی۔ چچی کو تو اپنے کاموں سے ہی فرصت نہیں تھی۔ اس لیے وہ اسے منہ نہیں لگاتی تھیں۔ البتہ ماں جی اپنی سادگی اور مروت میں اس سے باتیں کرلیتی تھیں۔ ویسے بھی ماں جی کے پاس گاؤں کی بہت سی عورتیں اپنے کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں آیا کرتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے دین محمد کی ماں کی آمد کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ البتہ وہ گاؤں کی دوسری عورتوں سے قدرے مختلف تھی۔ اس نے کبھی ماں جی کے سامنے اپنی کسی ضرورت کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی ان سے کسی کام کے سلسلے میں مدد مانگی بلکہ کبھی کبھی تو یوں لگتا کہ وہ اپنے آپ کو ہمارے ہم پلہ سمجھتی ہے جب کہ اس کی اور ہماری معیشت میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن ماں جی نے کبھی اس بات کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ کھلے دل اور کھلے ہاتھ کی عورت تھیں اور جو کوئی ان کے سامنے دست سوال دراز کرتا۔ اس کی دل کھول کر مدد کیا کرتیں۔

جب سے میں نے گرلز ہائی اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ ہمارے گھر میں اس کی آمد و رفت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اس نے حسب عادت میرے اسکول جانے پر تنقید کی اور ماں جی سے کہا۔ ''کیا ضرورت ہے لڑکیوں کو اتنا پڑھانے کی۔ آخر کو انہوں نے گھر داری ہی کرنا ہوتی ہے۔''

ماں جی تو حسب عادت خاموش رہیں لیکن چچی سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ تڑخ کر بولیں۔ ''گھر داری میں بھی تعلیم ہی کام آتی ہے اور جب بچی کو پڑھنے کا شوق ہے تو ہم اسے کیسے روک سکتے ہیں۔''

''یہ تمہاری ہی ہمت ہے کہ لڑکی کو قصبے کے اسکول میں داخل کرادیا۔ میں تو اپنے وینو کو بھی اتنی دور نہ بھیجتی۔''

''گاؤں کا اسکول تو دسویں تک ہے۔'' چچی نے کہا۔

''اس کے بعد کیا کرو گی۔ پھر تو تمہیں اسے مزید پڑھائی کے لیے شہر بھیجنا ہی ہوگا۔''

''آگے پڑھ کر کیا کرے گا۔ ہم نے کون سا اس سے

نوکری کروائی ہے۔ میں نے تو اس کے باپ سے کہہ دیا ہے کہ اپنی زمینیں بڑھانے کی فکر کرو۔ اس چھوٹے سے ٹکڑے میں تو اس کا گزارہ نہیں ہوگا۔"

مجھے اس کی لن ترانی سن کر ہنسی آگئی۔ وہ بے وقوف عورت شاید نہیں جانتی تھی یا جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی کہ اس کے شوہر نے یہاں سے اچھی خاصی رقم لے رکھی تھی جس کی ادائیگی وہ کوشش کے باوجود نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ مزید زمین کہاں سے خریدتا۔ دراصل اس کے اخراجات آمدنی سے زیادہ تھے۔ اسی لیے اسے قرض لینا پڑتا۔ حالانکہ اس کے چار بیٹے تھے لیکن کسی کو بھی زمین داری سے دلچسپی نہیں تھی۔ مجبوراً ملک فیروز کو اپنی زمین ٹھیکے پر دینا پڑ گئی اس کی آمدنی پہلے کے مقابلے میں کم ہوگئی اور وہ تنگ دست رہنے لگا۔

اس عورت کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں لیکن وہ صرف دین محمد کا ہی تذکرہ کرتی جس میں مبالغہ آرائی کی حد تک اس کی تعریف ہوتی۔ میرا دینو ایسا ہے میرا دینو ویسا ہے۔ اللہ رکھے پڑھائی میں بہت تیز ہے۔ گھر کے سارے کام اس نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ اب تو اس نے گاڑی چلانا بھی سیکھ لی ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے اس کی باتیں سن کر ہنسی بھی آتی اور غصہ بھی۔ کیونکہ گاؤں میں کوئی بات کسی سے چھپی نہیں رہتی۔ سب جانتے تھے کہ وہ کس قماش کا لڑکا ہے۔ اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ بہانے بہانے اسکول سے چھٹی کیا کرتا تھا۔ اگر اس کے باپ کو معلوم ہو جاتا تو وہ زبردستی اسے اسکول چھوڑ کر آتا ورنہ وہ سارا دن اپنے دوستوں کے ساتھ گھوم پھر کر گزار دیتا۔

اس نے رو پیٹ کر میٹرک تو کرلیا لیکن آگے پڑھنے سے صاف انکار کر دیا حالانکہ اس کے باپ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ شہر جا کر کسی کالج میں داخلہ لے لے لیکن وہ اس پر تیار نہیں ہوا۔ پھر باپ نے اسے اپنے ساتھ زمینوں پر لگانا چاہا لیکن اسے یہ کام بھی پسند نہیں تھا۔ تھک ہار کر ملک فیروز نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اپنے دوسرے لڑکوں پر توجہ دینے لگا۔

ایک دن اس کی ماں ہمارے گھر آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ دینو ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا ہے کیونکہ اس کے باپ نے دو روز قبل اسے کام نہ کرنے پر خوب ڈانٹا تھا جس پر اس نے بھی باپ کو دو چار باتیں سنا دیں۔ ملک فیروز سے یہ برداشت نہ ہو سکا اور اس نے غصے میں آکر کہہ دیا کہ اگر وہ کوئی کام نہیں کر سکتا تو اپنے لیے کوئی دوسرا ٹھکانا ڈھونڈ لے۔ یہ بات اس کے دل کو لگ گئی اور وہ کل شام سے غائب ہے۔ وہ رات بھر اس کا انتظار کرتی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔ اس کے باپ سے کہا کہ وہ اسے تلاش کرے تو اس نے کڑوا سا منہ بنا کر کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ دو چار دن دھکے کھانے دو۔ خود ہی تھک ہار کر واپس آجائے گا۔

دین محمد خود تو نہیں آیا لیکن اگلے روز اس کا ماموں شہر سے یہ اطلاع لے کر ضرور آگیا کہ دین محمد خیریت سے ہے اور گاؤں سے نکل کر سیدھا اس کے پاس پہنچا ہے۔ اب وہ وہیں رہے گا اور اس نے کہلوایا ہے کہ جب تک وہ کچھ بن نہیں جاتا اس وقت تک ماں باپ کو اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔ یہ سن کر اس کا باپ غصے سے بھڑک اٹھا اور چلاتے ہوئے بولا۔ "میں خود بھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ میری بلا سے وہ کہیں بھی رہے۔ اب اسے گاؤں آنے کی ضرورت نہیں۔"

دینو کا ماموں اس کا غصہ دیکھ کر ڈر گیا۔ وہ تو کچھ اور سوچ کر آیا تھا لیکن یہاں کا رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ پھر بھی اس نے ہمت کر کے کہا۔ "جوان اولاد پر سختی کرنا ٹھیک نہیں۔ فی الحال وہ جو کہہ رہا ہے اسے مان لو۔ اس کے دماغ میں مڈل ایسٹ جانے کی دھن سما گئی ہے۔ اس طرح تو جانا ٹھیک نہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ اسے سال چھ مہینے کا کوئی کورس کروا دوں۔ ہاتھ میں کوئی ہنر ہوگا تو اچھی نوکری مل جائے گی۔"

ملک فیروز کچھ نہ بولا لیکن اسے لگا کہ یہ کام ایک منصوبہ بندی کے تحت کیا گیا ہے اور اس سازش میں دین محمد کے علاوہ اس کی ماں اور ماموں بھی شریک ہیں۔ اس کا شبہ کسی حد تک درست تھا۔ دراصل دین محمد کو لاہور بلانے میں ماموں کی اپنی غرض پوشیدہ تھی۔ اس کی چار بیٹیاں تھیں لیکن بیٹا کوئی نہیں تھا۔ وہ کریانہ کی دکان کرتا تھا اور اسے شدت سے ایک ایسے بندے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو اس کے ساتھ دکان پر بیٹھ سکے۔ اب تک وہ کسی نہ کسی طرح سیلز مینوں کے ذریعے کام چلا رہا تھا لیکن اس میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ وہ اچھی خاصی تنخواہ مانگتے تھے۔ اس کے علاوہ چوریاں الگ کرتے تھے۔ ماموں کو دین محمد اور اس کے باپ کے درمیان ہونے والی کشمکش کا علم ہو گیا تھا۔

اس نے سوچا کہ بھانجے کو کوئی لالچ دے کر اپنے پاس بلا لیا جائے۔ اس طرح اسے ایک مفت کا ملازم مل جائے گا اور اگر قسمت نے یاوری کی تو وہ اپنی ایک بیٹی بھی اس کے پلے باندھ دے گا۔

وقتی طور پر اس کا منصوبہ کامیاب رہا۔ دینو خود بھی گاؤں کے ماحول سے تنگ آ چکا تھا۔ پڑھائی لکھائی اس کے بس کی بات نہیں تھی اور گاؤں میں رہ کر کنویں کا مینڈک بننا اسے پسند نہیں تھا۔ نہ جانے کب اور کیسے اس کے دل میں مڈل ایسٹ جانے کا خیال آ گیا اور وہ اٹھتے بیٹھتے اسی بارے میں سوچنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں میں رہ کر وہ اس ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ سب سے زیادہ مخالفت تو باپ کی طرف سے ہی ہوتی۔ اس کے پاس وسائل تھے اور نہ ہی کوئی ہنر جس کے برتے پر وہ باہر جانے کی کوشش کرتا۔ چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ماموں کے پاس شہر چلا جائے اور وہاں رہ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

ماموں اور ممانی نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ چاروں لڑکیاں بھی اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتی تھیں اور دوڑ دوڑ کر اس کے سارے کام کیا کرتیں۔ وہ اس ماحول سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس پر پیار و محبت کی بارش ہو رہی تھی۔ یہاں نہ باپ کی ڈانٹ ڈپٹ تھی اور نہ ہی ماں کا روتا بسورتا چہرہ، وہ بہن بھائیوں کی طنز آمیز نظروں اور معنی خیز مسکراہٹوں سے بھی محفوظ تھا لیکن اس کی سیمابی طبیعت بہت جلد اس ماحول سے اکتا گئی۔ ویسے بھی وہ خود دار بندہ تھا اور اسے ماموں کے یہاں مفت کی روٹیاں توڑنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ چنانچہ ایک ہفتے بعد ہی اس نے ماموں سے کہہ دیا کہ وہ گھر میں پڑے پڑے بور ہو رہا ہے اور اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔

اس وقت وہ سب لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ماموں نے اس کی بات سن کر ہاتھ روک لیا اور بولا۔ ''اگر کام کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کیا کرو گے۔ تم صرف میٹرک پاس ہو۔ تمہیں تو شاید چپڑاسی کی نوکری بھی نہ ملے۔ محنت مزدوری تم کر نہیں سکتے ورنہ گاؤں میں رہ کر ہی اپنی زمینوں پر کام کرتے۔ اس کے علاوہ اگر تمہارے ذہن میں کوئی اور بات ہے تو بتاؤ۔''

''آپ تو جانتے ہیں۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔''

''باہر جا کر کیا کرو گے۔ تمہارے پاس کوئی ہنر تو ہے نہیں جو کوئی ڈھنگ کی نوکری کر سکو۔ وہاں بھی مزدوری کرنا پڑے گی اور میں نہیں سمجھتا کہ تم اتنی شدید گرمی اور چلچلاتی دھوپ میں یہ مشقت برداشت کر سکو گے۔''

''پھر آپ ہی بتائیں کہ میں کیا کروں؟'' دین محمد نے بے بسی سے کہا۔

''میرے پاس ایک حل ہے۔ بشرطیکہ تم اس پر عمل کرو۔ مڈل ایسٹ جانے کے لیے ضروری ہے کہ تم پہلے کوئی ٹیکنیکل کورس کر لو۔ لاہور میں ایسے کئی ادارے ہیں جہاں صبح شام کے کورسز ہوتے ہیں لیکن ان کی فیس بہت تگڑی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم شام کی کلاس میں داخلہ لو اور صبح میں میرے ساتھ دکان پر بیٹھو۔ تمہیں جو تنخواہ ملے گی اس سے کورس کی فیس اور تمہارا جیب خرچ نکل آئے گا۔''

دین محمد کو یہ تجویز معقول لگی لیکن یہاں بھی اس نے خودداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تنخواہ نہیں لوں گا۔ بس آپ میری فیس دے دیا کریں۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ ماموں کے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنی بات رکھنے کے لیے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہارے اکاؤنٹ میں ہر مہینے کچھ پیسے ڈالتا رہوں گا تاکہ ایجنٹ کو دینے کے لیے کام آ جائیں۔''

دوسرے دن سے دین محمد نے دکان پر جانا شروع کر دیا۔ وہ صبح آٹھ بجے ماموں کے ساتھ دکان پر چلا جاتا اور رات آٹھ بجے تک وہیں رہتا۔ دوپہر میں ایک گھنٹے کا وقفہ ہوتا تو وہ کھانا کھانے کے لیے گھر آ جاتا۔ جہاں ماموں کی بڑی بیٹی رضیہ اس کا انتظار کر رہی ہوتی۔ دین محمد کے آتے ہی وہ اس کے لیے گرم گرم روٹیاں ڈالتی اور اس کے آگے کھانا رکھ دیتی۔ کھانے کے بعد وہ اس کے لیے چائے بناتی اور یوں دین محمد کا لنچ بریک اختتام کو پہنچتا۔ رضیہ نے بھی میٹرک کرنے کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور اب وہ بقول ممانی گھرداری سیکھ رہی تھی۔ انہوں نے رضیہ کو دین محمد کا خیال رکھنے کی خاص طور پر ہدایت کی تھی شاید اس طرح وہ ان دونوں کو قریب لانا چاہ رہی تھی۔

چند روز بعد ماموں نے اسے اپنے کسی جاننے والے کے توسط سے ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخل کروا دیا۔ اس نے موٹر مکینک کے کورس کا انتخاب کیا کیونکہ کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ خلیج کے ملکوں میں اس شعبہ کے لوگوں کی بڑی مانگ ہے۔ چھ مہینے کا کورس ختم ہوا تو اس نے آٹو الیکٹریشن کے کورس میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح ایک سال

کے عرصہ میں اس کے پاس دو سرٹیفکیٹ آگئے۔ پھر ماموں نے اسے کام سیکھنے کے لیے اپنے ایک دوست کے گیراج پر بھیجنا شروع کر دیا۔ جہاں وہ دوپہر دو بجے سے رات نو بجے تک کام کرتا۔ وہ ورکشاپ بہت بڑا تھا اور وہاں ہر قسم کی گاڑیاں مرمت کے لیے آتی تھیں۔ چند مہینوں میں ہی وہ اپنے کام میں ماہر ہو گیا تو ماموں نے اس سے کہا کہ وہ بیرونِ ملک ملازمت کے لیے کسی ایجنٹ سے رجوع کرے۔

وہ سستا زمانہ تھا۔ اس کے باوجود ایجنٹ نے تین لاکھ مانگے۔ یہ سن کر اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ ماموں نے اس کے اکاؤنٹ میں جو رقم جمع کی تھی۔ وہ ڈیڑھ لاکھ سے بھی کم تھی۔ ماموں کی اتنی استطاعت نہ تھی کہ وہ بقیہ رقم کا بندوبست کر سکتا۔ باپ کے آگے ہاتھ پھیلانا اس نے گوارہ نہ کیا۔ وہاں سے بھی اسے کچھ ملنے کی توقع نہیں تھی۔ ویسے بھی وہ اپنی بات پر قائم تھا کہ جب تک کچھ بن نہیں جاتا۔ وہ گھر والوں کو اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے ماموں سے ڈرتے ڈرتے کہا کہ اگر وہ اسے دکان سے فارغ کر دے تو وہ گیراج پر کل وقتی ملازمت کر لے گا۔ جہاں سے اسے ایک معقول تنخواہ مل سکتی ہے۔ اس طرح وہ چند مہینوں میں ایجنٹ کا مطالبہ پورا کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ ماموں کو بادل ناخواستہ اس کی بات ماننا پڑی اور اس کے ایک سال بعد دین محمد دبئی چلا گیا۔

مجھے یہ خبریں اس کی ماں سے مل رہی تھیں جو باقاعدگی سے ہمیں اس کی پروگریس سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔ دبئی جانے سے پہلے وہ ماموں کے سمجھانے بجھانے پر ایک دن کے لیے گاؤں آیا تھا۔ اس کے باپ کو تو اب یقین نہیں تھا کہ وہ دبئی میں کوئی ڈھنگ کا کام کر سکتا ہے بلکہ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں کسی الٹی سیدھی حرکت کے نتیجے میں اسے واپس نہ بھیج دیا جائے۔ اس لیے وہ اپنی عقل کے مطابق اسے سمجھاتا تھا کہ فلاں فلاں کام سے دور رہے۔ البتہ اس کی ماں ہواؤں میں اڑ رہی تھی اگر اس کے مالی حالات اچھے ہوتے تو وہ پورے گاؤں میں لڈو بانٹتی۔ اس کے باوجود وہ ہمارے گھر مٹھائی کا ڈبہ لے کر آئی اور ماں جی سے بولی۔ ”دعا کریں میرا دینو بہت سا پیسا لے کر آئے تا کہ میں بھی اپنے دل کے ارمان پورے کر سکوں۔“ یہ کہہ کر اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور میں شپٹا کر رہ گئی۔ نہ جانے اس بات سے اس کا کیا مطلب تھا۔

میں نے دسویں پاس کی اور خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ کیونکہ کالج میں داخلہ لینے کے لیے مجھے لاہور جانا پڑتا جس کی اجازت کبھی نہیں ملتی۔ حالانکہ وہاں میرے سگے چچا کا گھر تھا جہاں میں آرام سے رہ سکتی تھی لیکن اس کے باوجود میرا لاہور جانا ممکن نہیں تھا۔ یہ ایک انہونی بات ہوتی۔ آج تک گاؤں میں ایسا نہیں ہوا تھا کہ کوئی لڑکی پڑھنے کے لیے شہر گئی ہو۔ وہاں لڑکوں کی تعلیم پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی تو لڑکیوں کو کون گھاس ڈالتا۔ اس لیے میں نے کسی سے اس بات کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

میرا رزلٹ آئے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ لاہور والے چچا چھٹیوں میں مع اہل و عیال ہمارے گھر آئے۔ ان کے آنے سے ایک بار پھر حویلی میں رونق ہو گئی۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد سب لوگ حسبِ معمول گپ شپ کر رہے تھے کہ اصغر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”کزن، اب کیا ارادہ ہے؟“

”کیسا ارادہ؟“ میں انجان بنتے ہوئے بولی۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ وہ کیا پوچھ رہا ہے۔

”ارے بھئی! میں فرسٹ ایئر کے مضامین کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ سائنس لو گی یا کامرس۔ میرا خیال ہے کہ پہلے تمہیں پری میڈیکل میں کوشش کرنا چاہیے۔ اگر اچھے نمبر آگئے تو ٹھیک ورنہ سیکنڈ ایئر کے بعد کامرس لے لینا۔“

مجھے بہت زور کی ہنسی آگئی اور میں نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو تب ہوگا نا کہ جب کالج میں ایڈمیشن لوں گی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم کالج میں داخلہ نہیں لے رہی ہو؟“

”نہیں تم جانتے ہو کہ ہمارے گاؤں یا کسی نزدیکی قصبہ میں کالج نہیں ہے۔ اس کے لیے مجھے لاہور جانا ہوگا۔“

”سو واٹ؟ اس میں کیا مسئلہ ہے؟ وہاں تمہارا اپنا گھر ہے جب کہ دوسرے شہروں اور دیہاتوں سے آنے والی لڑکیاں ہوسٹلوں میں رہ کر بھی پڑھتی ہیں۔“

”تم پہلے فرد ہو جس نے یہ موضوع چھیڑا ہے۔ یہاں کسی کو اس سے دلچسپی نہیں اور نہ ہی پوچھا گیا کہ مجھے مستقبل میں کیا کرنا ہے۔“

”بڑی پرانی کہاوت ہے کہ ماں بھی بچے کو دودھ نہیں دیتی جب تک وہ روتا نہیں۔ تمہیں خود یہ بات اپنے منہ سے

کہنا چاہیے تھی۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ انکار ہو جاتا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟ بات کر کے تو دیکھو۔ ہو سکتا ہے کہ تایا جی مان جائیں۔"

"میں جانتی ہوں کہ وہ کبھی نہیں مانیں گے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ گاؤں کی کوئی لڑکی پڑھنے کے لیے شہر گئی ہو۔ پھر وہ مجھے کیسے بھیج دیں گے۔ وہ لاکھ روشن خیال سہی لیکن روایات سے انحراف نہیں کر سکتے۔"

"اگر تم کہو تو میں تایا جی سے بات کروں۔"

"نہیں۔" مجھے ڈر تھا کہ کہیں اسے میری وجہ سے ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ "تم چاچا جی سے کہو کہ وہ بابا سے بات کریں۔"

اصغر نے نہ جانے چچا سے کیا کہا اور انہوں نے میرا مقدمہ کس انداز میں بابا کے سامنے پیش کیا کہ وہ مجھے لاہور بھیجنے پر رضا مند ہو گئے۔ حالانکہ انہوں نے دبی زبان سے یہ عذر پیش کیا کہ وہ میری شادی کرنا چاہ رہے ہیں لیکن چچا بھی دھن کے پکے تھے۔ انہوں نے وکیلوں کی طرح جرح شروع کر دی۔

"کوئی رشتہ ہے آپ کی نظر میں؟"

"نہیں، ابھی تو صرف میں نے یہ بات سوچی ہے۔"

"تو پھر شادی کے انتظار میں لڑکی کا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ اسے پڑھنے دیں اگر اس دوران کوئی رشتہ آ گیا تو دیکھا جائے گا۔"

اصغر میرا دوست ہی نہیں بلکہ محسن بھی تھا۔ اسی کی وجہ سے مجھے لاہور آنے اور کالج میں داخلہ لینے کی اجازت ملی۔ چچا کے گھر میں مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی۔ چچی بہت مشفق اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے میرے لیے اوپر کی منزل پر ایک کمرا مخصوص کر دیا تھا تاکہ میں سکون سے اپنی پڑھائی کر سکوں۔ اس کمرے میں ضرورت کی ہر چیز یہاں تک کہ ایک چھوٹا فریج بھی رکھ دیا گیا تھا تاکہ مجھے پانی پینے کے لیے بھی نیچے نہ آنا پڑے۔ میرے میٹرک میں اچھے نمبر آئے تھے۔ اس لیے اپنی پسند کے کالج میں داخلہ لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ چچا نے میرے لیے ایک وین لگوا دی تھی جس کی وجہ سے مجھے آنے جانے میں آسانی ہو گئی۔ غرض یہ کہ پڑھائی کے لیے انتہائی سازگار ماحول تھا۔

پہلے میرے ذہن میں مستقبل کا کوئی واضح لائحہ عمل نہیں تھا لیکن جب کلاس میں ایک سے ایک ذہین اور پڑھا کو لڑکی سے واسطہ پڑا تو میرے اندر بھی مقابلے کا جذبہ بیدار ہو گیا اور میں پوری تندہی سے پڑھائی میں مصروف ہو گئی۔ مجھے پری میڈیکل میں اتنے نمبر لانے تھے کہ میرا داخلہ آسانی سے میڈیکل کالج میں ہو جائے۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ کیا ڈاکٹر بن سکوں گی۔ کیا مجھے اتنی مہلت مل جائے گی۔ ڈاکٹر بننے کے لیے انٹر سائنس سمیت سات سال کا عرصہ درکار تھا۔ جب کہ بابا میری شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا۔

دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ میں نے انٹر سائنس میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے جن کی بدولت میرا میڈیکل میں باآسانی داخلہ ہو سکتا تھا لیکن جب چھٹیوں میں گھر آئی تو معلوم ہوا ہے کہ بابا میرے لیے شدت سے رشتہ تلاش کر رہے ہیں لیکن انہیں ابھی تک اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں خاندان میں سب سے بڑی تھی اور سب لڑکے عمر میں مجھ سے چھوٹے تھے اور اگر دور پرے کے رشتے داروں میں کوئی لڑکا تھا بھی تو اس کا خاندان ہمارے ہم پلہ نہیں تھا۔ گویا میری خوب صورتی، تعلیم اور دولت ہی میرے راستے کی رکاوٹ بن گئی لیکن مجھے ان باتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ میڈیکل میں داخلہ لینے کے لیے بابا کو کس طرح راضی کیا جائے۔

لاہور میں رہنے اور کالج میں دو سال گزارنے کے بعد مجھ میں اتنا اعتماد آ گیا تھا کہ میں چچا یا اصغر کی مدد لیے بغیر بھی بابا سے بات کر سکتی تھی چنانچہ جیسے ہی میڈیکل کالجوں میں داخلے کا اشتہار آیا۔ میں نے اپنے دل کی بات ان سے کہہ دی۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ "لیکن پتر اس میں تو پانچ سال لگ جائیں گے۔"

"جی۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اگلا جملہ کیا کہیں گے۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔" انہوں نے قطعی لہجے میں کہا۔ "ہم تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ پانچ سال تو بہت بڑا عرصہ ہے۔ اس کام کو اتنی دیر تک نہیں ٹالا جا سکتا۔"

"میں واپس آ جاؤں گی۔" میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو......"

"پھر ادھورا کام کرنے سے کیا فائدہ۔ آرام سے گھر میں بیٹھو۔ کیا پتا کس وقت تمہارے بھاگ کھل جائیں۔"

"بابا" میں نے روہانسی آواز میں کہا۔ "جو میرے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ فی الحال مجھے وہ کام کرنے دیں جو میرے اختیار میں ہے۔"

"ٹھیک ہے پتر" وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولے۔ "جیسے تمہاری مرضی لیکن ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ جیسے ہی شادی کی تاریخ طے ہوئی تم سب کچھ چھوڑ کر واپس آجاؤ گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں بابا ایسا ہی ہوگا۔"

انہی دنوں معلوم ہوا کہ دین محمد دبئی سے آیا ہوا ہے۔ سنا تھا کہ وہ کافی پیسے کما کر لایا ہے۔ پورے گاؤں میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ گاؤں کا ہر نوجوان اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ دبئی چلو کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ اس کی ماں گھر گھر جا کر اس کی لائی ہوئی چیزوں کی تفصیل بیان کر رہی تھی اور باپ بھی اونچے شملے کا طرہ لگائے گاؤں کی چوپال میں بیٹھنے لگا تھا۔ اس کے پاس چار پیسے کیا آئے وہ اپنے آپ کو گاؤں کا چودھری سمجھنے لگا۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ وہ ابھی تک بابا کا مقروض تھا اور مالی حالات بہتر ہو جانے کے باوجود اس نے قرض کی رقم واپس نہیں کی تھی۔

جس روز میں لاہور واپس جا رہی تھی دین محمد اچانک ہی اپنے باپ کے ساتھ بابا سے ملنے آگیا۔ میں اس وقت کار میں سوار ہو رہی تھی اور بابا مجھے رخصت کرنے ڈیوڑھی تک آئے تھے۔ انہوں نے ملازم کو اشارہ کیا کہ وہ ان دونوں کو بیٹھک میں لے جائے اور خود میرے سر پر ہاتھ پھیر کر دعائیں دینے لگے۔ اس وقت میری نظریں ایک لمحے کے لیے دین محمد سے ملیں اور میں نے فوراً ہی چادر سے چہرہ ڈھانپ لیا لیکن وہ مجھے دیکھ چکا تھا۔ تبھی اس نے مجھ پر سے نظریں نہیں ہٹائیں اور مسلسل میری جانب دیکھتا رہا جب تک کہ میں گاڑی میں نہ بیٹھ گئی۔ میں نے اسے کئی سال بعد دیکھا تھا۔ وہ کافی بدل گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا تصور ایک دبلے پتلے اور آوارہ لڑکے کا تھا لیکن وہ دیکھنے میں خاصا بردبار اور معتبر نظر آرہا تھا گو کہ اس کی بدن بولی چیخ چیخ کر اس کے نو دولتیے ہونے کا اعلان کر رہی تھی لیکن یہ بات وہی لوگ محسوس کر سکتے تھے جو اس کے پس منظر سے واقف تھے۔ میرا میڈیکل کالج میں داخلہ ہوگیا۔ اصغر بھی میری ہی کلاس میں تھا۔ نہ جانے اس نے چھ مہینے کا فرق کیسے عبور

کرلیا۔ بہرحال اس کی وجہ سے مجھے کافی سہولت ہوگئی۔ اس سے میرے کئی رشتے ہوگئے تھے۔ وہ بیک وقت میرا کزن، دوست، ہمدرد، محسن اور کلاس فیلو تھا۔ میں اس کی احسان مند تھی اگر وہ میٹرک کے بعد میری مدد کے لیے آگے نہ بڑھتا تو شاید میں ابھی تک اپنے گھر میں بیٹھی شادی کے انتظار میں دن گن رہی ہوتی۔ میں اکثر سوچتی کہ اگر اصغر سال چھ مہینے مجھ سے بڑا ہوتا تو بابا کی یہ فکر بھی دور ہوجاتی اور وہ باآسانی میرا رشتہ اس سے طے کرسکتے تھے۔ نہ جانے ہمارے معاشرے میں یہ کیوں فرض کرلیا گیا ہے کہ شوہر کی عمر بیوی سے زیادہ ہونی چاہیے۔ اس کے پیچھے کیا فلسفہ ہے یہ میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا۔ یہاں ساٹھ سال کا بوڑھا سولہ سال کی لڑکی سے شادی کرسکتا ہے لیکن اگر عورت اپنے سے سال دو سال چھوٹے مرد سے شادی کرے تو اس پر باتیں بننے لگتی ہیں۔

ایک سال بعد جب میں چھٹیوں میں گاؤں گئی تو معلوم ہوا کہ دین محمد کی ماں اپنے بیٹے کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہے۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی جب اس کے بھائی کے گھر میں چار چار لڑکیاں موجود ہیں تو وہ ادھر اُدھر کیوں جھانکتی پھر رہی ہے بلکہ میری معلومات کے مطابق دین محمد کی ممانی نے اپنی بڑی بیٹی رضیہ کو اسی لیے اس کی خدمت پر مامور کیا تھا کہ وہ اس کے دل میں جگہ بنالے لیکن اس کی وجہ...... بھی بہت جلد میری سمجھ میں آگئی۔ دراصل دین محمد کی ماں اور اس کے بھائی کی حیثیت میں نمایاں فرق آگیا تھا۔ اس کا ماموں ایک معمولی کریانہ فروش تھا جب کہ دبئی جانے کے بعد دین محمد کی گردن میں سریا فٹ ہوگیا تھا اور ماں اس کے لیے کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھی جو بھاری بھرکم جہیز سے اس کا گھر بھردے۔ ماموں کے یہاں سے انہیں کیا ملتا۔ دین محمد اور اس کی ماں یہ بھول گئے تھے کہ اسی ماموں کے طفیل وہ دبئی میں بیٹھا پیسوں سے کھیل رہا تھا اگر وہ اسے اپنے ساتھ لاہور لے جاکر ٹیکنیکل کورس نہ کرواتا اور اسے دبئی جانے کا راستہ نہ بتاتا تو وہ شاید اب تک گاؤں کی گلیوں میں خوار ہورہا ہوتا لیکن اس کی ماں کی آنکھوں پر چربی چڑھ گئی تھی اور دولت کی چکاچوند میں اسے اپنی بھتیجیاں نظر نہیں آرہی تھیں۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ گاؤں میں وہ کون سا گھر ہے جہاں سے دین محمد کو اس کے حسبِ منشا لڑکی مل سکتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں کی اکثریت کسانوں، مزارعوں اور کمی کمہاروں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے کوئی بھی دین محمد کا ہم پلہ نہیں تھا۔ وہ بے چارے تو شادی بیاہ کے لیے فصل کٹنے کا انتظار کرتے یا قرض ادھار لے کر شادی کے اخراجات پورے کرتے۔ ان لوگوں کے لیے دین محمد کی ماں کی توقعات پوری کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اسی طرح آس پاس کے گاؤں دیہات میں بھی ایسا کوئی گھر نہیں تھا جہاں سے انہیں مطلوبہ لڑکی مل سکتی۔

ایک دن اس کی ماں ہمارے گھر آئی تو اس نے میرا پیچھا لے لیا۔ میری چھٹیاں ختم ہونے میں دو دن باقی رہ گئے تھے اور میں اپنا سامان پیک کررہی تھی۔ میں نے اخلاقاً اسے سلام کیا تو وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولی۔

”نا پتر! تو مجھے یہ بتا کہ ڈاکٹری پڑھ کر کیا کرے گی؟ تیرے باپ نے کون سا تجھ سے اسپتال میں نوکری کروانی ہے؟“

”پھر کیا کروں؟“ میں نے جل کر کہا۔

”آرام سے گھر میں بیٹھ۔ کچھ گھرداری سیکھ۔ کل کو دوسرے گھر جانا ہے۔ وہاں یہی چیزیں کام آتی ہیں۔“

”مشورہ دینے کا شکریہ۔ جب جانے کا وقت آئے گا تو گھرداری بھی سیکھ لوں گی۔“

لاہور واپس آکر میں دوبارہ اپنے معمولات میں مصروف ہوگئی۔ اصغر سے میری ہم آہنگی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ہم صبح ایک ساتھ کالج جاتے۔ دن بھر اکٹھے کلاسیں اور پریکٹیکل اٹینڈ کرتے۔ شام کو ساتھ ہی واپس گھر آتے اور رات کو اکٹھے بیٹھ کر کمبائنڈ اسٹڈی کرتے۔ وہ بہت ذہین اور پڑھنے میں تیز تھا اور مجھے اس سے بہت مدد مل رہی تھی۔ رات کو جب نیند ستانے لگتی تو وہ مجھے کافی بنا کر دیتا۔ میرے لیے چاکلیٹ بسکٹ اور کولڈ ڈرنک لے کر آتا۔ اگر بازار جانا ہوتو مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتا اور جتنی دیر میں شاپنگ کرتی۔ وہ ایک فرماں بردار دوست کی طرح میرے ساتھ رہتا۔ میں اکثر سوچا کرتی کہ اگر اصغر سے میری شادی ہو جائے تو زندگی کتنی اچھی گزر سکتی ہے لیکن یہ ناممکنات میں سے تھا۔ شاید ہی کسی نے یہ بات سوچی ہو۔ خود اصغر نے بھی کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا تھا کہ وہ مجھے کزن کے علاوہ کسی اور حیثیت سے دیکھتا ہے یا مجھے پسند کرتا ہے۔

دوسرے سال کے اختتام پر گاؤں گئی تو بابا جی مجھے پہلے سے زیادہ کمزور اور مضمحل نظر آئے۔ ماں جی نے بتایا کہ انہیں میری شادی کا غم کھا رہا ہے۔ وہ سرتوڑ کوشش کے باوجود میرے لیے رشتہ تلاش نہیں کرسکے۔ میری وجہ سے دوسری بہنوں کی بھی شادیاں نہیں ہو پا رہی ہیں۔ میں نے

ماں جی سے کہا کہ وہ میری فکر چھوڑیں اور اگر مناسب رشتے مل جائیں تو بہنوں کی شادیاں کردیں۔ بابا کا کچھ بوجھ تو ہلکا ہوگا۔ وہ شاید میری زبان سے یہی بات سننا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! یہ سب نصیب کی باتیں ہیں اگر تم پڑھنے کی ضد نہ کرتیں تو برادری میں ہی تمہارے جوڑ کا کوئی رشتہ مل جاتا۔ اب تو ہم صرف دعا ہی کرسکتے ہیں۔"

میں انہیں کیا بتاتی کہ اگر آپ لوگ ذات برادری سے باہر نکل کر سوچیں تو مجھے ایک سے ایک اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔ میڈیکل کالج میں کئی لڑکے مجھ سے دوستی کرنا اور میرے قریب آنا چاہتے تھے۔ ان میں زیادہ تر اسمارٹ، ہینڈسم اور امیر گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے ایک اشارے پر وہ دم ہلاتے میرے پیچھے چلے آتے لیکن میں نے ان سب سے ایک فاصلہ برقرار رکھا۔ ان میں ایک مل اونر کا لڑکا نوید تو بری طرح میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر مجھے کوئی اعتراض نہ ہو تو وہ اپنے والدین کو میرے گھر بھیجے لیکن میں نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ انہیں وہاں جاکر مایوسی ہوگی کیونکہ ہمارے یہاں برادری سے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں۔

اگلے ایک سال کے دوران میری دونوں بہنوں کی شادیاں ہوگئیں تو بابا کے چہرے کی رونق کچھ بحال ہوئی لیکن وہ اب بھی میرے لیے فکر مند تھے اور ہر آنے جانے والے سے میرے رشتے کے لیے کہا کرتے لیکن میں نے اپنی شادی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس کا امکان دن بہ دن کم ہوتا جا رہا تھا۔ خاندان میں میرے جوڑ کا کوئی لڑکا نہیں تھا اور برادری میں جو دو چار لڑکے رہ گئے تھے۔ وہ تعلیم اور رتبہ میں مجھ سے بہت کم تھے۔ لے دے کر میری نظر اصغر پر ہی جاکر ٹھہرتی تھی اور میں سوچنے لگتی کہ کاش کسی کے دل میں یہ خیال آجائے کہ اصغر سے بھی میری شادی ہوسکتی ہے لیکن یہ میری سوچ تھی۔ اصغر کے دل کا حال میں نہیں جانتی تھی۔ میں نے ایک دو دفعہ اسے ٹٹولنے کی کوشش کی لیکن اس نے کچھ نہ ظاہر ہونے دیا۔ اسے پڑھائی کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ اب اس کے دماغ میں باہر جانے کی دھن سوار ہوگئی تھی اور اس نے اعلان کردیا تھا کہ ایم بی بی ایس کے فوراً بعد وہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے انگلینڈ یا امریکا چلا جائے گا۔

چوتھے سال کے اختتام پر گاؤں گئی تو معلوم ہوا کہ دینو مستقل طور پر پاکستان آگیا ہے اور اس نے لاہور میں ایک بہت بڑا ورکشاپ اور کاروں کا شوروم کھولا ہے۔ اس کے بے حد اصرار کے باوجود ملک فیروز لاہور جانے پر تیار نہیں ہوا۔ اسے اپنی زمینوں سے بہت پیار تھا اور وہ کسی قیمت پر بھی زمینداری سے رشتہ نہیں توڑ سکتا تھا۔ اس کی بیوی کو بھی مجبوراً شوہر کا ساتھ دینا پڑا۔ ورنہ وہ تو بیٹے کے ساتھ لاہور کی عالیشان کوٹھی میں رہنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔

میں نے ایم بی بی ایس کرلیا۔ اب میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ گاؤں واپس جاتی تو میری ڈگری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی الماری میں بند ہو جاتی کیونکہ دو سو گھروں کے گاؤں میں روزانہ پانچ دس مریضوں کو دیکھ کر میرے علم اور تجربہ میں کتنا اضافہ ہوتا۔ اصغر نے انگلینڈ جانے کی تیاری مکمل کرلی تھی۔ وہ تو مجھ سے بھی ساتھ چلنے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن یہ میرے لیے ناممکن تھا۔ گاؤں سے شہر آنے کی اجازت تو اس لیے مل گئی تھی کہ یہاں چچا کا گھر تھا لیکن ملک سے باہر جانے کی اجازت کبھی نہ ملتی۔ پھر اسی نے ہی مجھے مشورہ دیا کہ میں لاہور کے کسی اسپتال میں ریزیڈنسی کرلوں۔ اس طرح مجھے ملازمت کے ساتھ ساتھ کسی ایک شعبہ میں اسپشلائز کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کی یہ تجویز مجھے پسند آئی اور میں نے ایک اسپتال میں ملازمت کرلی۔ ویسے بھی اصغر کے جانے کے بعد چچا اکیلے رہ جاتے۔ ان کا چھوٹا بیٹا امجد لاابالی قسم کا انسان تھا اور اسے اپنی ذات کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ ایسے میں مجھے ہی چچا کا سہارا بننا تھا۔

میں نے اسپتال آنے جانے کے لیے گاڑی خرید لی تھی۔ ایک دن واپسی میں میری نظر اچانک ہی ڈیش بورڈ پر گئی تو ہیٹ کی سوئی آخری حد کو چھو رہی تھی۔ یعنی انجن گرم ہو رہا تھا۔ میں نے گاڑی بند کی اور باہر آگئی۔ کچھ دیر انتظار کیا تاکہ انجن ٹھنڈا ہو جائے پھر دس منٹ بعد بونٹ اٹھا کر ریڈی ایٹر کا ڈھکنا کھولا۔ وہاں پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ڈگی میں پانی کی دو بوتلیں رکھی ہوئی تھیں میں نے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے گھر کی جانب چل دی۔ میری نظریں سڑک کی دونوں جانب کسی ورکشاپ کو تلاش کررہی تھیں۔ چند منٹ بعد ہی مجھے ایک گیراج کا بورڈ نظر آیا تو میں نے گاڑی وہاں کھڑی کردی۔ فوراً ہی دو لڑکے بھاگتے ہوئے آئے۔ میں نے چابی ان کے حوالے کرتے

ہوئے کہا۔ ’’ذرا دیکھو کیا ہوا ہے۔ گاڑی گرم ہو رہی ہے۔‘‘

ان میں سے ایک لڑکے نے بونٹ کھول کر ریڈی ایٹر چیک کیا اور بولا۔ ’’آپ کو گاڑی چھوڑنا پڑے گی۔ کام نکل آیا ہے۔‘‘

’’کیا ہوا؟‘‘ میں گھبرا گئی۔ گاڑیوں کے بارے میں میری معلومات بڑی محدود تھیں۔ کسی سے سن رکھا تھا کہ اگر ریڈی ایٹر میں پانی ختم ہو جائے تو انجن بیٹھ جاتا ہے۔ میں ڈر رہی تھی کہ اگر انجن میں کام نکل آیا تو لمبا خرچہ ہو جائے گا اور دو تین دن کے لیے گاڑی بھی ورکشاپ میں چھوڑنا پڑے گی لیکن اس لڑکے نے یہ کہہ کر میری فکر دور کر دی کہ گیس کٹ جل گئی ہے۔ اس کام میں دو سے تین گھنٹے لگ سکتے ہیں۔

میں نے گاڑی ورکشاپ میں چھوڑنی مناسب نہ سمجھا اور اس لڑکے سے کہا کہ ٹھیک ہے۔ تم کام شروع کرو۔ میں یہیں رک کر انتظار کرلوں گی۔ اس نے مجھے ایک اسٹول لا کر دے دیا اور خود کام میں لگ گیا۔ میں نے اپنا موبائل نکالا اور چچی کو فون کر کے پوری بات بتا دی تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے دس منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ ایک آدمی سفید شلوار قمیص میں ملبوس وہاں آیا۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر ان لڑکوں سے بات کرنے لگا جو میری گاڑی پر کام کر رہے تھے۔ اس کے بعد وہ میرے پاس آیا اور انتہائی مہذب انداز میں بولا۔ ’’میڈم! آپ بے شک گھر چلی جائیں۔ اپنا ایڈریس دے دیں۔ میں گاڑی گھر بھجوا دوں گا۔‘‘

’’کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کرلوں گی۔ آپ ذرا جلدی مجھے فارغ کر دیں۔‘‘

’’دیکھیں جی، جو وقت لگنا ہے وہ تو لگے گا، آپ اندر چل کر بیٹھیں۔ یہاں بہت گرمی ہے۔‘‘

وہ مجھے اپنے ساتھ برابر والے شوروم میں لے گیا اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے وہاں بٹھا دیا۔ وہ ایک جدید طرز کا دفتر تھا جہاں اے سی، کمپیوٹر، ٹیلی فون اور دیگر تمام سہولتیں موجود تھیں۔ اس نے ایک ملازم کو بلا کر میرے لیے کولڈ ڈرنک اور سینڈوچ منگوائے اور اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

’’آپ نے مجھے پہچانا؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ میں چونکتے ہوئے بولی۔

’’لیکن میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ ثمینہ ہیں نا، چودھری عاشق حسین کی بیٹی۔‘‘

’’ہاں لیکن آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟‘‘

’’اس لیے کہ میں بھی آپ کے گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام دین محمد ہے ملک دین محمد۔‘‘

مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس روپ میں میرے سامنے آئے گا۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ ’’تم دین محمد ہو، یقین نہیں آرہا۔ بہت بدل گئے ہو۔‘‘

’’بہت سے لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ میں وہی دین محمد ہوں۔ گاؤں کی گلیوں میں آوارہ پھرنے والا ایک نکما لڑکا۔ مالک کا کرم ہے کہ اس نے مجھے کسی قابل بنا دیا۔‘‘

’’یہ ورکشاپ اور شوروم تمہارا ہے؟‘‘

’’جی ہاں، اس کے علاوہ بھی مالک نے بہت کچھ دیا ہے۔‘‘ وہ انکساری سے بولا۔

اس نے مجھے بتایا کہ دبئی میں پانچ سال ملازمت کر کے اچھے خاصے پیسے جمع کر لیے تھے۔ اسے خیال آیا کہ دیار غیر میں نوکری کرنے اور مالکوں کی جھڑکیاں سننے سے بہتر ہے کہ اپنے ملک میں کوئی کاروبار کیا جائے۔ آپ وہاں چاہیں کتنی ترقی کرلیں کتنا پیسا کما لیں لیکن آپ کو مقامی لوگوں کے مقابلے میں حقیر ہی سمجھا جائے گا۔ اس لیے سب کچھ سمیٹ کر وطن واپس آگیا۔ باپ کا خیال تھا کہ ان پیسوں سے مزید زمین خریدی جائے تاکہ وہ بڑے زمیندار کہلا سکیں لیکن اسے اس کام سے دلچسپی نہیں تھی لہٰذا وہ لاہور گیا۔ پہلے اس نے یہ ورکشاپ کھولی پھر برابر والی جگہ خرید کر اس میں کاروں کا شوروم بنایا۔ اس کے علاوہ پراپرٹی کا بزنس بھی کرتا ہے۔ شہر میں اس کے دو پیٹرول پمپ اور ایک شادی ہال بھی ہے اور اب وہ ایک بینکویٹ بنانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

’’آپ ہی بتائیں۔ گاؤں میں رہ کر میں یہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اباجی سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ وہ بھی زمینیں بیچ کر یا کسی کو ٹھیکے پر دے کر شہر آجائیں۔ میں انہیں بھی کوئی کاروبار کروا دوں گا۔ شادی ہال میں بڑی کمائی ہے۔ دن بھر گھر میں آرام کرو۔ شام کو دو تین گھنٹے کے لیے چلے جاؤ لیکن وہ نہیں مانتے۔ انہیں اپنی زمینداری سے بہت لگاؤ ہے۔‘‘

’’وہ بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اگر سب لوگ گاؤں چھوڑ کر چلے گئے تو کھیتوں پر کون کام کرے گا۔‘‘

اس نے اپنے جو حالات بتائے اس حساب سے وہ کروڑپتی .... ضرور بن چکا تھا۔ میں پوچھنا چاہ

رہی تھی کہ اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی لیکن پہلی ملاقات میں اس سے اس طرح کا سوال کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ مجھے بار بار اس کے ماموں اور ان کی بیٹیوں کا خیال آرہا تھا۔ اگر وہ ان میں سے کسی ایک سے شادی کر لیتا تو ماموں کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا تھا لیکن شاید وہ بھی اپنی ماں کی طرح کسی بڑے گھر کی بیٹی سے شادی کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی اس نے ایسی بات کہہ دی جسے سن کر میں سٹپٹا گئی۔ اس نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اسے یہ سوال کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ بے شک اس کے پاس پیسا آگیا تھا لیکن ہمارے مقابلے میں وہ اب بھی بہت کم تر تھا۔ میں نے بے رخی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں بہت مصروف زندگی گزار رہی ہوں اور میرے پاس سوچنے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ ویسے بھی ذہن کو تھکانے سے کیا فائدہ۔ ہونا وہی ہے جو مقدر میں لکھ دیا گیا ہے۔''

اس کے بعد اس نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ تھوڑی دیر بعد ہی لڑکے نے آکر بتایا کہ گاڑی ٹھیک ہو گئی ہے۔ میں نے پرس کھول کر بل کے بارے میں پوچھا تو اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا لیکن میں اس کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی۔ اس لیے اصرار کر کے اس سے بل بنوایا اور ادائیگی کر دی۔ وہ مجھے کار تک چھوڑنے آیا اور بولا۔ ''آئندہ اگر گاڑی میں کوئی کام نکل آئے تو مجھے فون کر دیں۔ میں خود ہی گاڑی منگوا لوں گا۔''

اتفاق سے ایک ہفتہ بعد ہی چچا کی گاڑی خراب ہو گئی۔ ان کا مکینک ٹھیک طرح کام نہیں کرتا تھا جس کی وجہ سے گاڑی میں آئے دن کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہوتی رہتی تھی۔ میں نے انہیں دین محمد کے بارے میں بتایا تو وہ اس سے کام کروانے پر تیار ہو گئے۔ اسے فون کیا تو وہ خود ہی آگیا اور کہا کہ گاڑی ایک دن کے لیے اس کے پاس چھوڑ دی جائے تاکہ وہ اچھی طرح چیک کر کے ایک ہی دفعہ میں ساری خرابیاں ٹھیک کر دے۔ شام کو وہ گاڑی لے کر آگیا اور اس نے بہت مناسب پیسے چارج کیے۔ میں چچا کو اس کے بارے میں بتا چکی تھی۔ انہوں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ چائے پلائی اور کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ خود بھی بزنس مین تھے۔ اس لیے کاروباری لوگوں کی قدر کرتے تھے۔ دین محمد انہیں پہلی نظر میں ہی بھا گیا تھا۔

اس طرح دین محمد نے چچا کے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ اب وہ بہانے بہانے آنے لگا تھا۔ وہ عموماً اس وقت آتا جب میں گھر پر ہوتی۔ ویسے بھی دوسرے لوگوں کے لیے وہ اجنبی تھا۔ اس لیے مجھے ہی اس کے پاس بیٹھنا پڑتا۔ وہ بڑے رکھ رکھاؤ والا شخص تھا اور مجھ سے ہمیشہ تمیز کے دائرے میں رہ کر گفتگو کیا کرتا۔ اس لیے مجھے بھی اس کے پاس بیٹھنے میں عار محسوس نہیں ہوتا۔ گو کہ اس نے صرف میٹرک تک ہی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اخبارات، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے ذریعے اس نے اپنے علم میں بے پناہ اضافہ کر لیا تھا اور وہ ہر موضوع پر بے تکان بول سکتا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ صرف میٹرک پاس ہے۔

ایک دن اس نے ہم سب لوگوں کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ میں اس کی شاندار کوٹھی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وسیع و عریض ڈرائنگ روم، قیمتی فرنیچر، بڑے بڑے آراستہ بیڈروم، کشادہ ٹی وی لاؤنج، جدید کچن، خوب صورت لان اور سوئمنگ پول، کیا کچھ نہیں تھا اس کوٹھی میں۔ کھانا بہت مزے دار تھا۔ اس نے خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ چچا ٹی وی پر خبریں دیکھنے بیٹھ گئے اور وہ مجھے لے کر باہر لان میں آگیا۔ میں نے سوئمنگ پول پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اتنی بڑی کوٹھی میں اکیلے رہتے ہو، گھر والوں کو کیوں نہیں بلا لیتے؟''

''وہ آنے کے لیے تیار ہوں تو بلاؤں۔''

''تو پھر شادی کر لو۔''

''ماں کئی سالوں سے میرے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہے لیکن ابھی تک اس کی تلاش ختم نہیں ہوئی۔''

''تم خود کوئی لڑکی دیکھ لو۔''

''اب یہی کرنا پڑے گا۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے ایک لڑکی ہے میری نظر میں لیکن اس سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی۔''

''تم جیسے شخص کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ وہ انکار کر دے گی۔ تمہیں گولی تو نہیں مارے گی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب یہی کرنا پڑے گا۔'' اس نے ایک بار پھر میری جانب معنی خیز انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن میں اسپتال میں تھی کہ گیارہ بجے کے

قریب اس کا فون آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "آج آپ میرے ساتھ لنچ کر سکتی ہیں؟ مجھے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

اس کے لہجے کی بے باکی نے مجھے حیران کر دیا۔ میں آج تک کسی غیر مرد کے ساتھ باہر نہیں گئی تھی لیکن مجھے تجسس ہوا کہ وہ کون سی ضروری بات ہے۔ جس کے لیے وہ مجھے لنچ پر مدعو کر رہا ہے۔ لہٰذا میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اس نے مجھے اپنے شوروم کے نزدیک ہی ایک ریستوران کا پتا بتایا اور کہا کہ میں ٹھیک ایک بجے وہاں پہنچ جاؤں۔

اگلے دو گھنٹے میں نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزارے۔ بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہ رہا ہے۔ میں ٹھیک ایک بجے ریستوران پہنچ گئی۔ وہ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے مینو میرے سامنے رکھا اور کہا کہ اپنی پسند کی چیزوں کا آرڈر دے دوں۔ میں نے چائنیز رائس اور چکن کڑاہی منگوائی۔ کھانے کے دوران کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں نے آخری لقمہ لینے کے بعد گھڑی دیکھی اور کہا۔ "اب جو کہنا ہے جلدی سے کہہ ڈالو۔ مجھے دو بجے تک واپس اسپتال پہنچنا ہے۔"

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "پہلے وعدہ کریں کہ جو بات میں کہنے والا ہوں اگر وہ اچھی نہ لگے تو ناراض نہیں ہوں گی۔ غصہ نہیں کریں گی اور نہ ہی مجھ سے تعلق توڑیں گی۔ یوں سمجھ لیں کہ میں نے کچھ نہیں کہا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری کسی بات کا برا نہیں مناؤں گی۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر آہستہ سے بولا۔ "میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

میں یہ سن کر سناٹے میں آگئی۔ میرے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ فوری طور پر میرے اندر اشتعال کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اسے اتنی بڑی بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ جی چاہا کہ اس کے سر پر اتنے جوتے لگاؤں کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے لیکن میں ریستوران میں اپنا تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ میرے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اگر آپ کو میری بات بری لگی ہو تو اسے یہیں ختم کر دیں۔ یوں سمجھیں کہ میں نے کچھ نہیں کہا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولا۔ "البتہ ایک التجا ہے کہ صاف انکار کرنے سے پہلے گھر جا کر ایک دفعہ میری بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ بعض اوقات شر میں خیر کا پہلو نکل آتا ہے۔"

میں نے پرس اٹھایا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "اب مجھے چلنا چاہیے۔ دیر ہو رہی ہے۔"

وہ میرے ساتھ ساتھ گاڑی تک آیا اور کہنے لگا۔ "میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا۔"

میری طبیعت سخت مکدر ہو چکی تھی۔ اسپتال جا کر بھی کسی کام میں دل نہیں لگا۔ جیسے تیسے پانچ بجے تو میں نے گھر کی راہ لی۔ چچی شام کی چائے پر میرا انتظار کر رہی تھیں۔ میں نے ان کے سامنے اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ میں ان پر اپنی کیفیت ظاہر کرنا نہیں چاہ رہی تھی۔ ان سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اپنے کمرے میں آگئی اور بستر پر لیٹ کر دین محمد کی کہی ہوئی بات پر غور کرنے لگی۔

میرے لیے دین محمد کو انکار کرنا بہت آسان تھا لیکن میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے غور و فکر کرنے کی عادی تھی۔ جب میں نے دین محمد کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اس میں کئی مثبت پہلو نظر آئے۔ سب سے پہلا تو یہ وہ ہماری برادری کا تھا۔ گو کہ حیثیت میں اس کا خاندان ہم سے کم تھا لیکن اس نے ڈھیروں دولت اکٹھی کر کے یہ فرق بھی ختم کر دیا تھا۔ وہ ایک پُرآسائش زندگی بسر کر رہا تھا اور پوری برادری میں کوئی بھی اس کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ وہ صرف تعلیمی لحاظ سے مجھ سے پیچھے تھا جب کہ دوسری جانب میری اپنی پوزیشن بہت کمزور تھی۔ میں پینتیس برس کی ہو چکی تھی اور بابا سر توڑ کوشش کے باوجود میرے لیے رشتہ تلاش نہیں کر سکے تھے۔ اس معاملے میں ان کی دولت اور اثر و رسوخ بھی کام نہیں آرہا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ میری شادی کی امید ماند پڑتی جا رہی تھی اور بابا کی پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

میں نے دین محمد کی خامیوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو تعلیم کی کمی کے سوا مجھے اس میں کوئی خامی نظر نہیں آئی اگر میں بھی میٹرک کے بعد گھر بیٹھ جاتی تو ہم دونوں میں کوئی فرق باقی نہ رہتا لیکن ہوا یوں کہ میں نے پڑھائی پر توجہ دی اور وہ کمانے نکل گیا۔ اگر میں ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر تھی تو وہ بھی ایک دولت مند شخص تھا جسے دنیا کی ہر آسائش میسر تھی۔ پھر اس سے رشتہ جوڑنے میں کیا قباحت تھی۔ میں جتنا اس کے بارے میں سوچتی گئی اس کے نمبر بڑھتے گئے اور صبح ہونے تک میں اس کے حق میں فیصلہ کر چکی تھی۔

دوسرے دن میں نے اسے فون کر کے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا اور کہا کہ وہ اپنے والدین کو میرے گھر بھیجے۔ اگر بابا مان گئے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بصورت دیگر میں ان کے فیصلے کا احترام کروں گی۔ وہ بھی اس بات کو ہمیشہ کے لیے بھول جائے اور اسے اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائے۔ مجھے ایک موہوم سا شبہ تھا کہ اس کی کم تعلیم اور سابقہ حیثیت کے پیش نظر شاید بابا انکار کردیں لیکن انہوں نے نہ صرف رشتہ قبول کرلیا بلکہ شادی کی تاریخ بھی طے کردی۔ مجھ سے کسی نے پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ آخر وہ بھی ایک روایتی قدامت پرست زمیندار ہی نکلے۔

میری شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ بابا نے پانی کی طرح پیسا بہایا۔ پوری برادری کو کھانا دیا گیا اور جہیز تو اتنا شاندار تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گو کہ دین محمد کی ماں نے بھی بہت اچھی بری بنائی تھی لیکن میرے جوڑوں اور زیورات کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہیں تھی۔ پہلے دین محمد کا خیال تھا کہ وہ رخصتی کروا کر مجھے سیدھا لاہور لے جائے گا لیکن اس کی ماں پھیل گئی کہ ولیمہ تو گاؤں میں ہی ہوگا چنانچہ ہمیں ولیمہ تک رکنا پڑ گیا۔ البتہ شادی کے چوتھے روز ہم لاہور آگئے۔

شادی کے بعد مجھ پر دین محمد کی اصلیت ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ ویسے تو وہ مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔ مجھے روزانہ شام کو گھمانے لے جاتا۔ آئے دن کسی نہ کسی بڑے ہوٹل میں ڈنر کرواتا۔ میرے لیے قیمتی تحفے لے کر آتا۔ گھر میں ہر کام کے لیے نوکر تھے۔ ایک گاڑی بمع ڈرائیور میرے ڈسپوزل پر تھی۔ میں نے اسپتال سے ایک مہینے کی چھٹی لی تھی جب میں دوبارہ ڈیوٹی پر جانے لگی تو اس نے کہا۔ ”آج تو تم چلی جاؤ لیکن استعفیٰ دے کر واپس آجانا۔ تمہیں یہ معمولی نوکری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیسی باتیں کررہے ہو دین محمد؟“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”میری ریذیڈنسی چل رہی ہے۔ ایک سال باقی رہ گیا ہے اس کے بعد میں اسپیشلسٹ بن جاؤں گی۔ تم چاہتے ہو کہ میری اب تک کی محنت رائیگاں چلی جائے۔“

”کچھ بھی ہو میں تمہیں نوکری کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”تم سے اجازت کون مانگ رہا ہے۔“ میں نے ترخ کر کہا۔

”مت بھولو کہ تم میری بیوی ہو۔“

”اور تم بھی مت بھولو کہ میرے شوہر ہو آقا نہیں۔“

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا اور پرس اٹھا کر اسپتال کے لیے روانہ ہوگئی۔ شام کو واپس آئی تو اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے بھی اسے لفٹ نہیں کروائی اور لباس تبدیل کر کے چائے کے لیے بیٹھ گئی۔ اتفاق سے اسی وقت میرے ایک ساتھی ڈاکٹر کا فون آگیا، وہ مجھ سے کسی اہم مسئلے پر ڈسکس کرنا چاہ رہے تھے۔ اتفاق سے ان کی گفتگو کچھ زیادہ ہی طول پکڑ گئی۔ اس دوران وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھا بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔ خدا خدا کر کے ان کا فون بند ہوا تو وہ بولا۔ ”کس کا فون تھا؟“

”ڈاکٹر سعدی کا۔“

”یہ لوگ گھر پر بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”اسے منع کردو۔ آئندہ گھر پر فون نہ کرے۔ جتنی باتیں کرنا ہیں، اسپتال میں ہی کرلیا کرے۔“

میں نے فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم خود ہی کہہ دو۔ میں اتنی بداخلاق نہیں ہوسکتی۔“

وہ غصے میں آکر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ”تم انتہائی بدتمیز عورت ہو۔ تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“

اگلے تین چار روز میں ہی مجھ پر واضح ہوگیا کہ وہ انتہائی شکی مزاج اور حاسد شخص ہے اور اسے ہر عورت کا چال چلن مشکوک نظر آتا ہے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میری بھی جاسوسی ہورہی ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ایک روز اسپتال سے واپسی پر میں کچھ دیر کے لیے ایک شاپنگ مال پر رک گئی۔ مجھے اپنے لیے کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ وہاں اتفاق سے میری ایک کولیگ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے ہزبینڈ کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے چائے کی دعوت دی تو ہم شاپنگ مال کے ریستوران میں چلے گئے میں ایک گھنٹا تاخیر سے پہنچی تو وہ بے چینی سے لاؤنج میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی چلاتے ہوئے بولا۔

”تم مجھے فون کر کے نہیں بتا سکتی تھیں کہ شاپنگ کے لیے جارہی ہو۔“

میں ہکا بکا رہ گئی۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ پھر دوسرے ہی لمحے میری سمجھ میں آگیا کہ یہ یقیناً اس ڈرائیور کی کارستانی ہے جو میرے ساتھ ڈیوٹی کررہا ہے۔ اسے میری جاسوسی پر لگایا گیا ہے اور وہ میرے

بارے میں پل پل کی خبریں پہنچا رہا تھا۔ پھر فوراً ہی اس کی تصدیق بھی ہو گئی جب اس نے کہا۔ ”وہ آدمی کون تھا جس کے ساتھ تم ریستوران میں چائے پینے گئی تھیں؟“

”تمہارے جاسوس نے غلط انفارمیشن دی ہے۔“ میں نے بھی باآواز بلند کہا۔ ”میں اپنی سہیلی کے ساتھ چائے پینے گئی تھی۔ وہ آدمی اس کا شوہر ہے میں تو اسے جانتی بھی نہیں ہوں۔“

”بہرحال تم آیندہ میری اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاؤ گی۔“

”تم مجھ پر پابندی نہیں لگا سکتے۔ میری مرضی جہاں چاہوں جاؤں۔ البتہ اگر کوئی قابلِ اعتراض حرکت دیکھو تو ضرور بازپرس کرنا۔“

اس کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس لیے وہ پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے بعد یہ روز کا معمول بن گیا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ طوفان کھڑا کر دیتا۔ مجھے فائنل امتحان کی تیاری کرنا تھی۔ اس لیے رات کو دیر تک پڑھنا پڑتا۔ اس پر بھی اسے اعتراض تھا۔ وہ رات دس بجے ہی کمرے کی لائٹ آف کر دیتا۔ مجبوراً مجھے دوسرے کمرے میں پڑھنے کا انتظام کرنا پڑا۔ اس پر بھی اسے چین نہیں آیا۔ وہ بار بار اٹھ کر یہ دیکھنے آتا کہ میں کسی سے بات تو نہیں کر رہی ہوں۔ یہ فون بھی میرے لیے عذاب بن گیا تھا۔ جب بھی کسی کی کال آتی تو وہ میرے اردگرد منڈلانے لگتا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا کہ کہیں میں کسی سے عشقیہ گفتگو تو نہیں کر رہی۔ یہی نہیں بلکہ وہ دن میں کئی بار اسپتال فون کر کے مجھے ڈسٹرب کیا کرتا۔ میں نے اسے کئی بار منع کیا کیونکہ اس کا فون سننے کے لیے مجھے وارڈ چھوڑ کر باہر آنا پڑتا اگر کوئی میٹنگ ہو رہی ہوتی تو میں فون کو سائلنٹ پر کر دیتی۔ اس پر بھی وہ چراغ پا ہو جاتا کہ فون کیوں بند کر رکھا تھا۔

مجھے یہ عذاب سہتے ہوئے چھ ماہ ہو گئے تھے۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین اس وقت ہوا جب اصغر کے پاکستان آنے کی اطلاع ملی۔ اس کا کورس مکمل ہو چکا تھا اور وہ اسپیشلسٹ ڈاکٹر بن کر واپس آیا تھا۔ مجھے بھی اس کے آنے کی بہت خوشی تھی اور میں اسے ایئرپورٹ پر لینے کے لیے جانا چاہ رہی تھی لیکن اسپتال میں ایک ضروری میٹنگ کے سبب نہ جا سکی وہ شام کو خود ہی مجھ سے ملنے آ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ اور صحت مند ہو گیا تھا۔ اس کے گورے رنگ پر گھنگریالے بال اور سنہرے فریم کا چشمہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ میرے لیے کئی قیمتی تحائف لایا تھا۔ اس نے دین محمد کو بھی ایک خوب صورت گھڑی گفٹ کی لیکن اس جاہل شخص نے شکریہ ادا کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ صاف لگ رہا تھا کہ اسے اصغر کا آنا اچھا نہیں لگا جب کہ میں اس کی موجودگی کو نظرانداز کر کے اصغر سے پہلے کی طرح بے تکلفانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔ میں نے اسے کھانے پر روک لیا جب کہ دین محمد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دے۔

اس کے جانے کے بعد وہ مجھ پر برس پڑا اور بولا۔ ”آج تو میں نے تمہارے اس کزن کو برداشت کر لیا لیکن وہ آیندہ یہاں نہ آئے۔ مجھے غیر مردوں سے اس طرح تمہارا بے تکلف ہونا بالکل پسند نہیں۔“

”وہ غیر نہیں میرا کزن ہے۔ سگے چچا کا بیٹا۔ بچپن سے ہم ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتی۔“

”پھر مجھے چھوڑ دو۔“ اس نے گویا میرے سر پر بم پھوڑ دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنی بڑی بات اتنی آسانی سے کہہ دے گا۔

میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں بھی نہیں چھوڑ سکتی کیونکہ میں نے علیحدہ ہونے کے لیے تم سے شادی نہیں کی تھی۔“

”اگر میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو اصغر کو یہاں آنے سے منع کر دو۔“

”ٹھیک ہے۔ منع کر دوں گی۔“ میں نے مصلحتاً کہا۔

میں نے سوچا کہ اصغر مہینے دو مہینے بعد واپس چلا جائے گا پھر میں کیوں اس کی وجہ سے اپنا گھر خراب کروں۔ وہ سمجھ دار آدمی ہے اور اسے میری بھلائی ہر حال میں عزیز ہے۔ جب میں اسے پوری بات اور دین محمد کی نفسیات کے بارے میں بتاؤں گی تو وہ بھی میرے گھر کا رخ نہیں کرے گا لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ مجھے کہیں معلوم تھا کہ حالات کا رخ کس جانب ہے۔

دوسرے دن میں نے اسپتال سے اصغر کو فون کر کے ساری سچویشن بتا دی اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیا۔ وہ میری بات سن کر سٹپٹا گیا اور بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تم مجھے کہیں مل سکتی ہو؟“

”بالکل نہیں۔“ میں نے روتے ہوئے کہا۔ ”اس شخص نے مجھ پر پہرے بٹھا رکھے ہیں۔ ڈرائیور بھی اس کا جاسوس ہے اگر میں نے تم سے ملنے کی کوشش کی تو وہ فوراً اس

کو آگاہ کر دے گا۔''

''تم ایسا کرو کہ کسی بہانے کچھ دنوں کے لیے گاؤں چلی جاؤ۔ میں بھی دو چار روز بعد آجاؤں گا۔ وہاں بیٹھ کر ہی اطمینان سے بات کرسکیں گے۔''

مجھے امید تو نہیں تھی کہ دین محمد اتنی آسانی سے مان جائے گا لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر میرے گاؤں جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دو روز بعد اصغر بھی وہاں پہنچ گیا اور اس نے جب میرے حالات سنے تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''تم نے فیصلہ کرنے میں بہت جلدی کی۔ کم از کم میرا انتظار تو کرلیا ہوتا۔''

''کس برتے پر تمہارا انتظار کرتی؟'' میں نے جل کر کہا۔ ''تم نہیں جانتے کہ مجھ پر شادی کے لیے کتنا دباؤ تھا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ میری عمر نکلی جارہی ہے۔ میں بوڑھی ہورہی ہوں۔ مجبوراً مجھے والدین کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑا۔''

''تایا جی نے یہ بھی نہیں سوچا کہ پیسا آجانے سے آدمی کی اوقات نہیں بدل جاتی۔ وہ ایک کم تعلیم یافتہ شخص ہے اور اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی تم سے برتاؤ کررہا ہے۔''

''جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب تم بتاؤ کہ میں کیا کروں۔''

''اس سے جان چھڑا لو۔ میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

یوں لگا کہ جیسے میرے کانوں کے پاس بم پھٹا ہو۔ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں کہی۔ اب تو پانی سر سے اونچا ہوچکا۔''

''شاید تمہیں یقین نہ آئے میں تو تمہیں بچپن سے چاہتا ہوں اور ہمیشہ تمہیں اپنی محبوبہ کے روپ میں دیکھا۔ یہ میری دلی خواہش تھی کہ تم سے شادی ہو جائے لیکن زبان سے اس کا اظہار یوں نہ کرسکا کہ تم سے عمر میں چھ مہینے چھوٹا تھا اگر کسی کے سامنے اپنی خواہش بیان کرتا تو سب مجھے پاگل سمجھتے۔ اس لیے کہ ہمارے یہاں شوہر کو بیوی سے پانچ دس سال بڑا ہونا چاہیے۔ میں اپنی خواہش کو سینے میں دبائے باہر چلا گیا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید میری واپسی تک حالات بدل جائیں اور میں تمہیں اپنا بنا سکوں لیکن میرے آنے سے پہلے ہی تمہاری شادی ہوگئی۔''

''تم مجھ سے تو کہتے۔ شاید میں کوئی راستہ نکال لیتی۔''

''اس سے پہلے کہ تمہیں سزا کا حکم سنایا جائے تم عدالت کے سامنے کچھ پیش کرنا چاہتے ہو؟'' جج نے ملزم سے پوچھا۔

ملزم نے جواب دیا۔ ''نہیں جناب والا! جو کچھ میرے پاس تھا سب وکیل کی نذر کرچکا ہوں۔''

......

استاد جب کلاس میں سبق پڑھا چکے تو انہوں نے ایک لڑکے سے سوال کیا۔ ''عمران! اب جب کہ تم نے سبق اچھی طرح پڑھ لیا ہے تو یہ بتاؤ کہ جب بیٹے نے باپ کے سامنے اس کا پسندیدہ درخت کاٹ دیا تو باپ نے بیٹے کو مارا تک نہیں کیوں؟''

''سر! اس لیے کہ باپ کو معلوم تھا کہ بیٹے کے ہاتھ میں ابھی تک کلہاڑا موجود ہے۔''

مرسلہ: عنایت علی سرگونہ۔ پشاور

''تم کچھ بھی نہیں کرسکتی تھیں۔ ان فرسودہ روایات کی جڑیں بہت مضبوط ہیں۔ انہیں اکھاڑنا بہت مشکل ہے۔''

''کیا تم سمجھتے ہو کہ اس سے جان چھڑانا آسان ہے اگر میں نے طلاق کا مطالبہ کیا تو خاندان والے مجھ پر تھو تھو کریں گے۔ بابا کی عزت خاک میں مل جائے گی اور میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ نہیں میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی۔''

''اگر تم اس سے طلاق نہیں مانگ سکتیں تو اسے اتنا تنگ کرو کہ وہ خود تمہیں طلاق دینے پر تیار ہوجائے۔ ایسی صورت میں تم مظلوم کہلاؤ گی اور کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔''

''اگر پھر بھی اس نے طلاق نہ دی؟''

''یونہی اگر مگر کرتی رہیں تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ وہ اسی طرح تمہاری زندگی میں زہر گھولتا رہے گا۔ اس آگ میں تمہارا سب کچھ جل کر خاک ہوجائے گا۔ تمہاری شخصیت، کیریئر، مستقبل سب کچھ اس آگ کی نذر ہوجائے گا اور تم ساری عمر اس کی تپش محسوس کرتی رہوگی۔''

''میں کیسے یقین کرلوں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو اس پر عمل بھی کروگے۔''

''تمہیں یقین کرنا ہوگا۔'' وہ میرے دونوں کندھے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔ تمہیں

دھوکا دینے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے جو کہا ہے وہ کر کے دکھاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے دنیا بھر کی مخالفت مول لینا پڑے۔"

اس کی باتوں سے مجھے بڑا حوصلہ ہوا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ عدت پوری کرنے کے بعد نکاح کر کے وہ مجھے اپنے ساتھ انگلینڈ لے جائے گا اور ہم ہمیشہ کے لیے وہیں سیٹل ہو جائیں گے۔ وہ اسی روز لاہور واپس چلا گیا۔ تین چار دن بعد میں بھی اپنے گھر آ گئی۔ دین محمد مجھے دیکھ کر حیران تو ہوا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں پندرہ بیس دن یا مہینے بعد واپس آؤں گی۔

میں نے اگلے روز سے ہی اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ پہلے مرحلے میں ٹیلی فون کا استعمال بڑھا دیا۔ اسپتال سے واپس آنے کے بعد میں موبائل لے کر بیٹھ جاتی اور اپنے جاننے والوں سے گھنٹوں باتیں کرتی۔ دین محمد سامنے بیٹھا گھورتا رہتا لیکن اس کے پلے کچھ نہ پڑتا کیونکہ میں زیادہ گفتگو انگریزی میں کرتی تھی وہ جب بھی مجھ سے پوچھتا تو اسے یہی جواب دیتی کہ امتحان بالکل قریب آ گئے ہیں، اس کی تیاری کے لیے مجھے اپنے ساتھی ڈاکٹروں سے مختلف ٹاپک پر ڈسکس کرنا ہوتے ہیں۔ رات کو بھی یہی صورتِ حال ہوئی۔ میں کھانا کھانے کے بعد پڑھائی کے بہانے دوسرے کمرے میں چلی جاتی اور وقفے وقفے سے لوگوں کو فون کرتی رہتی۔ دین محمد بھی میری نگرانی کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا۔ اس لیے اس نے کمرے کے چکر لگانا کم کر دیے تھے۔ اس طرح مجھے اصغر سے بھی بات کرنے کا موقع مل جاتا۔

دوسرے مرحلے میں یہ پیش رفت ہوئی کہ میں نے پڑھائی کے بہانے اپنے ساتھی ڈاکٹروں کو گھر پر بلانا شروع کر دیا۔ ان میں صرف ایک لڑکی اور باقی مرد تھے۔ لڑکی کے آنے پر تو دین محمد نے کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن ڈاکٹر سعدی کو دیکھ کر وہ بھڑک اٹھا۔ میں نے اس کے غصے کی کوئی پرواہ نہیں کی اور سعدی کو لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ اس کی خوب خاطر تواضع کی اور چار گھنٹے تک کمرا بند کیے اس کے ساتھ پڑھتی رہی۔ اس کے جانے کے بعد دین محمد نے خوب ہنگامہ کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر دوبارہ ڈاکٹر سعدی یا کوئی اور مرد اس گھر میں آیا تو وہ اس کی ٹانگیں توڑ دے گا جس پر میں نے کہا کہ اگر تمہیں ان کے آنے پر اعتراض ہے تو میں اسپتال میں رک کر پڑھ لوں گی یا ان کے گھر چلی جاؤں گی۔

"بس بہت ہو چکا یہ ڈراما۔" وہ آگ بگولہ ہوتے ہوئے بولا۔ "کل سے تم اسپتال نہیں جاؤ گی۔"

"اگر میں نے ملازمت چھوڑ دی تو میری ساری محنت ضائع چلی جائے گی۔ میں اسپتال ضرور جاؤں گی۔"

"واپس آنے کی ضرورت نہیں اس گھر کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔"

"تم کچھ بھی کہو لیکن میں تمہاری فضول ضد کی وجہ سے اپنا کیریئر برباد نہیں کر سکتی۔"

"اگر تمہاری بھی ضد ہے تو میری طرف سے تم آزاد ہو۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

اس نے یہ الفاظ تین بار ادا کیے اور بولا۔ "ابھی اور اسی وقت اپنے چچا کے گھر چلی جاؤ۔ ڈرائیور چھوڑ آئے گا۔ تمہارا سامان بھی کل صبح بھیج دوں گا۔"

یوں میں طلاق کا جھومر ماتھے پر سجائے چچا کے گھر آ گئی۔ بابا نے یہ خبر سنی تو دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔

لیکن اس حادثے کو بھی انہوں نے اپنی ہی غلطی جانی اور میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "مجھے معاف کر دینا بیٹی میں نے تمہارے لیے غلط شخص کا انتخاب کیا۔ وہ کسی بھی اعتبار سے تمہارے لائق نہیں تھا۔"

اصغر نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ اس نے نہ جانے چچا اور چچی کو کس طرح راضی کیا کہ وہ عدت ختم ہوتے ہی میرا ہاتھ مانگنے آ گئے۔ اس بار بابا نے اپنی خاندانی روایات سے ہٹ کر میری مرضی معلوم کی اور بڑی سادگی سے اصغر کے ساتھ میرا نکاح ہو گیا اور چند ماہ بعد ہی میں انگلینڈ آ گئی۔ اب ہم دونوں ایک ہی اسپتال میں کام کر رہے ہیں اور زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ البتہ شک کی آگ نے دین محمد کی زندگی برباد کر دی۔ سنا ہے کہ میرے بعد وہ دو شادیاں کر چکا ہے لیکن کسی کے ساتھ بھی اس کا گزارہ نہیں ہو سکا۔ اب وہ تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی ماں گاؤں میں ایک ایک دروازے پر جا چکی ہے لیکن کوئی بھی اس کے ساتھ رشتہ جوڑنے پر تیار نہیں۔ یہاں تک کہ ماموں نے بھی اسے اپنی بیٹی دینے سے انکار کر دیا ہے۔ مجھے یہ سن کر خوشی نہیں بلکہ افسوس ہوتا ہے کاش وہ اتنا شکی نہ ہوتا تو اس کی زندگی یوں ویران نہ ہوتی۔ جو لوگ اپنی بیویوں پر بلاوجہ شک کرتے ہیں۔ ان کا یہی انجام ہوتا ہے۔

بازگشت

جناب مدیر سرگزشت
السلام علیکم
ایک بار پھر میں ایک نئی سرگزشت بازگشت کے ساتھ حاضر ہوں۔
اُمید ہے یہ بھی قارئین کو پسند آئے گی۔

زویا اعجاز
(لاہور)

سرما کی مرجھائی ہوئی زرد دھوپ دھیرے دھیرے گھروں کی منڈیروں پر پگھل رہی تھی۔ دو کمروں کے اس گھر کے کچے صحن میں ایک جواں سال عورت گیارہ سالہ بچے کے پیچھے لپکتی ہلکان ہو رہی تھی۔ "میرے چن پتر! نہ تنگ کر مجھے۔ چل نہا لے جلدی سے۔ تیرے ابا جی بھی آتے ہوں گے۔"

"نہیں نہانا مجھے اماں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا بس۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔

"نہ کر پتر! دیکھ تو صبح سپارہ پڑھنے بھی نہیں گیا۔ تیرے

ابا جی کتنا ناراض ہوں گے۔" کھلتی ہوئی شہابی رنگت اور اونچے لمبے قد کی اس عورت نے بیٹے کو پچکارتے ہوئے کہا لیکن اس کا ہر حربہ ناکام ثابت ہورہا تھا۔

اسی بھاگ دوڑ میں اسے بیرونی دروازے کی جانب ایک مخصوص آواز سنائی دی اور وہ فوری طور پر باہر لپکا۔ "اماں میں جیدے اور بالے کے ساتھ جارہا ہوں" وہ چیخ کر بولا اور زقند بھرتے ہوئے گھر کی دہلیز عبور کرگیا۔ دروازے کے بائیں جانب دو نفوس بے تابی سے اس کے منتظر تھے۔ پندرہ سالہ جاوید عرف جیدا، چوڑی کاٹھی کا مالک تھا۔ گندمی رنگت اور گھنگریالے بالوں والا یہ لڑکا عام سے نقوش کا حامل تھا لیکن اس کی آنکھیں اس کے چہرے سے بالکل جدا محسوس ہوتی تھیں۔ ان گہری، چمکدار آنکھوں میں کئی اسرار چھپے تھے۔ آگہی اور شعور کی بدولت ان میں ایک واضح اضطراب موجزن دکھائی دیتا تھا۔ چودہ سالہ بلال عرف بالا بھی اسی قبیلے کا باسی تھا۔ فربہی مائل بالے کی کاٹھی سے پہلا تاثر کینہ پروری کا منعکس ہوتا تھا۔ اس تکڑم کا تیسرا کونا نعمان عرف نوما تھا۔ گیارہ سالہ نوما ایک نڈر اور بیباک اپنے آپ میں مگن رہنے والا لڑکا تھا۔ جیدے اور بالے کے تمتماتے ہوئے چہرے اس وقت کسی "بڑی خبر" کا پتا دے رہے تھے۔ وہ دونوں فوری طور پر نومے کو لیے اپنے مخصوص ٹھکانے کنوئیں کی منڈیر پر جابیٹھے۔ جیدے نے تیکھے چتونوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوئے! تو آج آیا کیوں نہیں مدرسے صبح؟"

"بس یار! میری آنکھ ہی نہیں کھلی آج۔" نوما جلدی سے بولا۔

"او شہزادے! آنکھ کھولا کرناں۔ تو کاکا تو نہیں اب۔ آج ایک بہت بڑی "فلم" دیکھنے سے محروم رہ گیا تو۔" بالا آنکھ میچ کر بولا۔

"ہائیں! کیا ہوا؟ کون سی فلم؟" نومے نے بے تابی سے پوچھا۔

"کیا کہتے ہو؟ بتا دوں اسے؟" بالے نے شرارتی نظروں سے جیدے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جیدا اس چھوٹے سے گینگ کا غیر مشروط باس تھا۔

"خبردار بالے! کچھ پھوٹا منہ سے تو۔ کل خود آئے گا ہمارے ساتھ یہ۔" جیدا دوٹوک لہجے میں بولا۔ نوما منہ بسور کر رہ گیا۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ پتنگ بازی کے منصوبے بناتے وہاں سے چل دیئے تھے۔

☆☆☆

روشن گڑھ ایک روایتی گاؤں تھا۔ بمشکل ہزار نفوس پر مشتمل یہ ایک جڑی ہوئی بستی تھی۔ چھوٹے چھوٹے گھروں اور کچے صحنوں پر مشتمل گھروں میں دو باتیں مشترک تھیں۔ موروثی غربت اور خواب۔ روشن گڑھ کا کوئی خوش نصیب لڑکا اگر شہر جا کر پڑھ لکھ جاتا یا کسی خلیجی ملک میں نوکری کے حصول میں کامیاب رہتا تو باقی ماندہ گاؤں کی آنکھیں کچھ مزید خوابوں کے بوجھ تلے دب جاتیں۔ یہ خواب بے دریغ اپنی اولاد پر لادے جاتے جو اس بوجھ کو ڈھونے سے یکسر انکاری رہتے تھے۔ روشن گڑھ میں تعلیم کی شمع جلائے رکھنے کی غایت سے مسجد سے متصل ایک مدرسے میں بعد از نماز فجر بچوں اور بچیوں کو سیپارہ پڑھایا جاتا تھا۔ مائیں کھینچ کھانچ کر بچوں کو صبح مسجد بھیجنے کے لیے کوشاں رہتیں لیکن بچے مندی مندی آنکھوں سے ہوائی چپلیں گھسیٹتے مارے باندھے یہ فریضہ سرانجام دینے جایا کرتے تھے۔ مرد حضرات کھیتوں میں روانہ ہوجاتے اور خواتین گھریلو کام کاج میں مصروف ہوجاتیں۔ مدرسے سے واپسی کے بعد لڑکوں کا زیادہ تر وقت دھول اڑاتی کچی گلیوں میں گولیاں بنٹے کھیلنے، پتنگیں اڑانے اور کبھی سر پھٹول میں گذرتا۔ صبح چار و نا چار مسجد میں حاضری کے بعد وہ سارا دن وہاں قدم ہی نہ دھرتے۔ گاؤں کا واحد مؤذن و امام "حی علی الفلاح، حی علی الصلوۃ" کی صدائیں لگاتا رہتا لیکن چند عمر رسیدہ بوڑھوں کے علاوہ کوئی اس کی آواز پر لبیک نہ کہتا۔

روشن گڑھ میں ایک اسکول بھی موجود تھا اور اس کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ قریبی قصبے کا ایک ریٹائرڈ ماسٹر روشن فریدی چند گھنٹوں کے لیے وہاں آکر لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی پیڑھیوں پر بیٹھے چند بچوں کو تعلیم دیا کرتا تھا۔

شام کے سائے جب بستی کے گلی کوچوں میں اپنے پر پھیلانے لگتے تھے تو کھیل کود میں مشغول بچے بادل ناخواستہ اپنے گھروں کی راہ لیتے تھے جہاں انہیں اپنے مجازی خدا کے آگے پیچھے پھرتی ماں اور بیوی کے وجود کو نظروں سے تولتے ہوئے باپ کے سوا کوئی تیسرا منظر دکھائی نہ دیتا تھا۔ عشاء کی اذان کے بعد بچوں کو زبردستی بستروں میں گھسا دیا جاتا تھا۔ اندھیرے میں خیالی ہیولے تراشتے وہ بھی بچے نیند کی آغوش میں جانے سے قبل کم و بیش روزانہ ایک بے عنوان سنسنی کے بحر میں ڈوبتے ابھرتے تھے۔ یہ وہ وقت ہوتا تھا جب فطری تقاضوں سے مغلوب والدین بے احتیاطی ان پودوں کی زہریلی آبیاری کررہی تھی اور ان کی اخلاقی اقدار کو کھوکھلا کرکے انہیں آگاہی کے ایک ناقابل برداشت عذاب سے دوچار

کر رہی تھی۔ بالا، جیدا اور نوما بھی ایسے ہی عذاب کے پروردہ تھے اور عذاب اپنے جلو میں تباہی کے سوا کبھی کچھ نہیں لاتے۔

☆☆☆

پچھلے کچھ دنوں سے جیدا گروپ اسکول میں بلا ناغہ حاضری دے رہے تھے۔ ان کے والدین اس خوشگوار تبدیلی کو اپنی دعاؤں اور خلوص نیت کا ثمر گردان کر بے انتہا مطمئن و سرشار تھے۔ اس تبدیلی کے اندرون خانہ عوامل کی گہرائی میں جھانکنے کی انہیں فرصت تھی نہ ضرورت۔ وہ یہی سوچ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ ان کی اولاد پڑھائی میں دلچسپی لے رہی ہے۔

اسکول کا انتظام و انصرام ان دنوں روشن فریدی کے جواں سالہ بھانجے کے سپرد تھا۔ ساٹھ کے پیٹے میں موجود روشن فریدی کی بصارت اب اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی جس کے نتیجے میں اب وہ متعلمین کو احسن طریقے سے تعلیم دینے سے قاصر تھا لہٰذا اس نے اس کار خیر کی تکمیل کے لیے اپنے بھانجے کو بلوا لیا۔ چوبیس سالہ شکیل فریدی نے بخوشی یہ کام سنبھال لیا تھا۔ وہ چھریرے جسم کا متوسط قامت انسان تھا جس کی آنکھوں میں ایک مخصوص تیزی پنہاں تھی۔ چند دن بعد اس نے طلبہ و طالبات کے ذمے الگ امور تفویض کر دیے۔ لڑکیوں کو مدرسے کی اندرونی عمارت اور لڑکوں کو بیرونی عمارت اور چھت کی صفائی و ستھرائی کے لیے مامور کر دیا گیا۔ تمام لڑکوں نے اپنی ڈیوٹی کے دوران نت نئی سرگرمیاں تلاش کر لیں لیکن جیدا گروپ کے مشاغل ان سبھی سے منفرد تھے۔ وہ تینوں بے چین روحوں کے حامل تھے اور تجسس ان کا سب سے بڑا روگ تھا جس نے ان کے دلوں اور روحوں پر گھن لگا دیا تھا۔ اسکول کے دیگر لڑکوں سے "سینئر" ہونے کی وجہ سے وہ ان پر رعب جما کر اپنے حصے کا کام بھی بآسانی کروا لیا کرتے تھے اور خود عمارت کے عقبی حصے میں واقع ایک چھجے پر آ کر بیٹھ جاتے اور یہیں انہوں نے شکیل کا ایک مکروہ اور بھیانک روپ دیکھا جس نے نفس کی عمیق پستیوں میں ان کا سفر فزوں تر کر دیا۔

☆☆☆

روشن گڑھ پر شام کا سرمئی پنچھی دھیرے دھیرے اپنے پر پھیلا رہا تھا۔ جیدا، بالا اور نوما اپنے مخصوص کنویں پر موجود تھے لیکن آج ایک گہری خاموشی اور گریز ان کے مابین حائل تھا۔ چند ثانیوں بعد نومے نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے مدھم آواز میں کہا۔ "تم لوگ اسی بات کا ذکر کر رہے تھے ناں اس دن۔"

"ہاں تو اور کیا؟ یہ سب تو روز ہوتا ہے ادھر۔" بالے نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"مگر یہ سب غلط ہے بالے! تو نے دیکھا نہیں تھا کہ شکیل اس بے چاری کو کیسے مار رہا تھا۔"

"اپنے کو کیا؟" بالے نے ہنسی اڑائی۔

"یہ بات بڑوں تک پہنچائی جانی چاہیے۔ بلکہ میں خود......" نوما جوش سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تو جیدے نے ایک جھٹکے سے اسے بازو سے کھینچا۔ "اوئے! کوئی ضرورت نہیں اس کی۔ رفیع کوئی بچہ نہیں ہے۔ مکر جائے گا اس ساری بات سے اور ملبا ہم پر ڈال دے گا۔ موٹی عقل سے بھی سوچ سکتا ہے تو کہ بڑوں نے اس کی بات پہ یقین کرنا ہے کہ ہماری۔ اور پھر ہمارا حشر کیا کریں گے سب؟ یہ بھی سوچ لے ایک بار۔"

شکیل مکمل طور پر نفس کا پیروکار تھا۔ معصوم بچیوں کو ہراساں اور استحصال کرنے کی برائیوں میں بھی مبتلا تھا۔ اکثر اس کے رنگ برنگے بدقماش قسم کے دوست اس سے ملنے آ جایا کرتے تھے۔ بیمار اور لاچار ماموں کو الگ تھلگ کرنے میں بھیجنے کے بعد انہیں خوب کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا تھا۔ جیٹھ ہاڑ کی ان تپتی ہوئی طویل دوپہروں میں ابلیسیت کا برہنہ رقص ہوتا وہ گنبد اس سارے قبیح عمل سے واقف ہو چکی تھی لیکن زبانوں پر قفل لگائے بیٹھی تھی کیونکہ بزدلی اور موقع پرستی روشن گڑھ کے ہر مکین کا خمیر تھی۔

☆☆☆

شکیل فریدی کی گرفت دھیرے دھیرے روشن گڑھ پر کافی مضبوط ہو چکی تھی۔ وہ انتہائی ہوشیاری سے ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرتا تھا۔ اس کی تیز آنکھیں ایک ہی نظر میں مخالف کا ایکسرے کر لیا کرتیں جس کے بعد دوسری نظر وہ دانستہ جھکا لیتا تھا اور مخالف اس کی شرافت و پاکبازی کا مرید بن جاتا۔ پیری مریدی کا یہ رشتہ بند کواڑوں کے پیچھے خوب پروان چڑھا کرتا تھا ان میں اکثریت ان لڑکیوں کی ہوتی تھی جو آگہی کے روگ کا شافی علاج چاہتی تھیں لہٰذا شکیل فریدی اور اس کے دوستوں کی چیرہ دستیاں کبھی گرفت میں نہ آ سکیں۔ جیدا، بالا اور نوما چھجے کی آڑ سے ان کی خرمستیاں براہ راست ملاحظہ کرتے تھے۔ یہ سرگرمیاں ان تینوں کی ذات میں ایک بارود بھر رہی تھیں جس میں اک ذرا سی چنگاری ان کے وجود کے پرخچے اڑا سکتی تھی۔ شام کا وقت وہ کنویں کی منڈیر اور اس کے عقب میں واقع ایک خستہ حال سی جھونپڑی میں گزارتے تھے۔ اس

شام بھی بالا اور جیدا نوے کی آمد کے منتظر تھے لیکن وہ آ کے ہی نہ دے رہا تھا۔

"یہ نوما کدھر رہ گیا آج؟" جیدے نے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے کوفت سے کہا۔

"ہوگا یہیں کہیں۔ تو کیوں اتنا بے چین ہو رہا ہے؟" بالے نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

"دھیرج رکھ بھئی۔ بتاتا ہوں پھر سب کچھ۔" وہ مبہم انداز میں بولا۔

اسی اثناء میں نوما زمانے بھر کی کوفت چہرے پر سجائے آن وارد ہوا۔ "ہاں بھئی شہزادے! کدھر غائب ہے صبح سے؟" جیدا اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ اس کے اطوار کافی پُر اسرار اور ناقابلِ فہم تھے تاہم انہیں اتنا اندازہ ضرور ہو چکا تھا کہ وہ کوئی بہت بڑی خبر دبائے بیٹھا ہے جسے اگلے بغیر اسے چین بھی نہیں مل سکتا تھا۔

"میرا ماموں شہر سے آیا ہے آج صبح۔ میری پڑھائی کے متعلق سوال جواب ہی ختم نہیں ہو رہے تھے اس کے تو۔" نوما منہ بنا کر بولا۔

"ارے چھوڑ یار! کیا رکھا ہے پڑھائی میں۔ ہم دونوں کو دیکھ۔ کسی مائی کے لعل میں جرأت نہیں کہ ہمیں پڑھنے کے لیے مجبور کرے۔" بالا سینہ تان کر بولا۔

"میرے اماں ابا مجھے ماموں کی طرح بنانا چاہتے ہیں۔ ہر وقت ایک ہی رٹ پکڑے رکھتے ہیں بس۔" نوے نے کلس کر کہا۔

"بھئی! میں نے تو اب شادی کر لینی ہے جلد ہی۔" جیدے نے نہایت اطمینان سے بم پھوڑا۔

"ہائیں! شادی کس سے؟" وہ دونوں حیرت سے چلّا اٹھے۔

"دینو کی بیٹی سے۔ اچھے خاصے مالدار ہیں وہ لوگ۔"

"لیکن یہ کب ہوا؟ اور تو نے بتایا ہی نہیں ہمیں۔" بالا شاکی لہجے میں بولا۔

"بتانے کے لیے تو خیر بہت کچھ ہے میرے پاس" جیدے نے چٹخارہ لیتے ہوئے کہا۔ "بڑے مہینوں سے مسلسل ملاقات چل رہی ہے میری اس سے۔"

"بڑا ہی میسنا اور گھنا ہے تو جیدے۔ ہوا بھی نہیں لگنے دی ہمیں۔" نوما بھی گلہ کرنے لگا۔

"تو تم لوگ بھی بسم اللہ کرو کہیں۔ روکا کس نے ہے؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں؟ اپنے مدرسے کی پھلجھڑیاں آخر کس دن کام آئیں گی؟ لیکن بتا تو سہی کہاں تک معاملات پہنچے تم لوگوں کے؟" نوے نے معنی خیز انداز میں کہا تو بالے نے بھی اس کی فوری تائید کر ڈالی۔ اور پھر جیدا ان کے تصور کی انگلی تھامے انہیں ایک طویل سفر پر لے گیا۔ ایسا سفر جس کی مسافت بظاہر بہت خوشنما، دل آویز اور انتہائی مسحور کن تھی لیکن اس کے تعفن سے زندگیاں گل سڑ جاتی ہیں۔

☆☆☆

"موج لگ گئی شہزادے تیری تو! یہ ہوئی ناں بات۔" جیدا خوشی اور رشک کے ملے جلے تاثر سے نوے کے کندھے پر گھونسا رسید کر کے بولا۔

"کاہے کی موج یار؟ گاؤں کے بغیر، تم لوگوں کے بغیر دل کیسے لگے گا میرا؟" نوما خاصی بددلی کا شکار تھا۔ اس نے رو دھو کر گاؤں کے مڈل اسکول کا امتحان پاس کر لیا تھا اور اس کا "ولن ماموں" ایک بار پھر اس کے والدین کے کان بھرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میٹرک کے امتحان کے لیے وہ اسے شہر کے کسی اچھے اسکول میں داخل کروا کے اس کا مستقبل سنوارنے کا خواہشمند تھا۔ نوما غیر نصابی سرگرمیوں میں اپنے دوستوں کے ہمراہ اس قدر ماہر کھلاڑی بن چکا تھا کہ محدود اور بے رنگ کتابی دنیا سے اسے بالکل رغبت نہ رہی تھی۔

"پاگل مت بن! مجھے کبھی ایسا سنہری موقع ملتا تو میں کبھی بھی ضائع نہ کرتا۔" جیدا ذو معنی انداز میں اسے گھرک کر بولا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ شہر میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ہی پڑھتے ہیں۔"

"اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔" نوما کھلکھلا کر ہنسا۔

"دھیان کی بات نہ کر اب۔ دھیان تو تیرے بڑے گہرے ہوتے ہیں۔" بالے کے لہجے کی تپش نے ان دونوں کو ساکت کر دیا۔

"بس کر دے بالے اب۔ وہ بات ختم ہو چکی ہے۔" جیدے نے پاس ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو اسی کا ساتھ دے گا ناں۔ میری تو کوئی سنتا ہی نہیں۔" بالا پیر پٹخ کر بولا۔

کچھ عرصہ پہلے بالے کی پھپھی کی بیٹی کے ساتھ نوے کے تعلقات انتہائی تیزی سے پروان چڑھے تھے۔ دونوں فریقین کی باہمی رضامندی سے اس رشتے نے تمام تر اخلاقی حدود و قیود کی پامالی کر ڈالی تھی۔ لیکن کسی کو بھی اندازہ ہی نہ تھا

کہ میمونہ اندرون خانہ بالے کی بے ضابطہ منگیتر قرار پا چکی ہے اور جب بات کھلی تو بالے نے گویا آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ کسی صورت میمونہ کو اب اپنی زوجہ کے روپ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن گھر والوں کے سامنے انکار کی اصل وجہ بتانا ایک نئے طوفان کو مدعو کرنا تھا جس کی تاب اس میں بالکل نہ تھی۔ نوے نے اپنی اس نادانستہ کوتاہی کے لیے بالے سے بہتیری معافی مانگی مگر اس کے شب و روز غصے اور نفرت کی آگ میں سلگتے رہتے تھے جس کے باعث ان کی باہمی دوستی میں ایک بے عنوان کھنچاؤ اور سرد مہری در آئی تھی۔ جیدا ہی ان کے درمیان پل کا کردار ادا کرتا آ رہا تھا اور اب بھی اس نے یہی کیا۔

"اس نے جان بوجھ کر تو نہیں کیا تھا ایسا اور میمونہ کی مرضی بھی تو شامل تھی اس میں۔ اگر اسے علم ہوتا تو کیونکر کرتا یہ سب؟" جیدا دبنگ انداز میں بولا۔

"ہاں تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ اس نے جان بوجھ کر کیا تھا مگر وہ گلے پڑا ڈھول بجانا تو مجھے پڑے گا ناں۔" بالے کے خودساختہ غم کسی صورت کم ہی نہ ہو رہے تھے۔

"اچھا چل چھوڑ! جو ہو گیا اب بدلا تو نہیں جا سکتا ناں۔ نوما جا رہا ہے یہاں سے کیا پتا کبھی واپس آئے یا اسے بھی شہر کی ہوا راس آ جائے۔ ہنسی خوشی الوداع کہہ اپنے بچپن کا ساتھی ہے آخر۔" جیدے نے معاملہ ٹھنڈا کرواتے ہوئے کہا تو بالے نے بادل ناخواستہ اسے گلے لگا لیا۔ وہ ابھی عمر کے اس موڑ پر نہیں آئے تھے کہ سمجھ پاتے دوسروں کی عزتوں سے کھلواڑ کرنے والوں کو اس قرض کی ادائیگی اپنے ہی سکوں میں کرنی پڑتی ہے۔ فی الوقت وہ زندگی کی دوڑ میں نفس کے چابک کھاتے سرپٹ بھاگتے چلے جا رہے تھے۔

☆☆☆

شہر کی رنگینیاں نوے کو بہت بھلی لگی تھیں۔ اوپری متوسط طبقے کا مخلوط تعلیمی نظام کا حامل اسکول اور اس کی سرگرمیاں اسے اپنے فسوں میں مکمل طور پر جکڑ چکی تھیں۔ وہ گویا کسی کنویں سے نکل کر ایک دریا میں آ گیا تھا۔ مخلوط نظام کی بدولت جہاں اسے اپنی سابقہ روش کی بحالی میں کوئی رکاوٹ نہ ملی تھی، وہیں لڑکیوں کے سامنے ہونے والی متوقع بے عزتی نے اس کے اندر چھپے ایک خوفزدہ دیہاتی کو پہلی بار پڑھائی میں کافی حد تک سنجیدہ کر دیا تھا اور اسی سنجیدگی و لگن کے طفیل وہ میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج میں پہنچ گیا تاہم زندگی کے اس سنگ میل کا جشن منانے وہ اپنے سنگی بیلیوں کے پاس روشن گڑھ جا پہنچا تھا۔

روشن گڑھ نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمام تر شعبہ زندگی میں بھرپور تنزلی کی تھی۔ غربت و افلاس، جہالت، بے راہ روی اور پسماندگی مزید سوا ہوئی تھی۔ جو چنیدہ افراد پڑھ لکھ کر برسرروزگار ہو گئے تھے، انہوں نے اپنے آشیانے پردیس میں بسا لیے تھے۔ نوے کے والدین کی خوشیاں سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔ اگلی صبح وہ اپنے مخصوص ٹھکانے پر جا پہنچا۔ جیدے نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔

"واہ بھئی! جیدا جی! بڑی صحت بنا لی ہے۔" نوما اس کے کسرتی جسم کو رشک سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"ارے! تو فارغ رہ کر ہم جیسوں نے اور کرنا بھی کیا ہے؟" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔ "اچھا ہی ہوا جو تو آ گیا آج ملنے ورنہ شہر جا کے ملنا بڑا مشکل ہو جاتا۔"

"کیوں؟ کہیں جا رہا ہے کیا؟"

"ہاں یار! سسرال والے اپنے خرچے پر کویت بھیج رہے ہیں۔ بعد میں موقع ملا تو گھر والی کو بھی بلوا لوں گا۔ یہاں رہے تو بچے بھی ہم جیسے ہی بن جائیں گے۔ راہوں کی دھول۔" جیدے کا لہجہ بہت گمبھیر تھا۔

"بالا کہاں ہے؟ اسے بھی تو پیغام بھیجا تھا میں نے۔" نوما دل گرفتگی سے بولا۔

"وہ آج کل بہت اونچی ہواؤں میں ہے بھئی۔ شکیل فریدی کا عہدہ سنبھال لیا ہے اس نے۔" جیدا استہزائیہ ہنسا۔

"وہ کیسے؟ شکیل فریدی خود کدھر گیا؟" نوما ششدر رہ گیا۔

"تنگ آ گیا تھا وہ ماسٹر صاحب کی وفات کے بعد اس چھوٹے سے گاؤں سے۔ کسی نئی جگہ کی تلاش میں چلا گیا۔ دو سال بالا اس کی شاگردی میں رہا ہے۔ اور اب بکار رفیع اللہ بن چکا ہے۔ تجھے ملنا ہے اس سے تو لے چلتا ہوں۔" جیدا آج بے حد سنجیدہ و اداس معلوم ہو رہا تھا۔ شاید تبدیلی اس کے وجود میں نمو پانے لگی تھی۔

"نہیں۔ چھوڑ بس! مجھے دیکھ کر وہ پھر باولا ہو جائے گا۔"

"ہنہ! ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اپنا اتا پتا دے کر جانا مجھے۔ کویت سے تجھے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں خط لکھا کروں گا۔"

"ایسا مت کہہ جیدے! تیرے خطوط میں مجھے میرے بچپن کی خوشبو محسوس ہوا کرے گی۔ میں منتظر رہا کروں گا تیرے

چشموں کا۔" نوما خلوص سے بولا۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر کنویں کی منڈیر پر بیٹھے مستقبل کے خواب بنتے رہے۔

☆☆☆

"تمہارا مستقبل بہت تابناک دیکھنا چاہتا ہوں میں ثمرہ! اپنی اکلوتی منتوں مرادوں سے ملی بیٹی کو کسی بھی ایرے غیرے کے حوالے نہیں کر سکتا ناں میں۔" وہ آج پھر اسے پندو نصائح کر رہا تھا۔

"جی بابا! میں نے کب انکار کیا اس حقیقت سے؟"

"تو پھر کیوں خوامخواہ خدشات کا شکار رہتی ہو؟ شادی کے ذکر سے کیوں تمہارا رنگ فق ہونے لگتا ہے؟" وہ نڈھال سے انداز میں اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام کر بولا۔ "سچ بتانا! کیا کہیں اپنی مرضی سے..........." اس کی آواز رندھ گئی۔

"نہیں بابا! ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" ثمرہ یکدم تڑپ کر بولی۔

"تو پھر کیوں نہیں کرنا چاہتی تم شادی۔ میں بوڑھی جان کتنی دیر جی لوں گا اور تمہیں اپنی زندگی میں ہی کسی محفوظ سائبان تلے دیکھ لوں گا تو موت بھی آسان ہو جائے گی۔ بتاؤ؟ کیا میری خواہش غلط ہے؟"

"نن...... نہیں...... بابا۔" اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"تو بس میرا پت! بھروسا رکھ مجھ پہ۔ میں تیرے لیے بہترین جیون ساتھی ڈھونڈوں گا جو تجھے پھولوں کی طرح رکھے گا۔" ثمرہ بے بسی سے باپ کو دیکھتی رہی اور پھر کالج جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

کالج کا دور نومے کے لیے مزید یادگار ثابت ہوا۔ آزادی اور جوانی کا نشہ اس کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ اس نے اپنی وجاہت اور خوبصورتی خوب کیش کروائی۔ لڑکیوں کے ساتھ وہ ہمیشہ باہمی رضامندی کے اصول کے تحت چلتا تھا اور جہاں بھی کوئی بے وقوف لڑکی اسے شادی کے لیے مجبور کرتی وہ فوراً آنکھیں پھیر لیا کرتا۔ اب تو اسے اپنی زندگی میں آنے والیوں کی تعداد بھی یاد نہ رہی تھی۔ صنف مخالف کا وجود اس کے لیے ایک ٹشو پیپر سے زائد اہمیت کا حامل بھی نہ تھا۔

واجبی سے نمبروں سے گریجویٹ ہونے کے بعد وہ بخوبی جانتا تھا کہ ایک اچھی نوکری کا حصول کسی معجزے سے کم نہ ہوگا۔ تب ہی اس کی قسمت نے یاوری کی اور اس کے ماموں اللہ دکھا ایک حادثے کا شکار ہو کر چل بسے۔ انہوں نے تاعمر شادی نہ کی تھی لہٰذا ان کے چھوٹے موٹے اثاثہ جات اور مکان بلا شرکت غیرے نومے کے تصرف میں آ گئے۔ اس نعمت غیر مترقبہ سے اس نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ان اثاثوں کی مدد سے زنانہ و بچگانہ ملبوسات کی ایک دکان کھول لی۔ روزگار میں یہ رنگینی اس کی فطری مجبوری بن چکی تھی کیونکہ چور چوری سے تو جا سکتا ہے مگر ہیرا پھیری سے کب فرار ممکن ہے؟

نوما اپنے والدین کی شہر منتقلی کا شدید متمنی تھا لیکن وہ دونوں روایت پرست بوڑھے اپنی جنم بھومی کی محبت میں اتنے شدت پسند تھے کہ انہیں اکلوتے بیٹے کی کوئی بھی دلیل قائل نہ کر پاتی تھی۔ وہ اکثر ان سے الجھ جاتا تھا۔

"کیا رکھا ہے اس پسماندہ جگہ پہ ابا جی اب؟ چھوڑیئے سب کچھ۔ بس میرے ساتھ چلیے اب۔ بہت رہ لیا آپ نے تنہا۔"

"اس جگہ کا کوئی مول ہی نہیں نومے! مگر تو کہاں سمجھے گا اور کس نے کہا کہ ہم اکیلے ہیں؟ اس گاؤں کا چپہ چپہ، بوٹا بوٹا ہمارا سنگی بیلی ہے۔" احمد علی کی بوڑھی آنکھیں خوابناک ہو جاتیں۔ "تو شادی کر لے میرا پت اب۔ میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ ننھے روئی کے گالوں جیسے پوتے پوتیاں گود میں کھلاؤں۔"

"ٹھیک ہے ابا جی! لیکن میں رشتے داروں یا روشن گڑھ کی کسی بھی لڑکی کو اپنی زندگی کا حصہ نہیں بناؤں گا۔" وہ اٹل لہجے میں بولا اور والدین کے پاس دل مسوس کر اس کی یہ ضد تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔

☆☆☆

نومے کی شادی کے لیے اس کے مرحوم ماموں کے دوست کی بیٹی نادیہ کا انتخاب کیا گیا۔ اس نے بے حد مان اور چاؤ سے بالے اور جیدے کو بھی دعوت نامے ارسال کیے۔ وہ خواہش کے باوجود اپنے بچپن سے ناتہ نہیں توڑ سکا تھا۔ جیدے نے کویت سے اسے مبارکباد کا خط اور انتہائی پُر خلوص معذرت نامہ بھیجا جس کے ہر ایک لفظ سے اس کی محبت ظاہر ہو رہی تھی۔

"زندگی کا نیا سفر بہت مبارک ہو شہزادے! میری بہت تمنا تھی کہ تیری شادی میں میرا بیٹا شہ بالا بنتا۔ لیکن قسمت پہ کس کا زور چلا ہے؟ کل تک ہم ایک جان تھے مگر آج روزی روٹی نے سوکھے پتوں کی طرح کہاں سے کہاں لے جا پھینکا۔ شادی کے بعد میں بہت بزدل ہو گیا ہوں۔ اپنے بچوں

کی عافیت ہمیشہ دل ہولاتی رہتی ہے۔ بالے سے تعلقات میں سوچ سمجھ کر لینا۔ اس کی زندگی سے میں نے ایک بات پلے باندھ لی ہے۔ تجھے یاد ہے ناں بچپن میں ہم پرانے کھنڈر میں جا کر مختلف آوازیں نکالتے تھے اور وہی آوازیں ہمیں پلٹ کر سنائی دیتی تھیں تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ زندگی بھی شاید انہی آوازوں کے ہیر پھیر کا ہی نام ہے۔ اپنے بچوں کو زیادہ دوستیاں مت بنانے دینا۔ میرے تھوڑے کہے کو بہت جان لے۔ بھرجائی کو میرا اسلام کہنا۔ رب تیرا سدا راکھا رہے۔"

نوما کتنی ہی دیر کاغذ کا وہ ٹکڑا ہاتھ میں تھامے خلا میں جانے کیا تلاشتا رہا۔ اس کے دل پر ایک عجیب سا بوجھ دھر آیا تھا اور جانے کیوں اسے محسوس ہونے لگا کہ بالے کے بعد جیدا بھی ہمیشہ کے لیے اس سے بچھڑ گیا ہے۔

شادی کے بعد نومے کی زندگی میں کئی تبدیلیاں در آئی تھیں۔ نادیہ کے انتخاب سے قبل اسے شریکِ حیات کے متعلق بہت تحفظات تھے۔ اسے اپنی آیندہ نسل کے لیے ایک باحیا اور باکردار عورت کی تلاش تھی جو بالآخر انجام خیر تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن چھٹتی نہیں کافر منہ سے لگی ہوئی کے مصداق اس کی زندگی سے رنگینیوں کا باب تا حال ختم نہ ہوا تھا۔ اپنی دکان پر آنے والی کئی ایک خواتین کے ساتھ اس کے تعلقات استوار تھے۔ وہ اپنے تئیں گھر اور بیرونی سرگرمیوں میں بخوبی توازن برقرار رکھے ہوئے تھا لیکن زندگی کے اس سرکس میں ماہر ترین بازیگر بھی کمال مہارت کے باوجود تنے ہوئے رسے پر ڈگمگاتا ضرور ہے اور یہ ڈگمگاہٹ بہت جان لیوا خراج وصول کیا کرتی ہے۔

☆☆☆

"کتنی دیر میں پہنچیں گے آپ گھر؟" نادیہ کی کراہتی آواز نے اسے یکدم بوکھلا دیا تھا۔ وہ اس وقت شہر کے مشہور اور الگ تھلگ ہوٹل میں ایک نئے شکار کے ساتھ موجود تھا۔ ان کے گھر نئے مہمان کی آمد متوقع تھی۔ اس نے والدین کو بھی منت سماجت کے بعد کچھ عرصہ اپنے ساتھ رہائش کے لیے راضی کر لیا تھا لیکن وہ سیدھے سادے دیہاتی بہو کو اس مشکل وقت میں اسپتال نہیں لے جا سکتے تھے۔ اس ہنگامی صورتِ حال نے نومے کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے۔

"میں بس تھوڑی دیر تک پہنچتا ہوں۔ تم گھبرانا مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ بیوی سے زیادہ خود کو بہلا رہا تھا۔ شہر کے دوسرے کونے میں موجود اس ہوٹل سے واپسی میں تاخیر کا خمیازہ اسے بہت بھاری پڑا تھا۔

☆☆☆

"بس کر اب نادیہ دھی! کتنا روئے گی اور؟ اللہ نے اپنا کرم کر تو دیا ہے۔ صبر کر بس۔" رشیدہ نے بہو کو پچکارتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہوتا صبر مجھ سے۔ یہ کیا سمجھتے ہیں مجھے ان کی حرکتوں کا علم نہیں ہوا کبھی۔ یہ باہر جو مرضی گل کھلاتے رہے میں نے اف تک نہ کی کبھی۔ مگر آج ان کی وجہ سے میری اولاد چھن گئی مجھ سے۔ کیسے کرلوں میں صبر؟" نادیہ کی تڑپ دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان کے جڑواں بچوں میں سے بیٹا بہت مشکل سے بچ پایا تھا۔

"چھوڑ دوں گا میں سب کچھ نادیہ! بس آخری بار معاف کر دے مجھے۔ اس حادثے نے ہماری اولاد ہی نہیں میرے اندر ایک نومے کو بھی مار دیا ہے" وہ انتہائی منتشر اور بکھر چکا تھا۔

"میں کون ہوتی ہوں معافی دینے والی آپ کو؟ معافی مانگیے اس سوہنے رب سے، جس کی قائم کردہ حدود جانے کتنی بار پامال کی ہیں آپ نے۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔ "مجھے تو اب بھی یہی خدشہ ہے کہ آپ کی بوئی گئی فصل جانے زندگی کے کس موڑ پر مجھے یا میری اولاد کو کاشت نہ کرنی پڑ جائے۔"

"مت کر ایسی بات نادیہ! ایسی بددعائیں تو نہ دے مجھے۔" نوما یہ تازیانہ برداشت نہ کر پایا۔ لیکن وقت کی تمام تر مہربانیاں اب ختم ہو چلی تھیں۔ زبیر کی پرورش انتہائی کٹھن ثابت ہو رہی تھی۔ وہ عام بچوں کی طرح بالکل بھی چست نہ تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک ناقابلِ فہم بے ربطگی نظر آتی تھی۔ نوما والدین اور اولاد دونوں اطراف سے بے بسی کا شکار تھا۔ روشن گڑھ کے وہ دونوں بوڑھے اپنی زمین اور گھر کسی طور چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے۔ دوسری جانب گزرتا ہوا ہر پل زبیر کی شخصیت میں پنہاں نئی سے نئی کجی سامنے لا رہا تھا۔ ذرا ہوش سنبھالتے ہی اس نے ایک نیا مشغلہ اختیار کر لیا۔ نادیہ کے دوپٹے اوڑھ کر وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے عجیب و غریب حرکات کرتا۔ ہاتھ نچا کر بات کرنے کا مخصوص انداز اور تیور نومے کا کلیجہ چھلنی کر دیتے تھے۔ سختی اور پیار ہر حربہ اس پر ناکام ثابت ہوا تھا۔ ردعمل کے طور پر وہ حلق پھاڑ کر چیختا اور پورا گھر سر پر اٹھا لیتا تھا۔

والدین کے اصرار کے باوجود وہ اسے روشن گڑھ لے جانے کی تاب خود میں نہ پاتا تھا۔ نادیہ کی ذہنی حالت بھی بیٹے

کی اس بیماری کے باعث دگرگوں رہتی تھی۔ وہ ان دنوں ایک بار پھر امید سے تھی جب قسمت نے ان پر ایک اور وار کرڈالا۔

☆☆☆

وہ جون کی ایک تپتی ہوئی دوپہر تھی جب زبیر ماں کو سوتا پا کر چپکے سے بیرونی دروازے کی طرف لپک گیا۔ کچن میں موجود چھوٹی سی وضو کی چوکی پر سوار ہو کر قفل کھولنا اس کے لیے چنداں مشکل ثابت نہ ہوا۔ نوما دوپہر کھانے کے بعد قیلولے کی غرض سے گھر پہنچا تو چوپٹ کھلا ہوا دروازہ اور نادیہ کے بین اسے کسی انہونی کی خبر دے گئے۔ زبیر کو اس دن کے بعد کبھی کسی نے کہیں نہ دیکھا۔ ٹی وی، اخبارات اور ریڈیو پر دیئے گئے تمام اشتہارات بے سود ثابت ہوئے۔ اہل محلّہ کی چٹخارہ دار باتیں الگ دل کلساتی تھیں۔

''بھئی! آپ نے کسی ڈاکٹر کو کیوں نہ دکھایا تھا بیٹے کو؟ اسے کسی ادارے میں ہی داخل کروا دیتے تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ کسی جرائم پیشہ گروہ کے ہتھے نہ لگ گیا ہو۔ بے چارہ بچہ! جانے کیا بیت رہی ہوگی اس پہ۔'' بظاہر ہمدردی کی آڑ میں خوب نشتر زنی کی جاتی۔

نومے کے والدین بھی گاؤں سے یہ خبر سن کر دوڑے چلے آئے تھے۔ گھر میں ہمہ وقت ایک ماتمی فضا قائم رہتی۔ نادیہ کی ذہنی حالت خراب تر ہونے لگی ان دونوں میں جھگڑے بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔

''تمہاری غلطی نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا نادیہ! کیسی ماں ہو تم۔ ارے! مائیں تو سوتے میں بھی اولاد پر نظر رکھتی ہیں اور تمہیں کوئی ہوش ہی نہ رہا کہ میرے جگر کا ٹکڑا کب اس گھر کی دہلیز پار کر گیا۔''

''میرے نصیب ہی خراب ہیں۔ اولاد کا سکھ کبھی ملا ہی نہیں۔ آپ کو کیا لگتا ہے اس کے بچھڑنے کا مجھے کوئی دکھ نہیں۔ جیتے جی مار گیا ہے وہ مجھے۔ اللہ جانے کہاں کس حال میں ہوگا وہ۔'' نادیہ کرب سے اپنے بال نوچنے لگتی۔

نوما اس حادثے کے بعد مزید تبدیلیوں کی زد میں آ گیا۔ نماز پنجگانہ کی ادائیگی کے بعد وہ گڑگڑا کر اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگا کرتا تھا۔ صحت مند اولاد کے لیے اس نے بے انتہا دعائیں مانگیں۔

''یا اللہ! میری غلطیوں کی بخشش فرما دے۔ میں نے بہت صدمے جھیل لیے اب تو یہ آزمائش ختم فرما دے میرے معبود۔ اب تو انصاف فرما دے۔''

ماضی کی سابقہ روش ترک کرنے کے بعد اس میں نمایاں تبدیلیاں در آئیں اور پھر بالآخر اس کی دعائیں مستجاب ٹھہریں۔ رب تعالیٰ نے اسے اپنی رحمت سے نواز دیا۔ اس ننھی سی کلی جیسے وجود کو ہاتھوں میں تھامے وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ نادیہ نے بھی اس کی تبدیلی اور موجودہ حالت کے پیش نظر خود کو کافی حد تک ڈھال لیا تھا۔

''بس کیجیے اب۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی دعائیں رنگ لے آئیں۔'' وہ زخمی مسکراہٹ سے بولی۔

''ہاں نادیہ! رب نے مجھ گناہ گار کی سن ہی لی۔ میرے ساتھ انصاف فرما دیا۔ میری دعاؤں کا ثمر عطا کر دیا مجھے۔ یہ ننھی پری میری دعاؤں کا ثمر ہی تو ہے۔ اس کا نام ثمرہ رکھیں گے بس۔'' اس نے اشکبار آنکھوں سے بیٹی کی پیشانی پر مہر محبت ثبت کرتے ہوئے کہا۔ وہ یہ سچائی فراموش کر چکا تھا کہ رب تعالیٰ سے انصاف نہیں، رحم طلب کیا جاتا ہے کیونکہ اس کا انصاف بہت کھرا اور کڑا ہوتا ہے جسے برداشت کرنے کی بساط کسی بشر میں نہیں ہوتی۔

☆☆☆

''آج پھر تمہارا بی پی معمول پر نہیں ہے۔ کس بات کی پریشانی لیتی رہتی ہو آخر؟'' نومے نے فکرمندی سے نادیہ سے استفسار کیا۔

''میرا بیٹا...... میرا جگر گوشہ...... زبیر۔ جانے کس حال میں ہوگا؟ اس کی جدائی ایک رستا ناسور بن چکی ہے میرے لیے۔ اتنے سالوں میں ایک لمحے کے لیے بھی اس کا خیال دل سے جدا نہیں ہوتا۔ کسی پل بھی قرار نہیں ملتا۔ کیا کروں میں؟'' وہ بے بسی سے بولی۔

''بے قراری تو میرے وجود پر کسی موسم کی مانند ٹھہر گئی ہے۔ مگر اب اس ننھی گڑیا کی طرف بھی تو دیکھنا ہے۔ بڑی بھاری ذمہ داری ہے یہ ہم پر نادیہ! تم ہمت ہار دو گی تو کیسے سنبھال پائیں گے ہم ثمرہ کو۔'' اس کے لہجے میں انجانے اندیشے کلبلا رہے تھے۔

''ٹھیک کہہ رہے ہیں جی آپ۔ صرف اسی کا وجود تو مجھے زندگی کی ڈور سے باندھے ہوئے ہے۔ ورنہ زبیر کے بعد جینا ایک ناممکن امر تھا میرے لیے۔'' وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

آنے والا وقت ان کے لیے مشکل نہیں تو آسان بھی ثابت نہ ہوا تھا۔ ثمرہ کی تربیت انتہائی کڑے انداز میں کی گئی۔ اسے اسکول لانے اور چھوڑنے کی ذمہ داری نومے نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ وہ گرم ہوا کا کوئی ہلکا سا تھپیڑا بھی اپنی

بیٹی کی طرف بڑھتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ثمرہ خود بھی کافی کم گو اور لیے دیئے رہنے والی لڑکی تھی۔ اس نے اپنے والدین کی کسی بھی بات یا فیصلے کے سامنے کبھی کوئی آواز نہ اٹھائی تھی۔ روشن گڑھ سے اس کے تعلقات کا سلسلہ صرف والدین کے وجود تک ہی محدود ہو گیا تھا۔ جیدے کے خطوط میں قدرے تعطل آتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے خاندان کو روشن گڑھ جیسی عفریت سے محفوظ رکھنے کی غرض سے تاحیات بن باس کاٹنے کے لیے تیار تھا۔ نوما بھی اس کے فیصلے سے مکمل متفق تھا۔ وہ اپنے والدین ہی کو ہمیشہ شہر بلوا بھیجتا تھا۔ بوڑھے دادا دادی بھی اپنی پوتی پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ جب بھی انہیں ملنے شہر آتے تو موسمی سوغاتوں کا ڈھیر لگا دیا کرتے تھے۔ زندگی مکمل نہ سہی تاہم قدرے ہموار ہو چلی تھی۔ نادیہ کی طبیعت کا اتار چڑھاؤ اب ایک معمول بن چکا تھا لیکن وہ اس قدر خاموشی سے انہیں چھوڑ جائے گی، یہ خیال تو گمان کے کسی گوشے میں بھی نہ تھا۔ مئی کی ایک پرتپش شام میں اچانک ہونے والے بخار نے اسے جھٹ پٹ راہی ملک عدم کر دیا۔ نوے نے زندگی میں پہلی بار اپنی ذات کو بالکل تنہا محسوس کیا لیکن ثمرہ کا وجود اس کے لیے بہت بڑی تحریک تھا۔ وہ عمر کے دسویں سال میں قدم رکھ چکی تھی۔ اس کی اٹھان اپنے والدین ہی کی طرح شاندار اور دل موہ لینے والی تھی۔

زندگی کے اس موڑ پر نوما اپنے والدین سے روشن گڑھ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے پر مصر تھا۔ رشیدہ بیگم بیٹے کی سونی زندگی کے پیش نظر اس کے فیصلے میں نیم دلی سے رضامند تھی لیکن احمد علی کے لیے اپنی جڑوں سے دوری تا حال کٹھن امر تھا۔ نوما اپنے باپ کی روزانہ منت سماجت کرتا۔

"کیا پڑا ہے اس دھول اڑاتے گاؤں میں آخر؟ اس وقت ان مردہ قبروں سے زیادہ آپ کے بیٹے کو زندگی کی ضرورت ہے ابا جی! مجھے کیوں نہیں آخر آپ؟ اگر یونہی ضد دکھانی تھی تو مجھے کیوں بھیجا تھا شہر؟ پہلے مجھے اس گاؤں کے لیے اجنبی بنا دیا اور اب میری آزمائش میں میرا ساتھ بھی نہیں دے رہے۔" وہ گلوگیر ہو گیا تو احمد علی کا دل بھی پسیج گیا۔

"ٹھیک ہے پت! اس بڑھے ویلے زندگی ویسے ہی بوجھ لگنے لگتی ہے۔ اگر اپنی اولاد کا بھلا کر سکوں تو خوش نصیبی ہوگی یہ میری۔" وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ "تو چل نا ہمارے ساتھ کچھ دن۔ زمین اور گھر کا کوئی سودا کر آنا اپنی مرضی سے، ورنہ میرا دل پھر ہمکتا رہے گا وہاں جانے کے لیے اور جو بھی حصہ بنے وہ میری ثمرہ دھی کی شادی کے لیے

محفوظ کرلینا۔"

احمد علی کی یہ نئی شرط اس کے لیے فکر کا ایک نیا در وا کر گئی۔ وہ ہمیشہ ہی سے روشن گڑھ اکیلا جایا کرتا تھا لیکن پہلے اس کی شریکِ حیات گھر میں ثمرہ کے پاس رہتی تھی۔ اب اکیلے گھر میں بیٹی کو چھوڑ کر جانے کا تصور بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ گاؤں میں اب کوئی واقف کار اور قابلِ بھروسا فرد بھی نہ رہا تھا جس سے وہ اس مشکل وقت میں مدد طلب کرسکتا۔ لے دے کے ایک بالا ہی تھا مگر اتنے طویل عرصے کی دوری اور سابقہ چپقلش نے اس رشتے کو بھی بے جان اور کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ نوے کے دل سے بے اختیار ایک ہوک سی اٹھی اور چاروناچار اس نے ثمرہ کو بھی ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔

زمین اور گھر کا سودا جیدے کے چھوٹے بھائی اصغر کے تعاون کی بدولت خلافِ توقع بہت جلد خوش اسلوبی سے نمٹ گیا لیکن ماں کی جدائی سے نڈھال ثمرہ وہاں بہت بیمار ہوگئی تھی۔

گاؤں میں چند دن قیام کے دوران اس کا سامنا کئی ایک بار بالے سے ہوا۔ جس کے انداز و اطوار کی فرعونیت اور ظاہری حلیہ میں شکیل فریدی کا عکس اس کی طبیعت مکدر کر گیا۔ بالے کا اندازِ تخاطب بچپن کی کسی سہانی یاد سے میل نہ کھاتا تھا۔ جمعہ کی باجماعت نماز کے دوران وہ بڑے کروفر سے اسے مخاطب ہوکر بولا۔

"زہے نصیب! آج نعمان صاحب نے ہماری مسجد کو رونق بخش دی۔ ہاں بھئی! اس عمر میں تو بڑے بڑے اپنے گناہوں سے تائب ہو جاتے ہیں۔ کبھی آنا میرے مدرسے میں...... خصوصی وظائف بتاؤں گا معافی و مغفرت کے۔" اس کی سرمے سے بھری آنکھیں اور ہونٹوں پہ کھیلتی طنزیہ مسکراہٹ نوے کو بچپن کے کئی گمراہ لمحات ازسرِنو یاد کروا گئے۔ اس کا دل یکدم بے حد بوجھل ہوگیا اور وہ خاموشی سے وہاں سے پلٹ آیا۔

اللہ اللہ کر کے تمام معاملات کی تکمیل کے بعد وہ والدین کو ہمراہ لیے روشن گڑھ سے ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ آیا۔ اس کے اعصاب اب بے حد پُرسکون اور ذہن مطمئن تھا لیکن اس اطمینان کا تاوان اسے احمد علی کی دائمی جدائی کی صورت میں ادا کرنا پڑا تھا۔ وہ روشن گڑھ کی زمین کا شجر تھا اور اپنی جڑوں سے دوری اس کے وجود کو بالآخر ختم کرگئی تھی۔ ماں کے بعد اب جان سے زیادہ عزیز رکھنے والے دادا کی وفات نے ثمرہ کو مزید خاموش کردیا۔ دادی نے حتی المقدور پوتی کی پرورش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اپنی زندگی میں ہی جیسی

خوبصورت ترین نعمت کی کمی کا مداوا اس نے ثمرہ کی صورت میں جی بھر کے پورا کیا اور اسے بھی گھریلو امور میں طاق کر دیا۔ زندگی اب قدرے سہل لگنے لگی تھی۔

☆☆☆

ثمرہ کے انٹر کے امتحانات کے بعد رشیدہ بیگم بھی سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئیں۔ ماں کی اس جدائی نے نوے کو ایک بار پھر کسی گلستان سے تپتے صحرا میں لا پھینکا۔ زندگی کے اس موڑ پر اس کے ذہن پر اب ایک ہی دھن سوار تھی۔ وہ جلد از جلد بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونے کا خواہشمند تھا۔ لیکن شادی کا ذکر سنتے ہی ثمرہ کی حالت متغیر ہوگئی اور وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔

"میں آپ کو اکیلا چھوڑ کے کیسے چلی جاؤں بابا؟ میں آپ سے دور نہیں جانا چاہتی۔ آپ کے ساتھ ہی رہوں گی ہمیشہ۔"

"لے پگلی نہ ہو تو! بیٹیاں سدا ساتھ کب رہ سکتی ہیں بھلا؟ وہ تو بابل کے آنگن کی چڑیاں ہوتی ہیں جنھیں جلد یا بدیر اڑ جانا ہوتا ہے۔" وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے شفقت سے مسکرایا۔

"لیکن میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ بس" اس کے لہجے میں پوشیدہ خوف کو وہ روایتی جھجک ہی سمجھتا رہا۔

"اچھا! چل ایسا کریں گے۔ ہم گھر جوائی ڈھونڈ لیں گے پھر میرے پاس ہی رہ لینا۔ اچھا ہے، میرا بھی دل لگا رہے گا اپنے نواسے نواسیوں کے ساتھ۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر اسے دلاسہ دیتا۔

لیکن آج، اس نئی افتاد پر اسے اعصاب اپنا ساتھ چھوڑتے محسوس ہونے لگے۔

☆☆☆

ڈرائنگ روم میں اس وقت ایک اعصاب شکن خاموشی طاری تھی۔ صوفے پر براجمان دو خواتین اور ایک مرد کسی بے چینی کا شکار تھے۔

"کیا آپ نے اپنی بیٹی کی رضامندی دریافت کی تھی نعمان صاحب؟" ادھیڑ عمر عورت نے تیکھے چتونوں سے دریافت کیا۔

"میری بیٹی کی رضامندی میری مرضی سے الگ نہیں بہن جی۔" اس کی دھڑکن کی رفتار معمول سے تیز ہوگئی تھی۔

"معاف کیجیے گا بھائی صاحب! لیکن آپ کی بیٹی کے تیور تو کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔" اس عورت نے بغیر لگی لپٹی کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ میری بیٹی کے کردار پر انگلی

اٹھا رہی ہیں آپ؟ نعمان کے اندر برسوں پرانا تروما یک لخت بیدار ہوا۔

”نہیں بھائی صاحب! ان کا یہ مطلب نہیں تھا۔“ ان کے ساتھ موجود باریش مرد نے متانت سے کہا۔ ”ثمرہ بہت معصوم اور باحیا لڑکی ہے۔ آپ نے یقیناً بن ماں کی اس بچی کی بہت اعلیٰ تربیت کی ہے مگر.........“

”مگر کیا بھائی جی؟ ایسا کیا کہہ دیا ہے ثمرہ نے آپ کو؟“ نعمان کے دل کو یکدم کوئی نوکیلی شے جکڑنے لگی تھی۔

”نہیں۔ اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا مگر اس کی سراسیمگی اور وحشت کچھ اچھا تاثر نہیں دیتی۔ ہم بھی عورت ذات ہیں اور دوسری عورت کے خدشات بخوبی پڑھ سکتی ہیں۔“ ان کے ساتھ موجود ذرا کم عمر نظر آنے والی لڑکی نے کہا۔ ”آپ پلیز اس کے ڈر کا خاتمہ کیجیے۔ زندگی کا نیا سفر الجھنوں کے زادِ راہ سے شروع نہیں کیا جا سکتا۔ ہم پھر دوبارہ آئیں گے۔“ اس نے بڑے خلوص سے کہہ کر جانے کی اجازت لی۔

وہ صوفے کی پشت پر سر رکھ کر بے اختیار اپنا سینہ مسلنے لگا۔ چند آنسو پلکوں کی حد بندی کی بغاوت کر کے اس کی کنپٹیوں کے پاس بہہ نکلے جن میں ماضی کا عکس کسی ٹھہری ہوئی شفاف جھیل کی مانند جھلکنے لگا۔ اس شفافیت میں وہ دیوانہ وار اپنی کوتاہیاں اور ثمرہ کی تربیت کا سقم تلاشنے لگا۔ ان کے جانے کے بعد سے دل پر دھرا بوجھ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے اور دل و دماغ ایک ہی فریاد کر رہے تھے۔

”یا اللہ! کہاں کوتاہی رہ گئی اب مجھ سے۔ میں نے تو کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اس کی تربیت میں۔ پھر یہ آزمائش کیوں؟“ اس کے بین بڑھتے ہی چلے گئے۔ چہرہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ ضبط کا دامن جب تار تار ہو گیا تو کراہیں بے ساختہ دھاڑوں میں بدل گئیں۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گرا شکستگی سے اپنے بال نوچنے لگا۔ ثمرہ اس کی آوازیں سن کر برہنہ پا ڈرائنگ روم میں دوڑی آئی۔

”بابا! کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ ہوش کریں پلیز...... آپ کی طبیعت پہلے ہی نہیں ٹھیک۔“ اس نے تڑپ کر باپ کے بازو تھام کر کہا۔

”مت قریب آؤ میرے۔ جاؤ چلی جاؤ یہاں سے۔“ اس کی آنکھیں اور لہجہ لہو رنگ ہو رہے تھے۔

”مت کریں ایسا بابا۔ اٹھیں پلیز۔“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”اپنی شکل لے جاؤ میرے سامنے سے ثمرہ۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ وہ تنفر سے اسے جھٹک کر بولا۔

”کہاں چلی جاؤں بابا؟ میری کوئی جائے امان نہیں ہے کہیں بھی۔“

”بس کر دو یہ ڈرامے اب! اور سیدھی طرح بتاؤ مجھے کس کے ساتھ نکاح کی مرضی ہے تمہاری؟ بیٹیاں جب شادی سے انکار کرنے لگیں تو سمجھ جانا چاہیے کہ وہ اپنی مرضی کی تکمیل چاہتی ہیں...... میں ہی بے وقوف تھا جو اپنی تربیت اور تلافی کے زعم میں تمہیں ڈھیل دیتا رہا۔ بتا ہی دو آج مجھے کس کے لفظوں کے جال میں آ کر باپ کی عزت داؤ پر لگائی ہے تم نے؟“ وہ اسے زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے دھاڑا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے بابا! میں نے کبھی آپ کی تربیت پر حرف نہیں آنے دیا۔“

”میں نہیں یقین کر سکتا تیری کسی بھی بات پر اب۔ یہ سب تیری ماں کی بدولت ہی ہوا ہوگا۔ اولاد بھی سنبھالی ہی نہ گئی اس سے۔ بیٹا بھی اس کی بے پروائیوں نے گنوا دیا اور اب بیٹی نے بھی جانے کون سے گل کھلا رکھے ہیں۔“ تو ما بالکل ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا۔

”بس کر دیجیے بابا...... خدارا میری مرحومہ ماں کو تو بخش دیجیے۔ وہ ذمہ دار نہیں ہیں اس سارے قضیے کی۔“ ثمرہ پھٹ پڑی۔

”تو کون ہے ذمہ دار، بتاؤ مجھے۔“

ثمرہ کی آنکھوں میں برسوں پرانا منظر تازہ ہو گیا۔

”کیا ہو گیا میری دھی رانی کو؟ کیوں اتنا بخار چڑھا لیا آتے کے ساتھ ہی؟“ دادی کی شفیق اور فکر مند آواز پر ثمرہ نے بخار سے سوجی ہوئی آنکھیں بمشکل کھول کر اس کی جانب دیکھا۔ ماں کی وفات کے بعد وہ روشن گڑھ اپنے آبائی گھر میں موجود تھی۔ ماں کی جدائی، سفر کی طوالت، بے آرامی اور گاؤں میں مچھروں کی بہتات نے مل کر اسے اچھا خاصا بیمار کر دیا تھا۔

”کچھ نہیں دادی...... بابا آئیں گے تو دوائی لے کر ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ وہ پپڑی زدہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بدقت بولی تھی۔

”آئے ہائے! وہ تو رات کو دیر سے لوٹے گا۔ زمین کے سودے کوئی گڈے گڑیا کا کھیل تھوڑی ہیں۔“ دادی کی تشویش کسی صورت کم نہ ہو رہی تھی اپنی اس اکلوتی پوتی پر وہ جان چھڑکتی تھی۔ کافی دیر تک وہ اسے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتی رہیں لیکن جب اس سے بھی کوئی افاقہ نہ ہوا تو اسے یکدم ایک خیال سوجھا۔

”نظر لگ گئی ہے میری شہزادی کو۔ چل آ میرے ساتھ دم کروا کے لاتی ہوں تجھے۔“ ثمرہ قطعی طور پر اس کے

ساتھ جانا نہ چاہتی تھی لیکن بوڑھی دادی کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اور منت ریز لہجہ اس سے انکار نہ کرواسکا۔ گھر سے ایک اسکول نما عمارت تک کے سفر نے اسے بہت تھکا دیا۔ بخار کے باعث ہونے والی کمزوری سے وہ بری طرح ہانپنے لگی۔ اسکول میں چالیس سے متجاوز ایک گٹھے ہوئے جسم والے آدمی نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ اس کی سرمے سے بھری آنکھوں میں ثمرہ کو ایک عجیب سی نفرت جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔

"آج میرے غریب خانے کو کیسے رونق بخش دی ماسی رشیدہ نے؟ اور یہ ساتھ کون ہے بھلا؟" وہ سرتاپا اسے ٹٹولتے ہوئے بولا۔

"میری پوتی ہے یہ پت! اپنے نوے کی دھی۔ بڑا ہی بخار ہے اسے۔ کوئی دم درود کرناں اس پہ۔ جلدی سے ٹھیک ہو ورنہ اس کا باپ تو میری جان کو آجائے گا کہ دھیان نہیں رکھا میں نے اس کی لاڈو رانی کا۔"

"ہاں جی! کیوں نہیں۔ مگر خود کدھر ہے وہ؟" شکیل کے چہرے پر یکدم در آنے والی سختی ثمرہ نے بخوبی محسوس کی تھی۔

"زمین کے سودے کے لیے گیا ہوا ہے اپنے ابا جی کے ساتھ، شہر لے جارہا ہے ناں ہمیں ہمیشہ کے لیے۔" سادہ لوح دادی مخالف کی نظروں میں چھاتی والی عداوت دیکھ ہی نہ پارہی تھی۔

"ٹھیک ہے ماسی! بچی تو بہت بیمار ہے، خصوصی وظیفہ کرنا پڑے گا اس کے سرہانے۔ تو کہاں خوار ہوتی رہے گی ادھر۔ اماں سے مل لے جاکے۔" شیطان نے انتہائی مکاری سے اپنا جال بچھا دیا تھا۔

"ہاں پت! ملنا تو ہے ہی تیری ماں اور گھر والوں سے۔ پھر جانے کب آنا نصیب ہو یہاں۔" دادی گلوگیر آواز میں کہتی اٹھ گئی۔

ثمرہ کو شکیل کی نظروں سے سخت گھٹن محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اپنی طرف بڑھتے خطرے سے یکسر لاعلم تھی۔ شکیل ماسٹر نے اسے کمرے کے کونے میں دھری ایک چوکی پر بٹھا کر چند پڑیاں ایک شربت میں گھول کر تھمادیں۔ "یہ لے...... دوا پی لے پہلے...... پھر میں وظیفہ شروع کرتا ہوں۔"

دوا پینے کے بعد وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔ جب ہوش آیا تو اپنا برہنہ تن اسے بہت کچھ غلط ہونے کا احساس دلا چکا تھا۔ معصومیت درندگی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ شکیل ماسٹر خشونت سے بولا۔

"بڑا پرانا قرض تھا تیرے باپ پہ۔ آج حساب برابر کر دیا میں نے۔ اب یہ مت سوچنا کہ اس بھگوڑے سے ڈر جاؤں گا میں۔ اس جیسے کئی بالے کی جوتیاں صاف کرتے ہیں۔ زیادہ اچھل کود کی تو باپ کا مرا ہوا منہ ہی دیکھے گی۔" وہ مکروہ انداز میں ہنستا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"بول" چپ کیوں ہے، کون ہے اس کا ذمے دار۔" نوما کی آواز نے اسے ماضی سے حال میں کھینچ لیا۔

کمرے میں کچھ دیر غیر فطری سا سکوت طاری رہا جسے ثمرہ کی سرسراتی آواز نے توڑا۔ "سچ بہت کڑوا ہوتا ہے بابا! میں بھی کبھی آپ کے سامنے زبان کھولنے کی جسارت نہ کرتی لیکن آپ نے مجبور کر دیا مجھے...... میں کسی کے ساتھ نکاح نہیں کرنا چاہتی کیونکہ میرا غلیظ وجود نکاح جیسے مقدس بندھن کے لائق ہی نہیں اور اس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں بلکہ آپ کا کوئی بہت قریبی اپنا ہے۔"

"ک ک...... کس کی بات کر رہی ہو تم؟" نوے کو ایک انجانی عفریت اپنی جانب بڑھتی محسوس ہونے لگی۔

"ماسٹر شکیل...... آپ کے بچپن کا دوست......"

اس کا ذہن بھک سے اڑ گیا۔ ثمرہ کے منہ سے ادا ہونے والے الفاظ اس کے ذہن پر یکے بعد دیگرے کئی مناظر تخلیق کرنے لگے۔ ہر منظر اس کی روح کے ریشے کو بری طرح ادھیڑ رہا تھا۔

☆☆☆

نوما پھٹی پھٹی نظروں سے ثمرہ کے بے ریا اور معصوم چہرے کو یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن مفلوج ہونے لگا تھا۔ عمر بھر کی ریاضت اور کٹھن مسافت کے بعد منزل لٹ جانے کے احساس نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اسی پل اسے بیٹی کی آواز میں ان گنت لڑکیوں کی آہوں اور سسکیوں کی بازگشت سنائی دینے لگی جن کا وہ گنہگار تھا اور ٹھیک اسی پل ایک جان لیوا احساس نے اس کا دل لہولہان کر دیا۔ ان بے گناہوں کی معافی کے بغیر وہ رب کی معافی کا حقدار کیونکر ٹھہر سکتا تھا۔ اس نے بیٹی کی پیدائش سے قبل اپنی ہر دعا میں انصاف طلب کیا تھا اور انصاف کے دن کے حاکم نے عدل قائم کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے دبیز اندھیرا چھانے لگا اور ذہن اس بازگشت کا بوجھ سہارنے سے قاصر ہو کر بے ہوشی کی دھند میں کھو گیا۔

اونچی ناک

محترم مدیر
سلام تہنیت
اس روداد کو کسی ایک گھرانے کا کہہ کر محدود نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صرف رضیہ یا پروین کی کہانی نہیں، یہ صرف فتح آباد کا واقعہ نہیں، یہ کہانی ہے ہمارے آس پاس کے ہر علاقے کی۔ بس آپ نظر اٹھا کر جائزہ لیں۔

ارشد علی ارشد
(سعودی عرب

اماں کو آخری جمعہ شہر خاموشاں جانا ہوتا ہے اور آج مہینے کا آخری جمعہ تھا۔ میں نے عجلت میں آفس کا کام نمٹایا اور گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔ سیمرا کو میں پہلے ہی فون پر اطلاع دے چکا تھا۔ مجھے یقین تھا اس نے بددلی سے ہی سہی مگر اماں کو تیاری کروا دی ہوگی۔ اس کے خیال میں اماں ابھی تک پرانے خیالات کی چھڑی پکڑے ہوئے زندگی کی شارع پر گامزن ہیں۔ ہر ماہ آخری جمعہ کو قبرستان جانے کی کیا ضرورت ہے، وہ بھی راولپنڈی سے ٹیکسلا کے مضافاتی گاؤں

میں...... بظاہر اماں کی یہ روٹین میری سمجھ سے بھی بالاتر تھی مگر میں نے کبھی پوچھنے کی جرأت نہیں کی نہ اماں نے خود کچھ بتایا...... مجھے بیوی نے کئی بار اکسایا کہ اماں سے اس کی وجہ پوچھوں مگر میں نے کبھی اس کی جانب دھیان نہیں دیا۔ زیادہ اصرار کرنے سے وہ بھی کتراتی ہے کیونکہ اسے پتا ہے کہ اماں کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے میں ان کا بہت دھیان رکھتا ہوں، مجھے ابا کا پیار نہیں ملا۔ باپ کی بانہوں میں زیادہ راحت ہوتی ہے کہ ماں کی۔ میں فرق کی اس لذت سے محروم تھا۔ کیونکہ ابا بچپن میں ہی گزر گئے تھے۔ مجھے ان کی شبیہ تک یاد نہیں۔ اس لیے میں نے اماں کو یوں رکھا ہوا تھا جیسے انہوں نے مجھے بچپن میں رکھا تھا...... اماں میرے لیے پھولوں بھرا گلدستہ تھی۔ وہ میرے گھر کی سجاوٹ بھی تھیں اور خوشبو بھی۔ میرے بچوں کے لیے میری اماں کی گود بہت آسودہ تھی۔

میں گھر پہنچا تو حسب توقع اماں تیار بیٹھی تھیں۔ میں نے سمیرا کو بچوں کے متعلق چند ضروری ہدایت دیں اور اماں کو لے کر نکل آیا۔ ہماری منزل مقصود کوئی گھنٹے بھر کی مسافت پر واقع تھی۔ اماں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے راستہ کٹنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب ہم ٹیکسلا شہر سے فتح آباد گاؤں کی طرف مڑے تو حسبِ روٹین اماں نے چہرے پر اسکارف لے لیا، یہاں سے گاؤں صرف پندرہ بیس منٹ کے سفر پر واقع تھا۔ قبرستان گاؤں کے ساتھ ہی مشرقی کونے پر آباد تھا۔ شہروں دیہاتوں کی آبادی زندوں سے اور قبرستان کی آبادی مردوں سے ہوا کرتی ہے۔ قبرستان پہنچ کر میں نے گاڑی ایک طرف درخت کے سائے تلے پارک کردی۔ ڈگی سے چونے اور پھول کی پتیوں کی تھیلیاں نکالیں اور اماں کو اتار کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ قبرستان میں جا بجا کانٹے دار جھاڑیاں، لمبی لمبی گھاس، دریک اور توت کے درخت اگے ہوئے تھے۔ جھاڑیوں اور کاٹ دار جنگلی گھاس سے دامن بچا کر چلنا پڑتا تھا۔ اسّی فی صد قبریں گھاس اور جھاڑیوں کے پردے میں چلی گئی تھیں۔ جن مردوں کے زندوں میں ضمیر زندہ تھے ان کی قبریں صاف ستھری تھیں۔ ان پر مٹی بھی برابر تھی اور پتھر بھی چونا کیس تھے۔ ہم احتیاط سے چلتے ہوئے آہستہ آہستہ مطلوبہ قبر تک پہنچ گئے۔ ہماری ہر ماہ کی آمد اور محنت سے اس قبر پر کوئی گھاس یا جھاڑی نہیں تھی۔ یہ قبر کچی تھی اور سیاہ رنگ کا کتبہ کسی قسم کی عبارت سے خالی تھا۔ اماں کتبے کے پاس بیٹھ گئیں اور میں اپنے کام میں جت گیا۔ پندرہ بیس منٹ میں، میں نے پوری قبر کی صفائی کرکے اس پر چونا اور پھول کی پتیاں چھڑک دی۔ اس دوران اماں آنکھیں بند کیے تسبیح پر کچھ ورد کرتی رہیں اور قبر پر پھونکتی رہیں۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ اماں اپنے کام سے فارغ ہوئیں اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”کبیر پتر تو کتنے عرصے سے میرے ساتھ یہاں آتے ہو۔ قبر کی صفائی کرتے ہو مگر پتر کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔“

”اماں مجھے تجسس تو بہت رہتا ہے۔ اور کئی سوالات بھی ہیں جو میرے ذہن میں ہمہ وقت سر اٹھاتے ہیں مگر میں چپ رہتا ہوں۔ اس خیال سے کہ جب مناسب ہوگا آپ خود ہی جواب دے دیں گی۔“

میری بات سن کر اماں کچھ دیر خاموش رہی جیسے خود کو باور کروا رہی ہوں کہ اب ان سوالات کے جواب دینے کا وقت آگیا ہے۔ ”پتر میں کب کا تیرے سارے سوالوں کا جواب دے دیتی مگر میرے اندر ہمت دم توڑ چکی ہے۔ پھر بھی بیٹا آج میں تمہیں سب کچھ بتاتی ہوں۔“

”جی اماں۔“ میں اٹھ کر ان کے قریب چلا گیا۔ اماں نے قبر کی مٹی مٹھی میں لی تو ان کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

”اس مٹی کے نیچے دفن بختاں ماری کے ساتھ ایک عبرت ناک داستان بھی دفن ہے۔“ اماں نے مٹی اپنی گود میں ڈالتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

اماں داستان سناتی رہیں۔ وقت پھسلتا رہا۔ کبھی وہ روتیں تو کبھی میں آنسو روک نہ پاتا۔ کبھی میری ہچکیاں بندھتی تو کبھی اماں سسک اٹھتیں۔ دو گھنٹے میں ہمہ تن گوش رہا۔ اماں چپ ہوئیں تو میرا سر ان کی گود میں تھا اور میرے بالوں میں ہاتھ پھیر کر وہ مجھے دلاسہ دے رہی تھیں۔ میں اس بات سے بے خبر آنسو بہا رہا تھا کہ داستان سن کر میرا یہ حال ہے تو داستان گو کی کیا حالت ہوگی۔

☆☆☆

یہ کہانی ہے گاؤں فتح آباد کی جو ایک روایتی گاؤں تھا۔ گاؤں ......کی آبادی کا ذریعہ معاش زراعت تھا۔ لہلہاتے کھیت، سبزہ زار میدان فطری مہک سے لپٹی ہوئی پگڈنڈیاں، مال مویشی۔ دیواروں سے چپکے ہوئے گوبر کے اپلے، گھروں کی چھوٹی چھوٹی دیواروں سے بلند ہوتا ہوا صبح وشام دھواں۔ چائے کے ہوٹلوں پر بلند آواز میں بجتا ہوا ٹیپ ریکارڈر۔ نوجوانوں کی محفلیں اور بوڑھوں کی حجروں میں چوپال، گھوڑ دوڑ بیل دوڑ کے مقابلے۔ کتوں اور مرغوں کی لڑائیاں۔ اور میلے...... یہ سب کچھ فتح آباد گاؤں کا خاصا تھا۔ گاؤں کی مغربی سمت آبادی سے ذرا ہٹ کر تین بھائیوں گوہر رحمان، عتیق الرحمان اور

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

سیف الرحمان کا حویلی نما مکان تھا۔ یہ مکان دو کنال کے رقبے پر بنا ہوا تھا۔ مکان کا مرکزی دروازہ ایک ہی تھا مگر اندر گھر کو چھوٹی چھوٹی دیواروں سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ کام ان کے والد نے مرنے سے پہلے ہی کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا خوشحال زندگی گزارنے کے لیے چولہوں کا الگ ہونا ضروری ہے۔ تم بھائی بے شک یک مٹھی رہو زمین و جایداد اکٹھی رہے اور سارا معاملہ مشترکہ رہے مگر کچن علیحدہ ہونا چاہیے۔ اس طرح بھائیوں کے تمام معاملات مشترکہ رہے مگر خواتین کا نظام الگ رہا۔ بھائی بہنوں میں گوہر رحمان سب سے بڑا تھا اس کے بعد عتیق اور پھر چھوٹا سیف تھا۔ ابا کا یہ تیر ٹھیک نشانے پر لگا اور زندگی ہنسی خوشی بسر ہونے لگی۔ جب تک ابا زندہ رہا خاندانی معاملات کی انگھوٹی اپنے ہاتھ میں پہنی رکھی۔ فوت ہوئے تو یہ امانت بڑے بیٹے گوہر کو سونپ گئے۔ اماں ان معاملات میں دلچسپی نہیں لیتی تھیں اس لیے اب اختیارات کی کل جاگیر کا مالک گوہر تھا۔ ان کی کافی زمین و جایداد تھی۔ گھر سے باہر تینوں بھائی ایک مٹھی کی طرح بند رہتے تھے اس لیے گاؤں میں اس خاندان کا ایک نام و مقام اور دبدبہ تھا۔ گوہر رحمان اپنے آپ کو چودھری کہلوانا پسند کرتا تھا۔ اس کے کام اور شوق بھی چودھریوں والے تھے۔ بوسکی کا بے داغ سوٹ، تلے دار چپل، ہاتھ میں بٹیر اور بغل میں اس کا کڑھائی شدہ موتی ستاروں سے چمکتا دمکتا دھیلا۔ تراشے ہوئے بال، بڑی بڑی مونچھیں اور بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں زمرد اور عقیق کے نگینوں سے مزین انگوٹھیاں۔ اپنے حجرے میں اس نے تین تین لاکھ کے دو بیل، ایک عرب النسل کی گھوڑی لڑاکا کتا اور مرغ پال رکھے تھے۔ گاؤں اور گردو نواح میں جہاں بھی ان کے مقابلے منعقد ہوتے چوہدری گوہر ان میں ضرور حصہ لیتا تھا۔ کبھی لاکھوں جیت جاتا اور کبھی ہار مقدر ٹھہرتی۔ فارغ اوقات میں یار دوستوں کے ساتھ گاؤں کے مشہور ملنگا ہوٹل پر محفل جمتی تھی۔ وہاں چائے پی جاتی لوڈو پر میچ کھیلے جاتے اور عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے گیت سنے جاتے تھے۔ عتیق اور سیف زمینوں کی نگرانی کرتے تھے اور باپ کے بعد گوہر کو باپ سمجھتے تھے۔ اتفاق کی بات تھی کہ تینوں بھائیوں کا ایک ایک بیٹا تھا مگر بیٹیوں کے معاملے میں قدرت نے اس خاندان پر فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بڑے بھائی اور منجھلے کی دو دو اور چھوٹے کی پانچ بچیاں تھیں۔ اولادوں کے بچپن میں، والدین کی چوٹھیاں بخیر و خوبی زندگی کی شاہراہ پر گامزن رہیں۔ ادھر بچوں کے قد نکلے تو ادھر والدین کے بالوں میں چاندنی چمکنے لگی۔ اصل کہانی تب شروع ہوئی جب چھوٹے بھائی سیف کی تیسرے نمبر کی بیٹی رضیہ چند دنوں کے لیے اپنی پھوپی کے پاس گئی۔ پھوپی کی واحد بیٹی حمیرا اس کی ہم عمر اور بہترین سہیلی تھی۔

ان کی پھوپی ساتھ والے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس علاقے میں عورتوں کا سخت پردے کا رواج تھا۔ عورتوں کی زندگیاں گھر کی چاردیواری میں ہی رسم و رواج کی زنجیر میں جکڑی ہوئی بسر ہوتی تھیں۔ ان کے جذبات و احساسات مردوں نے اپنی جھوٹی انا اور غیرت کی رسی میں کس کر باندھ رکھے تھے۔ رسموں کی یہ چھڑی صرف اس گھر یا گاؤں پر نہیں بلکہ علاقے کے کئی دوسرے دیہاتوں پر بھی برستی تھی۔

رضیہ کا پھوپی کے گھر وہ دوسرا دن تھا۔ حمیرا نے اسے بتایا کہ گاؤں میں اس کی سہیلی جویریہ کے بھائی کی شادی ہے۔ رات میں ہم دونوں بھی ان کے ساتھ رسم مہندی میں جائیں گے۔ یہاں سے دو گاؤں آگے دلہن کے گاؤں جانا ہے۔ بہت مزہ آئے گا۔ ایسا موقع انہیں شاذ و نادر ہی ملتا تھا اس لیے رضیہ بھی فوراً رضامند ہوگئی۔ وہ گھر والوں کی اجازت سے رات شادی میں چلی گئی۔ دیہاتوں کی شادیوں میں بہت زیادہ ہنگامے تو نہیں ہوتے مگر ڈھول پر ٹپے ماہیے گانا عام رواج تھا۔ وہ لوگ تین مزداویگنوں پر دلہن کے گاؤں پہنچیں اور روایتی ٹپے ماہیے شروع ہوگئے۔ جویریہ نے انہیں بھی شامل کرنا چاہا مگر کم عمری کی جھجک اور شرم بیچ میں حائل رہی اس لیے وہ دونوں ٹپے گانے والی ٹولی سے ہٹ کر بیٹھ گئیں۔ ان کی عمریں اس وقت چودہ پندرہ برس رہی ہونگی۔ ڈھولک کی تھاپ پر متفرق گونجتی ہوئی آوازیں بچوں کا شور غل اور دلہا کے سسرالیوں آنا جانا بام عروج پر تھا جب رضیہ نے حمیرا کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’وہ لڑکا دیکھ رہی ہو؟‘‘

’’کون سا...؟‘‘ حمیرا نے چونک کر پوچھا۔

’’وہ سامنے دروازے کے پاس سفید سوٹ اور کالی واسکٹ والا۔‘‘ حمیرا نے بتائی ہوئی نشانیوں کی مدد سے لڑکے کو دیکھ کر کہا۔

’’ہاں دیکھ لیا ہے۔ کیا ہوا؟‘‘

’’وہ مسلسل مجھے گھور رہا ہے۔‘‘

’’اچھا...... حمیرا اس کی بات سن کر چونک اٹھی۔‘‘ اس کی یہ مجال۔‘‘ اس نے تند لہجے میں کہا اور تیش میں اٹھنا چاہا مگر رضیہ نے اسے کلائی سے پکڑ لیا۔

’’آرام سے بیٹھو تم میرے بھائی نہیں ہو پھوپی کی بیٹی

ہو۔"

"کیا مطلب؟" حمیرا نے جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا۔

"مطلب جذبات پر قابو رکھو ورنہ خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ شادی کا گھر ہے، بھانت بھانت کے لوگ موجود ہیں۔ بات ہمارے گھروں تک پہنچ گئی تو تمہیں پتا ہے الٹا لٹکا دیا جائے گا۔"

"تو اس کمینے کو یوں ہی چھوڑ دیں اور وہ تجھے نظر ہی نظر میں چباتا رہے۔" حمیرا نے نسبتاً بلند آواز میں کہا مگر شادی کے ہنگامے میں اس کی آواز رضیہ تک ہی محدود رہی۔

"اسے دفع کرو اور یہاں سے جانے کی سوچو۔"

"ہم دونوں اتنی دور کیسے جا سکتی ہیں رضیہ۔ وہ بھی رسم بیچ میں چھوڑ کر۔ جویریہ تو گلے پڑ جائے گی۔"

"تو ٹھیک ہے۔ پھر ہمیں یہاں سے اٹھ جانا چاہیے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ چلو کچھ دیر کے لیے باہر صحن میں چلتے ہیں۔" حمیرا نے اس کی تجویز پر لبیک کہا۔

دونوں اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ وہ ابھی برآمدہ پار کر رہی تھیں کہ جویریہ دو لڑکیوں کے ساتھ آتی ہوئی نظر آئی۔ اس نے حمیرا کا ہاتھ پکڑا اور تیز لہجے میں بولی۔ "تم کہاں جا رہی ہو۔ ادھر آؤ ذرا تم سے ایک ضروری کام ہے۔" اس نے حمیرا کو اندر کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"جویریہ تم چلو میں۔"

"میں کیا آؤں جلدی...... رضیہ تم بھی آؤ...... کچھ دیر میں رسم شروع ہونے والی ہے۔"

"تم چلو ہم آتے ہیں۔" رضیہ نے کہا مگر اس نے حمیرا کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے تم بعد میں کچن کے ساتھ والے کمرے میں آ جانا......" وہ حمیرا کو گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئی۔ رضیہ کچھ دیر شش و پنج میں وہیں کھڑی رہی پھر اس نے بھی حمیرا کے پیچھے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تیزی سے دروازہ پار کر رہی تھی کہ اس طرف سے آنے والے شخص سے ٹکرا گئی۔ لمحہ بھر اسے صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوا۔ جب ہوا تو مارے شرم کے وہ سرخ ہو گئی۔ سفید سوٹ اور کالی واسکٹ والا لڑکا اس کے بالکل قریب کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹپٹا گئی۔ اپنی نازک پوزیشن کا خیال آتے ہی اس نے اندر بھاگنا چاہا کہ لڑکے نے اسے آواز دی۔ "سنو...... مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

آواز سن کر اس کا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ اسے محسوس ہوا جیسے ابھی اچھل کر حلق میں آ جائے گا۔ اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے لڑکے کو دیکھا۔ دراز قد لڑکے کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے تیزی سے اندر بھاگ گئی۔ اسے اپنی حالت غیر ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی مگر حمیرا تک پہنچتے پہنچتے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ حمیرا سے اس نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ مہندی کی رات وہ جب تک اس گھر میں رہی لڑکا اسے بہانے بہانے سے دیکھتا رہا۔ کئی بار ان کی نظریں ملیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھ مچولی کے اس کھیل کا حصہ بنی رہی۔ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی مگر ہو رہا تھا۔ ایک عجیب اور ان دیکھا سرور سا اس کے اندر اترنے لگا تھا۔ واپسی پر اس کی اندرونی کیفیت کے تختے پر بیک وقت ڈر اور سرور براجمان تھے۔ اس وقت وہ ایک ایسا ترازو بن گئی تھی جس کے دونوں پلڑے برابر تھے، ایک پلڑے میں خوف تھا اور دوسرے میں لذت تھی...... وہ کسی بھی ایک پلڑے سے کچھ نہ نکال سکی۔ حمیرا نے اسے برات پر بھی لے جانا چاہا مگر اس نے دل پر جبر کی سل رکھی اور نہیں گئی۔ لیکن اگلے دن جب وہ دلہن دیکھنے کے لیے جویریہ کے گھر گئی تو وہاں دو آنکھوں نے اسے احاطے میں لے لیا۔ اس بار وہ بوسکی کے سوٹ میں ملبوس تھا اور واسکٹ بھی ہم رنگ تھی۔ گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر تین چار سالہ بچی کے ساتھ کھیل رہا تھا مگر نظریں بار بار اس طرف اٹھ رہی تھیں۔ اسے خوف محسوس ہوا کہ جہاں دیدہ عورتیں وارفتگی کی یہ نگاہیں بھانپ لیں گی۔ کیونکہ مہندی کی رات والا رش نہیں تھا یہاں۔ اس نے حمیرا کے کان میں سرگوشی کی کہ گھر چلتے ہیں۔

"ہائے اتنی جلدی...... ابھی تو آئی ہو، رکو ذرا ابھی میری دوسری سہیلیاں بھی آنے والی ہیں۔ مزہ آئے گا۔" وہ چہک کر بولی۔

"حمیرا میرے سر میں بہت تیز درد اٹھ رہا ہے۔" اس نے بہانہ تراشا۔

"ایک منٹ تمہیں ڈسپرین کی گولی منگوا دیتی ہوں۔ گھر جا کر بھی یہی لوگی نا۔"

"حمیرا گھر جا کر آرام کروں گی تو درد دور ہو جائے گا اور دلہن دیکھنی تھی دیکھ لی۔ اب بیٹھنے کا فائدہ؟"

"تم بیٹھو میں ابھی آئی۔" حمیرا اس کی بات سنی ان سنی کر کے اٹھ گئی۔ اس نے بے چینی سے اس طرف دیکھا جہاں دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اب بھی نشانے پر تھی۔ وہ

وہاں سے اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ حمیرا ایک دس گیارہ سالہ بچے کے ساتھ آئی اور بولی۔

"اس کے ساتھ تم گھر چلی جاؤ۔ میں نے جویریہ کو منانے کی کوشش کی ہے مگر وہ مجھے ابھی نہیں چھوڑ رہی۔"

رضیہ کی عقل نے جو فیصلہ کیا اس نے عمل کر دیا۔ بچے کو لے کر گھر سے نکل گئی۔ اسے اپنی غلطی کا احساس کچھ دیر میں ہو گیا جب ایک آواز نے اسے پکارا۔

"رضیہ سنو۔" اپنا نام کسی اجنبی آواز میں سن کر وہ حیرانی سے مڑی تو پاؤں زمین سے چپک گئے۔ اس کے سامنے وہی لڑکا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو خون نہیں۔ اس نے جلدی سے اپنا نقاب درست کیا۔ قدم آگے بڑھانا چاہے کہ وہ بولا۔ "رضیہ صرف ایک منٹ میری بات سنو۔ میں دلہن کی خالہ کا بیٹا ہوں۔ کوئی تک نہیں بنتی تھی آج یہاں آنے کی مگر میں صرف تمہارے لیے آیا ہوں۔"

رضیہ نے گھبرائی ہوئی نظروں سے بچے کو دیکھا وہ کھڑا لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ میرا بھائی ہے۔ فکر مت کرو کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔"

"مگر...... مگر...... مجھے جانا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے جاؤ مگر مجھے کوئی جگہ اور وقت بتاؤ کہ میں چند لمحے سکون سے بات کر سکوں۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ میرا پیچھا مت کریں۔"

"یقین کرو میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے کسی پل چین نہیں پایا۔ میرا یقین کرو میں کوئی آوارہ لڑکا نہیں ہوں۔ اپنے گاؤں میں پہلا لڑکا ہوں جو پڑھائی میں بی اے تک پہنچ گیا ہے۔"

"مجھے سمجھ نہیں آرہی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" رضیہ نے پریشان نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہر طرف رات کا اندھیرا اور سناٹا تھا۔ گاؤں میں عشاء کے بعد ہی راتیں ویران اور سنسان ہو جاتی ہیں۔ ابھی تک کوئی بندہ اس طرف نہیں آیا تھا مگر رضیہ کو خوف تھا کہ دلہن دیکھنے کے لیے جانے والی عورتوں میں سے کوئی بھی اس طرف آسکتی ہے۔ اس نے مزید کچھ نہیں کہا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ دل کی دھڑکن ہنوز تیز جھکڑ کی طرح چل رہی تھی۔ اس بار اسے پکارا نہیں گیا۔ اس کے ساتھ آنے والا بچہ شاید وہیں کھڑا رہ گیا مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کچھ دیر بعد اسے بھاگتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ آواز سے اسے اندازہ ہوا کہ بچہ بھاگتا ہوا آرہا ہے۔

"باجی یہ خط بھائی نے دیا ہے۔" بچے نے آتے ہی اس کی طرف تہہ شدہ کاغذ بڑھاتے ہوئے بولا۔ اس نے کاغذ یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"یہ خط واپس بھائی کو دے دینا۔ اس نے خط نہیں لیا مگر جب وہ گھر میں داخل ہو رہی تھی تو بچے نے خط اس کے قدموں میں پھینکا اور واپس بھاگ گیا۔ وہ پریشان نظروں سے گھر کی دہلیز پر پڑے ہوئے خط کو دیکھ رہی تھی۔ پہلے تو وہ یوں ہی اندر داخل ہو گئی مگر پھر یہ خیال آیا کہ کسی نے اٹھا کر پڑھ لیا تو اس کا دامن بھی خوامخواہ داغ دار ہو جائے گا۔ واپس پلٹ کر خط اٹھا لیا۔ کمرے میں پہنچ کر اسے کئی طرح کے وسوسوں نے گھیرا۔ خط وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ اسی لیے اسے سرسری سا دیکھا اور اپنے جسم میں چھپا لیا۔ اس کا بدن یہ سوچ کر کانپ رہا تھا کہ راستے میں اگر کسی نے دیکھ لیا ہوتا اور بات گھر تک پہنچ جاتی تو تایا اس کی تکہ بوٹی کر دیتے۔ اس کا تایا چار بندوں میں بیٹھنے والا شخص تھا۔ اسے جرگوں میں بلایا جاتا تھا اور کئی بار اس نے ایسی غلطی پر لڑکی کو گولی مار دینے کا فیصلہ سنایا تھا۔ وہ دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ کسی نے دیکھا نہ ہو اور اس قہر سے وہ بچ جائے۔ حمیرا لوٹی تو وہ جاگ رہی تھی۔ اسے خیالوں میں گم پا کر وہ بولی۔

"طبیعت کیسی ہے تمہاری۔ ڈسپرین لے لی تھی۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ حمیرا اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ ان کے تمام راز و نیاز مشترکہ تھے۔ وہ اس ادھیڑ بن میں مبتلا تھی کہ یہ بات حمیرا کو بتائے یا نہیں۔ اس کے اندر کہیں کسی خانے میں خط سننے کی خواہش دبکی بیٹھی تھی۔ اور اس خواہش کی تکمیل کا سرا حمیرا کے ہاتھ میں تھا کیونکہ وہ آٹھ کلاس پڑھی تھی۔ حمیرا اپنی چارپائی سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"رضیہ کیا بات ہے پریشان لگتی ہو؟" اس کے انداز محبت کے سامنے وہ پگھل گئی اور خط نکال کر اس کی گود میں رکھ دیا۔ حمیرا نے اسے پھر خط کو دیکھا۔

"کیا ہے یہ؟" اس نے خط اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"خود ہی دیکھ لو۔" حمیرا نے خط کھولا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پڑھنے لگی۔

"یہ...... یہ خط...... تمہیں کس نے دیا ہے؟" خط پڑھنے کے بعد اس نے حیرت سے پوچھا۔ جواب میں رضیہ نے من و عن سارا قصہ سنا دیا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔ وہ کمینہ تو بہت تیز نکلا۔" حمیرا تفصیل سن کر بولی۔ رضیہ خاموش رہی۔ "ویسے لڑکا برا نہیں ہے رضیہ۔ پڑھا لکھا اور خوبصورت ہے۔ رکھ رکھاؤ سے خاندانی لگتا ہے۔"

"میں نے یہ تمہیں اس کی تعریفیں کرنے کے لیے نہیں بتایا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "حمیرا مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"اچھا یہ ڈرور کی باتیں بعد میں کرنا پہلے اپنے عاشق کا محبت نامہ تو سن لے۔" حمیرا نے شوخ لہجے میں کہا تو اس کے گال شرم وحیا سے سرخ ہوگئے۔ کانوں کی لو تپنے لگی۔ حمیرا نے خط پڑھنا شروع کیا۔ خط سے اسے معلوم ہوا اس کا نام اشفاق ہے اور نزدیکی گاؤں میں رہتا ہے۔ وہ رضیہ سے پہلی نظر کی محبت کا دعوی دار تھا اور ملنے کے لیے منتیں کر رہا تھا۔ ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ کل ان کے گھر اس کا چھوٹا بھائی آئے گا تو خط کا جواب اس کے ہاتھ بھجوا دینا۔

"کیا کہتی ہو؟" خط پڑھنے کے بعد حمیرا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں اس پر۔" رضیہ نے کہا مگر حمیرا اس کا کمزور لہجہ سمجھ گئی۔ وہ مسکرا کر بولی۔

"قسم کھاؤ کہ تم اس پر لعنت بھیجتی ہو۔"

"وہ نہیں میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں اور ابھی اس کی خواہش کے احترام میں اسے ملنے جاتی ہوں۔" اس نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

"جو بھی کہو..... مجھے تمہاری آنکھوں کا فسانہ کچھ اور ہی لگ رہا ہے۔"

"چل ہٹ....."

"ٹھیک ہے سوجاؤ صبح دل مانا تو بتا دینا جواب لکھ دوں گی۔" حمیرا کی بات پر وہ خاموش رہی مگر یہ سچ تھا کہ اندر سے وہ بہت خوش تھی۔ چاہے جانے کا فخر اسے شاداں کیے جا رہا تھا۔ اگلے روز اس نے حمیرا سے مختصر خط لکھوایا۔ ملنے سے معذرت اور آئندہ خط نہ لکھنے کی تنبیہ کی۔ خط اس کا بھائی ظہر کے وقت آکر لے گیا۔ اگلے روز اس نے واپس اپنے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ حمیرا نے بھی اسے نہیں روکا۔ ان حالات میں اس کا چلے جانا ہی بہتر تھا۔ وہاں سے وہ بخیر وخوبی پلٹ آئی مگر مقدر نے اس کی بربادی کی جگہ اس کا اپنا گھر منتخب کر رکھا تھا۔ چار دن بعد اس پر قہر ٹوٹ پڑا۔ اپنے گھر واپس آئے اسے تیسرا روز تھا۔ امی پڑوس میں کسی کام کے لیے گئی تھی۔ گھر میں ضرورت پڑی تو وہ امی کو بلانے گئی۔ واپس جب گھر کے دروازے پر پہنچی تو اشفاق نجانے کہاں سے نمودار ہوگیا۔ رضیہ کا دل اسے دیکھ کر اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ سانس لینا تک بھول گئی اور سکتے کی سی کیفیت میں جہاں کھڑی تھی وہیں جم گئی۔ شاید اشفاق اسے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ بھی اٹھا ہوا تھا جس میں خط تھا مگر رضیہ کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ اسے نہ کچھ نظر آرہا تھا نہ سمجھ۔ اسے ہوش تب آیا جب اس نے ابا کو دیکھا۔ ابا نے اشفاق کو موٹی گالی دی اور اسے گردن سے دبوچ لیا۔ رضیہ کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ دروازے کی طرف بھاگی۔ آخری منظر میں اس نے بھائی اور مجھلے چچا کے بیٹے کو اشفاق پر جھپٹتے دیکھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور جسم سے ساری توانائی نچڑ گئی تھی۔ وہ جاتے ہی چارپائی پر بے سدھ ہوکر گر گئی۔ پانچ بہنوں اور ایک بھائی میں اس کے سب سے زیادہ قریب کلثوم تھی۔ دونوں کی عمر میں صرف ایک سال کا فرق تھا۔ کلثوم نے اسے یوں چارپائی پر گرتے دیکھا تو اس کی طرف بھاگی۔ بڑی بہن پروین بھی یہ منظر دیکھ کر اس کے سرہانے پہنچ گئی۔

"کیا.....کیا ہوا رضیہ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" کلثوم نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ پروین نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"یا اللہ خیر یہ تو ٹھنڈی ہورہی ہے۔" اس نے سینے پر ہاتھ جما کر کہا۔ کلثوم نے چونک کر اسے دیکھا پھر رضیہ کے گال تھپتھپائے۔ رضیہ نے بمشکل بند ہوتی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ "پا پانی....." رضیہ کے خشک گلے میں کانٹے اگ آئے تھے اور بنجر ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ کلثوم اس کی بات سن کر مٹکے کی طرف بھاگی۔

پروین اس کے پاؤں کی تلیاں ملنے لگی۔ اس دوران دوسری بہنیں بھی آگئیں۔ وہ سب پریشان تھیں اور ماجرا سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کلثوم نے اسے سہارا دے کر پانی پلایا۔

پروین نے اسے آواز دی۔ "رضیہ.....رضیہ....."

پانی حلق سے اترا تو رضیہ کو بھی کچھ ہوش آیا۔ آوازیں سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کلثوم کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ خارجی دروازے سے امی داخل ہوئیں۔

"ہائے میرے اللہ کیا ہوا میری بچی کو۔ ادھر حجرے سے بھی تمہارے ابا اور بھائیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔" امی نے چادر ایک طرف پھینکی اور بھاگ کر رضیہ کے پاس آئی۔

"کیا ہوا میری بچی کو؟"

"پتا نہیں امی۔ آپ کو بلانے کے لیے گئی تھی۔ واپس

آئی تو یہ حالت تھی۔" کلثوم نے روتے ہوئے بتایا۔

"اللہ خیر کرے ادھر تمہارے ابا کی یوں آوازیں آرہی ہیں جیسے حجرے میں جھگڑا ہو گیا ہے۔" امی کی بات سن کر ان کی پریشانی سوا ہو گئی۔ امی رضیہ کی طرف متوجہ تھی کہ ابا اور بھائی انتہائی غصے کی حالت میں داخل ہوئے۔

"کہاں ہے وہ بے غیرت؟" ابا نے اندر آتے ہی غراتے ہوئے کہا۔ ماں بیٹیوں کی جان نکل گئی۔ ابا اور بھائی کی حالت بتا رہی تھی کہ کچھ غیر معمولی بات ہو گئی ہے۔ وہ دونوں تیر کی طرح رضیہ کی طرف بڑھے۔ امی نے آگے بڑھ کر ابا سے کچھ پوچھنا چاہا مگر ابا نے اسے ایک طرف دھکیل کر رضیہ کو بازو سے پکڑ لیا۔

"اٹھ بے غیرت باپ کی پگڑی اچھال کر یہاں آرام سے پڑی ہے۔" ابا نے رضیہ کو زور کا جھٹکا دیا۔

"ہائے ہائے...... کیا ہوا...... کیا کر رہے ہو۔ میری بچی کی حالت۔" امی تڑپ کر آگے بڑھی۔ بہنوں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

ابا نے امی کو پرے دھکیلا۔ "ہٹ جا تیری اس بے غیرت دھی نے آج ہمیں زندہ دفن کر دیا ہے۔" ابا اور بھائی رضیہ کو پکڑ کر کمرے کی طرف گھسیٹنے لگے۔ رضیہ کے جسم میں تو پہلے ہی طاقت نکل چکی تھی۔ وہ زمین پر رگڑ کھاتی ہوئی ان کے ساتھ بڑھنے لگی۔ امی نے ایک بار پھر ابا کو پکڑنا چاہا مگر اس بار ابا نے زور کا دھکا دیا۔ امی توازن برقرار نہ رکھ سکی اور پیچھے گر پڑی۔

"امی۔" چھوٹی عاشی کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ پروین نے امی کو سنبھالا۔ ابا اور بھائی رضیہ کو کمرے میں لے جا کر دروازہ بند کر چکے تھے۔ پھر انہیں ابا اور بھائی کی گالیوں کی اور رضیہ کی چیخوں اور کراہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ سب دروازہ پیٹنے لگیں۔

"ابا...... ابا...... رحم کر ابا۔" پروین چیخنے لگی۔

"کاشف...... رک جا کاشف کیوں ظلم کر رہے ہو بہن پر۔" امی بیٹے کو پکارتی رہی مگر اندر سے مار پیٹ کی آوازوں کے ساتھ اب رضیہ کی آہیں اور سسکیاں سنائی دیتی رہیں۔ بہنیں ایک طرف رو رہی تھیں اور امی دروازہ پیٹ پیٹ کر وہیں نڈھال ہو کر گر پڑی۔ باپ بیٹا ہانپتے ہوئے باہر آئے اور ابا نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

"خبردار اگر کسی نے اسے کمرے سے باہر لانے کی کوشش کی اور یہ بات بڑے بھائی کو پتا چلی تو سب کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔" ابا حکم صادر فرما کر باہر چلے گئے۔ بھائی بھی نکل گیا تو بہنوں کو ہوش آیا اور وہ اندر کی طرف بھاگیں۔ رضیہ کی حالت دیکھ کر بے اختیار ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں تھیں۔ اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا گیا تھا۔ وہ تو پہلے ہی زندہ لاش میں تبدیل ہو چکی تھی اوپر سے دو مردوں کی وحشیانہ مار کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

☆......☆

گھر والوں کو رضیہ کا قصور بعد میں پتا چلا تھا کہ کسی دوسرے گاؤں کا ایک لڑکا اس سے ملنے آیا تھا۔ رضیہ اس سے باتیں کر رہی تھی کہ ابا نے دیکھ لیا۔ بعد میں اس لڑکے کی حجرے میں خوب درگت بنائی گئی اور ہاتھ پیر توڑ کر اسے گاؤں سے باہر ویرانے میں پھینک دیا گیا تھا۔ اس کی جیب سے خط بھی برآمد ہوا جو وہ رضیہ کو دینے آیا تھا۔ خط کی تحریر سے انہیں پتا چلا کہ رضیہ پہلے بھی اس لڑکے سے مل چکی ہے۔ امی اور بہنیں رضیہ سے کیا وضاحت طلب کرتیں وہ تو سانس بھی مشکل سے لے رہی تھی۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جس پر زخم نہ ہو۔ چہرہ اس قدر سوج گیا تھا کہ آنکھیں بالکل بند ہو گئی تھیں۔ ابا نے کہا تھا اس کی روٹی پانی کا انتظام کمرے میں ہی کیا جائے۔ خبردار اگر باہر لانے کی کوشش کی۔ روٹی پانی کا کیا انتظام ہوتا وہ تو منہ بھی نہیں کھول سکتی تھی۔ کئی روز اس کے حلق میں چمچ کے ذریعے دودھ کے چند قطرے ٹپکائے جاتے رہے۔ جن دنوں یہ المناک واقعہ ہوا ان دنوں تایا ابا گاؤں میں موجود نہیں تھے۔ کسی دوسرے علاقے میں میلہ منعقد ہو رہا تھا۔ میلے میں مختلف روایتی کھیلوں کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔ وہ اپنے بیلوں کی جوڑی مقابلے کے لیے لے کر گئے تھے۔ ابا نے اپنے گھر اور منجھلے بھائی کے گھر سخت آڈر کر دیا تھا کہ یہ بات بڑے بھائی کے کانوں تک نہ پہنچے۔ رضیہ کے تایا ابا ایک ہفتے بعد لوٹے اور مزید ایک ہفتہ اسے کوئی خبر نہیں ہوئی کہ ان کے گھر پر کون سا قیامت خیز واقعہ گزر چکا ہے۔ یہ کوئی بیس پچیس دن بعد کی بات ہے۔ تایا ابا کسی ہوٹل میں اپنے یار بیلیوں کے ساتھ چائے پی رہے تھے۔ وہاں کسی شخص نے پوچھ لیا۔

"چوہدری اس لڑکے کا کیا ہوا جسے تمہارے بھائی اور بھتیجوں نے مار پیٹ کر گاؤں سے باہر پھینک دیا تھا۔" سوال پر چوہدری بڑی طرح چونک پڑا۔ باقی افراد بھی لگتا تھا کہ اس واقعے سے لاعلم تھے۔ وہ سب پرتجسس نگاہوں سے چوہدری کو دیکھنے لگے۔

"کون سا لڑکا...... کیا کہنا چاہتے ہو تم۔"

''لگتا ہے آپ کو کچھ علم نہیں۔''

''کھل کر بات کرو۔''

''چوہدری ناراض نہ ہونا۔میں نے سنا ہے کسی دوسرے دراز گاؤں سے کوئی لڑکا تیرے چھوٹے بھائی کے دروازے پر کسی بری نیت سے آیا تھا۔اور اسے پکڑ لیا گیا۔''

بات سن کر چوہدری کے اندر ہلچل مچ گئی۔وہ چائے کا سپ لینے لگا تھا مگر کپ درمیان میں ہی رک گیا۔اس کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھی۔بھری محفل میں اس پر ایسا تیر پھینکا گیا تھا جس نے اس کے دل کو چیر کر رکھ دیا تھا۔اس کا جی چاہا کہ ابھی ازار بند میں لٹکا ہوا چاقو نکالے اور بات کرنے والے کے سینے میں اتار دے مگر اس نے خود پر کنٹرول کیا اور اٹھ کر گھر کی راہ لی۔پہلے وہ اپنے گھر گیا اور اپنی بیوی بچوں کو بلایا۔اور دو ٹوک الفاظ میں بولا۔

''جو کچھ پوچھوں گا سچ بتانا ورنہ خدا کی قسم تم سب کو لاشوں میں تبدیل کر دوں گا۔''اس کی گرجدار آواز سے گھر والوں کے رنگ فق ہو گئے۔وہ جانتے تھے کہ چوہدری گوہر رحمان جو کہتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔چوہدری نے ایک ایک کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔''کچھ دن پہلے بھائی سیف کے گھر میں کیا واقعہ ہوا ہے۔''اس کے سوال پر اس کی بیوی اور بیٹیوں کے رنگ فق ہو گئے۔جہاں دیدہ چوہدری بھانپ گیا کہ کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہے اور اس کی بیوی بیٹی سب جانتی ہیں۔اس نے دیوار سے لٹکی ہوئی رائفل اتاری اور مزید سخت لہجے میں کہا۔

''میں صرف سچ سنوں گا۔''گھر والوں کے چہرے متغیر ہو چکے تھے۔بیٹیاں خوف سے کانپنے لگی تھیں۔اس کی بیوی نے اپنے بچوں کو ایک نظر دیکھا پھر پورا واقعہ من و عن گوش گزار کر دیا۔بیوی کی باتیں سن کر اس کے بدن میں بھڑکنے والی آگ شعلوں میں تبدیل ہو گئی۔اس نے سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے بیٹے سے کہا۔

''جاؤ اپنی دادی اور دونوں چچا کو بلا کر لاؤ ابھی فوراً، اسی وقت۔''بیٹا بنا چوں چرا کیے اٹھ کر چلا گیا۔بیوی اور بیٹیوں پر کپکپی طاری تھی اور چوہدری بے چینی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ادھر ان بیس پچیس دنوں میں رضیہ کو اتنا افاقہ ہوا تھا کہ وہ دو بندوں کے سہارے بیٹھ جاتی تھی اور دو چار روٹی کے لقمے چبا چبا کر کھا لیتی تھی۔چہرے کی سوجن ہنوز رفع نہیں ہوئی تھی اور پورا منہ نہیں کھلتا تھا۔اس نے اٹک اٹک کر بہنوں کو ساری داستان بھی سنا دی تھی۔سیف الرحمان اور عتیق الرحمان اپنی اماں کے ساتھ بھائی کے گھر کی دہلیز پار کر رہے تھے تو ہزار وسوسوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔سب کے دل میں ایک ہی دعا تھی کہ رضیہ والے واقعے کی خبر گوہر تک نہ پہنچی ہو۔ان کے پیچھے سیف کا بیٹا کاشف بھی چلا آیا تھا۔

''کیا بات ہے پتر۔خیر تو ہے۔''اماں نے جاتے ہی پریشان لہجے میں پوچھا۔اماں منجھلے بیٹے کے گھر میں رہتی تھی۔وہ سب صحن میں بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔گوہر اماں کی بات سن کر بولا۔

''خیر کیسے ہو اماں خاندان کی ناک کٹ گئی اور خیر ہو۔ہمارے ابا و اجداد اور پھر ہم نے عزت و توقیر کی جو عمارت کھڑی کی تھی وہ ڈھے گئی ہے اماں۔''اس کے لہجے میں غم و غصہ کا امتزاج تھا۔سیف اور عتیق نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔گوہر نے سیف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سیف مجھے سب پتا چل چکا ہے۔میرے پیچھے اس گھر پر قیامت گزر گئی اور تم لوگوں نے مجھے بے خبر رکھا۔''

''لالا ہم نے دونوں کو عبرت ناک سزا دی ہے۔ہم......''

''بچی زندہ ہے یا مار دیا؟''بھائی کی بات کاٹ کر گوہر نے سفاکانہ لہجے میں کہا۔

''ہائے ہائے کیا بول رہے پتر۔اللہ نہ کرے......''

اماں فوراً بولی مگر گوہر اس کی بات سنی ان سنی کرتا ہوا سیف سے مخاطب ہوا۔

''جواب دو سیف۔رضیہ زندہ ہے یا مردہ۔''

''ز......زندہ......''

''مجھے بچی چاہیے سیف۔''اس نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔بھائیوں کے چہروں پر موت جیسی زردی پھیل گئی تھی۔اماں اٹھ کر گوہر کے پاس جا کر بولی......

''اسے پہلے ہی مار مار کر موت کے منہ تک پہنچا دیا ہے ان باپ بیٹے نے پتر۔اب اس قصے کو بھول جاؤ۔''

''بھول جاؤں۔''گوہر غصے میں کھڑا ہو گیا۔انتہائی غصے کی حالت میں اس کا جسم کانپنے لگا تھا۔وہ زخمی شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے بولا۔

''میری بیٹی کے قصے لوگوں کی زبان پر ہوں اور میں مونچھوں کو تاؤ دے کر گاؤں میں چلتا پھروں......اماں میں اتنا بے غیرت نہیں ہوں۔''

''آپ کیا چاہتے ہو لالا......؟''سیف نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"دو ہی باتیں ہیں۔" گوہر کھڑے کھڑے بولا۔ رائفل ہنوز اس کے ہاتھ میں تھی۔ "بچی میرے حوالے کرو ورنہ میں پہلے اپنی بیوی بچوں کو ماروں گا پھر خود کو گولی سے اڑا دوں گا۔" اماں تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔

"میری بوڑھی ہڈیوں پر رحم کھا پتر...... بھول جا اس بات کو۔ ٹھنڈے دماغ سے کام لے......"

"اماں میں نے جو کہہ دیا وہی ہوگا۔ مجھے بچی چاہیے بس۔ ورنہ تین قبریں تیار کر لو۔" سیف اور عتیق جانتے تھے کہ اس نے جو فیصلہ کر لیا اب وہی ہوگا۔

"تایا ابا ہم نے رضیہ کی اتنی درگت بنائی ہے کہ اسے چلنے پھرنے کے قابل نہیں چھوڑا اب......" کاشف کی بات سن کر گوہر تیر کی طرح اس کی جانب بڑھا اور اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

"کمینے اپنی بہن کو غیر کے ساتھ کھڑے دیکھ کر تجھے اتنی غیرت نہیں آئی کہ دونوں کے سینے میں چاقو اتار دیتا۔" اس نے جھٹکے دے کر کاشف کو واپس چارپائی پر گرا دیا۔ برآمدے کے ستون سے اس کی بیوی لرزاں براندام کھڑی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ سختی سے پکڑ رکھا تھا۔

سیف اور عتیق بت بنے بیٹھے تھے اور اماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کاشف کا جوان خون اندر سے ابل رہا تھا مگر چپ تھا۔

"سیف مجھے جواب چاہیے۔" گوہر نے چھوٹے بھائی کی متوحش نظروں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے لالا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ آپ کی جو مرضی ہے کرو۔"

"نہیں نہیں پتر نہیں......" اماں سیف کی بات سن کر لرز اٹھی۔ گوہر اماں کی کیفیت سے بے خبر دروازے کی جانب چلتا ہوا بولا۔

"میرا مقدمہ نہ لڑنا نہ مجھے معاف کرنا۔ جس دن تختہ دار پر لٹکا دیا جاؤں میری پگڑی اپنے سر پر رکھ لینا اور جان لینا کہ خاندان کی پگڑی بچ گئی ہے۔ اور اس نمازی کے جنازے پر کسی کو نہ بلانا نہ اعلان کرنا نہ کتبے پر کسی کا نام لکھنا۔" اس نے قدم آگے بڑھائے تو اماں ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کے بوڑھے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ "گوہر پتر میں تیری منت کرتی ہوں۔ پاؤں پڑتی ہوں یہ ظلم نہ کر۔ بچی ہے ناسمجھ ہے غلطی کر بیٹھی ہے۔ یہ دیکھ...... اماں نے اس کے قدموں میں اپنا دوپٹا پھینک دیا۔" میرے دوپٹے کی لاج رکھ لے پتر یہ تیری پگڑی سے زیادہ اونچا ہے۔"

گوہر اماں کے دوپٹے کو پھلانگتا ہوا چلا گیا۔ اماں سیف کی طرف آئی اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ "جا جا اسے روک لے...... اتنے ظالم مت بنو تم لوگ۔"

سیف نے اماں کو گلے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ادھر گوہر کی بیوی ستون کے عقب سے نکلی اور بھاگتی ہوئی شوہر کے پیچھے لپکی۔ "میں یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی چاہے مجھے جان سے مار دے۔"

کاشف اور گوہر کا بیٹا وسیم بھی ان کے پیچھے چلے گئے۔ عتیق کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ بت بنا ہوا اپنی جگہ پر جم گیا تھا۔ اماں نے سیف کو پرے دھکیلا اور

جھولی پھیلا کر بولی۔ ”اے میرے سوہنے رب تو مجھے اٹھا لے اور ان درندوں کو بھی معاف نہ کرنا۔“ اماں کی بوڑھی ہڈیوں میں مزید کچھ کہنے سننے کی طاقت نہیں رہی تھی وہ پیچھے لڑھک گئی۔ سیف اور عتیق اسے آوازیں دیتے رہے مگر رب نے اماں کی لاج رکھ لی تھی۔

ادھر گوہر بھائی کے گھر میں اسلحہ سے لیس داخل ہوا تو گھر والوں کو سانپ سونگھ گیا۔ اس نے جاتے ہی دھاڑتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں ہے رضیہ؟“

”کلثوم بھاگ کر تایا ابا کے پاس پہنچی اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ تایا ابا رضیہ کی جگہ مجھے گولی مار دے وہ بیچاری تو پہلے ہی زندہ لاش میں بدل چکی ہے۔“ گوہر نے جیسے اسے دیکھا ہی نہیں اس نے بھابی سے پوچھا۔

”رضیہ کہاں ہے؟“ غم سے نڈھال ماں نے کسی روبوٹ کی طرح دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ دروازے کے سامنے پہلے ہی پروین اور عاشی کھڑی تھیں۔ گوہر انہیں ایک طرف کرتا ہوا اندر داخل ہوا اور دروازہ لاک کر دیا۔ اس دوران گوہر کی بیوی بھی آ گئی تھی مگر دروازہ مقفل تھا وہ صرف پاگلوں کی طرح دروازہ پیٹتی رہی اور ہزیانی انداز میں چیختی رہی۔ گوہر نے رضیہ سے کہا۔

”کلمہ پڑھ لو اس گھر کو اب تیری ضرورت نہیں رہی۔“ رضیہ نے لرزتے ہونٹوں سے نہ جانے کیا کہا۔ گوہر نے تین کارتوس اس کے سینے میں داغ دیے۔

گوہر خود تھانے میں پیش ہو گیا اور اقرار جرم کر لیا۔ اس دن وہاں سے دو جنازے نکلے۔ ایک رضیہ کا اور دوسرا اس کی دادی کا۔ اموات کا اعلان نہیں کروایا گیا نہ ہی کسی کو خبر دی گئی۔ قریبی عزیز واقارب نے آ کر تدفین کے مراحل پورے کیے۔

☆......☆

چوہدری گوہر نے کوئی وکیل نہیں پکڑا بلکہ قتل کا اعتراف کر لیا اس لیے اسے موت کی سزا سنا دی گئی۔ اسے جیل میں ڈھائی برس گزر گئے مگر ابھی سزا پر عمل نہیں ہوا تھا۔ بچوں کی عمریں متقاضی تھیں کہ اب ان کے رشتے طے کر دیے جائیں۔ بڑے بھائی کے بعد عتیق ہی اس خاندان کا بڑا تھا۔ اس نے یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور بڑی بھابی کے پاس مشاورت کے لیے گیا۔ اس کی بات سن کر وہ بولی۔ ”آپ کے دل میں کیا ہے عتیق، کس کا رشتہ کس کے لیے مناسب رہے گا۔“

”بھابی ہم تینوں بھائیوں کا بیٹا تو ایک ایک ہی ہے۔ ہمارے چھ بچے تو گھر میں ہی لگ جائیں گے۔ باقی بچیاں ابھی چھوٹی ہیں وقت آنے پر اللہ تعالیٰ ان کے لیے بھی خاندان میں ہی کہیں رشتے بھیج دے گا۔“

”ٹھیک کہتے ہو عتیق مگر چھ بچے جو اسی گھر میں لگ سکتے ہیں ان کے رشتے کیسے طے ہوں گے؟“

”بھابی عمر کے لحاظ سے آپ کا بیٹا وسیم اور سیف کی بڑی بیٹی پروین کا جوڑ بنتا ہے۔ سیف کے بیٹے کاشف کا میرے گھر اور میرے بیٹے سجاول کا آپ کے گھر......اس طرح تینوں گھروں سے دو دو بچوں کے رشتے طے ہو جائیں گے۔“

”عتیق بات تو تم نے سولہ آنے درست کہی ہے۔ چھوٹے بھائی سے بھی مشورہ کر لے اگر وہ بھی رضامند ہے تو پھر میں تم دونوں سے ایک بات کہنا چاہوں گی۔“

”آپ بات کریں بھابی۔“

”عتیق گوہر نے جو کچھ کیا تم سب جانتے ہو میں اس پر بہت تڑپی اور روئی بھی مگر وہ غیرت میں آ کر کر گیا۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ مقدر کا لکھا کوئی ٹال نہیں سکتا۔ تم سیف سے بات کرو۔ اسے معاف کر دے۔ اس کی بیٹی تو چلی گئی باپ جیسے بھائی کی لاش کیسے اٹھائے گا۔“

”بھابی یہ کام میں بہت پہلے کر چکا ہوتا مگر لالا نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔“

”تم اس کی بات پر دھیان مت دو۔ بس یہ کام کر گزرو۔ میری آنے والی نسلیں بھی تمہیں دعائیں دیں گی۔“

عتیق کچھ دیر خاموش رہا پھر طویل سانس لے کر سر ہلاتا ہوا اٹھا اور بولا۔ ”ٹھیک ہے بھابی۔ کوشش کرتا ہوں۔ رشتوں کے بارے میں سوچنا۔“

”یہ کام ہو جائے تو رشتے پکے ہیں عتیق۔ اس خاندان کی پختگی کے لیے بھی یہ رشتے بہت ضروری ہیں۔“

عتیق نے چند دنوں میں ہی سیف کو راضی کر لیا۔ سیف کے اپنے دل میں بیٹی کے لیے صرف نفرت تھی۔ وہ اسے خاندان کی عزت پر ناسور سمجھتا تھا اس لیے اس کے مٹ جانے پر اسے کوئی ملال نہیں تھا۔ گھر کی عورتوں نے اس کے فیصلے پر خوب واویلا مچایا مگر اس خاندان میں عورتوں کی کون سنتا تھا۔ عورتیں چیخ سکتی تھیں مگر بات منوا نہیں سکتی تھیں۔ ہوتا وہی تھا جو مرد چاہتے تھے۔ اس لیے گوہر جیل سے باہر آ گیا۔ مونچھوں پر تیل لگا کر انہیں تاؤ دیتے ہوئے اور گاؤں میں

گھومتے ہوئے اب اسے کوئی شرمندگی نہیں تھی کیونکہ وہ غیرت کے نام پر قتل کر چکا تھا اور اس کی پاداش میں ڈھائی برس جیل بھی کاٹ چکا تھا۔ اس کے باہر آجانے کے ایک ماہ بعد عتیق کی منشا کے مطابق رشتے طے ہو گئے مگر پروین کو پتا چلا تو سسک اٹھی اس نے ماں سے کہا۔

"امی میں یہ شادی نہیں کر سکتی آپ ابا کو بتا دیں۔" امی اس کی بات سن کر چونک پڑی اس کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"کیوں ایک اور موت کو آواز دے رہی ہے۔"

"ہاں دے رہی ہوں آواز۔" پروین نے چیختے ہوئے کہا۔ "جب مجھے بھی گولی ماردی جائے تو رضیہ کے پہلو میں قبر بنانا۔ میں مر جاؤں گی مگر میری ڈولی بہن کے قاتل کے گھر نہیں اترے گی۔"

"پروین چپ کر جا۔ تیرے ابا نے سن لیا تو زندہ زمین میں گاڑ دے گا۔"

"امی تو کیوں فکر کرتی ہے میرے بعد بھی تین بچ جائیں گی۔"

"زبان بند کر کملیے۔ تجھے پتا تو ہے یہاں وہی ہوتا ہے جو مرد چاہتے ہیں۔ انہوں نے رضیہ کو مارنا چاہا مار دیا۔ بھائی کو چھڑانا چاہا چھڑا لیا۔ اب تو بھی ہنس کے سولی چڑھ جا تیری چیخ و پکار سے کچھ نہیں ہونے والا۔"

"سولی ہی چڑھنا ہے امی تو بہن کے قاتل کے گھر نہیں چڑھوں گی۔ اپنے گھر یہ قربانی دوں گی۔ کچھ بھی ہو جائے میں یہ شادی نہیں کروں گی۔"

رشتے تو طے ہو چکے تھے اور شادیوں کی تاریخ بھی رکھ دی گئی تھی۔ پروین کو امی اور بہنوں نے سمجھا بوجھا کر چپ کروا دیا تھا مگر اس کی خاموشی کسی بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ شادیوں کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ چوہدری گوہر ویسے کے لیے چار اعلیٰ نسل کے بیل لایا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے پورے گاؤں کو بلایا بلکہ کئی دور دراز گاؤں میں اس کے جاننے والے مدعو تھے۔ گھر اور حجرے کو برقی قمقموں سے سجا دیا گیا تھا۔ برات والی رات تیسری صنف کا ڈھول باجوں کے ساتھ حجرے میں بہت بڑا پروگرام بھی رکھا گیا تھا۔ براتوں سے دو دن پہلے کی رات سیف نے عتیق اور گوہر کو علیحدہ بلایا۔

"لالا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آپ بھی بخیر و خوبی باہر آ گئے اور ہمارے بچوں کے کل نکاح ہو جائیں گے اور خاندان کی عزت و توقیر میں اور اضافہ ہو جائے گا۔"

"درست کہتے ہو سیف۔ اور یہ سب تم دونوں بھائیوں کی دور اندیشی کا ثبوت ہے۔" چوہدری گوہر نے دونوں کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لالا مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔"

"ہاں بولو سیف۔"

"مجھے اس بندے کا نام بتائیں جس نے ہوٹل میں آپ کو رضیہ کی بات بتائی تھی۔" سیف کے سوال پر گوہر اور عتیق دونوں بڑی طرح چونک پڑے۔ انہیں اس سوال کی قطعی توقع نہیں تھی۔

"سیف اس قصے کو بھول جاؤ۔ رضیہ کے ساتھ اس سے وابستہ ہر بات دفن ہو چکی ہے۔ آگے کی سوچ۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہو لالا مگر مجھے وہ نام جاننا ہے۔"

"سیف اب اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہ کون تھا اور کیا تھا اب یہ سب بے معنی ہو چکا ہے۔" عتیق نے کہا تو سیف بولا۔

"اگر بے معنی ہو چکا ہے تو نام بتانے میں بھی کوئی ہرج نہیں سیف الرحمان۔"

"سیف ضد نہ کرو۔ پتا چل بھی گیا تو کیا ہوگا جان سے مارو گے اسے۔ اگر ہاں تو مجھے بتاؤ میں ابھی اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیتا ہوں مگر یہ بھی سوچو اس نے جھوٹ کی تہمت نہیں لگائی تھی۔"

"ضد کی کوئی بات نہیں لالا۔ نام پوچھا ہے بس آپ بتا دیں قصہ ختم۔"

"مگر میں نام نہیں بتا سکتا۔"

"ضد والی بات تو یہ ہے لالا...... آپ اپنے بھائی کو ایک غیر شخص کا نام کیوں نہیں بتا سکتے۔"

"سیف تمہارا سوال بے وقت اور بے محل ہے۔"

"کچھ بھی ہے لالا آپ بس مجھے نام بتا دیں۔" عتیق اپنی چارپائی سے اٹھ کر سیف کی طرف آیا تو سیف نے اسے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہیں بیٹھے رہو عتیق۔ میں نام جانے بغیر یہاں سے نہیں اٹھوں گا۔"

"سیف۔" چوہدری گوہر نے غصیلی آواز میں اسے پکارا۔ "تم خوامخواہ بات بڑھا رہے ہو۔"

"نام بتا دو لالا...... بات ابھی کی ابھی ختم......"

"اور اگر نہ بتاؤں تو......؟"

"تو میری طرف سے رشتے کا انکار سمجھیں۔" یہ دوسرا دھماکا تھا جو شفیق نے برمحل کیا تھا۔

چوہدری گوہر غصے میں کھڑا ہو گیا۔ وہ سانپ کی طرح پھنکارتے ہوئے بولا۔ "کیا بک رہے ہو۔ ہوش میں تو ہو۔ میرے حجرے میں چار بیل کھڑے ہیں۔ ہزار لوگوں کو دعوت دے چکا ہوں۔ اور تم......" وہ دونوں بھی کھڑے ہو چکے تھے۔

شفیق سیف کے پاس آ کر بولا۔ "سیف کیوں ضد میں سب کچھ تباہ کرنے پر تل گئے ہو۔"

"ضد میں نے نہیں لالا نے پکڑ رکھی ہے۔ ان کی نظر میں ہم سے زیادہ غیر کی اہمیت ہے۔"

"سیف آخری بار کہہ رہا ہوں۔ بھول جاؤ اس بات کو۔" لالا نے غصے سے کہا مگر شاید مقدر نے ان کے ساتھ کھیل کھیلنا تھا۔ سیف نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

"لالا نام نہیں بتا سکتے تو میرے گھر برات بھی نہ لے کر آنا۔" اس کی بات سن کر گوہر نے پستول نکال لیا۔ "جی چاہتا ہے کہ تیرے سینے میں چھ کی چھ گولیاں اتار دوں مگر لوگ کہیں گے بھائی کو مار دیا۔ اس لیے......" گوہر نے اپنی کنپٹی پر پستول رکھ لیا...... شفیق کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ کبھی گوہر کو دیکھتا اور کبھی سیف کو۔ چوہدری گوہر کہہ رہا تھا۔

"ایک منٹ ہے تیرے پاس سیف۔ بات ختم کرو۔"

"لالا مجھے نام چاہیے بس......" سیف کے منہ سے آخری الفاظ ادا ہو رہے تھے کہ گوہر نے گولی چلا دی۔

☆......☆

خاندان میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا۔ جہاں سے باراتیں نکلنا تھیں وہاں سے جنازہ اٹھا۔

چار روز بعد پروین نے ماں کے ہاتھ پر چھ چھرے مار گولیاں رکھتے ہوئے کہا۔ "امی سوچا تھا نکاح والے دن کھا لوں گی اور بہن کے پہلو میں جا کر سو لوں گی مگر اب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہے۔ اب میں یہ شادی کرنے کے لیے تیار ہوں......

چالیسویں کے تین دن بعد شفیق نے کہا سب تیاری مکمل ہیں اس لیے خاموشی سے بچوں کی رخصتیاں کر دیتے ہیں۔ سب رضامند تھے مگر گوہر کا بیٹا رشتے سے انکاری ہو گیا۔ اس نے ماں سے کہا جو شخص میرے باپ کی موت کا سبب بنا میں اس کی بیٹی سے شادی نہیں کر سکتا۔ ماں نے کہا۔

"بیٹا تیرے باپ کو کسی نے نہیں مارا اسے اس کی ضد نے مارا ہے۔ ہاں البتہ تیرے باپ نے سیف کی بیٹی کو ضرور قتل کیا ہے پھر بھی وہ تجھے رشتہ دینے پر رضامند ہے۔"

"وہ غیرت کا قتل تھا ماں۔ اور یہ...... میرے غیرت مند باپ کو جان بوجھ کر اکسایا گیا ہے۔"

"بیٹا وہ غیرت تھی تو یہ غیرت نہیں کہ تیری منگ کی شادی کسی اور سے ہو جائے؟" ماں کا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ وہ بیٹے کو منانے میں کامیاب ہو گئی مگر اس نے یہ شرط رکھی کہ نہ میں کبھی چاچا کے گھر جاؤں گا نہ ان میں سے کوئی ہمارے گھر آئے گا۔ یہ شرط بھی مان لی گئی کیونکہ دو لاشیں اٹھانے کے بعد اب انہیں بربادی کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سادگی سے سب رخصتیاں ہو گئیں۔ مگر پروین اور وسیم کی پہلے دن سے ہی ٹھن گئی۔ دونوں دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت پال رہے تھے اس لیے ایک ماہ بعد پروین گھر لوٹ آئی۔ نہ اسے طلاق دی گئی نہ واپس لے جایا گیا۔ باقی شادیاں کسی نہ کسی بہانے قائم رہیں۔

☆......☆

"اماں یہ قبر......" میں نے قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"رضیہ کی ہے پتر...... اور میں پروین ہوں...... اس کم نصیب کی بڑی بہن۔" اماں کی بات سن کر میں حیرت سے اچھل پڑا۔ "مگر اماں آپ کا نام تو زیتون ہے۔ اور......" مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا بات کہوں۔

"چھوٹی بہن عاشی کی شادی پنڈی میں ہوئی تھی۔ جب تو پانچ برس کا ہوا تو میں اپنا حصہ لے کر عاشی کے پڑوس میں رہنے لگی۔ میں نے دانستہ اپنا نام بدل دیا تھا۔ عاشی تجھے پہلے بچے کی پیدائش کے وقت چل بسی تھی۔ بن ماں کا بچہ نفرتوں کی نذر ہوتا کہ میں نے دامن پھیلا دیا۔ تجھے پاتے ہی میں نے علاقہ بدل لیا اور میری زندگی کا محور تو بن گیا۔"

"اور میرا باپ......" میں نے بمشکل سوال پوچھا۔

"شاید زندہ ہو مجھے نہیں پتا...... وہ سامنے فتح آباد کی آبادی ہے۔ تجھے اجازت ہے جا کر پتا کر سکتے ہو اور زندہ ہو تو مل بھی سکتے ہو۔"

میں نے اماں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں کھڑا کیا اور گاڑی کی طرف چل پڑا۔

اماں نے اسکارف چہرے پر چڑھا لیا تھا اور میں نے اسپیڈ بڑھا دی۔ میں جلد از جلد گاؤں کی حدود سے دور جانا چاہتا تھا۔

ملمع

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

اکثر لوگوں کے کئی چہرے ہوتے ہیں۔ ایک چہرہ وہ جو سب کے سامنے ہوتا ہے اور ایک وہ چہرہ جو چھپا ہوتا ہے۔ یہ چھپا ہوا چہرہ ہی سب سے خطرناک ہوتا ہے۔ میری زندگی میں بھی ایک ایسا ہی شخص آیا تھا جس کے دو چہرے تھے۔ اسی کی وجہ سے میری زندگی میں ایک موڑ ایسا آیا جو فلموں کے منظر جیسا تھا اور یہی موڑ اہم تھا۔ یہ سب کیسے ہوا، میں نے الفاظ کے ذریعے تصویر کشی کردی ہے۔ اگر کسی قابل ہے تو اسے بھی سرگزشت میں جگہ دے دیں۔

شمسہ عالم

(کراچی)

اس دن ایڈمیشن فیس جمع کرنے کی آخری تاریخ تھی۔ مجھ پر ہول سوار تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ مجھے بینک ٹائم سے پہلے یونیورسٹی پہنچنا تھا ورنہ فیس جمع نہ ہوتی۔ ان دنوں بینکس دوپہر ایک بجے تک پبلک ڈیلنگ کیا کرتے تھے۔

میں جلدی جلدی تیار ہو کر روبی کے گھر کی طرف چل دی۔ ہم دونوں پرائمری سے لے کر کالج تک ایک ساتھ ہی پڑھے تھے۔ میں اس کے بغیر یا وہ میرے بغیر کبھی کالج نہیں

جاتی تھی۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ خدا کرے، روبی تیار ہو ورنہ آدھا گھنٹا تو وہ بھی کھا جاتی۔

میں روبی کے گھر پہنچی تو میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ وہ موصوفہ ابھی تک سر جھاڑ منہ پھاڑ بیٹھی تھیں اور چائے سے شغل فرما رہی تھیں۔ میری تو جان ہی جل گئی۔ میں نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے تمہیں اس سال ایڈمیشن نہیں لینا ہے؟“

”ہاں یار!“ روبی نے منہ بنا کر کہا۔ ”مجھے واقعی ایڈمیشن نہیں لینا ہے۔“

”کیا بات ہے روبی؟“ میں اس کی سنجیدگی پر چونک اٹھی۔ ”گھر میں تیرا کسی سے جھگڑا ہوا ہے یا آنٹی نے کچھ کہہ دیا ہے؟ اب اس ناراضگی کو چھوڑ، واپس آ کر ناراض ہو لینا، جلدی کر پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے۔“

”شمسہ بیٹا!“ مجھے آنٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ نہ جانے کب کمرے میں آ گئی تھیں۔ ”روبی اب ایڈمیشن نہیں لے گی۔ اگلے مہینے اس کی شادی ہو رہی ہے۔“

”کیا...... شادی؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”آنٹی لیکن ابھی تو......“

”دیر مت کر شمسہ!“ روبی نے کہا۔ ”جا ورنہ تجھے بھی ایڈمیشن نہیں ملے گا واپسی پر حیرت کر لینا۔“ روبی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں نے یہ سوچا کہ اس وقت واقعی دیر ہو چکی ہے میں یونیورسٹی سے واپسی پر روبی سے تفصیل پوچھوں گی۔ میں روبی کے گھر سے نکل کر تیز تیز قدموں سے بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔ خلافِ توقع بس بھی فوراً ہی آ گئی اور اس میں زیادہ رش بھی نہیں تھا۔

میں راستے بھر روبی کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ خاصی ذہین لڑکی تھی اور اسے حصولِ علم کا شوق بھی تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ابو تو اس کی تعلیم کی راہ میں حائل نہیں تھے لیکن امی چاہتی تھیں کہ اب وہ گھر میں بیٹھے اور خانہ داری بھی سیکھ لے۔ جس وقت ہم دونوں بی ایس سی فائنل کا امتحان دینے کے بعد واپس آئے تو آنٹی نے کہا تھا کہ روبی نے بی ایس سی کر لیا۔ بس یہ ہی کافی ہے بلکہ کافی سے زیادہ ہے۔

ان کی بات پر روبی مسکرا دی تھی اور مجھ سے بولی تھی۔ ”شمسہ! امی تو نہ جانے کس دور میں جی رہی ہیں۔ میں ایم ایس سی ضرور کروں گی۔ پاپا میرا ہی ساتھ دیں گے۔“

روبی کے والد کسی پرائیویٹ فرم میں خاصی معقول پوسٹ پر تھے۔ روبی کے بھائی جان سہیل بھی ایم بی اے کرنے کے بعد امریکا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لوٹے تھے اور اب وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کر رہے تھے۔ وہ بھی روبی کی تعلیم کے خلاف نہیں تھے۔ پھر ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ تعلیم چھوڑ کر روبی شادی پر آمادہ ہو گئی تھی۔

میں نے بھاگ دوڑ کر کے ایڈمیشن فارم لیا اور اسے بھر کے فیس جمع کرانے بینک پہنچ گئی۔ بینک کے باہر بھی لڑکیوں اور لڑکوں کی ایک لمبی قطار تھی۔ وہاں اتنی لمبی لائن دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ میں اگر قطار میں لگتی بھی تو میرا نمبر آنے سے پہلے ہی بینک ٹائم ختم ہو جاتا۔

اچانک مجھے اپنے محلے کا ایک لڑکا اختر نظر آ گیا۔ وہ بینک سے باہر نکل رہا تھا کہ مجھے دیکھ کر وہ رک گیا اور بولا۔ ”شمسہ تم یہاں کیسے آئی ہو؟“

”میں ایڈمیشن فارم جمع کرانے آئی تھی اختر بھائی لیکن یہاں تو اتنا رش ہے کہ لگتا ہے لیٹ فیس دے کر ہی فارم جمع کرنا پڑے گا۔“

”یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے شمسہ۔“ اختر نے کہا۔ ”لاؤ فارم مجھے دو۔“

میں نے فارم اور پیسے اسے دے دیے۔ وہ فارم لے کر اندر چلا گیا۔ میں اضطراب کے عالم میں باہر انتظار کرتی رہی۔

مشکل سے دو منٹ میں وہ لوٹ آیا۔ اس نے فارم کی رسید مجھے دے دی۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہو گئی۔

بس میں بیٹھنے کے بعد ایک مرتبہ پھر مجھے روبی کا خیال آ گیا۔ میں نے سوچا کہ گھر پہنچتے ہی روبی کے گھر جاؤں گی۔

☆......☆

”ہاں اب بتا تجھے شادی کی کیا مار پڑی تھی؟“ میں نے روبی سے پوچھا۔ اس وقت میں روبی ہی کے کمرے میں بیٹھی تھی۔

”مار مجھے نہیں بلکہ امی کو پڑی تھی۔“ روبی منہ بنا کر بولی۔

”لیکن تیرا منگیتر تو اگلے سال آنے والا تھا اس نے بھی وعدہ کیا تھا کہ میں روبی کو تعلیم حاصل کرنے سے نہیں

روکوں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس کا ٹیلی فون نمبر دے۔ میں عمران سے ابھی بات کرنا چاہتی ہوں۔ اس سے پوچھوں گی کہ......"

"میری شادی عمران سے نہیں ہو رہی ہے۔" روبی نے اطمینان سے کہا۔ "اس لیے تو زیادہ جذباتی مت ہو۔ میری شادی صفدر سے ہو رہی ہے۔"

"صفدر۔" میں نے کہا۔ "یہ کون ذات شریف ہیں اور تو انہیں کیسے جانتی ہے، میرا مطلب ہے کہ آنٹی اور انکل انہیں کیسے جانتے ہیں؟"

"تجھے یاد ہے کہ گزشتہ مہینے ہم ثمینہ کی شادی میں گئے تھے؟" روبی نے کہا۔

"ہاں، لیکن بات ثمینہ کی نہیں بلکہ تیری شادی کی ہے۔" میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"میں وہی تو تجھے بتا رہی ہوں، صفدر، ثمینہ کے دور کے رشتے دار ہیں۔ اس شادی میں وہ بھی اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھے۔ بس انہوں نے اور ان کی اماں نے مجھے دیکھا اور انہیں میری اس منحوس صورت میں نہ جانے کیا نظر آیا کہ وہ لوگ رشتہ لے کر ہمارے گھر آ گئے۔"

"اب بھی، سارا کیا دھرا تیری خوب صورتی کا ہے لیکن تیری منگنی تو عمران سے ہو چکی ہے۔" میں نے الجھ کر کہا۔

"امی تو ان لوگوں کی بے پناہ دولت اور امارت سے ایسی مرعوب ہوئیں کہ انہوں نے منگنی توڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ پاپا اور بھیا نے کہا بھی کہ منگنی توڑنا مناسب نہیں ہے لیکن امی نے ان کی ایک نہ سنی اور صفدر کا رشتہ منظور کر لیا۔ اب ان لوگوں کو بھی بہت جلدی ہے اس لیے اگلے ہفتے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"روبی! شادی تو ایک نہ ایک دن ہر لڑکی کو کرنا پڑتی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ممکن ہے صفدر بھی تجھے تعلیم حاصل کرنے کا موقع دے۔ تو اب اس مسئلے کو اپنی انا کا مسئلہ مت بنانا اور صفدر کو محسوس بھی نہ ہونے دینا کہ تو اس شادی سے خوش نہیں ہے۔"

"اچھا دادی اماں، بہت اچھا۔" روبی جل کر بولی۔ "نصیحتیں تو یوں کر رہی ہے جیسے میری دادی ہو۔"

میں کچھ دیر وہاں مزید رکی۔ آنٹی نے مجھے کھانے پر روکنا چاہا لیکن میں نے معذرت کر لی۔

جاوید بھائی اس وقت آفس سے لوٹے تھے انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا۔ "اوہو شبانہ! آج تم اس وقت کیسے نظر آ رہی ہو؟" انہوں نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا اور بولے۔ "بھئی تم تو صرف صبح کے اوقات میں نظر آتی ہو۔"

"اب میں صبح آ کر کیا کروں گی؟" میں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "روبی تو نے تو آدھے راستے میں مجھے دھوکا دے دیا۔"

"کیا اس گھر میں صرف روبی ہی ہے؟" جاوید نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کوئی اور بھی تو تمہارا انتظار کر سکتا ہے۔"

"وہ کوئی اور ہمارے گھر کیوں نہیں آتا۔" یہ کہہ کر میں باہر نکل گئی۔

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا تھا لیکن پھر بعد میں مجھے خود ہی شرمندگی ہوتی رہی۔ جاوید ہمارے گھر کیوں آتا میرا تو کوئی بھائی بھی نہیں تھا اور ہم لوگ ابھی اتنے آزاد خیال نہیں ہوئے تھے کہ لڑکے بغیر کسی وجہ کے ہمارے گھر آنے لگیں۔ جاوید بھی روبی کی طرح پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ مجھے اچھا بھی لگتا تھا۔ اس بات کا احساس تو مجھے کافی عرصے بعد ہوا تھا کہ جاوید بھی مجھے پسند کرتا ہے۔ یہی سب کچھ سوچتی ہوئی میں گھر آ گئی۔

☆......☆

پھر روبی کی شادی ہو گئی اور وہ بیاہ کر فیڈرل بی ایریا سے ڈیفنس چلی گئی۔ میں اس کی شادی میں شرکت بھی نہ کر سکی کیوں کہ اس دن ہمارے چھوٹے ماموں کی بھی شادی تھی۔

میں نے سوچا تھا کہ صفدر اور روبی کی دعوت کروں گی تو اس سے معذرت کر لوں گی لیکن اس کا موقع ہی نہیں آیا۔ شادی کے فوراً بعد وہ لوگ ہنی مون پر چلے گئے۔ ان کا ہنی مون کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا۔ آنٹی نے مجھے بتایا کہ صفدر ہنی مون کے ساتھ ساتھ اپنے کاروباری معاملات بھی نمٹائے گا۔

اس دوران میں کئی مرتبہ روبی نے مجھے ٹیلی فون کیا۔ وہ ہر مرتبہ صفدر کی تعریفیں کرتی تھی۔ صفدر میری ہر فرمائش پوری کرتے ہیں وغیرہ۔ وہ اپنی شادی سے بہت خوش تھی۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ میں روبی کو جانتی تھی کہ وہ کتنی ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی اس وجہ سے خدشہ تھا کہ روبی اتنی آسانی سے اس تبدیلی کو قبول نہیں کرے گی لیکن روبی نے حالات سے

سمجھوتا کر لیا تھا۔
روبی کی شادی کو دو مہینے ہو چکے تھے۔ اس دن میں یونیورسٹی سے لوٹی تو روبی کی والدہ لاؤنج میں امی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔
انہیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کے ڈھیروں دعائیں دیں۔
یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میرے لیے جاوید کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔
امی نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں اس لیے ابھی ایسی کوئی بات مت سوچیں۔
''بیٹا! انہیں بھی شادی کی جلدی نہیں ہے۔'' امی نے کہا۔ ''تو یہ بتا کہ تجھے یہ رشتہ منظور ہے؟''
میں نے سر جھکا کر کہا۔ ''امی آپ نے اگر پسند کیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ گئی۔
روبی تین مہینے بعد ہنی مون سے لوٹی اور آتے ہی اس نے مجھے ٹیلی فون کر کے بتایا کہ میں رات کو کراچی پہنچی ہوں۔ کل صبح امی کے گھر آؤں گی۔
دوسرے دن میں روبی کے گھر پہنچ گئی۔ روبی کا حسن کچھ اور نکھر آیا تھا اور خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑتی تھی۔
ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ روبی ہنس کر بولی۔ ''شمسہ! مجھے صفدر کی ہر بات پسند ہے لیکن وقت کی پابندی سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ انہیں ہر کام وقت پر چاہیے۔ ناشتا اتنے بجے اور رات کا کھانا اتنے بجے، وقت کی پابندی کے معاملے میں تو انہوں نے انگریزوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔''
''اور تو سدا کی لیٹ لطیف۔'' میں ہنس کر بولی۔ ''اب گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنے میں تکلیف تو ہوگی مگر فکر مت کر تو جلد ہی اس کی عادی ہو جائے گی۔''
''میں عادی ہو چکی ہوں یار۔'' روبی ہنس کر بولی۔ ''میں نے ان کی خاطر اپنی صبح کی نیند قربان کر دی ہے۔''
''تو اگر رات کو دیر تک جاگنے کی عادت چھوڑ دے گی تو تجھے اپنی نیند بھی قربان نہ کرنا پڑے گی۔'' میں نے کہا۔
''یہ تو صفدر کے الفاظ ہیں۔'' روبی ہنس کر بولی۔ ''وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ جلدی سونے سے صبح تک نیند پوری ہو جاتی ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''اور تو نے میرے جاتے ہی میرے بھیا پر ہاتھ صاف کر دیا۔''
''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں منہ بنا کر بولی۔ ''آنٹی کو خود بھی بیٹے کی شادی کی لگی ہوئی تھی۔ میں کیوں ہاتھ صاف کرنے لگی۔''
''ارے یار، میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' روبی نے کہا۔ ''ویسے لگتا ہے میرے ساتھ ساتھ وہ میری پڑھائی بھی چھڑوانا چاہتی ہیں۔''
اس کی بات سن کر ہم دونوں ہنسنے لگے۔
دروازے پر دستک دے کر جاوید اندر آ گئے اور بولے۔ ''بھئی باقی باتیں آیندہ کے لیے اٹھا رکھو۔ ساری باتیں آج ہی کر لو گی تو آیندہ کیا کرو گی؟ چلو چائے تیار ہے۔''
''اچھا تو آپ صرف یہی اطلاع دینے آئے ہیں۔'' روبی نے ہنس کر کہا۔ ''آپ چلیں میں آرہی ہوں۔''
چائے پینے کے بعد میں کچھ دیر وہاں مزید ٹھہری، پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''شمسہ! بھیا بھی شاید میری شادی کا انتظار کر رہے تھے کہ یہ جائے تو میں گاڑی خریدوں ورنہ مجھے لانے لے جانے کی بیگار ان کے گلے پڑ جاتی۔''
''تم تو بہت ذہین ہو۔'' جاوید مسکرا کر بولے۔ ''فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں۔ ویسے تم لوگوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ گاڑی میں نے خریدی نہیں ہے مجھے اپنی فرم کی طرف سے ملی ہے۔''
اس وقت روبی کے پاپا وہاں آ گئے اس لیے ہم سب خاموش ہو گئے۔
ایک ہفتے بعد پھر روبی کا ٹیلی فون آیا اور وہ بولی۔ ''شمسہ! میں اور صفدر آج تیری طرف آرہے ہیں۔''
''ایسے اچانک مت آؤ'' میں نے کہا۔ ''تمہاری تو کوئی بات نہیں ہے لیکن صفدر بھائی پہلی دفعہ ہمارے گھر آئیں گے اس لیے کچھ اہتمام تو کرنا پڑے گا نا۔''
''کوئی اہتمام نہیں۔'' روبی نے کہا۔
''میں سوچ رہی تھی کہ صفدر بھائی کے طفیل تجھے بھی اچھا کھانا مل جائے گا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔
''یار یہ ملاقات اب کینسل نہیں ہو سکتی۔ میں صفدر سے کہہ چکی ہوں کہ آج شام کو ہم شمسہ کے گھر چلیں گے اور

رات کا کھانا وہیں کھائیں گے۔"

"لیکن روبی، میری بات تو سن......!"

"ہم لوگ ٹھیک آٹھ بجے تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔" پھر میں ہیلو...... ہیلو کرتی رہی، اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے جلدی جلدی کھانے کی تیاری کی اور آٹھ بجے تک خاصا اہتمام کرلیا۔ ویسے صفدر کے بارے میں میرے خیالات کچھ اچھے نہیں تھے۔ اس نے روبی کی منگنی تڑوا کے اس سے شادی رچائی تھی۔ میری نظروں میں وہ خود غرض آدمی تھا۔ وہ دولت مند تھا اور دولت مندوں کی طرح ہر چیز کو پیسے سے خریدنا اپنا حق سمجھتا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے صفدر کی چمچماتی ہوئی گاڑی ہمارے دروازے پر آرکی۔ میں نے برآمدے میں ان دونوں کا استقبال کیا۔ میری توقع کے برعکس صفدر خاصا وجیہہ اور خوش لباس آدمی تھا۔ روبی نے میرا تعارف کرایا تو وہ خوش دلی سے بولا۔ "اچھا تو یہ ہیں شمسہ! روبی آپ کی بہت تعریف کرتی ہے۔" وہ مسکرایا۔

"روبی کی باتوں میں مت آئیے گا۔ یہ تو آپ کی بھی بہت تعریف کرتی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

میری بات سن کر صفدر نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔

پھر وہ کھانے کی میز پر بیٹھا تو امی اور ابو سے یوں گھل مل کر باتیں کرنے لگا جیسے انہیں برسوں سے جانتا ہو۔ مجھ سے بھی وہ بے تکلف ہو گیا اور مجھے سوچنا پڑا کہ صفدر ویسا نہیں ہے جیسا میں نے اسے سمجھا تھا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تو صفدر ہنس کر بولا۔ "شمسہ! تم نے کھانا بہت بہترین بنایا تھا۔ میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کھا گیا لیکن چائے تو روبی کے ہاتھ کی ہی اچھی لگتی ہے۔"

"تو پھر میں آپ کے لیے روبی ہی سے چائے بنوا دیتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"آپ کی بنائی ہوئی چائے بھی بہت اچھی ہے۔"

"شمسہ! تم ان کی باتوں کو سیریس مت لینا اور یہ تمہیں چھیڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"بھئی شمسہ میری سالی ہیں۔ ان کے ساتھ مذاق کرنے کا حق تو ہے مجھے۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا پھر روبی سے بولا۔ "میرے خیال میں اب چلنا چاہیے۔"

"ابھی اتنا زیادہ وقت تو نہیں گزرا۔" میں نے کہا۔

"صرف دس ہی تو بجے ہیں صفدر بھائی۔"

"تم جانتی تو ہو کہ یہ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔" روبی ہنس کر بولی۔ "یہ ٹھیک گیارہ بجے سونے کے لیے لیٹ جاتے ہیں۔"

"بھئی اب تو گھر دیکھ لیا ہے۔" صفدر نے مسکرا کر کہا۔ "اب تو آنا جانا لگا رہے گا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شمسہ اب تم کسی دن ہماری طرف آؤ ناں میں گاڑی بھیج دوں گا۔"

"میں آپ کے گھر ضرور آؤں گی۔" میں نے کہا۔

"روبی!" صفدر نے روبی سے کہا۔ "یار تم شمسہ کے گفٹ دینا تو بھول ہی گئیں۔"

"وہ تو گاڑی ہی میں رکھے ہیں۔" روبی نے کہا۔

صفدر گاڑی سے کئی پیکٹ نکال لایا اور بولا۔ "روبی نے لندن، پیرس سنگاپور سے تمہارے لیے کچھ گفٹ لیے ہیں۔" پھر اس نے بڑا سا ایک پیکٹ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ میری طرف سے۔"

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی صفدر بھائی۔" میں نے کہا۔

"یہ تکلف نہیں ہے۔" صفدر مسکرا کر بولا۔ "اور ہمیں اجازت دو۔" وہ مسکراتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں روبی کی خوش نصیبی پر رشک کرتی رہی۔ صفدر واقعی ایک آئیڈیل مرد تھا۔ وجیہہ و شکیل، دولت مند اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔

اس دن میں یونیورسٹی سے واپس آنے کے بعد سو رہی تھی۔ گرمی بہت شدید تھی۔ اچانک ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ میں پہلے تو اس انتظار میں رہی کہ امی فون اٹھالیں گی۔ ٹیلی فون کا ایک ایکسٹینشن لاؤنج میں بھی تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ لاؤنج والا ایکسٹینشن تو میں نے خود ہی آف کر دیا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

میں نے جھنجلا کر ریسیور اٹھالیا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت نسرین نے فون کیا ہوگا۔ نسرین یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتی تھی اور وقت بے وقت مجھے فون کرتی رہتی تھی۔ میں نے جھلا کر کہا۔ "ہاں بولو کیا پریشانی ہے؟"

"شاید میں نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا؟" دوسری طرف صفدر کی آواز سن کر میں چونک اٹھی۔

"آپ......آپ......"

"میں صفدر بول رہا ہوں۔" صفدر نے کہا۔

"صفدر بھائی، وہ دراصل میں سمجھی کہ......سوری...... میں......"

"تم شاید سو رہی تھیں؟" صفدر نے ہنس کر کہا۔

"سوری میں نے تمہیں ڈسٹرب کر دیا۔"

"میں سونے کے لیے لیٹی تھی۔ سو نہیں رہی تھی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"تم نے ہمارے گھر کا وعدہ کیا تھا شمسہ مگر تم آئیں نہیں۔"

"صفدر بھائی! آج کل فائنل سمسٹر کے پیپر ہو رہے ہیں امتحان سے فارغ ہونے کے بعد میں آپ کے یہاں ضرور آؤں گی۔" میں نے کہا۔ "ہاں، روبی کیسی ہے؟"

"روبی ٹھیک ٹھاک ہے۔" صفدر نے کہا۔ "وہ تمہیں بہت یاد کر رہی ہے۔"

"ذرا اس سے بات کرائیں۔" میں نے کہا۔

"میں تو اس وقت آفس میں ہوں۔" صفدر نے جواب دیا۔ پھر بولا۔ "تم امتحانات سے کب تک فارغ ہو جاؤ گی؟"

"بیس تاریخ کو میرا آخری پیپر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے شمسہ، پھر ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں ریسیور ہاتھ میں لیے دیر تک سوچتی رہی کہ صفدر نے اس وقت مجھے فون کیوں کیا؟ بہت دیر تک سوچنے کے بعد بھی میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

میں امتحان سے فارغ ہوئی تو روبی سے بات کرنے کا خیال آیا۔ میں نے اسے فون کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے ریسیور اٹھایا تو مجھے صفدر کی آواز سن کر حیرت ہوئی۔ "کیسی ہو شمسہ؟" اس نے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"کل ہی امتحانات سے فارغ ہوئی ہوں اور اپنی تھکن اتار رہی ہوں۔"

"میں تمہارے لیے گاڑی بھیج رہا ہوں۔" صفدر نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے امی کو بتایا۔ "روبی مجھے بلا رہی ہے میں اس کے گھر چلی جاؤں؟"

امی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں بچپن سے روبی کے گھر جاتی رہی تھی۔ انہوں نے مجھے اجازت دے دی۔ میں جلدی جلدی تیار ہوئی اور گاڑی کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ڈرائیور گاڑی لے آیا۔ میں روبی کے گھر پہنچی تو روبی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے شاید میری آمد کا علم نہیں تھا۔

وہ مجھ سے کچھ پوچھنے والی تھی کہ صفدر لاؤنج میں داخل ہوا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ "سرپرائز! روبی میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں آج تمہیں سرپرائز دوں گا۔" وہ ہنس کر بولا۔

"روبی بھی ہنستی ہوئی میرے گلے لگ گئی اور صفدر سے بولی۔ "کیا زبردست سرپرائز ہے۔"

"ہمارے ساتھ رہو گی تو ایسے ہی سرپرائز ملتے رہیں گے۔" صفدر نے کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "شمسہ! کیسی ہو تم؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تم آنٹی کو بتا کر آئی ہو ناں کہ یہاں دو چار دن رہو گی؟"

"دو چار دن؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "یہ تو میں امی کو بتا کر نہیں آئی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔" صفدر ہنس کر بولا۔ "روبی بتا دے گی۔"

"لیکن......صفدر بھائی......مجھے گھر میں بہت سے کام ہیں اور......"

"رک جاؤ نا شمسہ۔" روبی نے کہا۔ "میں سارا دن گھر میں پڑے پڑے بور ہو جاتی ہوں۔ ایک دو دن تمہارے ساتھ ہلا گلا رہے گا۔"

"میں نے پکنک کے کئی پروگرام بنا رکھے ہیں۔" صفدر نے کہا۔ "آج ہم لانگ ڈرائیو پر جائیں گے اور باہر ڈنر کریں گے۔ کل ہم سی سائیڈ پر جائیں گے پرسوں......"

"بس بس، صفدر بھائی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ابھی یہ ہی طے نہیں ہوا ہے کہ میں یہاں رکوں گی یا نہیں۔"

"یہ تو ابھی طے کیے لیتے ہیں۔" اس نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر روبی کے سامنے رکھ دیا اور بولا۔ "تم ذرا آنٹی سے بات کر لو۔ تمہاری بات تو وہ کبھی نہیں ٹالیں گی۔"

روبی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور ہمارے گھر کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ پھر اس نے امی سے کچھ ایسے انداز میں بات کی کہ امی نے فوراً اجازت دے دی۔

"صفدر بھائی۔" میں نے کہا۔ "کیا میں دو دن تک یہ ہی ایک جوڑا پہنے رہوں گی؟"

"کوئی پرابلم نہیں ہے۔" صفدر نے کہا۔ "میرے خیال میں تمہارا اور روبی کا سائز برابر ہے۔ تم روبی کے کپڑے استعمال کرسکتی ہو۔"

"ہاں شمسہ۔" روبی نے کہا۔ "میرے بہت سے جوڑے ابھی تک بالکل نئے رکھے ہیں۔ تم وہ پہن لینا۔"

میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ یوں بھی روبی امی سے اجازت لے چکی تھی۔

مجھے اچانک الجھن سی ہونے لگی۔ روبی سے زیادہ صفدر روکنے میں پیش پیش تھا۔ روبی جانتی تھی کہ میں کہیں بھی نہیں رکتی ہوں لیکن صفدر کی وجہ سے شاید اس نے امی سے اجازت لی تھی۔

شام کو ہم لانگ ڈرائیو پر نکل گئے۔ راستے میں ایک جگہ رک کر ہم نے آئس کریم کھائی اور صفدر دیر تک سڑکوں پر گاڑی دوڑاتا رہا، پھر ہم نے رات گئے ڈنر کیا۔ اس وقت پونے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "صفدر بھائی! آج آپ کی گھڑی بند ہے کیا؟"

روبی نے حیرت سے صفدر کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔

ہم کھانا کھا کر گھر لوٹے تو روبی نے ہنس کر کہا۔ "صفدر صاحب! آج آپ کو اکیلے ہی سونا پڑے گا آج میں شمسہ کے کمرے میں لیٹوں گی۔"

"شوق سے لیٹو۔" صفدر نے خوش دلی سے کہا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد روبی نے کمرے کا دروازہ اندر سے بولٹ کیا اور میرے نزدیک آ گئی۔ وہ کسی سوچ میں غرق تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو روبی؟" میں نے پوچھا۔

وہ چونک اٹھی اور بولی۔ "شمسہ! میں صفدر کے رویے پر غور کر رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے کچھ بتائے بغیر گاڑی بھیج کر تمہیں بلایا، پھر اصرار کر کے تمہیں یہاں روکا۔"

"میں خود بھی ان باتوں پر غور کرتی رہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "مگر میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔"

"لیکن میں سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔" روبی نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم کیا سمجھ رہی ہو؟" میں اٹھ کر بیٹھ گئی، پھر سوچ کر بولی۔ "روبی! مجھے خود بھی یہ سب اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ میں کل ہی اپنے گھر چلی جاؤں گی۔"

"نہیں شمسہ! ایسا مت کرنا ورنہ صفدر یہ سمجھیں گے کہ میں نے تم سے کچھ کہا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں، مجھے صفدر بھائی کا رویہ بہت عجیب لگا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم کچھ مت کرو۔" روبی نے کہا۔

پھر ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اگلی صبح ہم دونوں دیر تک سوتے رہے۔ روبی سے پہلے میری آنکھ کھل گئی۔ میں باتھ روم میں چلی گئی۔ وہاں سے نکلی تو روبی بیڈ پر نیم دراز چائے پی رہی تھی۔ میں نے حیرت سے دیکھا اور بولی۔ "اب تو چائے بھی پینے لگی؟"

"ہاں یار!" روبی مسکرائی۔ "صفدر کی وجہ سے میں بہت سی چیزوں کی عادی ہو گئی ہوں اور بہت سی چیزیں ترک کر دی ہیں۔"

ہم دونوں تیار ہو کر باہر نکلے تو صفدر لاؤنج میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ ہمیں دیکھ کر اس نے اخبار رکھ دیا اور روبی سے بولا۔ "روبی ڈیئر! مجھے افسوس ہے کہ ہمیں اپنا پروگرام کینسل کرنا پڑے گا۔ ڈیڈی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے اس لیے مجھے آفس جانا پڑے گا۔"

"ڈیڈی کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟" روبی نے چونک کر کہا۔

"نہیں زیادہ خراب تو نہیں ہے ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے۔ ایسے موقع پر ڈاکٹر انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیتا ہے۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "سوری شمسہ! میں......"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ کا آفس جانا ضروری ہے۔ تفریح پھر کبھی سہی۔"

تھوڑی دیر بعد صفدر تیار ہو کر آفس چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے روبی سے کہا۔ "میں ڈرائیور کو لے کر نہیں جا رہا ہوں اگر تمہارا کہیں جانے کا موڈ ہو تو چلی جانا۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے روبی سے کہا۔ "میرے خیال میں اب مجھے بھی گھر چلنا چاہیے۔"

"ابھی بھی کیا جلدی ہے شمسہ۔" روبی ہنس کر بولی۔

"تم ایک دو دن میرے ساتھ نہیں گزار سکتیں۔ ہم اپنے طور پر بھی تو انجوائے کر سکتے ہیں۔"

میں نے سوچا۔ روبی امی سے تو اجازت لے ہی چکی ہے۔ میں بھی فارغ ہوں اس لیے روبی کے ساتھ رہنے میں کوئی ہرج نہیں ہے ہم دونوں اپنے طور پر زیادہ انجوائے کریں گے۔

ان دو دنوں میں صفدر سے صرف رات کو کھانے پر ملاقات ہوتی تھی۔ صبح ناشتے کے وقت تو میں سوتی رہتی تھی۔

تیسرے دن دوپہر کو روبی میرے ساتھ نکلی اور بولی۔

"پہلے ہم شاپنگ کریں گے۔ پھر میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گی۔"

میں گھر پہنچی تو امی کا موڈ خراب تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں اگر روبی کے گھر ٹھہرنا ہی تھا تو مجھے بتا کر جاتیں۔ وہیں سے بیٹھے بیٹھے فون کروا دیا کہ بیگم صاحبہ یہاں کچھ دن قیام فرمائیں گی۔"

"امی میرا ارادہ تو بالکل نہیں تھا۔ روبی میرے پیچھے پڑ گئی کہ یہاں رک جاؤ پھر میرے انکار کے باوجود اس نے آپ کو فون کر دیا۔"

"تمہارے ابو کو یہ بالکل پسند نہیں ہے اس لیے آئندہ محتاط رہنا۔" یہ کہہ کر امی کچن میں چلی گئیں۔

دوسرے دن رات کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ٹائم دیکھا اس وقت رات تین بج رہے تھے۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ فون صفدر نے کیا ہے۔ مجھے اب اس سے الجھن ہونے لگی تھی۔ وہ کیوں میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں نے جھنجلا کر ریسیور اٹھا لیا اور اکھڑ لہجے میں بولی۔ "ہیلو۔"

"شمسہ باجی!" دوسری طرف سے روبی کی چھوٹی بہن ارم بول رہی تھی۔

"ہاں ارم، بولو خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے شمسہ باجی۔" ارم نے کہا۔ "بھیا اور پاپا ایک شادی میں شرکت کے لیے حیدر آباد گئے ہوئے ہیں گھر میں...... کوئی...... بھی نہیں ہے...... امی کی...... طبیعت......"

"امی کو کیا ہوا ارم؟" میں نے پوچھا۔

"وہ شاید باتھ روم گئی ہوئی تھیں کہ اچانک گر گئیں۔ میری آواز ان کے گرنے سے کھلی ہے اب...... وہ......"

"اچھا میں آ رہی ہوں۔" میں نے کہا اور بستر چھوڑ دیا۔

میں نے بال سیٹ کر جوڑا بنایا اور امی کو بتایا کہ فرحت آنٹی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ میں ان کے گھر جا رہی ہوں۔

میری آواز سن کر ابو بھی کمرے سے نکل آئے اور بولے۔ "ٹھہرو شمسہ، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

میں ابو کے ساتھ روبی کے گھر پہنچی تو آنٹی کی حالت واقعی خراب تھی۔ ابو نے فوراً ایمبولینس کے لیے فون کر دیا۔ فوراً ہی ایمبولینس وہاں آ گئی۔

ابو کا خیال تھا کہ آنٹی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ اسپتال میں آنٹی کو فوراً آئی سی یو میں بھیج دیا گیا۔ میں اور ارم باہر کوریڈور میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ابو نے بتایا کہ اب آنٹی کی حالت خطرے سے باہر ہے۔

ارم نے روبی کو بھی اطلاع دے دی تھی۔ وہ صفدر کے ساتھ فوراً ہی اسپتال پہنچ گئی۔ میں نے جاوید اور انکل کو اطلاع دینے سے منع کر دیا تھا۔ آنٹی کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ وہ دونوں یوں بھی صبح کراچی آنے والے تھے پھر انہیں پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

روبی بہت زیادہ بوکھلائی ہوئی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ آنٹی کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ صفدر بھی اسے تسلیاں دے رہا تھا۔

صبح تک آنٹی کی حالت مزید سنبھل گئی۔ انہیں آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ صبح میں ارم کو لے کر گھر چلی گئی۔ ابو اپنے گھر کی طرف چلے گئے۔ میں ارم کے ساتھ روبی کے گھر ٹھہر گئی۔ اس وقت جاوید اور انکل حیدر آباد سے لوٹ آئے۔ آنٹی کی بیماری کے بارے میں سن کر جاوید بہت زیادہ پریشان ہو گیا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ آنٹی کی طبیعت اب ٹھیک ہے۔ انہیں آئی سی یو سے کمرے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

"امی کے پاس کون ہے؟" جاوید نے پوچھا۔

"ان کے پاس روبی اور صفدر بھائی ہیں۔ میں ارم اور ابو بھی اسپتال سے واپس آئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

انکل اور جاوید اسی وقت اسپتال چلے گئے۔ میں گھر واپس آ کر لیٹ گئی۔

دوسرے روز معلوم ہوا کہ آنٹی گھر آ گئی ہیں اور وہ امی کو بلا رہی ہیں۔

امی یوں بھی ان کے گھر جا رہی تھیں۔ میں گھر ہی پر

رک گئی۔

امی تقریباً دو گھنٹے بعد وہاں سے لوٹیں تو کسی سوچ میں گم تھیں۔

"کیا ہوا امی خیریت تو ہے؟"

"بیٹا خیریت ہی ہے۔" امی نے جواب دیا۔ "بس فرحت نے عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"کیوں اب آنٹی کو کیا ہوا؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"بیٹا وہ زیادہ مایوس ہیں۔" امی نے کہا۔ "میں نے انہیں بہت سمجھایا کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے لیکن ان کے ذہن پر نہ جانے کیوں موت کا خوف سوار ہے۔"

"موت کا خوف؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بیٹا ان کا وہم ہے کہ وہ کچھ دن بعد مر جائیں گی۔" امی نے کہا۔ "وہ مرنے سے پہلے جاوید کی شادی کرنا چاہتی ہیں۔"

میں بری طرح چونک اٹھی لیکن بولی کچھ نہیں۔

"بیٹا میں جانتی ہوں کہ ابھی تمہاری تعلیم ادھوری ہے لیکن......"

"امی انہیں سمجھائیں کہ یہ سب ان کا وہم ہے۔"

"میں نے انہیں بہت سمجھایا، روبی اور جاوید نے بھی سمجھایا لیکن ان کی ایک ہی رٹ ہے کہ میں جاوید کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ان کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انہیں کسی بھی قسم کا ذہنی دباؤ نہیں پہنچنا چاہیے۔ شمسہ بیٹا میں تو چاہتی ہوں کہ تو اپنی تعلیم مکمل کر لے لیکن فرحت......"

"امی!" میں نے کہا۔ "میں پہلے روبی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔

میں اصل میں جاوید سے بات کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں ضرور کرو۔" روبی ابھی وہیں ہے۔" امی نے کہا۔

میں تھوڑی دیر بعد روبی کے گھر پہنچ گئی۔ مجھے دیکھ کر آنٹی کی آنکھوں میں چمک سی بھر آئی۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔ پھر آہستہ سے بولیں۔ "شمسہ بیٹا! مجھے مایوس مت کرنا، بیٹا میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ میری یہ آخری خواہش پوری کر دے۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔ "آنٹی ایسی باتیں مت

شہاب 3

(Shahab-III)

ایران کے براعظمی میزائلوں کا ایک سلسلہ۔ اس سلسلے کا شہاب 3 میزائل مئی 2002ء میں چھوڑا گیا یہ اسرائیل کے علاوہ سعودی عرب، ترکی اور افغانستان میں تعینات امریکی فوج کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ 810 میل کی دوری پر مار کر سکتا ہے۔

ایران نے اگست 2004ء میں درمیانی فاصلے تک مار کرنے والے شہاب تھری میزائل کا کامیاب تجربہ کیا۔ میزائل کی رینج 2500 کلومیٹر تھی۔ جب کہ یہ اپنے ساتھ ایک ہزار کلوگرام وار ہیڈ لے جانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ 2012ء میں شہاب 7 کا تجربہ کیا گیا جس نے امریکی ٹیکنولوجی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

مرسلہ: ارباز خان، سیالکوٹ

کریں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

پھر انکل وہاں آگئے تو میں ان کے پاس سے اٹھ گئی۔

میں وہاں سے لاؤنج میں آئی تو جاوید وہاں موجود تھا۔ جاوید مجھے دیکھ کر میری طرف آگیا اور بولا۔ "شمسہ! میں جانتا ہوں کہ امی کی خواہش پوری کرنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہے لیکن انہیں بیمار سمجھ کر ان کا صرف دل ہی رکھ لیتا۔"

"میں کچھ نہیں آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس وقت تم امی کا دل رکھنے کے لیے ہاں کر دو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں ان سے جھوٹ بولوں۔" میں نے کہا۔ "جاوید صاحب مجھے ایک بات بتائیے کیا مجھے شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم جاری رکھنے دیں گے آپ؟"

جاوید کو شاید مجھ سے ایسے دو ٹوک رویے کی توقع نہیں تھی۔ وہ حیرت اور بے چینی سے میری شکل دیکھنے لگا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "شمسہ! میں تو روبی کی تعلیم کا بھی مخالف نہیں تھا۔ شادی کے بعد بھی آپ پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ آپ جب تک چاہیں پڑھتی رہیں۔"

اس وقت روبی مجھے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آگئی اور

بولی۔ ”ارے تم ابھی تک موجود ہو۔ میں تو سمجھی تھی کہ تم جا چکی ہو۔“

”بس جا ہی رہی ہوں۔“ میں نے مسکرا کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

”شمسہ!“ روبی نے مجھے آواز دی۔ ”ٹھہرو، میں تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

جاوید نے شوخ نظروں سے میری طرف دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔

روبی میرے ساتھ ہمارے گھر آگئی۔ اس نے کچھ دیر امی سے رسمی باتیں کیں پھر میرے کمرے میں آگئی۔

”چائے بناؤں تمہارے لیے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب تو تو چائے بھی پینے لگی ہے۔“

”رہنے دے شمسہ! مجھے تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

”یہ بات تو دوسری مرتبہ کہہ رہی ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”شمسہ! تجھے آنٹی نے بتایا تو ہوگا کہ وہ کیا چاہتی ہیں؟“

”ہاں روبی مجھے معلوم ہوا ہے کہ......“

”میں یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ تو امی کی بات مان ہی لے۔ بس تو......“

”تھوڑا سا جھوٹ بول دوں؟“ میں نے اس کا جملہ پورا کردیا۔ ”لیکن میں اتنے بڑے معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتی۔ آنٹی کی طبیعت ایسی خراب ہے لیکن انشاء اللہ کل وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ پھر میں اپنے جھوٹ سمیت ان کا سامنا کر سکوں گی؟“ پھر میں آہستہ سے بولی۔ ”سن روبی! میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں اتنی پتھر دل بھی نہیں ہوں کہ آنٹی کو مایوس کروں۔ میرے لیے تو زیادہ اہم ہے روبی، تعلیم نہیں میں آنٹی کی بات ماننے کو راضی ہوں۔“

”شمسہ......تو......لیکن......اتنی بڑی بات سن کر روبی کچھ بوکھلا گئی تھی۔ ”وہ......امی......تو......آئندہ جمعے کو نکاح اور رخصتی کرنے کا کہہ رہی ہیں۔“

”ہاں تو جب ایک کام کرنا ہی ہے تو کیا جمعہ اور کیا ہفتہ۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میری طرف سے تم لوگ کل نکاح کرا دو لیکن یہ ڈیپارٹمنٹ امی اور ابو کے پاس ہے اس لیے میں کچھ نہیں کر سکتی۔“

”مجھے تو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی۔ آنٹی اور انکل کے ڈیپارٹمنٹ سے نمٹنا میری ذمے داری ہے۔“

اچانک ارم کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ”آپی! صفدر بھائی آچکے ہیں۔ وہ تمہیں بلا رہے ہیں۔“

”چلو میں چل رہی ہوں۔“ روبی نے کہا۔ پھر ہنس کر بولی۔ ”باقی باتیں صفدر کے جانے کے بعد۔ میں ابھی امی کے گھر رہوں گی۔“

میں نے امی کو بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کردیا۔ امی نے جذباتی ہو کر مجھے سینے سے لگالیا۔

رات کو ایک بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں اس وقت نیم غنودگی میں تھی۔ میں نے ٹیلی فون سیٹ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ لیا تھا کیوں کہ روبی نے فون کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا میں غنودہ لہجے میں بولی۔ ”ہیلو! تجھے اب فرصت ملی ہے؟“

”تم شاید نیند میں ہو شمسہ!“ دوسری طرف سے صفدر کی آواز آئی۔

”سوری صفدر بھائی! میں سمجھی کہ روبی نے فون کیا ہے۔“

”ویسے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے شمسہ؟“ صفدر نے پوچھا۔ ”آواز سے تو ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں صفدر بھائی۔“ میں نے کہا۔ ”بس آج ذرا کچھ تھکن ہو گئی ہے۔“

”چلو پھر تم سو جاؤ۔ میں تمہیں مزید پریشان نہیں کروں گا، شب بخیر۔“ صفدر نے آہستہ سے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

اس ٹیلی فون کال سے میری نیند اڑ گئی تھی۔ میں ایک مرتبہ پھر سوچنے لگی کہ آخر یہ شخص چاہتا کیا ہے؟

دوسری صبح بہت ہنگامہ خیز تھی۔ میں سو کر اٹھی تو روبی امی کے پاس بیٹھی تھی! اور نہ جانے ان سے کیا کھسر پھسر کر رہی تھی۔ میں اسے امی کے ساتھ مصروف چھوڑ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ باہر نکلی تو روبی جا چکی تھی۔

امی میرا ناشتا لے کر آئیں تو میں نے ان سے پوچھ لیا۔ ”یہ روبی صبح صبح کیوں آئی تھی؟“

”صبح صبح!“ امی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ دوپہر ہو رہی ہے۔ بارہ بجے بھی تمہیں صبح صبح لگ رہی ہے۔ پھر بھنا کر بولیں۔ ”تمہاری شادی کی تاریخ طے کر گئی ہے آئندہ جمعے کو تمہاری رخصتی ہے۔ اب جلدی جلدی ناشتا کرو اور

میرے ساتھ بازار چلو۔ مجھے تمہارے لیے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔"

شاپنگ کرتے ہوئے ہمیں شام ہو گئی۔ امی بہترین منتظمہ تھیں۔ چند گھنٹوں میں انہوں نے میرے لیے سونے کا سیٹ ... خرید لیا، کپڑے اور جوتے بھی خرید لیے، فرنیچر کا آرڈر بھی دے دیا۔

شام کو ہم لدے پھندے گھر پہنچے۔

میں گھر جا کے فریش ہونے کے بعد چائے کا مگ لے کر بیٹھی ہی تھی کہ ارم آ گئی۔ اس نے امی سے کہا کہ آنٹی آپ کو امی بلا رہی ہیں۔

امی نے کہا۔ "بیٹا فرحت کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"ان کی طبیعت پہلے سے بہت بہتر ہے۔" ارم نے جواب دیا۔

"اچھا بیٹا تم چلو میں ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔" امی نے کہا۔ پھر ارم کے جانے کے بعد بولیں۔ "بیماری نے فرحت بے چاری کو کتنا مجبور کر دیا ہے۔ اللہ اسے صحت عطا فرمائے۔"

چائے ختم کرنے کے بعد وہ روبی کے گھر چلی گئیں۔ میں لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ کوشش اس لیے کہ ٹی وی دیکھنے کو میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

امی، روبی کے گھر سے واپس آئیں تو بتانے لگیں۔ "یہ فرحت بیمار پڑی ہے لیکن اس بیماری میں بھی اسے چین نہیں ہے۔ وہ کل تمہیں اپنے ساتھ لے کر بازار جانا چاہ رہی ہے۔"

"امی کیا ہو گیا ہے فرحت آنٹی کو، اس حالت میں بازار جائیں گی۔"

"میں نے سختی سے انکار کر دیا کہ اس حالت میں تم گھر سے نکلو گی بھی نہیں۔ پھر اس نے ضد کر کے یہ پیسے دے دیے کہ میری طرف سے شمسہ کو دے دیں۔ وہ اپنی پسند کا کوئی سوٹ خرید لے گی۔"

"امی میرا خیال ہے کہ فرحت آنٹی آرام بھی نہیں کر رہی ہوں گی۔ یہ روبی بھی بیٹھی ہوئی تماشا دیکھتی رہتی ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

روبی تو آج دوپہر ہی واپس چلی گئی۔ صفدر اسے لینے آیا تھا۔

"صفدر بھائی بھی عجیب ہیں۔" میں نے کہا۔ "انہیں آنٹی کی بیماری کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔"

"نہیں بیٹا۔" امی نے کہا۔ "صفدر اکیلا رہتا ہے اسے کھانے پینے کی تکلیف ہو گی۔"

میں نے ان کو نہیں بتایا کہ صفدر اکیلا نہیں رہتا ہے بلکہ گھر میں چوکیدار، مالی اور ڈرائیور کے علاوہ تین ملازم گھر کے کام کاج کے لیے ہیں۔ اسے بھلا کھانے پکانے کی تکلیف کیسے ہو گی۔

دوسرے دن پھر صفدر کا فون آ گیا۔ اس نے کہا۔ "شمسہ، روبی کی طبیعت کچھ خراب ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر تھوڑی دیر پہلے اسے دوائیں دے کر گیا ہے، روبی تمہیں بلا رہی ہے۔ میں گاڑی بھیج رہا ہوں اس کے ساتھ چلی آؤ۔"

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی لیکن صفدر نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے امی کو بتایا کہ روبی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ صفدر بھائی نے مجھے بلایا ہے۔

امی بھی گھبرا گئیں اور بولیں۔ "اللہ خیر کرے، نہ جانے اس خاندان پر کیا آفت آ گئی ہے؟ تم چلی جاؤ وہاں جا کر شمسہ کی خیریت سے مطلع کرنا۔"

میں نے کپڑے بدلے، بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بنایا اور جانے کو تیار ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد صفدر کی گاڑی بھی آ گئی اور میں روبی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

روبی کے گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ وہاں سناٹا ہی رہتا تھا۔ میں برآمدہ عبور کر کے لاؤنج میں داخل ہوئی تو وہاں بھی سناٹا تھا۔ روبی کا بیڈ روم اوپر تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں پہنچ کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھی ہی تھی کہ مجھے اوپر کی منزل پر صفدر نظر آیا۔ وہ مجھے اوپر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی اور صفدر سے پوچھا۔ "روبی کیسی ہے صفدر بھائی؟"

"روبی...... ہاں روبی...... ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"روبی کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"روبی ادھر ہے اس کمرے میں۔" اس نے اپنے بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا۔ "ڈاکٹر اسے دوا دے کر گیا ہے۔ وہ اس وقت سو رہی ہے۔ اسے ڈسٹرب مت کرو۔"

"سو رہی ہے؟" میں نے چونک کر کہا۔ "اس کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"کیا تم نے بار بار ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے۔" صفدر نے جھنجھلا کر کہا۔ اس لمحے مجھے اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی جھلک دکھائی دی۔ "میں بتا تو رہا ہوں کہ اس کی طبیعت اب

ٹھیک ہے۔ وہ سو رہی ہے۔‘‘

’’صفدر بھائی!‘‘ میں نے کہا۔ ’’اگر اس کی طبیعت ٹھیک ہے تو آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا؟‘‘

میرا خیال تھا کہ روبی کی وجہ سے صفدر بہت پریشان ہے اور الٹی سیدھی باتیں کر رہا ہے۔

’’آؤ ہم اس کمرے میں بیٹھتے ہیں۔‘‘ صفدر نے اس بیڈ روم کی طرف اشارہ کیا جس میں کچھ دن پہلے میں رہی تھی۔

’’صفدر بھائی میں......‘‘

’’آؤ شمسہ۔‘‘ صفدر نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کمرے میں گھسیٹ لیا۔

مجھے پہلی دفعہ اس سے خوف محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی چمک اب بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ’’صفدر بھائی میں ایک نظر روبی کو دیکھ لوں۔ پھر مجھے اطمینان ہو جائے گا۔‘‘

’’روبی......روبی......روبی۔‘‘ صفدر چیخ کر بولا۔ ’’سونے دو اسے تم یہاں میرے پاس بیٹھو۔‘‘ صفدر نے مجھے بیڈ پر دھکیل دیا۔

میں تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ’’مجھے جانے دیں صفدر بھائی۔‘‘

’’اتنی مشکل سے تو تم یہاں آئی ہو۔ اب تمہیں جانے دوں۔‘‘ صفدر نے میرا بازو پکڑ کر پھر مجھے بیڈ کی طرف دھکیلا۔

’’صفدر بھائی پلیز مجھے جانے دیں۔‘‘ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

’’میں دو تین گھنٹے میں تمہیں خود گھر چھوڑ آؤں گا۔‘‘ صفدر نے کہا۔

’’مجھے جانے دیں۔‘‘ میں نے چیخ کر کہا اور صفدر کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرا۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف لپکی۔ صفدر میرے پیچھے بھاگا اور مجھے سیڑھیوں کے پاس پکڑ لیا۔

’’رک جاؤ شمسہ۔‘‘ صفدر نے کہا۔ ’’ڈرو مت......تم رو کیوں رہی ہو؟ آؤ میرے پاس بیٹھو۔‘‘

’’آپ پاگل تو نہیں ہو گئے ہیں؟‘‘ میں نے چیخ کر کہا۔

’’آپ نے جھوٹ بول کر مجھے یہاں بلوایا، کیوں، آخر کیوں؟‘‘

’’تم اتنی خوب صورت ہو شمسہ کہ میں تمہیں دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھا۔‘‘

’’آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو آپ کی بہت عزت کرتی تھی۔ آپ تو بہت گھٹیا آدمی ہیں۔‘‘

’’مجھے عزت کی نہیں تمہارے پیار کی ضرورت ہے۔‘‘ صفدر مجھے دھکیل کر پھر اس بیڈ روم میں لے گیا۔ ’’مجھے تمہارا پیار چاہیے شمسہ۔‘‘

’’مجھے چھوڑ دے ذلیل آدمی۔‘‘ میں نے صفدر کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

جوابی طور پر میرے چہرے پر صفدر کا زوردار تھپڑ پڑا تو میرے کان میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ صفدر چیخ کر بولا۔ ’’تو مجھ پر ہاتھ اٹھائے گی۔ تو دو ٹکے کی لڑکی صفدر پر ہاتھ اٹھائے گی تجھے اپنے حسن پر بہت ناز ہے۔ بہت غرور ہے ناں میں تیرا غرور مٹی میں ملا دوں گا۔‘‘ صفدر نے مجھے بیڈ پر گرا دیا۔

وہ میرے اوپر جھکا تو میں نے اس کے سینے پر زوردار لات ماری۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا اور اس کا سر دیوار سے ٹکرا گیا۔ میں جھپٹ کر دروازے کی طرف بھاگی تو اس نے میرا پیر پکڑ لیا۔ میرا توازن بگڑ گیا اور میں صفدر کے اوپر جا گری۔ اس نے مجھے بری طرح دبوچ لیا۔

اس وقت باہر سے اطلاعی گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔ صفدر چونک اٹھا۔ اس نے مجھے کسی ہلکی پھلکی گڑیا کی طرح اٹھا کر پٹخ دیا۔ میرا سر فرش سے ٹکرایا اور میری آنکھوں میں ستارے ناچ گئے۔ پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو کچھ دیر تک تو مجھے یاد ہی نہ آیا کہ میں کہاں ہوں؟ میرے سر اور شانوں میں بہت درد ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے سر پر ہاتھ لگانا چاہا تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ میں نے اٹھنا چاہا تو اٹھ نہ سکی کیوں کہ میرے دونوں پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ یہ وہی بیڈ روم تھا جس میں صفدر مجھے لے کر آیا تھا۔

میں پوری قوت سے چیخی۔ ’’صفدر بھائی، روبی......پلیز میری مدد کرو۔‘‘ لیکن میری آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔ اپنی بے بسی پر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب رونے سے میرا دل کچھ ہلکا ہوا تو میں نے سوچا میں اس وقت بہت بڑے خطرے سے دوچار ہوں۔ امی تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ میں یہاں اس مصیبت میں گرفتار ہوں۔ وہ تو یہ ہی سمجھیں گی کہ میں روبی کے گھر ہوں۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو جنبش دی تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے صفدر نے زیادہ سختی سے نہیں باندھا ہے۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو پہلو سے نکالا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے

اپنے پیٹ کی طرف لے آئی۔ پھر میں نے سانس روک کے مزید گنجائش پیدا کی تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے اپنا ایک ہاتھ آزاد کرا لیا۔ پھر میں نے بہت تیزی سے اپنے جکڑ بند کھولے اور خود کو آزاد کرا لیا۔ میں رسی کی قید سے تو آزاد ہو گئی تھی لیکن اب بھی کمرے میں قید تھی۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں دروازے کا جائزہ لے رہی تھی کہ مجھے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے تیزی سے ارد گرد کا جائزہ لیا تاکہ اپنے بچاؤ کے لیے کوئی چیز لے سکوں۔ مجھے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ماربل کا گلدان نظر آیا۔ میں نے وہی ہاتھ میں اٹھا لیا۔

دروازے میں چابی لگنے کی آواز آئی تو میں جھپٹ کر دروازے کے نزدیک دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئی۔ یہ سب میں نے فلموں میں دیکھا تھا۔ دروازہ کھلا تو میں اس کے پٹ کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

صفدر نے دروازے پر کھڑے کھڑے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ بیڈ سامنے ہی تھا جس پر اس نے مجھے باندھ کر ڈالا تھا۔ وہ حیرت زدہ سا اندر داخل ہوا۔ بس اسی لمحے میں نے اس کے سر پر ماربل کے بھاری گلدان سے وار کیا۔ وہ تیورا کر فرش پر گر پڑا۔ میں خوف سے کانپتی ہوئی وہاں سے بھاگی اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے پہنچی۔ لاؤنج میں مجھے ٹیلی فون نظر آ گیا۔

میں نے ٹیلی فون پر جاوید کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف ارم تھی۔

”ارم، ذرا میری بات جاوید سے کرا دو۔“

دوسرے ہی لمحے جاوید لائن پر آ گیا اور بولا۔ ”ہاں شمسہ تم کہاں سے بول رہی ہو؟“

”میں روبی کے گھر میں ہوں جاوید۔“ میں نے کہا اور رونے لگی۔

”شمسہ! تم ٹھیک تو ہو، روبی کہاں ہے۔ تم رو کیوں رہی ہو؟“ جاوید کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

”تم وہیں ٹھہرو میں ابھی آ رہا ہوں۔“ جاوید نے کہا۔

میری حالت اس وقت تباہ ہو رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے کپڑے ملگجے سے ہو گئے تھے اور پیروں میں چپل بھی نہیں تھی۔ میں اپنی چپل لینے دوبارہ اس بیڈ روم میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ مجھے خدشہ تھا کہ صفدر ہوش میں نہ آ جائے۔ مجھے یہ ہول ناک خیال آیا تو میں نے سوچا کہ اس بیڈ روم کا دروازہ باہر سے لاک کر دوں۔ میں ڈرتے ڈرتے پھر اوپر پہنچی۔ بیڈ روم کے دروازے کے سامنے ہی صفدر بے ہوش پڑا تھا۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور اسے لاک کر دیا۔ میں پھر نیچے لاؤنج میں جا کر بیٹھ گئی۔

مجھے وہاں انتظار کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی تھی یا پھر مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ اچانک بنگلے کے گیٹ کے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ پھر مجھے جاوید کے پیچھے امی اور ابو کے چہرے دکھائی دیے۔ میں دوڑ کر ابو سے لپٹ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

”صفدر کہاں ہے؟“ جاوید نے پوچھا۔

”میں نے اسے بے ہوشی کی حالت میں اوپر بیڈ روم میں بند کر دیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

پھر ہم سب اوپر پہنچے۔ جاوید نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ کھولا تو صفدر اسی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ کر کارپٹ میں جذب ہو گیا تھا۔ اس نے جھک کر اس کی نبض دیکھی اس کی سانس محسوس کرنے کی کوشش کی پھر آہستہ سے بولا۔ ”یہ مر چکا ہے۔“

”کیا؟“ میں نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔ ”مم...... مم...... مر گیا...... نہیں...... یہ......؟“

”یہ مر چکا ہے شمسہ۔“ جاوید نے کہا۔ ”اب یہاں کسی چیز کو ہاتھ مت لگانا۔ سب کچھ اسی طرح چھوڑ دو۔ میں پولیس کو ٹیلی فون کر رہا ہوں۔“

”لیکن...... رو...... روبی...... کہاں...... ہے؟“

”میں پہلے پولیس کو فون کر دوں پھر روبی کو تلاش کرتے ہیں۔“

میں خوف سے بری طرح کانپ رہی تھی۔ یہ تصور ہی میرے لیے خوف ناک تھا کہ میرے ہاتھوں ایک جیتا جاگتا انسان موت کے منہ میں چلا گیا۔

جاوید روبی کو ڈھونڈتا رہا، اسے آوازیں دیتا رہا لیکن روبی کو تلاش نہیں کر سکا۔

تھوڑی دیر بعد پولیس وہاں پہنچ گئی۔ پولیس انسپکٹر چالیس بیالیس سال کی عمر کا چاق و چوبند آدمی تھا۔ اس نے پہلے لاش کا جائزہ لیا پھر رومال میں لپیٹ کر وہ گل دان اٹھا لیا جو آلۂ قتل تھا۔ پھر اس نے میرا بیان لیا۔ میں نے سب کچھ اسے تفصیل سے بتا دیا۔

”جب آپ یہاں پہنچیں تو صفدر کہاں تھا؟“

”وہ اوپر ہی تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس نے مجھے

بھی اوپر ہی بلا لیا تھا۔"

"آپ نے روبی سے ملنے کی کوشش نہیں کی؟"

"کی تھی لیکن صفدر نے مجھے روبی کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا۔"

"وہ ڈرائیور کہاں ہے جو آپ کو یہاں تک لایا تھا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی، ڈرائیور مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"سر مقتول کے ملازموں میں سے کوئی بھی یہاں موجود نہیں ہے۔"

"او کے۔" ایک ماتحت نے جواب دیا۔

"ایسا لگتا ہے جیسے وہ لوگ بھی عجلت میں یہاں سے گئے ہوں۔"

"مقتول کے والدین کہاں رہتے ہیں؟" اس نے جاوید سے پوچھا۔

"وہ لوگ یہاں سے زیادہ دور نہیں رہتے۔" جاوید نے جواب دیا۔

"میرے پاس ان کا ایڈریس بھی ہے اور ٹیلی فون نمبر بھی۔"

انسپکٹر نے جاوید کے والد کا فون نمبر لیا اور نمبر ملا کر بولا۔ "احمد اللہ صاحب! میں انسپکٹر فہیم ہوں۔ آپ کے بیٹے کے گھر سے بول رہا ہوں۔ انہیں حادثہ پیش آ گیا ہے آپ فوراً یہاں پہنچیں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اچانک اس کا ماتحت چیخ کر بولا۔ "سر یہ...... ذرا ادھر آیئے۔"

انسپکٹر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا کوریڈور کے سرے پر واقع کمرے میں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ جاوید بھی تھا۔ پھر مجھے جاوید کی آواز سنائی دی۔ "یہ...... یہ...... کیسے ہو گیا...... روبی......؟"

"حوصلہ رکھیں مسٹر جاوید۔" انسپکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔

میں بھی بھاگ کر وہاں پہنچی۔ کمرے کے ایک کونے میں روبی گٹھڑی کی صورت میں فرش پر پڑی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ اس وقت مسخ ہو رہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں میں اس وقت کوئی انجانا سا خوف تھا اور وہ مر چکی تھی۔

اچانک مجھے زور کا چکر آیا اور میں نے سہارے کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنا چاہا پھر میں فرش پر گر پڑی اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔

مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں کسی اسپتال کے کمرے میں تھی۔ امی اور ابو میری دائیں طرف والی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھنا چاہا تو امی نے نرمی سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے روک دیا۔

مجھے تفصیلات کئی دن بعد معلوم ہوئیں۔ صفدر نے روبی کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش اس کمرے میں ڈال دی تھی۔ پھر اس نے مجھے فون کر کے بلا لیا۔ پولیس نے اس ڈرائیور کو بھی گرفتار کر لیا تھا جو مجھے لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ صفدر نے اس سے کہا تھا کہ تم جا کر شمسہ بی بی کو لے آؤ۔

پھر مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ اس وقت میں پولیس کی حراست میں ہوں اور اپنے کمرے سے باہر نہیں جا سکتی۔ کمرے کے باہر پولیس کا ایک کانسٹیبل موجود تھا۔

صفدر کے والد سیٹھ احمد اللہ نے مجھ پر الزام لگایا تھا کہ شمسہ نے پہلے روبی کو قتل کیا پھر بے خبری میں صفدر کو بھی قتل کر دیا۔

احمد اللہ نے بہت زور لگایا کہ کسی طرح مجھے مجرم ثابت کر دے لیکن انسپکٹر فہیم نے جو ایف آئی آر بنائی تھی وہ میرے حق میں تھی۔ وہ لوگ مجھے مجرم ثابت نہ کر سکے اور کورٹ نے مجھے باعزت بری کر دیا۔

صفدر ذہنی مریض تھا اور دو سال تک ایک دماغی اسپتال میں زیر علاج بھی رہا تھا۔ احمد اللہ نے جانتے بوجھتے اپنے پاگل بیٹے کی شادی کر دی۔ روبی سے پہلے بھی دو لڑکیاں اس کا شکار ہوئی تھیں لیکن خوش قسمتی سے وہ بچ گئی تھیں۔ احمد اللہ نے ان کے والدین کو بھاری رقم کھلا کر ان کا منہ بند کر دیا تھا۔ وہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ روبی سے شادی کرنے کے بعد صفدر نارمل ہو گیا ہے لیکن مجھے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر اس کا پاگل پن لوٹ آیا۔ اب کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ صفدر کا قصور تھا یا اس میں میرے بے پناہ حسن کا ہاتھ تھا۔ میں بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی تھی۔ اس سانحے نے میری عزیز از جان دوست روبی کی جان لی۔ میری تعلیم ادھوری رہ گئی اور اس سے بھی بڑا سانحہ یہ ہوا کہ جاوید کے گھر والوں نے اس کی شادی کہیں اور کر دی۔

فرحت آنٹی آج بھی زندہ سلامت ہیں۔ البتہ میں ایک چلتی ہوئی لاش بن کر رہ گئی ہوں۔ میں نے بعد میں اپنی ادھوری تعلیم مکمل کر لی اور اب ایک سرکاری کالج میں لیکچرر ہوں۔ اسی کا نام زندگی ہے۔

مانوس اجنبی

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
یہ چاندنی کی کہانی نہیں، برسوں کی دبی ہوئی آہ ہے۔ آپ خود ملاحظہ کریں کہ کیا پرانے شکاری اب نہیں رہے وقت کے ساتھ انہوں نے بھی حلیہ بدل لیا ہے۔ وہی شکاری اب نئے انداز سے شکار کررہے ہیں، اجنبی ہوتے ہیں لیکن حرکتیں مانوس سی ہوتی ہیں۔

محمد فیاض ماہی
(فیصل آباد)

لوگ جھوٹی کہانیاں لکھتے اور سناتے ہیں میں نے بھی پچاسوں کہانیاں لکھی اور چھپوائی ہیں لیکن جب مجھے فاریہ کی کہانی معلوم ہوئی تو میں سکتے میں رہ گیا۔ اس لیے کہ اس کہانی میں وہ سب کچھ ہے جو کسی اچھی کہانی میں ہونا ضروری ہے۔ اس لیے اس کہانی کو اسی انداز میں لکھ رہا ہوں جس انداز میں فاریہ سے سنا ہے۔ تو آیئے کہانی کی طرف چلتے ہیں۔

چاندنی نے اخبار میں اشتہار دیکھا تو اس کو لگا کہ اب

اس کے دل کی شدید خواہش پوری ہو کر ہی رہے گی۔ کیونکہ فلموں اور ڈراموں میں کام کرنا وہ خود کے لیے بہت ہی ضروری سمجھتی تھی، ایک تو وہ بہت خوبرو اور حسین تھی اور دوسرے اس کا قد کاٹھ بھی فلمی ہیروئنوں جیسا ہی تھا لیکن ایک ہی خامی اس کو اپنی ذات میں نظر آتی تھی وہ تھی اس کا ان پڑھ ہونا۔ بس پانچ جماعتیں وہ جیسے تیسے کر کے پڑھ گئی تھی۔ پھر گھر کے حالات نے اجازت ہی نہ دی تھی کیونکہ اس نے باپ کی صورت تک نہ دیکھی تھی بس ماں ہی کو دیکھا تھا اور وہی اس کا باپ بھی تھی اور ماں بھی۔

وہ مستقبل کے سنہری خوابوں میں کھونے لگی تھی کہ چندا کی ٹھن ٹھن کرتی ہوئی کھانسی نے اس کا موڈ خراب کر دیا۔ اس نے کمرے کے دوسرے حصے میں ایک پرانی سی چارپائی پر پڑی ہوئی اپنی بوڑھی ماں کی طرف دیکھا جس کو ایک بار پھر کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا اور وہ کھانس کھانس کر مرنے والی ہو رہی تھی۔

چاندنی نے اٹھ کر اس کو ایک بوتل سے پانی پلانے کے لیے گلاس پکڑا تو چندا نے انگلی کے اشارے سے منع کرتے ہوئے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور کانپتی ہانپتی دوبارہ میلی سی چادر پر لیٹ گئی اور اپنی سانس درست کرنے لگی۔

"اماں آپ نے خود ہی تو پیر صاحب سے یہ پانی دم کروایا تھا اب اس کو پیو گی نہیں تو آرام کیسے آئے گا؟" چاندنی نے دوبارہ بوتل پر ڈھکن لگاتے ہوئے کہا تو چندا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا:

"تم بھی بہت ہی بھولی ہو۔ میری بیماری اب دم والے پانی سے ٹھیک ہونے والی نہیں ہے۔" وہ بمشکل ہی بول پائی تھی کہ ایک بار پھر کھانسی نے اپنا رنگ دکھانے کے لیے اس کے پھیپھڑوں کو تکلیف دینا شروع کر دی تھی۔

چاندنی نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کو اٹھا کر بٹھایا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ چندا نے ہانپتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور آہستگی سے بولی۔ "میری بیٹی۔ تم ایک بار حکیم صاحب کے پاس جا کر میری بیماری کا بتا دو وہ گھر آ کر مجھے دیکھ لیں گے پھر ان کو دوائی بنانے میں آسانی ہو جائے گی۔"

وہ ایک بار پھر لیٹنا چاہتی تھی کہ چاندنی نے پوچھا، "اماں اگر راجا صاحب کے گھر سے ہوتی آؤں تو؟" چاندنی نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ کر ماں کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں پر چھا جانے والے کرب اور اذیت کی ابھرنے والی لہر کو وہ محسوس کر سکتی تھی۔

"وہ بھولنے والے تو نہیں ہیں، بس کوئی کام پڑ گیا ہو گا۔" چاندنی "ہونہہ" کہہ کر سر ہلا کر رہ گئی تو چندا پھر بولی، "بس کوئی بات نہ کرنا ان سے صرف گھر سے ہو کر ہی آ جانا، اتنا کہنا کہ رانی بیگم کی خیر خبر کے لیے اماں نے بھیجا تھا۔" چاندنی چارپائی سے اٹھتی ہوئی بولی۔ "ہاں وہ سمجھدار ہیں خود ہی سمجھ جائیں گے کہ مہینا پورا ہو گیا ہے۔ اور ہاں اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہہ دینا سمجھی تم؟" چندا بہت ہی دکھی لگ رہی تھی۔

چاندنی نے اپنی جوتی پہنی اور دوپٹا سر پر ٹھیک طرح سے رکھا اور دروازے کا پردہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

چاندنی کے ذہن میں اخبار کا وہ اشتہار ہی گھوم رہا تھا جس نے اس کو اس کے سنہرے خواب پورے ہونے کی وعید سنائی تھی لیکن اب مسئلہ اس ڈائریکٹر کے دفتر تک پہنچنے کا تھا جو کہ فی الحال جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ چاندنی کو اچانک خیال آیا کہ راجا صاحب کی ملازمہ اس کی مدد کر سکتی ہے کیونکہ وہ سودا سلف لانے کے لیے مارکیٹ جاتی رہتی ہے اور اس کو شہر کے سب راستوں کا بھی علم ہے۔

راجا صاحب کے گھر جا کر رانی بیگم کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اس نے چھنو سے اپنے دل کی بات کہی تو وہ ہونقوں کی طرح اس کا منہ دیکھنے لگی کیونکہ راجا صاحب کی حویلی میں تو اس بات کا تصور بھی نہ تھا کہ کوئی ڈراموں یا فلموں میں کام کرے، وہ لوگ اس کام کو اچھا نہیں سمجھتے تھے اور یہ مانتے تھے کہ یہ کام شریف لوگوں کے کرنے کا نہیں ہے لیکن چاندنی نے چھنو کو اپنی دوستی کے واسطے دے کر راضی کر لیا کہ وہ اس کو اخبار پر درج فلمی ادارے کے دفتر تک لے جائے گی لیکن خود اندر نہیں جائے گی اور چاندنی کو خود ہی واپس آنا پڑے گا۔

چاندنی بخوشی اس بات پر راضی ہو گئی تھی، وہ سہانے خوابوں کے ساتھ گھر پہنچی تو چندا کھانس کھانس کر سو چکی تھی، ایک بار تو چاندنی کو لگا کہ اس کی ماں اللہ کو پیاری ہو چکی ہے لیکن سانس لینے اور چندا کے کروٹ بدلنے پر اس نے سکون کا سانس لیا۔

چھنو بھی بہت چالاک لڑکی تھی اسی نے سارا پلان بنایا تھا کہ وہ چندا کو یہ کہہ دے گی کہ رانی صاحبہ نے چاندنی کو اپنے گھر میں کام کے لیے بلایا ہے اس طرح وہ دونوں

آسانی سے مارکیٹ جاسکیں گی اور چاندنی فلموں کے دفتر چلی جائے گی۔

چندا کو کوئی بھی اعتراض نہ تھا کہ چاندنی راجا صاحب کے گھر جا کر کام کاج کرلیا کرے کیونکہ ایک راجا صاحب ہی تھے جو اب تک اس کا ماہانہ خرچ اٹھا رہے تھے اور اس کے دوا دارو کا بندوبست بھی راجا صاحب نے اپنے ذمہ لیا ہوا تھا۔ وہ ایک خداترس انسان تھے اور ان کو یہ بھی علم تھا کہ چندا کے اس محلہ اور ان کے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے، اور چندا بھی اپنی ماں کے سہارے زندگی گزار رہی ہے اور اس بات کا چندا کو آسرا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد راجا صاحب اس کی بیٹی کو زمانے کے ہاتھوں کھلونا بننے کے لیے نہیں چھوڑیں گے بلکہ باعزت طریقے سے اس کی شادی کسی نہ کسی کا مے کے ساتھ کردیں گے اور اس کی چاندنی اچھی زندگی گزارے گی۔

ڈائریکٹر جو کہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو بالکل فٹ رکھا ہوا تھا کہ اس کی فیلڈ ہی ایسی تھی اس نے اپنے کمرے میں اپنے سامنے کھڑی چاندنی کو غور سے دیکھا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ خاصی گھبرائی ہوئی ڈائریکٹر کی طرف دیکھنے لگی۔ دوسری بار کہنے پر وہ کرسی پر بیٹھ گئی لیکن اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ ابھی کہ ابھی اٹھ کر بھاگ جائے گی۔

''میرا نام رجب ہے اور میں اب تک بہت سی فلمیں بنا چکا ہوں۔'' ڈائریکٹر نے اپنا نام بتا کر اپنا تعارف کروانا شروع کردیا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتی ہوئی اپنے خشک ہوتے ہوئے گلے کو تر کرنے کی کوشش کی اور توجہ سے رجب کی باتیں سننے لگی تھی، جو کہہ رہا تھا۔ ''یہ فیلڈ ہے تو بہت منافقت والی لیکن جو بھی اس میں اپنا کام ایمان داری سے کرکے اپنا نام بنالیتا ہے یہ دنیا اس کے قدموں میں گر جاتی ہے۔''

چاندنی نے اثبات میں سر ہلا کر اس کو ہنکارہ دیا تو وہ پھر گویا ہوا۔ ''مجھے اپنی نئی فلم کے لیے تم جیسی ہی کسی لڑکی کی ضرورت تھی پرانے چہروں سے تو لوگ اکتا چکے ہیں۔''

اتنا سن کر تو چاندنی کی باچھیں ہی کھل گئیں تھیں، وہ پہلی بار بولی۔ ''میں پڑھی لکھی نہیں ہوں۔''

رجب سن کر مسکرایا اور بولا۔ ''میں تو خود ہی پاگل ہو گیا ہوں کہ تمہارے حسن میں اس قدر کھو گیا کہ تمہارا نام ہی نہیں پوچھا۔''

وہ اب کچھ حوصلہ کرتی ہوئی بولی۔ ''چاندنی'' اس کا انداز ایسا تھا کہ رجب قربان ہوتا ہوتا ہی رہ گیا۔

ان کے درمیان بہت سی باتیں ہوئی تھیں۔ چاندنی نے اگلے دن شوٹنگ اسٹارٹ ہونے کا سن کر بے یقینی کی کیفیت میں رجب کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتا ہوا اسی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ جس پر چاندنی کو جھینپنا پڑا۔ کل وقت پر آنے کا کہہ کر چاندنی جب رجب کے کمرے سے باہر نکلی تو اس کے پاؤں ہی زمین پر نہ ٹک رہے تھے، وہ ہواؤں میں اڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ گھر پہنچی تو چندا کی حالت کچھ ٹھیک نہ تھی وہ کھانس کھانس کر چارپائی سے گرنے والی تھی کہ چاندنی نے اس کو سنبھالا دے کر لٹایا اور اس کو دوائی پلائی تو چندا کو کچھ دیر بعد افاقہ محسوس ہونے لگا تھا، وہ اپنا سانس درست کرتی ہوئی چاندنی کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''کیا راجا صاحب کے گھر کوئی مہمان وغیرہ آرہے ہیں؟'' اب چندا میلے سے تکیے کو سر کے نیچے رکھ کر سیدھی لیٹ گئی تھی، اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

''ہاں اماں، لگتا ہے کہ چھوٹے راجا کی شادی ہے اس لیے کافی کام ہے۔'' چاندنی نے ایک بہت بڑا جھوٹ بول کر چندا کو مطمئن کرنے... کی کوشش کی۔ ''اور رانی بیگم کا کہنا تھا کہ جب تک چھوٹے راجا کی شادی نہیں ہو جاتی مجھے ہر روز ان کی حویلی جا کر کام کرنا ہوگا۔'' چاندنی نے اپنی بات کہہ کر کنکھیوں سے ماں کی طرف دیکھا جو کروٹ لے چکی تھی اور کہہ رہی تھی۔

''تو کیا ہوا تم کون سا مری جارہی ہو۔ یہ بھی تو دیکھو ان کے سوا ہمارا کون ہے، وہ ہمارا کتنا خیال کرتے ہیں۔''

چاندنی نے تیر نشانے پر لگتے دیکھا تو اپنی بات بھی

شمارہ اکتوبر 2016ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆ اول: جھولا......ارشد علی ارشد (سعودی عرب)

☆ دوم: استاد جی......شمیم غوری (کراچی)

☆ سوم: دھوکا......ارسلان (کراچی)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

سیدہ ضوباریہ ساحر

(گزشتہ قسط کا خلاصہ)

ماہین پہلوٹھی کی اولاد ہوتی ہے۔ ماہین سے پہلے بڑی امی کے گھر سات بیٹوں کی پیدائش ہوتی ہے لیکن کوئی بھی سال بھر سے زیادہ زندہ نہیں رہا تھا بڑی امی کی سوتیلی ماں ایک سکھ تھیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بڑی امی کے والد سے عقد کرلیتی ہیں۔ بڑی امی کی سوتیلی ماں ننھی منی ماہین کے پیر پر جلتی ہوئی لکڑی رکھ دیتی ہیں یہ ایک ٹوٹکا ہوتا ہے پرانے وقتوں میں کہا جاتا تھا کہ جس بہن کے بھائی زندہ نہیں بچتے اگر بھائی کی پیدائش کے فوراً بعد اس کے ٹخنے پر جلتی لکڑی سے داغے جائیں تو بھائی بچ جاتے ہیں ماہین کے بھائی شہباز کی تو زندگی اس ٹوٹکے سے بچ جاتی ہے لیکن ماہین خود نرینہ اولاد سے محروم رہ جاتی ہے ماہین چار سال کی عمر سے قربانیاں دیتی آرہی ہوتی ہے۔ بڑی امی نے کچھ عرصے تک اپنے دونوں بچوں کے ساتھ بیوگی کا تکلیف دہ دور دیکھا ہوتا ہے۔ کیا میکہ اور کیا سسرال سب کے ہوتے ہوئے بڑی امی کا کوئی نہیں رہا تھا ایسے میں ایک سلجھا ہوا انسان ان کی طرف پیش قدمی کرتا ہے، پانچ سال کی ماہین اور ڈیڑھ سال کے شہباز کو سینے سے لگا کر وہ ایک بار پھر نئی زندگی کا آغاز کرتی ہیں کچھ عرصہ سکھ وچین کی یہ چادر ان پر تنی رہی تھی اس کے بعد بڑی امی کی گود میں چار زندگیاں اور آجاتی ہیں لیکن اچانک ہی منظور الحسن (بڑی امی کے دوسرے شوہر) اچانک دنیا سے کنارہ کرتے ویرانے میں جا بستے ہیں۔ سال یونہی گزر جاتے ہیں ماہین اب میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں پہنچ جاتی ہے تب اس کے ددھیال والوں کو بڑی امی کی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے ماہین کے تایا شبیر علی پانچ بیٹوں کے باپ اور زمیندار ہوتے ہیں انہیں اپنے دوسرے نمبر والے عارف علی کے لیے ماہین پسند آجاتی ہے یوں ماہین اپنی ماں کا آنگن چھوڑ کر سسرال سدھار جاتی ہے اور شادی کے تین سال بعد منتوں مرادوں بعد ہادیہ پیدا ہوتی ہے۔ عارف علی باپ کے مرنے کے بعد سارے کاروبار کو سنبھال لیتا ہے اور اپنے نت نئے شوق بھی پورے کرتا ہے لیکن جب ماہین دوسری بیٹی انیقہ کو جنم دیتی ہے تو عارف علی سب سے روٹھ کر پہاڑ پر موجود درگاہ پر جا بیٹھتا ہے، وہ گھرانا جہاں دن رات نعمتوں کی فراوانی رہتی تھی دودھ، پھل، گوشت کی کبھی کمی نہ ہوتی ایسے گھر میں ماہین اور اس کی دونوں بیٹیاں ہر نعمت سے محروم زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ شہباز ایف ایس سی کلیئر کرنے کے بعد تعلیم کو خیر باد کہہ چکا ہوتا ہے۔ اپنی ماں کی دن رات کی مشقت اور بچپن سے اب تک سب کی محرومیوں نے اس کے اندر کچھ بن کر دکھانے کا جوش پیدا کردیا ہوتا ہے اور پھر شہباز شوکت بھائی (ہمسائے) کے ہمراہ جرمنی چلا جاتا ہے لیکن پہلے ہی مرحلے میں اس کے ساتھ دھوکہ ہوتا ہے۔ شوکت بھائی شہباز کو جرمنی ایئرپورٹ پر تنہا چھوڑ کر اپنی راہ لیتے ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

آج پھر لیزلی نے بار میں داخل ہوتے ہی اپنے مخصوص ٹیبل پر بیٹھتے ہی شہباز کو خاص ادا سے بلایا تو اس کی چھٹی حس پوری طرح چوکس ہوگئی۔

''وڈ یو پلیز اسپینڈ سم ٹائم ودمی...... آئی وانٹ ٹو ٹاک ٹو یو آؤٹ سائیڈ دا بار ٹوڈے۔'' شہباز کے قریب آتے ہی اس نے کہا تو شہباز نے گھبرا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا' خوب صورت تیکھے نقوش جو مے نوشی یا پھر شاید اندر کے کسی احساس سے مزید تیکھے اور تمتماتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

کرنا نہ بھولی۔

"پر...... اماں، وہ مجھے چھنو کے ساتھ مارکیٹ بھی بھیجنے کا کہہ رہے تھے، مجھے نہیں جانا مارکیٹ۔"

یہ سن کر چندا نے مشکل سے کروٹ بدلی اور غصے سے چاندنی کی طرف دیکھا اور کھا جانے والے انداز میں بولی۔

"اب اس وقت میری بوڑھی ہڈیوں کو احسان فراموشی کی سزا دو گی تم؟"

چاندنی کی خواہش کے مطابق لوہا خاصا گرم ہو چکا تھا وہ بڑے بھولپن میں بولی، "تو پھر نہ کہنا کہ مجھے گھر آنے میں دیر ہوگئی ہے۔ تمہارا خیال کون رکھے گا، تمہیں دوائی کون پلائے گا، تم خود سے اٹھ کر پانی تک تو پی نہیں سکتی ہو۔ مجھے نہیں کرنا راجاؤں کی خدمت۔"

نتیجہ چاندنی کی عین مرضی کے مطابق ہی نکلنا تھا اور وہی ہوا چندا چلا کر کچھ بولنے لگی تو اس کو اچھو لگ گیا۔ وہ کھانسنے لگی تو چاندنی نے اس کی بات کو پورا کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے اماں، ٹھیک ہے، میری طرف سے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" دم کیا ہوا پانی پی کر چندا کو کچھ افاقہ تو ہوگیا تھا لیکن اس کی سانس بحال نہ ہو رہی تھی، چاندنی نے اس کی پیٹھ سہلانا شروع کردی تھی اور اب آہستہ آہستہ چندا بھی پُرسکون ہوتی جارہی تھی، کیونکہ چاندنی نے اس کے دل کی بات کہہ کر اس کی لاج جو رکھ لی تھی۔

چاندنی کا مقصد پورا ہونا شروع ہوگیا تھا وہ راجا صاحب کے گھر کا کہہ کر صبح کو گھر سے نکلتی اور شام کو گھر لوٹتی تھی اب تو اس نے چھنو کو بھی ساتھ لے جانا گوارہ نہ سمجھا تھا کیونکہ وہ بقول رجب کے بہت جلد اس ملک کی نامور ہیروئن بننے والی تھی اور مستقبل کی نامور ہیروئن کو چھنو جیسی تھرڈ کلاس ملازمہ کے ساتھ دوستی اور رازداری نہیں رکھنا چاہیے تھی۔

چندا کی بیماری نے زور پکڑا تو چاندنی کو بھی ہوش آیا وہ بھاگم بھاگ حکیم صاحب کے پاس پہنچی، وہاں رش تھا اس کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑا تو ایک نوجوان لڑکی حکیم صاحب کو اپنی نبض چیک کروا رہی تھی، یہ کوئی چونکنے والی بات نہیں تھی لیکن چاندنی کو ایک زوردار جھٹکا تب لگا جب لڑکی نے اپنی بیماری کی علامات حکیم صاحب کو بتانا شروع کیں۔

"مجھے کوئی بھی چیز ہضم نہیں ہوتی، پانی بھی پیتی ہوں تو الٹی ہوجاتی ہے۔"

وہ لڑکی بتا رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں چاندنی کے چہرے کی رنگت زرد ہوتی جارہی تھی، ایک نامعلوم سا احساس اس کو ہونے لگا تھا کہ کوئی بہت ہی خطرناک بم اس کی طرف بڑھنے لگا ہے اور وہ بم اس کے سر پر آکر پھٹ جائے گا۔ وہ لڑکی اپنی نبض چیک کروارہی تھی لیکن فکر چاندنی کو ہو رہی تھی اس کا دھیان ادھر ہی لگا تھا۔

"مبارک ہو بیٹی، اللہ نے تم پر اپنی رحمت کردی ہے۔" حکیم صاحب کہہ رہے تھے اور ان دیکھا بم چاندنی کے سر پر آکر کھڑا ہوگیا تھا، "تم ماں بننے والی ہو۔" بم ایک زوردار دھماکے سے چاندنی کے سر پر پھٹ چکا تھا، اس کا اپنا ہاتھ بے اختیار اپنے پیٹ پر رینگ گیا تھا، وہ ہیروئن بن چکی تھی لیکن ابھی تک اس کی کسی بھی فلم کی شوٹنگ اسٹارٹ نہ ہوسکی تھی۔

چاندنی نے گھر آکر بوجھل دل کے ساتھ چندا کو دوائی پلائی اور اپنے بستر پر لیٹ گئی، لیکن طبیعت خراب محسوس ہو رہی تھی، اور حکیم کی بات اس کے دل و دماغ میں زور زور سے نقارہ بجارہی تھی کہ تم ماں بننے والی ہو، تم ماں بننے والی ہو......

اس کو ایک دم متلی سی محسوس ہوئی تو وہ اٹھ کر صحن میں پڑے ہوئے سلور کے حمام کی جانب بڑھی تو اس کو قے ہونے لگی تھی۔

اس کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے چندا بھی پریشان ہوگئی تھی وہ غور سے جوان بیٹی کی طرف دیکھے جارہی تھی لیکن جان بوجھ کر کچھ بھی نہ سمجھنا چاہتی تھی۔

دو دن بعد جب چاندنی فلم اسٹوڈیو سے واپس گھر پہنچی تو چندا اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اور چاندنی نے بخوبی محسوس کیا تھا کہ آج اس کی ماں کے تیور بھی بدلے ہوئے لگ رہے ہیں، اس نے فوراً ہی ایک اچھا سا بہانہ سوچ لیا کہ وہ راجا صاحب کا نام لے کر چندا کو ایک بار پھر بہلالے گی، لیکن آج چندا کسی اور ہی موڈ میں نظر آرہی تھی۔

"کہاں سے آرہی ہو چاندنی؟" یہ سوال شاید چاندنی کے لیے متوقع نہ تھا یا پھر ماں کا لہجہ آج بدلا ہوا تھا، وہ کچھ گڑبڑائی لیکن فوراً ہی خود کو سنبھالتی ہوئی بولی۔

"اماں وہی راجا صاحب کے گھر کے کام اور بازار جانا اور پھر......" وہ اپنی بات پوری ہی نہ کرپائی تھی کہ چندا زور سے چلائی۔

"جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے چاندنی، تمہارا لہجہ

"تمہارے الفاظ تمہاری زبان کا ساتھ نہیں دے رہے۔" چندا نے ہلکا سا کھانسا اور پھر بولی، "اعتماد سب سے بڑی چیز ہے اگر یہ کھو جائے تو انسان کی اوقات زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔"

چاندنی کے لیے چندا کا بدلا ہوا رویہ اور لہجہ گو کہ تکلیف دہ تھا لیکن وہ خود چور بنی آج ماں کی ممتا کے کٹہرے میں کھڑی تھی۔

چندا پھر بولی۔ "چھنو آئی تھی۔" وہی ہوا جس کا ڈر تھا کہ چاندنی کا راز کھل گیا ہے۔ سہ حرفی فقرہ بہت ہی بڑا لگا تھا، اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گھبرائی ہوئی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا جو کہہ رہی تھی۔

"جن راہوں پر تم چل نکلی ہو وہ کانٹوں کی سیج ہیں۔ ان پر چلنے کے لیے فولاد سے بھی زیادہ مضبوط دل اور پہاڑوں سے بھی زیادہ بڑے حوصلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

چاندنی نے آگے بڑھ کر اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو چندا نے ہاتھ اٹھا کر اس کو بولنے سے منع کر دیا، اور اپنی کھانسی کو روکتی ہوئی کہنے لگی۔

"تم میری اکلوتی بیٹی ہو، میں نے زمانے کی دھوپ اور چھاؤں سے بچا کر تمہاری پرورش کی ہے، تمہیں بڑی تکلیفوں سے پالا پوسا ہے، لیکن جو راستہ تم نے اختیار کیا ہے وہ اس دنیا کا غلیظ ترین راستہ ہے، جس پر چلنے والے کے نہ صرف پاؤں گندے ہوتے ہیں بلکہ اس کے کردار پر بھی کبھی نہ مٹنے والا وہ داغ لگ جاتا ہے کہ اس کو اپنی باقی زندگی زمانے سے منہ چھپا کر ہی گزارنا پڑتی ہے۔"

"میں سمجھی نہیں اماں؟" چاندنی نے پہلی بار زبان کھولی تو اس کے الفاظ اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ چندا کی باتوں سے متفق نظر آ رہی ہے۔

چندا نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "چھنو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے کہ تم اس ملک کی نامور ہیروئن بننے کے خواب دیکھ رہی ہو۔"

چاندنی کو رجب کے الفاظ یاد آنے لگے کہ چھنو جیسی تھرڈ کلاس ملازماؤں سے دوستی نہیں رکھنا چاہیے، وہ فوراً بولی "اماں۔ رجب بہت اچھے ہیں اور وہ اس ملک کے نامور ڈائریکٹر ہیں، میں ان کی اگلی دو فلموں کی ہیروئن ہوں۔"

چاندنی نے اپنے تئیں ماں کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن تب اس کا دل کٹ کر رہ گیا جب اس نے چندا کے

موچ

کسی عضو کا مڑ جانا یا کھنچ جانا۔ اس سے متاثرہ عضو متورم ہو جاتا ہے اور اس میں سخت درد ہوتا ہے۔ عموماً ٹخنے کے پاس پیر مڑ جانے سے موچ آتی ہے۔ اس صورت میں جوتا اتار دینا چاہیے ورنہ ورم آنے کی صورت میں اسے کاٹ کر علیحدہ کرنا پڑے گا۔ اگر فوراً ہی ٹخنے پر روئی رکھ کر، خوب کس کے پٹی باندھ دی جائے تو ورم نہیں آئے گا اور مریض آرام محسوس کرے گا۔

مرسلہ: ڈاکٹر جنید مسیح۔ کراچی

ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکان دیکھی اور یہ سنا۔ "ابھی تم تھکی ہوئی ہو جا کر سو جاؤ، صبح تم سے بات کروں گی۔"

"اماں کل رجب یہاں آ رہے ہیں مجھے اپنی بڑی سی گاڑی میں لینے کے لیے، ہم نئی فلم کے لیے لوکیشن پر جا رہے ہیں۔" چاندنی نے پُرجوش لہجے میں کہا تو چندا ہولے سے مسکائی اور بولی۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ میں بھی اس ڈائریکٹر سے مل لوں گی۔"

"چھنو کا... بیڑہ غرق ہو، اسی نے اماں کو بہکایا ہے۔"

چاندنی نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے خود کلامی کی اس کو رہ رہ کر خود پر ہی غصہ آ رہا تھا کہ اس نے کم ظرف چھنو کو اپنی رازدار کیوں بنایا تھا، خیر اب کل وہ رجب سے ماں کو... ملوائے گی اور ساری غلط فہمیاں دور کر دے گی اور ایک دن اس ملک کی بہت بڑی ہیروئن بن کر چھنو جیسی تھرڈ کلاس لڑکی کو منہ تک نہیں لگائے گی، "اونہہ، چھنو، دفع دور کمینی۔" اس نے خیالی طور پر ہی چھنو کو کھری کھری سنا دی تھیں۔

اگلا دن چاندنی کے لیے بھی ایک تجسس بھرا دن تھا اور چندا بھی اس کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کے لیے وقتی طور پر اپنی بیماری بھول گئی تھی لیکن اس کے چہرے پر تکلیف اور کرب کے آثار واضح تھے۔ چاندنی کو اس وقت کا انتظار تھا کہ آج کسی بھی وقت رجب اس کو لینے آ جائے گا اور وہ پھر نئی فلم کی لوکیشن پر جائیں گے۔

"آج سے بائیس سال قبل فلم انڈسٹری کو ایک صنعت کا درجہ حاصل تھا۔" چندا نے زمانے کی اونچ نیچ

سمجھانے کے لیے الفاظ کا بہترین چناؤ کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس کے الفاظ میں جو تجربہ اور زمانہ شناسی شامل تھی وہ چاندنی کو بہت کچھ سکھا سکتی تھی لیکن ابھی تو چاندنی کے ذہن پر نامور ہیروئن بننے کی دھن سوار تھی پھر بھی وہ اپنی بوڑھی ماں کی باتیں سننے اور برداشت کرنے پر خود کو مجبور محسوس کر رہی تھی۔

"گھر والوں کی مرضی کے بغیر فاریہ نامی ایک خوبرو لڑکی نے فلموں میں کام کرنے کی ٹھانی اور ایک ڈائریکٹر کے ساتھ اپنے تعلقات بنا لیے جو بہت ہی جلد ایک فلم شروع کرنے والا تھا، اس کا نام جبران تھا اور وہ بہت سی نئی اداکاراؤں کو اپنی فلموں میں کام دے چکا تھا اور اس کی بنائی ہوئی فلمیں ملک بھر میں دیکھی جاتی تھیں اور پسند بھی کی جاتی تھیں۔"

چاندنی کے لیے یہ موضوع دلچسپی کا باعث بنتا جا رہا تھا کہ چندا بھی اس کو زمانہ شناسی سکھانے کے لیے ایک فرضی کہانی سنانے لگی تھی تو اس نے فلم کا ہی موضوع چنا تھا، اس لیے چاندنی ہمہ تن گوش ہو کر ماں کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی باتیں غور سے سن رہی تھی۔

"فاریہ بھی اس وقت کی نامور ہیروئن بن چکی تھی لیکن اس کا فلمی نام پری تھا اور لوگ اس کو پری کے نام سے ہی جانتے تھے وہ اکثر جبران کے ساتھ دیکھی جاتی تھی اور لوگ تو یہاں تک کہنے لگے تھے کہ ان دونوں نے شادی کر لی ہے لیکن پری جانتی تھی کہ وہ جبران کی باقاعدہ بیوی نہیں ہے مگر اس کے بچے کی ماں ضرور بننے والی ہے۔" اتنا کہہ کر چندا خاموش ہو کر بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی تھی جہاں پر اس کو ندامت اور پچھتاوا نظر آنا شروع ہو گیا تھا اور یہ بات چندا کے لیے شرم سے ڈوب کر مر جانے کے مترادف تھی لیکن اس نے اندر کی تکلیف کو اپنے چہرے پر واضح نہ ہونے دیا اور اپنی کہانی جاری رکھی۔

"پری کے لاکھ کہنے پر بھی جبران نے اس سے شادی نہیں کی بلکہ پری کو مشورہ دیا کہ وہ اس بچے کو جنم دینے کی بجائے ابارشن کروا لے۔ لیکن ڈاکٹرز سے مشورہ کے بعد ان کو اپنے منصوبے پر پانی پھرتا ہوا نظر آنے لگا کیونکہ اب کافی دیر ہو چکی تھی، اور بچہ ضائع کرنے کا مطلب تھا کہ پری کی جان بھی جا سکتی تھی، اس بات کو لے کر جبران اور پری کافی پریشان تھے کیونکہ پری کے سامنے اس کا کیریئر پڑا تھا اور جبران کو اپنی نئی فلم کے لیے کوئی نیا چہرہ ابھی تک نہ مل سکا تھا، پری نے ایک پیاری سی بیٹی کو جنم دیا تو جبران نے اس بچی کو جان سے مارنے کی بہت کوشش کی لیکن ہر بار ماں کی ممتا آڑے آئی اور پری اس بچی کو لے کر منظر سے ہی غائب ہو گئی، اخبارات نے بہت کچھ لکھا اور بہت سی بے سروپا باتیں بھی سننے میں آتی رہیں، لیکن ناظرین پھر کبھی بھی پری کو سلور اسکرین پر نہ دیکھ سکے۔ کسی کو کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ پری اپنی چند ماہ کی بیٹی کو لے کر دنیا کے کس کونے میں جا چھپی ہے۔ وہ زندہ بھی تھی یا مر گئی تھی کسی کو اس بارے میں کوئی بھی علم نہ تھا۔"

یہ کہہ کر چندا نے بیٹی کی طرف دیکھا تو اس کو بیٹی کا زرد ہوتا چہرہ دیکھ کر اپنی بیماری بھی یاد آ گئی، وہ زور زور سے کھانسنے لگی جب وہ کھانس کھانس کر بے حال ہو گئی تو چاندنی کو یاد آیا کہ اس نے اپنی ماں کو دم کیا ہوا پانی بھی پلانا ہے، وہ اٹھ کر پانی کی بوتل کی طرف بڑھی ہی تھی کہ چندا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیا۔

"فلم انڈسٹری اور شوبز سے منسلک لوگ اپنے مفاد پر کسی بھی رشتے کو قربان کر دیتے ہیں۔"

چاندنی نے دروازے کی طرف دیکھا تو چندا کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکان دیکھ کر وہ کرب اور ایک انجانے خوف سے بولی۔

"اماں۔ تمہاری اس طنزیہ مسکان کو میں کیا سمجھوں؟"

چندا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار سے بولی۔ "تمہارا ڈائریکٹر بھی تمہیں لینے نہیں آئے گا۔"

"وہ ضرور آئے گا اماں۔" چاندنی کا لہجہ اور الفاظ اس کی آواز کا ساتھ نہ دے پائے تھے، اس کی آواز رندھ گئی تھی، اور نگاہیں ہنوز دروازے پر ہی تھیں۔

"اگر یہ لوگ اپنے وعدوں کو وفا کرنا جانتے ہوتے تو آج ماضی کی نامور ہیروئن فاریہ عرف پری آج تمہارے سامنے اس میلی سی چارپائی پر اپنی موت کی منتظر نہ ہوتی۔"

چندا کہہ رہی تھی اور چاندنی پتھر بنی اپنی ماں کی طرف دیکھے جا رہی تھی، یوں لگ رہا تھا کہ چاندنی کے بدن میں کاٹو تو لہو نہیں...... وہ پتھر کے اس مجسمے میں تبدیل ہو چکی تھی جس کی آنکھیں اپنی ماں پر جم کر رہ گئی تھیں، جو اسے اجنبی لگ رہی تھی۔ مانوس اجنبی۔

خطا

محترم مدیراعلیٰ

تسلیم

گو کہ یہ سرگزشت کافی الجھی ہوئی ہے پھر بھی آپ کو مزہ آئے گا اس لیے کہ یہ کئی ادوار کو احاطہ کیے ہوئے ہے۔

آصفہ ضیاء احمد

(حیدرآباد)

جب میں نے اپنے نومولود بیٹے کو گود میں اٹھایا تو میرا دل ایک نئے احساس سے آشنا ہوا۔ یہ بچہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے۔ میرا جگر گوشہ ہے۔ یہ دل خوش کن احساس میری رگ رگ میں سما رہا تھا۔ میں نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ بیٹے کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ قریب ہی بیڈ پر لیٹی ہوئی ربیعہ نیم وا آنکھوں سے مجھے اور بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ نے فوراً بھانپ لیا تھا کہ قدرت کی جانب سے اتنی بڑی خوشی ملنے کے بعد بھی میں اندر سے بے پناہ دکھی ہوں۔ کیونکہ میرا

چہرہ دکھوں کی غمازی کررہا تھا۔ ربیعہ نے اپنی کمزور اور ناتواں آواز میں استفسار کیا۔ ”ارمغان کیا سوچ رہے ہو۔ رب نے کتنی عظیم نعمت ہماری جھولی میں ڈالی ہے لیکن آپ کے چہرے کے تاثرات کچھ اور ہی کہانی سنا رہے ہیں۔“

میں نے بیوی کی بات سن کر ایک سرد آہ بھری اور گل گوتھنے سے بیٹے کو ربیعہ کے پہلو میں لٹاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ربیعہ آج پہلی بار محسوس ہوا کہ والدین کے دل اپنی اولاد کے لیے کس طرح دھڑکتے ہیں۔ پدری محبت کسے کہتے ہیں۔ میں نے کتنی آسانی سے اپنا گھر اور اپنے والدین کو چھوڑ دیا تھا۔ آج سوچ رہا ہوں کہ وہ میری کتنی بڑی بھول تھی بلکہ زندگی کی ایسی ناقابلِ فراموش غلطی تھی جس کا ازالہ ناممکن ہے۔“

ربیعہ نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ ”ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اب آپ اپنے بیٹے کو لے جاکر دادا دادی کی گود میں ڈال دینا۔ دیکھنا وہ پل بھر میں اپنے سارے غم بھول جائیں گے۔ اصل کے ساتھ سود پاکر ان کی خوشی دگنی ہو جائے گی۔ وہ تمام رتجگے جو آپ کی جدائی میں برداشت کیے ہیں وہ چاندنی راتوں میں ڈھل جائیں گے۔ بس میں ذرا صحت یاب ہو جاؤں اور نقاہت دور ہو جائے تو انشاء اللہ ہم دونوں آپ کے والدین سے ملنے چلیں گے۔“

میرے ہونٹوں پر پھیکی اور اداس مسکراہٹ بکھر گئی۔ میں نے ایک بار پھر بیٹے کو چوما اور کمرے سے نکل گیا۔

☆......☆

ننھا ارسلان ڈیڑھ سال کا ہو چکا تھا۔ ربیعہ کا اصرار مسلسل جاری تھا۔ میرے والدین سے ملاقات اس کی دیرینہ خواہش تھی لیکن میں بڑی خوش اسلوبی سے اسے ٹال رہا تھا۔ بالآخر ربیعہ نے ایک دن مجھے آڑے ہاتھوں لیا کہ ارسلان کو اپنے والدین سے کیوں نہیں ملواتے۔ اس میں کیا بھید ہے۔ کیوں اپنے ماضی سے پردہ نہیں اٹھاتے۔

میں نے حسب سابق پھر بات اڑانی چاہی لیکن آج ربیعہ بھی دل میں ٹھانے بیٹھی تھی کہ وہ میرے گزرے ہوئے کل کے بارے میں جان کر ہی رہے گی۔ اس کی ہٹ دھرمی کے آگے میں ہار گیا اور اس نے ایک دبی ہوئی سانس خارج کی پھر بولا۔

”میرے والد شایان مرزا سندھ کے ایک نواحی گاؤں کے صاحب حیثیت زمیندار ہیں۔ انتہائی نیک نام اور دیانت دار زمیندار تھے۔ اماں بابا کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے میں انتہائی ناز و نعم میں پلا بڑھا۔ بابا کی کئی ایکڑ پر پھیلی اراضی تھی ساتھ ہی وہ ایک حقیقت پسند ذہن کے پڑھے لکھے انسان تھے اور زمانے کی رفتار اور تعلیم کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں پرتعیش زندگی کا عادی بن جاؤں اور دوسرے امیرزادوں کی طرح زمینیں بیچ بیچ کر گزارہ کروں۔ اس لیے انہوں نے مجھے تعلیم میں دلچسپی لینے کا کہا۔ ان کی سوچ بالکل صحیح تھی لیکن میں پڑھنے لکھنے سے اس طرح فرار حاصل کرتا جس طرح شیطان لاحول سے، جھوٹ کا سہارا لے کر نت نئے بہانے میں مجھے مہارت حاصل تھی۔ کیوں کہ مجھے شرافت بھائی کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ ہر محاذ پر میری خاطر سینہ سپر ہو جاتے۔ مجھے نت نئے مشورے دیتے کہ میں کیسے ٹیوٹر کو دھوکا دے سکتا ہوں۔ شرافت بھائی اور میں......“

ربیعہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”یہ شرافت بھائی کون ہیں۔“

وہ ایسی باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا لیکن قدرت نے انہیں بینائی سے محروم رکھا ہے۔ وہ بابا کے ایک عزیز کے بیٹے ہیں۔ صغر سنی میں ہی باپ کا سایہ ان کے سر سے ہٹ گیا تو بابا انہیں لے آئے۔ وہ بھی میرے ساتھ اماں کو اماں اور بابا کو بابا کہتے تھے۔ ان کی کمپنی ملنے پر میرے اور پر نکل آئے۔ غلط بیانی اور جھوٹ بول کر کس طرح اپنی جان چھڑانی ہے۔ بہانے بازی کے لیے کون کون سے گر اپنانے ہیں۔ باز پرس کرنے والوں کو کس طرح ڈھٹائی سے جواب دینا ہے۔ یہ سارے ہنر مجھے شرافت بھائی نے چند ہی دنوں میں سکھا دیے۔ میرا میٹرک کا سال تھا لیکن میں اسٹڈی کے بہانے شرافت بھائی کو لے کر نکلتا اور ہم دونوں سینما ہال پہنچ جاتے۔

ربیعہ نے پھر بات کاٹی۔ ”فلم کس طرح دیکھتے ہوں گے، وہ تو اندھے تھے۔“

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ صرف بینائی سے محروم تھے مگر ان کی تمام حسیں بیدار تھیں۔ سینما ہال سے واپسی پر وہ گھنٹوں فلم پر تبصرہ کرتے جس کی وجہ سے میری دلچسپی سوا جاتی۔ فلم کے کردار اچھے لگتے۔ گانے گنگنانا اچھا لگتا۔ وہ وقتاً فوقتاً مجھے باور کراتے کہ میری آواز بہت میٹھی اور سریلی ہے۔ اپنا ہاتھ میرے چہرے پر پھیر کر کہتے۔ ”تم خوبصورت بھی ہو اگر لاہور پہنچ جاؤ تو شوبز والے تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔“

شرافت بھائی کی باتیں سن کر میرے دل میں پھلجھڑیاں سی پھوٹنے لگتیں اور میں ایک تصوراتی دنیا میں پہنچ جاتا۔ مجھے محسوس ہوتا جیسے دولت شہرت میرے قدم چوم رہی ہیں۔ انسانوں کا اژدھام ہے جو میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہے۔ میں خود کو فلمی اداکار پوز کرانے کے لیے مکالمے بھی وحید مراد کے انداز میں بولتا۔ گاؤں کے لوگ میرے مزارعہ تھے وہ بھی چاپلوسی میں میری تعریف کرتے۔ خواب سے میں اس روز جاگا جب میٹرک کا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ بابا میری مارکس شیٹ دیکھ کر آگ بگولہ ہواٹھے۔ ہر پیپر میں باؤنڈری مارکس تھے۔ فیل میں اس لیے نہیں ہوا تھا کہ نقل کرنے کے ان گنت طریقے شرافت بھائی نے سکھا پڑھا دیے تھے اور میں نے اس پر پورا عمل کیا تھا لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ نقل کے لیے بھی عقل چاہیے اور میرے پاس عقل کا فقدان تھا۔ اس لیے نقل کرنی بھی نہیں آئی کیونکہ کچھ پڑھ کر ہی نہیں دیکھا تھا۔ تاکا جھانکی کر کے برابر میں بیٹھنے والے طلباء سے جو مواد حاصل ہوا وہ لکھ مارا تھا۔ بابا نے پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ یہیں سے میرے دل میں بابا کے لیے نفرت کا شعلہ بھڑکا۔

شرافت بھائی اور اماں نے میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ میں نے اپنا دل کھول کر شرافت بھائی کے سامنے رکھ دیا۔ انہیں بتایا کہ ایسے کٹھور اور سنگدل باپ کے ساتھ میرا گزارہ نہیں ہے۔

بابا نے اماں کو بھی میرے کمرے میں جانے سے روک دیا تھا۔ گھر کے نوکر چاکر اور شرافت بھائی میرا ہر طرح سے خیال رکھ رہے تھے لیکن میں اس گھر سے ہمیشہ کے لیے فرار چاہتا تھا۔ شرافت بھائی نے نہایت سوجھ بوجھ کے ساتھ میرے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کیا اور اس پر جب عمل کرنے کا وقت آیا تو میرے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے لیکن شرافت بھائی نے ہمت بندھائی کہ یہی وقت ہے جو تمہیں اس قید خانے سے نجات مل سکتی ہے۔ ورنہ زندگی بھر بابا کے ہاتھوں دھنائی ہوتی رہے گی۔ پڑھنے لکھنے میں تو تمہارا دل لگتا نہیں ہے۔ اس لیے اساتذہ کے ہاتھوں سے بھی جوتے ہی کھانا پڑیں گے۔ بات ان کی بھی صحیح تھی۔ اس لیے انکار نہیں کیا بلکہ فوراً کہہ دیا۔ ”شرافت بھائی آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گا۔“

شرافت بھائی نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق مجھے گھر کی پچھلی کھڑکی سے باہر نکالا۔ ایک تھیلے میں میرے چند جوڑے تھے۔ وہ میرے حوالے کیے اور نوٹوں کی ایک موٹی گڈی مجھے تھمائی۔ میں اتنی بڑی رقم دیکھ کر سہم گیا۔ میں نے فوراً سوال کیا۔ ”شرافت بھائی اتنے سارے پیسے آپ کے پاس کہاں سے آئے۔“

انہوں نے میرے شانے پر بڑے پیار سے تھپکی دی اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”تمہارے بابا کا ہی پیسا ہے۔ باپ کماتا کس لیے ہے کہ اس کی دولت اس کی اولاد کے کام آئے۔ بس تم آم کھاؤ پیڑ مت گنو۔“

جب ہم دونوں رات کے اندھیرے میں گھر سے باہر نکلے تو بے اختیار دل بھر آیا۔ ضبط کا یارا نہیں رہا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شرافت بھائی نے برہم ہو کر تیور چڑھائے اور غصیلے انداز میں کہا۔ ”ارے یار! تم ابھی سے بزدلی دکھا رہے ہو۔ آگے کی منزلیں کس طرح طے کرو گے۔ فلم انڈسٹری اور ٹی وی ڈراموں تک پہنچنے میں تو ابھی تمہیں بہت دھکے کھانے ہیں۔

ان کی سرزنش پر میں فوراً سنبھل گیا اور اپنے کرتے کے دامن سے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے تھیلے کو مضبوطی سے پکڑا اور پھر شرافت بھائی سے استفسار کیا۔ ”شرافت بھائی آپ بھی چل رہے ہیں ناں میرے ہمراہ۔“

میرے سوال پر وہ اچھل پڑے۔ وہ مجھے اپنی اندھی آنکھوں سے یوں دیکھ رہے تھے جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ ”ارمغان میں تو آنکھوں کا اندھا ہوں لیکن تم عقل کے اندھے ہو، ارے بے وقوف اگر میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں تو یہاں اماں بابا کو شک نہیں ہو جائے گا کہ ہم دونوں کی ملی بھگت ہے۔ ہم دونوں کا ایک دوسرے سے دور دور رہنا ہی ٹھیک ہے۔ میرا ایک جاننے والا تمہیں حیدرآباد سے لاہور والی ٹرین میں بٹھا دے گا۔ یہاں سے تم اور وہ بائی بس جاؤ گے۔ بس اب جلدی کرو کیونکہ اس بس کے بعد ہمارے گاؤں سے پھر کوئی بس یا وین نہیں جاتی۔“

ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بس اسٹینڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

بس سے حیدرآباد پہنچا، وہاں شرافت بھائی کے دوست نے ٹرین میں بٹھا دیا۔ ٹرین نے آہستہ آہستہ رفتار پکڑنی شروع کی۔ پہلے پہل تو میں باہر کے مناظر میں گم رہا۔ پھر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافروں پر نظر ڈالی اور خاموش سا اپنی جگہ تھیلے کو سینے سے لگائے چوکنا بیٹھا رہا۔ نیند

اور غنودگی کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ چلتے ہوئے میں نے اپنی میٹرک کی مارک شیٹ بھی جیب میں رکھ لی تھی کہ بوقتِ ضرورت بتا سکوں کہ میں جاہل نہیں بلکہ میٹرک پاس ہوں۔

اپنے خیالوں میں غرق میں لاہور کی طرف رواں دواں تھا۔ جس طرح باہر کے مسحور کن مناظر میرے سامنے متحرک تھے۔ اسی طرح اپنا ماضی بھی ورق بہ ورق میرے سامنے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اماں کا لاڈ و پیار، بابا کی سختیاں شرافت بھائی کی رفاقت اور دوستانہ سب یکے بعد دیگرے آنکھوں کے سامنے رقصاں تھے۔ گاڑی جیسے جیسے رفتار پکڑ رہی تھی خوف کا عنصر بھی شدید ہوتا جا رہا تھا۔ دن گزر گیا اور شام اتر آئی تھی۔ اس لیے باہر گھور اندھیرا تھا۔ کیوں کہ آبادی بہت پیچھے رہ گئی تھی ہر طرف سناٹا اور تاریکی تھی اور ٹرین کی چھکڑ چھکڑ کی آواز تھی۔

☆......☆

گاڑی جوں ہی منزل مقصود یعنی لاہور پہنچی۔ میرے برابر بیٹھے ہوئے مسافر نے کھڑکی کا شیشہ کھول دیا۔ پلیٹ فارم بھانت بھانت کے لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ میں نے متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ خوف اور دہشت کی لہر پورے جسم میں سرائیت کر گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جاؤں، پہلی بار شرافت بھائی پر غصہ آیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی بے وقوفی اور نادانی پر بھی۔ دور الیکٹرک پول کے نیچے ایک ریڑھی والا کھڑا تھا۔ اس حصے میں نسبتاً لوگوں کی بھیڑ بھاڑ کم تھی۔ میں نے ریڑھی والے سے روٹی اور دال خریدی اور پیٹ کی آگ بجھائی۔ جیسے ہی معدے میں خوراک کی رسد پہنچی نیند اپنی پوری قوت سے حملہ آور ہوئی۔ گو کہ رات ابھی اتر رہی تھی مگر سفر کی تھکن نے مجبور کر دیا تھا۔ بس میں نے سرہانے اپنا تھیلا رکھا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ اچانک بے تحاشا شور سن کر آنکھ کھلی تو یوں محسوس ہوا جیسے میرے سرہانے کوئی ڈھول پیٹ رہا ہو۔ چند لمحے تو میں کچھ نہ سمجھ پایا پھر بے اختیار تھیلا یاد آیا جو کہ سرہانے سے غائب تھا۔ نیند کا خمار پل بھر میں رفو چکر ہو گیا۔ قریب ہی ایک شخص ایک لڑکے کی پٹائی کر رہا تھا۔ لڑکا بھی پوری قوت سے مزاحمت کر رہا تھا لیکن بڑے میاں کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ اس لڑکے سے میرا تھیلا چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اب پوری طور سے ہوش و حواس میں آ چکا تھا، میں فوراً اس شخص کی طرف بڑھا اور چلا کر کہا۔ ”بابا یہ میرا تھیلا ہے۔“

بوڑھے نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے معلوم ہے یہ تیرا تھیلا ہے اور یہ موذی اٹھائی گیرا تیرا یہ بستہ لے کر بھاگنے کی کوشش میں ہے۔“

ریلوے پولیس کا ایک اہلکار دوڑتا ہوا آیا اور اس اچکے کو مارتا ہوا لے کر چلا گیا۔ میں نے اپنا تھیلا کھول کر اس کا جائزہ لیا تو میرے کپڑے اور رقم صحیح سلامت تھے۔ وہ شخص اس وقت مجھے فرشتہ لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار شرافت بھائی یاد آئے۔ مجھے پرائے پردیس روانہ کرتے وقت کتنی بڑی رقم دے ڈالی اور یہ بابا بھی کتنا نیک اور ہمدرد ہے۔ میری مدد کے لیے آ پہنچا۔ بوڑھے بابا نے پیار سے میرے کندھے کو تھپتھپایا اور شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”بیٹے تیرے بچپنے کی نیند نے آج تیری لٹیا ڈبو دی تھی اگر یہ چور کا بچہ آہستہ سے تیرا بستہ کھینچتا تو مجھ کو تو پتا بھی نہیں چلتا لیکن اس نے گھبراہٹ میں جب زوردار آواز کے ساتھ تیرے سرہانے سے تیرا توشہ کھینچا تو میں فوراً سمجھ گیا کہ تو کہیں دور پار سے آیا ہے اور یہ چور تیرے سامان کی تاک میں ہے۔ بس میں نے اس کمبخت کو ایسے آڑے ہاتھوں لیا کہ اسے نانی دادی سب یاد آ گئیں۔“

بابا کی نرم اور ہمدردانہ گفتگو سن کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس اجنبی شہر میں، میں تنہا نہیں ہوں بلکہ میرا اپنا بھی کوئی ہے۔ میرے دل میں سمایا ہوا ڈر اور خوف ہوا میں تحلیل ہو گیا اور میں دیوانہ وار اپنے محسن سے لپٹ گیا۔ میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ بابا نے اپنے استخوانی بوڑھے ہاتھوں کے حصار میں لے کر میری پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا۔ ”بیٹا مجھے لگتا ہے تو کسی دور افتادہ بستی سے شہر میں پہلی بار آیا ہے اور مجھے یوں لگ رہا ہے کہ تو اکیلا ہے۔“ اس بوڑھے کے تجربے پر میں انگشت بدنداں رہ گیا۔

میرا حلق خشک ہو گیا۔ میں نے بدقت تمام تھوک نگلا اور دھیمی آواز میں کہا۔ ”بابا میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ سب بتاؤں گا بس ذرا سا سر چھپانے کے لیے کوئی ٹھکانا مل جائے۔“

بوڑھے نے ایک دبی ہوئی سانس خارج کی اور نرم آواز میں کہا۔ ”چل میرے ساتھ۔“

میں نے فوری حکم کی تعمیل کی اور اس چند لمحوں کے ساتھی کے پیچھے چلنے لگا۔ اپنے تھیلے پر گرفت اور مضبوط کر لی اور نوٹوں کو ایک بار پھر سے چھو کر دیکھا اور طمانیت بھری سانس لی۔ روپیا پیسا پاس ہو تو چوری چکاری کا دھڑکا تو ہوتا

ہے لیکن دل کو یہ اطمینان اور سکون بھی ہوتا ہے کہ جب تک جیب گرم ہے تب تک ساری دنیا ہماری مٹھی میں ہے۔ اس وقت کچھ اسی طرح کی کیفیت میری بھی تھی۔ ایک موٹی رقم کی گرماہٹ تھی تو ساتھ ہی چوری کا خطرہ بھی تھا۔ بہر حال پھر بھی اس خستہ حال اور مجہول بوڑھے کے ساتھ چلتا رہا کیونکہ دور دور تک کوئی ماں جایا تھا اور نہ کوئی باپ کا سگا تھا۔ ایک یہی بوڑھا تھا جس نے مجھے ایک بہت بڑی مصیبت سے بچایا تھا۔ اس لیے اپنے تمام شکوک و خدشات کو پرے رکھ کر میں اس شخص پر بھروسا کرنے پر مجبور تھا۔

کافی پُر پیچ اور تنگ گلیاں طے کرنے کے بعد وہ بوڑھا شخص ایک تنگ کوٹھڑی کے سامنے جا کر رک گیا۔ ساری گلی میں عجیب سی بے رونقی چھائی ہوئی تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ اپنی جیب سے چابی نکال کر اس نے سالخوردہ دروازے کو دھکا دیا اور داخل ہوتے ہی سوئچ آن کیا۔ کم وولٹیج کے بلب کی زرد روشنی جیسے ہی کمرے میں پھیلی۔ ہر چیز نمایاں ہو گئی۔ بان کی ٹوٹی چار پائی، بوسیدہ کرسی، ایک کونے میں کھانے پکانے کے برتن اور چولہا تھا تو دوسری جانب ایک تپائی پر الم غلم سامان اور دواؤں کی بے شمار شیشیاں۔ میں نے ایک طائرانہ نظر کمرے پر ڈالی تو ساکت و جامد رہ گیا۔ میرے ملازم بھی اس سے اچھے گھروں میں رہنے کے عادی تھے۔ دل چاہا اس جگہ سے فوراً بھاگ جاؤں لیکن پھر فوراً ارادہ بدل دیا کہ یہاں سے جاؤں گا کہاں۔ باہر نکلوں گا تو قدم قدم پر لٹیرے بیٹھے ہیں۔ بابا جیسے لوگ تو دنیا میں کم ہی ہوں گے جو اپنی جان پر کھیل کر دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ بابا کی جھریوں دار چہرے کو بغور دیکھا اور چارپائی پر ٹک گیا۔ بابا نے گھڑے میں سے پانی نکال کر گلاس بھرا اور میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا تو ہمارا مہمان ہے لے پانی پی۔ میں تیرے لیے چائے بناتا ہوں۔“ انہوں نے ایک ٹوٹے پھوٹے کپ میں مجھے چائے پیش کی۔ اونٹی ہوئی چائے کے اوپر بالائی کی جھلی سی جم گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے جی متلا گیا لیکن میں نے قطعاً اس کا مظاہرہ نہیں کیا۔ چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

”بابا آپ مجھے مہمان کہہ رہے ہیں لیکن میں تو بن بلایا مہمان ہوں اور بن بلائے مہمان کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔“

پہلی بار بابا نے بھرپور قہقہہ لگایا اور خوش دلی سے کہا۔

”تم بن بلائے نہیں ہو بلکہ میں تمہیں لے کر آیا ہوں۔ تم آرام کرو میں تمہارے کھانے پینے کے لیے کچھ لے کر آتا ہوں۔“ بابا کی آواز انتہائی میٹھی اور پیار بھری تھی۔

میں نے بابا کو کھانے کے لیے منع کر دیا اور ان کی چار پائی پر پیر پھیلا کر ایک آسودہ سانس لی اور آنکھیں موندھ لیں۔ بابا کے کمرے میں کوئی گھڑی نہیں تھی جس سے ٹائم کا پتا چلتا۔ ہاں یہ ضرور محسوس ہو رہا تھا کہ رات کا کوئی پہر ہے۔ طویل سفر اور خوف و خدشات نے جسمانی طور پر مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آنکھیں بند کر کے میں ایک بار پھر پچھلی یادوں میں کھو گیا۔ اپنا گاؤں اپنے ساتھی، اماں بابا اور شرافت بھائی سب یاد آنے لگے۔ حتیٰ کہ اپنے وہ اساتذہ کے چہرے بھی پردۂ ذہن پر منعکس ہو گئے جو وقتاً فوقتاً مجھے حصول علم کی ترغیب دیتے، نصیحتیں کرتے اور پھر میری ہٹ دھرمی پر کمال بھی ادھیڑتے۔ آج اس وقت گزرے ہوئے کل کا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ حقیقتاً سب اپنی اپنی جگہ صحیح تھے۔ غلط تھا تو صرف میں خود تھا۔ آج پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ وطن اور اپنا گھر کیا ہوتا ہے۔ سوچتے سوچتے کب نیند نے آ دبوچا پتا ہی نہ چلا۔

صبح بیدار ہوا تو رات گئی بات گئی پر عمل کرتے ہوئے میں نے ہر بات اپنے دل و دماغ سے جھٹک دی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا اور اچانک آنکھ کھل گئی ہو۔

دوسری صبح مجھے بہت روشن اور چمک دار محسوس ہو رہی تھی۔ بابا چونکہ پکوڑوں اور کچوریوں کا خوانچہ لگاتے تھے۔ وہ تیاری میں مصروف تھے۔ وہ اپنے کام میں اس قدر ٹرینڈ تھے کہ انہیں پکوڑے اور کچوریاں بیچنے کے دوران کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

انہوں نے ناشتا بھی مجھے گرما گرم کچوریوں سے کروایا۔ ایسی مزیدار اور ذائقے دار کچوریاں میں نے پہلی بار کھائی تھیں۔ میں تعریف کیے بنا نہیں رہ سکا۔ میری زبان سے اپنی کچوریوں کی تعریف سن کر بابا خوش ہو گئے۔ پھر وہ بولے۔ ”آج تم آرام ہی کرو جب تھکن ختم ہو جائے تو پھر باتیں ہوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنا خوانچہ سنبھالتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

میں ایک بار پھر چارپائی پر لڑھک گیا۔ طبیعت میں بے چینی، بے قراری اور اضمحلال تھا۔ دماغ بھی بھاری بھاری ہو رہا تھا۔ پھر سونے کی کوشش کی لیکن آنکھیں بند

کرتے ہی پھر اپنے گاؤں کی گلیوں اور کھیت کھلیانوں میں پہنچ گیا۔ اس لیے پھر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ معاً مجھے اپنا تھیلا اور اس میں رکھی ہوئی رقم یاد آ گئی۔ پلنگڑی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سوتے وقت دیوار میں لگی کیل میں، میں نے اپنا تھیلا لٹکایا تھا لیکن اب وہ وہاں سے غائب تھا۔ دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا کہ ضرور یہ شخص اور وہ لڑکا آپس میں ملے ہوئے ہیں اور بڑے ڈرامائی انداز میں دونوں نے میری رقم پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ شدید اشتعال اور مایوسی کے عالم میں اپنے ہی بال نوچنے لگا۔

اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں اس بوڑھے اور لڑکے کی سازش کا شکار ہو گیا ہوں۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ غیر ارادی طور پر زور زور سے پیر ہلانے لگا کہ اچانک میرے پیر کسی چیز سے ٹکرائے جھک کر دیکھا تو میرا تھیلا تھا۔ دل کو تسلی ہوئی فوراً زپ کھول کر دیکھنے لگا۔ نوٹوں کی گڈی کا لمس پاتے ہی اللہ کا شکر ادا کیا۔ اپنے مکروہ خیال پر میں دل ہی دل میں کٹ کر رہ گیا۔ اپنے آپ سے ہی کراہیت محسوس ہوئی کہ میں نے اس پاکباز انسان کے لیے ایسا سوچا ہی کیوں۔ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتے ہوئے میں نے اپنا استری شدہ جوڑا نکالا اور اس غسل خانے میں نہا دھو کر فارغ ہوا جو غسل خانہ ٹین کی زنگ آلود چادر لگا کر کمرے کے ایک کونے میں بنایا گیا تھا۔ بابا کے اکلوتے کمرے میں کچن، بیڈ روم اور باتھ روم سب ہی کچھ تھا۔ ضروریات سے فراغت پانے کے لیے پڑوس کے گھر میں جانا پڑتا تھا۔ پڑوسی بابا سے ہر ماہ اس کا پیسا لیا کرتا تھا۔ یہ بات مجھے رات بابا نے ہی بتائی تھی۔ مجھے تعجب بھی ہوا تھا اور ہنسی بھی آئی تھی کہ شہروں میں ایسا بھی ہوتا ہے۔

فریش ہونے کے بعد میں اس جگہ پہنچا جہاں میری ملاقات بابا سے ہوئی تھی لیکن بابا کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ میں نے ایک شخص سے ان کا اتا پتا پوچھا تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ارے بچے اپنے بابا کا نام تو بتا تاکہ میں تجھے اس کا ٹھیا بتا سکوں۔“

اب مجھے پہلی بار خیال آیا کہ رات سے ابھی تک میں اور بابا ساتھ ساتھ ہیں لیکن نہ انہوں نے میرا نام دریافت کیا اور نہ میں نے ان کا۔

میں اس اجنبی کو تکتا رہا۔ زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ناگاہ نظر ایک طرف اٹھی تو بابا نظر آ گئے۔ میں نے خوش ہو کر چہکتی آواز میں کہا۔ ”وہ..... وہ ہیں میرے بابا۔“

میں نے سرپٹ دوڑ لگائی اور ان کے خوانچے کے قریب جا کر چلایا۔ ”بابا۔“

انہوں نے گھبرا کر کہا۔ ”تو نے نکلنے سے پہلے دروازے کا کھٹکا لگایا تھا؟“

میں نے نفی میں جواب دیا۔ بابا نے فوراً اپنی سجی سجائی دکان سمیٹی اور کہا۔ ”تو بڑا بے وقوف ہے اگر اتنی دیر میں کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھا دی تو ہم دونوں روزی روٹی سے بھی گئے۔“

بابا کے اس طرح کہنے پر مجھے اپنا تھیلا اور رقم یاد آ گئی۔ بس اوسان خطا ہو گئے۔ بابا انتہائی متفکر اور پریشان لگ رہے تھے۔ ان کے اطراف میں بیٹھے ہوئے چند لوگوں نے استفسار کیا۔ ”ارے ابو خاں، آج اتنی جلدی اپنی دکان اٹھالی۔“

اب مجھے علم ہوا کہ بابا کا نام ابو خاں ہے۔ بابا نے ان کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا۔ سر پر اپنا سامان دھرا اور ہم دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ بابا نے اسے دیکھا اور پھر ایک طمانیت بھری سانس خارج کی۔ اس کے بعد چونکتے ہوئے کہا۔ ”تو اپنے سامان کی بھی تو جانچ پڑتال کر میں نے تیرا تھیلا پلنگ کے نیچے رکھا تھا۔“

میں نے انہیں پلنگ پر بٹھاتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ”بابا آپ جیسے لوگوں کا حافظ و ناصر اللہ ہے۔ اس لیے کوئی آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ آپ کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے اور میرے سامان کو کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔“

بابا کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کہا۔ ”تو باتیں اچھی بنا لیتا ہے۔ لگتا ہے کسی پڑھے لکھے گھرانے سے تیرا تعلق ہے۔“

میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ چند ثانیے خاموشی چھائی رہی اس کے بعد بابا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”آج بیٹا بکری ویسے ہی مندی تھی۔ اوپر سے میں خوانچہ پہلے اٹھا لایا۔“

میں نے بابا کی دکان اپنے سر پر لادی اور بابا کے نہیں ..... کے باوجود کوٹھڑی سے نکل کھڑا ہوا اور اسی اسپاٹ پر آ کر خوانچہ سجا کر بیٹھ گیا۔ پہلے پہل تو کسی نے توجہ نہیں دی لیکن جیسے ہی ٹرین آ کر رکی، مسافروں کے ایک بڑے ریلے نے پکوڑیوں اور پکوڑوں پر ہلہ بول دیا۔ چٹنی پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اسی لیے میں نے معذرت کرتے ہوئے گاہکوں کی

فرمائش پر پکوڑے اور کچوریاں پیک کرنا شروع کردیں۔

تھوڑی ہی دیر میں پورا تھال خالی ہو چکا تھا اور میری دونوں جیبوں میں سکے کھنک رہے تھے۔ آج مجھے احساس ہوا کہ کام کرنے میں کتنا مزہ آتا ہے۔ کچھ لمحوں کے لیے میں اپنا گھربار اور وہاں کے رہنے والوں کو بھی بھول چکا تھا۔ مجھے زندگی میں پہلی بار اس بات کا علم ہوا کہ مصروفیت انسان کے لیے کتنی ضروری چیز ہے ورنہ دماغ شیطان کا کارخانہ بنا رہتا ہے۔ میں نے اسی لمحے مصمم ارادہ کرلیا کہ بابا کے ساتھ رہ کر ان کا ہاتھ بٹاؤں گا۔ اس روز کی ساری کمائی جیب میں نے بابا کے ہاتھوں میں رکھی تو ان کی حالت دیدنی تھی۔ وہ میرا ماتھا چومتے کبھی میری آنکھیں۔ میرے دماغ سے بھی ایک بوجھ اتر گیا کہ میں ایک بوڑھے کے در پر بیٹھ کر روٹیاں نہیں توڑ رہا ہوں۔ بلکہ اپنے قوت بازو سے اپنا رزق حاصل کر رہا ہوں۔

سر پر چھت اور پیٹ بھر کر روٹی ملی تو اپنا مقصد یاد آیا کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے بابا سے سوال کر ہی دیا۔ ”بابا یہاں لاہور میں فلمی ستارے اور ٹی وی آرٹسٹ کدھر رہتے ہیں۔“

پہلے پہل تو بابا کچھ سمجھ ہی نہیں پائے۔ جب میں نے گہرائی میں جا کر تشریح کی تو انہوں نے زیر لب مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”بیٹا میں کیا جانوں اس شہر میں کون کہاں رہتا ہے۔ لیکن کیا وہ تیرے جاننے والے ہیں جو تو ان سے ملنا چاہتا ہے؟“

میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ کیونکہ بابا کی سمجھ سے یہ ساری باتیں بلند تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگا۔ وہ تو اپنی دکان سجا کر کسی ایک جگہ ٹک جاتے لیکن میں ایک دوسرے تھال میں یہ چیزیں سجا بنا کر رکھتا اور اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل جاتا۔ قریب ہی ایک اسکول کی عمارت تھی۔ اس کے سامنے پیپل کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر میں سیلنگ کا کام شروع کردیتا۔ اسکول کی چھٹی ہوتے ہی بچوں کی فوج ان چٹخارے دار چیزوں پر اس طرح حملہ آور ہوتی کہ مجھے اس فوج کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ چھوٹے چھوٹے بچے مجھے بہت اچھے لگتے۔ معصوم بھولے بھالے، اُجلے صاف ستھرے یونیفارم میں ملبوس، انہیں دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آجاتا۔ میری اماں بھی مجھے سجا سنوار کر ایک ملازم کے ساتھ اسکول روانہ کرتی تھیں۔ قرآن پاک کی بہت سی سورتیں پڑھ کر مجھ پر دم کرتیں اور کہتیں میرا بیٹا پڑھ لکھ کر بہت بڑا صاحب بنے گا۔

اماں بابا نے میرے لیے کیا کیا خواب دیکھے تھے اور میں...... اس سے آگے سوچنے کی میری ہمت نہ ہوتی۔ میں پھر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آتا اور اپنے ننھے منے گاہکوں کو جلدی جلدی نمٹانا شروع کرتا۔ کئی بار دل چاہا کہ کسی نہ کسی ذریعے سے شوبز کی دنیا تک پہنچ کر وہاں کام تلاش کروں لیکن میں ویسے ہی فطری طور پر ڈرپوک اور بزدل تھا۔ مرے پر سو درے بابا نے مجھے مزید خوفزدہ کردیا تھا کہ ”یہ لاہور ہے۔ ہر کسی پر بھروسا کر کے اس کے ساتھ نہ چل دینا۔“

بابا ہر بات اتنے اچھے پیرائے میں سمجھاتے کہ میں فوراً ان کی بات گرہ میں باندھ لیتا۔ ان کے سمجھانے کے انداز میں ایسی جادوئی کشش تھی کہ ان کی بتائی ہوئی راہ پر میں فوراً چل پڑتا۔ بابا نے چونکہ مجھے کہہ رکھا تھا کہ لوگوں سے ملنے جلنے میں احتیاط برتنا۔ اس لیے میں ہر ایک سے لیے دیے رہتا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا۔

ماں کی دعاؤں اور باپ کی شفقت کا احساس بھی اس شدت سے ہوا کہ بے اختیار آنکھیں بھر آئیں۔ ان آنسوؤں کو اپنی ہتھیلی پر سمیٹ کر میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ میں اپنے والدین کا خواب ضرور پورا کروں گا۔ پھر سے اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کروں گا۔ انتھک اور جان لیوا محنت کر کے اس مقام تک رسائی حاصل کروں گا جو میرے ماں باپ نے میرے لیے سوچا تھا۔

اپنے اس فیصلے کے بعد دل یکدم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ دماغی اور اعصابی تناؤ بھی ختم ہو گیا۔ الجھی الجھی سوچوں سے نجات ملی تو آنکھوں میں نیند اتر آئی اور پھر میں غفلت کی نیند سو گیا۔ بابا کے چلنے پھرنے کی آہٹ سے میں بیدار ہوا اور اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بابا نے شہد بھرے لہجے میں فوراً استفسار کیا۔ ”کیا بات ہے بچے طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آج خلاف معمول ذرا تاخیر سے جاگے ہو۔“

میں نے فوراً اپنی آواز کو ہشاش بشاش بنا کر جواب دیا۔ ”ارے بابا آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

پچھلی رات میں کس طلاطم خیز طوفان سے گزرا تھا، اس کی بھنک بھی میں نے بابا کو نہیں لگنے دی۔ ایک دن موقع محل دیکھ کر میں نے بابا سے کہا۔ ”بابا سب بچے اسکول جاتے ہیں تب میرا بھی دل چاہتا ہے کہ میں پڑھ لکھ کر بڑا

آدمی بنوں اور آپ کی خدمت کر کے آپ کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچاؤں۔"

بابا نے چونکتے ہوئے۔ الٹا مجھ سے ہی سوال کر بیٹھے۔ "ارے تو تو ایک دن مجھ سے کہہ رہا تھا کہ سینما اور ناٹک والوں کے پاس جا کر کام مانگے گا۔ پھر اب کیا ہو گیا۔"

میں نے شرمسار لہجے میں آہستہ سے کہا۔ "نہیں بابا وہ راستہ میرے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے لیکن آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں اپنے کام پر بھی توجہ دوں گا۔ اسٹیشن پر تو رات بھر ہی چل پہل ہوتی ہے۔ شام سات بجے سے رات بارہ بجے تک میں دکان لے کر بیٹھوں گا۔ چار پانچ گھنٹوں میں ٹھیک ٹھاک بکری ہو جائے گی۔"

بابا نے برا مانتے ہوئے شاکی لہجے میں کہا۔ "کام کرنے کے لیے میں نے تجھے کبھی نہیں کہا۔ پڑھنے لکھنے سے ہی انسان میں انسانیت آتی ہے اور پھر......"

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے فوراً کہا۔ "نہیں بابا آپ کا خیال بالکل غلط ہے۔ آپ اپنی ہی مثال لے لیں، کون سی یونیورسٹی سے آپ نے ڈگری لے رکھی ہے لیکن ساری انسانیت آپ پر ختم ہو گئی ہے۔"

بابا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے بیٹا میں کیا میری حقیقت کیا۔ بس دل میں خوف الٰہی ہے۔ اس لیے ہر برے کام سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

میں نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔ "بابا آپ کے اس فارمولے کو میں بھی اپنی زندگی کا اساس بناؤں گا۔ بابا شاید میری بات سمجھ نہیں سکے۔ اس لیے انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن میں ان کے پُرنور اور معصوم چہرے کو کافی دیر تک تکتا رہا۔"

☆......☆

زمانے کی تیز اور کڑی دھوپ نے مجھے وقت سے پہلے سب کچھ سکھا دیا تھا۔ حالات کا عفریت میرے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ محنت مشقت کرنے سے نہ صرف رنگ روپ سنولا گیا تھا بلکہ صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ شرافت بھائی کی دی ہوئی رقم جو میری کل جمع پونجی تھی۔ اسے خرچ کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ سب سے پہلے اپنی اور بابا کی صحت پر توجہ دی۔ صحیح خوراک اور پھل وغیرہ کو اپنے کھانے میں شامل کیا۔ تنگ گلیوں اور مکانوں کا وہ جال جو ریلوے ٹریک کے قریب آباد تھا اور جس میں ہمارا آشیانہ آباد تھا۔ اس جگہ کو خیر باد کہا اور نسبتاً ذرا صاف ستھرے علاقے میں رہائش اختیار کی اور بابا سے کہا کہ میں بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتا ہوں اس لیے آمدنی بڑھ گئی ہے۔ بابا اس جگہ سے جانے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن میری ضد کے آگے انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ اپنا پس انداز کیا ہوا پیسا بھی انہوں نے میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ معاشی طور پر میں اس حد تک تو مستحکم تھا کہ میرا اور بابا کا گزارہ ٹھیک ٹھاک طور پر ہو رہا تھا۔ انٹر سائنس کے لیے فارم پُر کر کے جب پہلے دن کلاس جوائن کی تو یک گونہ اطمینان حاصل ہوا کہ میں پڑھ سکتا ہوں۔ تعلیم کے ساتھ ہی اپنا کام بھی جاری رکھا۔ میں زیادہ ذہین تو نہیں تھا لیکن دوران تعلیم مجھ پر عقدہ یہ کھلا کہ میں جو کام محنت اور لگن سے کرتا ہوں اس میں ناکام نہیں رہتا۔ اپنی محنت سے ہر مضمون میں امتیازی نمبر حاصل کرتا۔ میرے لیے یہ بات باعث طمانیت تھی کہ اساتذہ بھی مجھے پسند کرنے لگے تھے۔ اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات تھے۔ کسی ساتھی یا ٹیچر نے میرا حسب نسب جاننے کی کوشش نہیں کی اور نہ کسی نے یہ پوچھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ بڑے شہروں میں سکونت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس قسم کے سوالات کریں۔ حصول تعلیم اب میرا شوق نہیں بلکہ ضرورت بن چکا تھا کیونکہ پڑھ لکھ کر مجھے ذریعۂ معاش حاصل کرنا تھا تاکہ میں اور بابا سکون کی سانس لے سکیں۔ بابا نے کام کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر لے رکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں مکمل طور پر ذہنی و جسمانی طور پر پُرسکون رہ کر تعلیم حاصل کروں۔ پہلے میں خوانچہ لگاتا تھا اس کی بھی انہوں نے سختی سے ممانعت کر دی۔ اس لیے میں پوری تندہی سے اپنی اسٹڈی میں مصروف ہو گیا۔ شب و روز کی محنت شاقہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ٹیسٹ میں تمام مضامین میں، میں امتیازی نمبر حاصل کرتا رہا۔ انٹر کا نتیجہ جب سامنے آیا تو میرا وہ دماغی خلل دور ہو گیا کہ میں پڑھ نہیں سکتا۔ میری خوشی میں شریک ہونے والا صرف میرا بابا تھا۔ بابا کے بوڑھے اور کمزور ہاتھ ابھی بھی مشین کی طرح کام کر رہے تھے لیکن مجھے لقمہ اٹھاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے گزر اوقات کے لیے میں نے کالج ٹائم کے بعد ٹیوشنز پڑھانی شروع کر دی۔ اتوار کا دن بھی ضائع نہیں کرتا بلکہ ایک جنرل اسٹور پر حساب کتاب کا کام کرتا جس کا مجھے معقول معاوضہ ملتا۔ یہ وقت میرے

لیے بڑا کٹھن تھا۔ گریجویشن کرنے کے بعد ماسٹرز کرنے کا ارادہ تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ بابا اب کام کریں۔ اس لیے میں نے سختی سے بابا کو مزید محنت مشقت سے روک دیا اور ایک فرم میں جاب کرلی۔ اب نہ صرف اپنا بلکہ بابا کی بھی ہر ضرورت کا خیال مجھے ہی رکھنا تھا۔ بابا بضد تھے کہ میں اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع نہ کروں۔ جب کہ مجھے اب روزی روٹی کی فکر کھائے جارہی تھی۔ بابا کے مسلسل اصرار پر اپنی ملازمت بھی جاری رکھی اور ماسٹرز کے لیے فارم بھر دیا۔ اب آرام کے لیے مجھے صرف پانچ گھنٹے ملتے۔ چار سے رات کے آٹھ بجے تک فرم میں کام کرتا۔ وہاں سے آکر کھانا کھاتا اور پھر اگلے روز کی تیاری کرتا۔ رات ایک ڈیڑھ بجے تک اسٹڈی کرتا۔ اس ساری جانفشانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایم ایس سی کی ڈگری میرے ہاتھ میں تھی۔ ایم فل کے لیے میں نے یونیورسٹی جوائن کی لیکن بابا کو میری یہ خوشی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔ انہیں بیماری تو کوئی نہیں تھی لیکن موت برحق ہے۔ اس لیے اپنے مقررہ وقت پر اس نے دروازے پر دستک دی اور بابا کو چپکے سے مجھ سے جدا کردیا۔ میں روتا بلکتا رہ گیا۔ ابھی تک ہر کام کے لیے بابا سے مشاورت کرتا تھا لیکن اب زندگی کا ہر حتمی فیصلہ مجھے ہی کرنا تھا جس یونیورسٹی سے ایم فل کیا تھا وہیں لیکچرر شپ مل گئی۔ یہ تمام ایام میرے نہایت سخت اور کٹھن گزرے تھے۔

جب حالات بہتر ہونا شروع ہوئے تو مجھے نہ صرف اپنے والدین بلکہ بابا بہت شدت سے یاد آئے۔ میری اس ساری ترقی میں بابا ابوخاں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اگر لاہور میں وہ میرا ہاتھ نہ پکڑتے تو غنڈہ موالی بن کر کسی جیل کی ہوا کھا رہا ہوتا۔ شرافت بھائی بھی اکثر یاد آتے ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے لاہور کا راستہ دکھایا تھا۔ آج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوں۔ پی ایچ ڈی بھی مکمل کر چکا ہوں لیکن خرابیٔ نصیب کہ میرے سب سے بڑے محسن اور خیرخواہ بابا ابوخاں میرے اچھے دن نہ دیکھ سکے۔

اسی اثناء میں میں نے سوچا کہ اپنے گاؤں جاکر اپنے والدین اور شرافت بھائی سے ملاقات کر آؤں لیکن یہ خواہش بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی کیونکہ جب میں جانے کے لیے پر تول رہا تھا اسی دوران بحیثیت لیکچرار تمہارا تقرر یونیورسٹی میں ہوا۔ تم کو دیکھا پرکھا تم اچھی لگیں تو دل کی خواہش زبان پر لے آیا۔ تمہارے اور تمہارے خاندان کی طرف سے اقرار کی نوید ملی تو فوراً بلا کسی تاخیر کے تمہیں ہم سفر بنا لیا۔ کچھ عرصے کے لیے میں نے یکسر اپنے ماضی کو فراموش کردیا لیکن آج جب کہ میں خود ایک بیٹے کا باپ بن چکا ہوں تو احساس ہوا کہ اولاد کے لیے ماں باپ کس طرح تڑپتے ہیں اگر ارسلان ایک لمحے کے لیے بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے تو تم اور میں بے قرار ہوجاتے ہیں تو بھلا تم ہی بتاؤ۔ میرے والدین پر اس تمام عرصے میں کیا گزری ہوگی۔ ربیعہ مجھے اپنے وجود سے نفرت محسوس ہورہی ہے۔ میں نے انہیں کیا دیا۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انہیں کچھ اچھا نہیں لگتا ہوگا۔ بے سکونی، بے قراری سے گھر کا دروازہ تکتے ہوں گے۔ رتجگے کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئی ہوں گی۔ ربیعہ میں ایک ناخلف اولاد ہوں۔ اپنے والدین کو سوائے دکھوں کے کچھ نہ دیا۔"

ربیعہ پوری محویت کے ساتھ شوہر کی سرگزشت سن رہی تھی۔ وہ اس وقت چونکی جب میں خاموش ہوا۔ میری زبان رک چکی تھی لیکن آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی اتر آئی تھی اور جیسے ہی ربیعہ نے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا۔ میں برسوں کے تھمے ہوئے اشکوں کو نہ روک سکا۔ سارے زخم تازہ ہوگئے تھے۔

مجھے تسلی دینے کے لیے ربیعہ کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ دکھی نگاہوں سے مجھے دیکھے جارہی تھی۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور لان میں لاکر ایک چیئر پر بٹھا دیا۔ خود بھی میرے مدمقابل بیٹھ گئی۔ شام ہو چلی تھی۔ ٹھنڈی اور سرد ہواؤں کے جھونکوں سے درخت اور پودے ہلکورے لے رہے تھے۔ فضا بڑی سہانی اور خوب صورت تھی لیکن ہمارے دل غمزدہ تھے۔ ربیعہ نے ملازم کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا اور پھر وہ شوہر سے مخاطب ہوئی۔ اس کا لہجہ انتہائی نرم اور ملائم تھا۔

"ارمغان آپ اپنی فیلڈ میں ایک مقام رکھتے ہیں۔ انتہائی خارزار راستے سے گزر کر آپ یہاں تک پہنچے ہیں۔ اس طویل سفر میں کئی لوگ آپ سے ٹکرائے لیکن آپ کی آپ بیتی سن کر میں نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ پہلا شخص شرافت علی صرف نام کا شرافت تھا۔ حقیقتاً وہ شر اور آفت کا سنگم تھا۔ آپ کی سادگی پر قربان جاؤں کہ آپ آج بھی اسے اپنا خیرخواہ اور ہمدرد سمجھ رہے ہیں جب کہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ انتہائی مکار اور عیار شخص ہے۔ اس نے ایک منظم سازش کے تحت آپ کو آپ کے والدین سے دور کیا تاکہ آپ کی تمام جائیداد کا بلاشرکت غیرے مالک بن

سکے۔ آپ کی طویل غیر حاضری میں پتا نہیں آپ کے ضعیف والدین کے ساتھ اس نے کیا سلوک کیا ہوگا۔ یہ آپ کی حماقت تھی کہ آپ نے کبھی مڑ کر دیکھا بھی نہیں کہ ان دونوں پر کیا گزری۔"

بیوی کی خیال آرائی میرے لیے ایک دھما کا خیز انکشاف تھا۔ میں نے تھکی ہوئی نگاہوں سے ربیعہ کو دیکھا۔ اس انکشاف سے مجھے دلی صدمہ پہنچا تھا۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے فوری جواب نہیں دیا بلکہ گہری سوچوں میں ڈوب گیا۔ اسی اثناء میں ملازم چائے لے آیا۔ ربیعہ نے چائے بنا کر کپ میری ...طرف بڑھایا لیکن میں اسٹیچو بنا ہوا اپنے خیالوں میں گم تھا۔ اس وقت میرے دل و دماغ حالات کا تجزیہ کررہے تھے۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ شرافت بھائی کی آمد کے بعد ان کے گھر میں چوری کی بڑی واردات ہوئی تھی لیکن نہ چوروں کی ٹولی پکڑی گئی تھی اور نہ اس کا سرغنہ اور پھر وقت کے ساتھ بات آئی گئی ہوگئی لیکن جب وہ گھر سے نکل رہا تھا اور شرافت بھائی نے نوٹوں کی گڈی تھماتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ پیسا تمہارے باپ کا ہی ہے۔"

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور پُرجوش آواز میں بولا۔ "ربیعہ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے میری توجہ اس جانب مبذول کروائی۔ ورنہ میں تو آج تک اس شخص کو اپنا حمایتی اور مددگار ہی سمجھتا رہا۔ پہلی فرصت میں ہمیں اماں بابا تک پہنچنا چاہیے۔"

ربیعہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میری تائید کی۔

☆......☆

ٹرین صوبہ سندھ کی حدود میں داخل ہوچکی تھی۔ ربیعہ ارسلان کو نرم و گداز بستر پر سُلا کر اسے پیار بھری نظروں سے تکتی رہی پھر مجھ پر نظر ڈالی۔ کھڑکی سے باہر حدِ نگاہ تک تیار فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ بلکہ کٹائی کا کام بھی جاری تھا۔ اکتوبر کا وسطی مہینا جاری و ساری تھا۔ گلابی جاڑوں کی آمد تھی۔ کھڑکیوں سے آتی ہوئی حرارت آمیز دھوپ بے حد خوشگوار محسوس ہورہی تھی۔ میں انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ چونکہ حیدرآباد کا فاصلہ ابھی کافی تھا۔ اس لیے میں نے ٹرین کی دھیمی رفتار پر۔ ریلوے انتظامیہ کو صلواتیں سنائیں۔ ربیعہ متبسم اور پُرسکون انداز میں مجھے دیکھتی رہی۔ دونوں نے مل کر ناشتا کیا اور اپنی جگہ سوچنے لگے کہ کاش وہ یہ سفر بائے ایئر ہی کرلیتے۔ بہرحال جب ہم حیدرآباد اسٹیشن اترے تو نہ صرف ذہنی طور پر بلکہ جسمانی طور پر بھی بری طرح تھک چکے تھے اور آبائی گاؤں تک کا سفر ابھی باقی تھا۔ اپنے گاؤں پہنچ کر میری آنکھوں میں بھولی بسری یادوں کے چراغ جل اٹھے۔ میں گرد و پیش سے بے خبر اپنے ماضی میں گم تھا۔ گاؤں کی کچی اور گرد آلود پگڈنڈیاں اب سڑکوں میں تبدیل ہوچکی تھیں۔ اکثر بل کھاتی ندی اب سوکھ کر نالا بن چکی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کا شور، اطراف میں دکانوں اور ہوٹلوں کی قطاریں اور ان میں بے ہنگم موسیقی کا غل غپاڑہ، ہریالی اور کھیتوں کی جگہ اب دیواروں کا ایک جنگل تھا جسے آبادی کہتے ہیں۔ میں نے سرگوشیانہ انداز میں بیوی سے کہا۔ "ربیعہ مجھے لگ رہا ہے میں بھٹک کر کہیں اور آگیا ہوں۔ یہاں تو سب کچھ تبدیل ہوچکا ہے نہ وہ......" ابھی میں نے اپنا فقرہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ رکشے والا ایک جھٹکے سے رکا اور چلایا۔ "صاحب جی آگئی حویلی۔"

میں نے ایک طویل عرصے بعد اپنے گھر پر نظر ڈالی تو دل تھام کر رہ گیا۔ گھر بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ میرے دل میں ایک مایوس کن سوچ ابھر آئی کہ وقت کے سنگین ہاتھوں نے جب گھر کو اس نہج پر لا کھڑا کیا ہے تو ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔ کہیں وہ......اس سے آگے سوچنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ اتنی دیر میں ربیعہ رکشے والے کو فارغ کرچکی تھی۔

حویلی کے گیٹ پر موجود دربان نے جب ایک ننھے منے بچے کے ساتھ ایک جوان اور اجنبی جوڑے کو دیکھا تو وہیں بیٹھے بیٹھے ایک ملازم کو آواز لگائی کہ اندر جا کر اطلاع دے۔ ملازم نے فوراً دوڑ لگا دی۔ اس کی واپسی سے پہلے میں اور ربیعہ گیٹ کھول کر اندر داخل ہوچکے تھے۔ دربان اپنی جگہ شور مچا رہا تھا لیکن ہم نے اس کی ایک نہ سنی اور تیز تیز چلتے ہوئے حویلی کے دیوان خانے میں داخل ہوگئے۔ پرانی طرز کے فرنیچر سے آراستہ یہ کمرا بھائیں بھائیں کررہا تھا۔ اسی سے متصل ایک کمرے کے دروازے پر میں نے ہلکی سی دستک دی لیکن جواب ندارد۔ معاً ہال کے سرے پر وہی ملازم نظر آیا جو چوکیدار کے حکم پر اندر آیا تھا۔ اس نے اشارے سے زینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ میں ربیعہ کی معیت میں تیزی سے زینہ چڑھتے ہوئے اوپر پہنچا۔ ایک کمرے سے وقفے وقفے سے کھانسی کی آواز ابھر رہی تھی۔ ہم نے اسی طرف قدم

بڑھائے اور دبیز پردہ اٹھا کر داخل ہو گئے۔ سامنے ہی جہازی سائز آبنوسی تخت پر ابو نیم دراز تھے۔ ملازم لڑکا حقہ تازہ کررہا تھا۔ آہٹ پر چونکتے ہوئے انہوں نے اپنا نحیف ونزار وجود سمیٹا اور کمزور اور نقاہت بھری آواز میں ملازم سے استفسار کیا۔ ”شفیق کون لوگ ہیں جو مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ تم انہیں دیوان خانے میں بٹھاؤ میں نیچے آنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

میں نے باپ کے قدموں میں بیٹھ کر دل گرفتہ اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”بابا آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ارمغان آپ کے قدموں میں تو بیٹھا ہوں۔ بہت دوررہ لیا آپ سے۔ اب آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔“

ربیعہ کی بوڑھی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ چہرے کو دیکھ کر رخسار اور داڑھی تر ہو گئی۔ لرزیدہ ہاتھوں سے مجھے سینے سے لگایا اور کہا۔ ”میرے رب نے میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخش دیا۔ میرے بچے تیری ماں تو تجھ سے ملنے کی حسرت لے کر ہی اس دنیا سے سدھار گئی۔“

اس ملن نے ربیعہ کو بھی رلا دیا۔ باپ کی گود میں سر رکھے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ابو کی بھی سسکیاں فضا میں گونج رہی تھیں۔ شفیق نے حقہ ایک طرف رکھ کر باہر کی راہ لی اور پھر وہ شرافت کو بلا لایا۔ میں نے شرافت کو دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ زمانے کے ماہ و سال کی گردش نے شرافت پر ایسا کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ اپنی چھڑی کے سہارے وہ سنبھل سنبھل کر کمرے میں داخل ہوا اور مجھ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ”آج کا دن کیسا مبارک ہے کہ برسوں کے بچھڑے مل گئے۔ سب کچھ ناقابلِ یقین سا لگ رہا ہے۔“

میں نے ربیعہ کا تعارف کرواتے ہوئے بچے کو ابو کی گود میں ڈال دیا۔ ابو کی خوشی اور مسرت دیدنی تھی۔ شرافت بھی بچے کو گود میں لے کر کافی دیر پیار کرتا رہا۔ پھر اس کے رونے پر ربیعہ کے حوالے کر کے میرے اور ابو کی باتوں میں شامل ہو گیا۔ مجھے جہاں گھر پہنچ کر باپ سے ملنے کی خوشی تھی وہیں ماں کی موت کا سن کر دکھوں میں اضافہ بھی ہو گیا تھا۔ ماں کی موت کا ذمہ دار میں اپنے آپ کو سمجھ رہا تھا۔ کرید کرید کر میں سوالات کر رہا تھا اور ابو بڑی تفصیل سے بتا رہے تھے کہ میرے جانے کے بعد ماں ماں کی ماری امی کس طرح ماہی بے آب کی طرح تڑپی ہیں۔ کس طرح وہ بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑا کر دعائیں کرتی تھیں۔ روزانہ دروازے کو آس بھری نگاہوں سے تکتیں اور پھر ساری رات مالک حقیقی سے فریاد کرتی تھیں کہ میرا لعل جہاں بھی رہے اسے خوش وخرم رکھیو اور اپنے حفظ وامان میں رکھیو۔“ ماں کی دعائیں باپ کی زبانی سن کر میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہاں موجود ملازمین کی آنکھیں بھی آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ مجھ کو آج یقین ہو گیا کہ بابا ابو خاں سے میری ملاقات یونہی نہیں ہوئی بلکہ یہ سب ماں کی دعاؤں کا اثر تھا۔ ان کی شب بیداریوں اور التجاؤں کا ثمر تھا جو رب نے ہر پُرخطر موڑ پر میری حفاظت اور معاونت فرمائی۔

میری گریہ وزاری پر شرافت نے پشت تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”ارے میاں زندگی میں اس طرح کے غیر متوقع حالات پیش آتے ہی ہیں۔ انسان کو اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔“

ملازم نے ناشتا لگنے کی اطلاع دی تو میں اور ربیعہ نے سہارا دے کر ابو کو اٹھایا اور ناشتے کی میز تک لائے۔ ابو کو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا اوپر والے نے بے حساب خوشیوں سے انہیں نواز دیا ہو۔ بار بار وہ ربیعہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے، پوتے کو چومتے اور اس کی چہکار سن کر خوش ہوتے۔

میرے آنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ اپنے پرائے دوست احباب کی آمد و رفت جاری و ساری تھی۔ جب ذرا ہلا گلا شور شرابہ کم ہوا تو میں نے خود پر گزری تمام روداد ابو کے گوش گزار کی۔ ابو نے سب کچھ بغور سننے کے بعد ایک دبی ہوئی سانس خارج کی اور بولے۔ ”اپنا کیریئر بنانے میں تم نے جو جان لیوا محنت کی اس کے لیے تم قابلِ تحسین ہو۔ میں تمہارے معاون و مددگار بابا ابو خاں کا بھی مشکور ہوں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کے احسانات کا بدلہ انہیں اللہ ہی دے گا۔ ہم تو ان کے سامنے تہی دست ہیں۔“

میں نے مثبت انداز میں گردن ہلاتے ہوئے ابو کی بات سے اتفاق کیا۔ ربیعہ بھی قریب بیٹھ کر گفتگو سن رہی تھی۔ ہماری گفتگو کے درمیان ایک مختصر سا وقفہ آیا پھر ابو نے کھنکھار کے گلا صاف کیا اور بولے۔ ”شرافت نے تم کو ہم لوگوں سے بدظن کیا اور تمہیں شہر بدر کروایا۔ اس انکشاف سے مجھے ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ تمہاری ماں اکثر مجھے کہا کرتی تھیں کہ ارمغان کو ورغلانے میں شرافت کا ہاتھ ہے۔ وہ
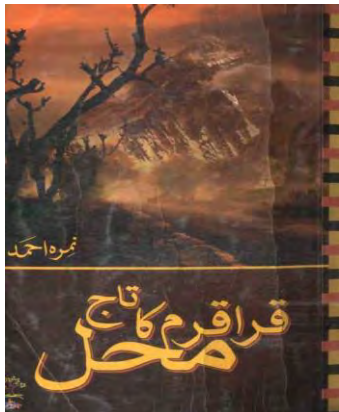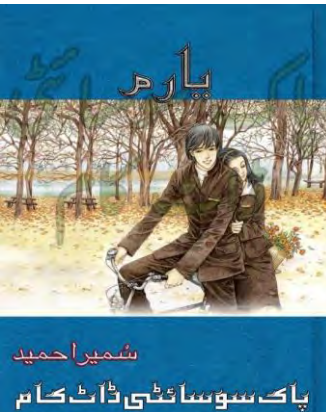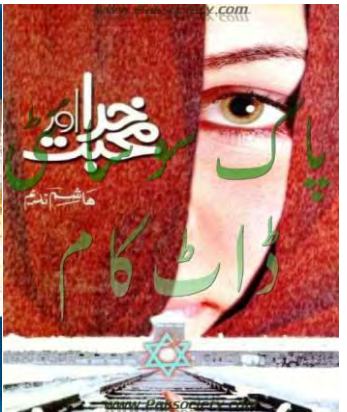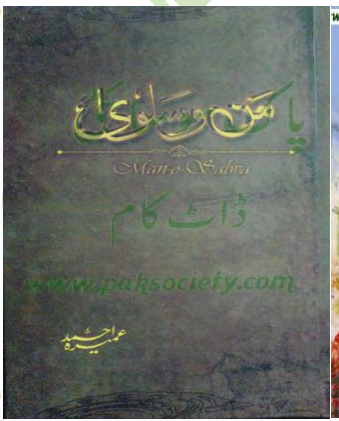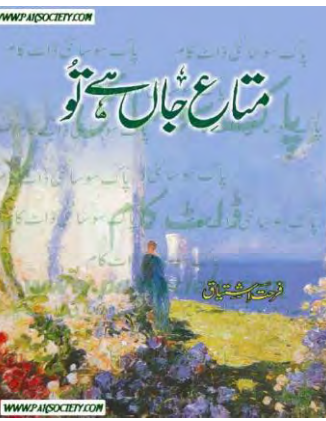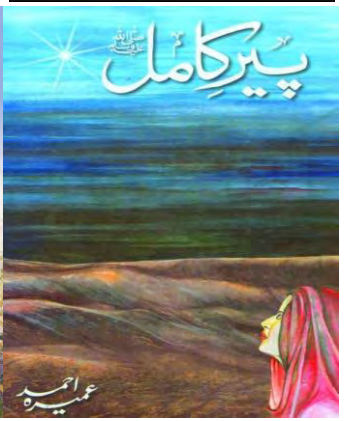
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اپنے آخری ایام میں اس سے بری طرح متنفر ہوگئی تھیں۔"

ربیعہ نے مداخلت کرتے ہوئے سوال کیا۔ "بابا کیا اماں بیمار تھیں اور اگر بیمار تھیں تو آپ نے کسی معالج کو نہیں دکھایا؟"

بابا نے ایک آہ بھری اور اداس لہجے میں جواباً کہا۔ "بیٹا بیمار ہوتیں تو میں کسی ڈاکٹر حکیم سے رجوع کرتا ناں۔ وہ تو رات میں مجھ سے باتیں کرنے کے بعد اپنے بستر پر گئیں۔ ملازم نے دودھ کے بھرے گلاس لاکر میز پر رکھے تو میرا گلاس اٹھا کر مجھے پیش کیا اور پھر خود دودھ پی کر ایسی سوئیں کہ پھر نہیں اٹھیں۔ روزانہ تہجد کے لیے اٹھتی تھیں تو میری بھی آنکھ کھل جاتی تھی لیکن اس روز بالکل سناٹا چھایا رہا۔ کوئی آہٹ نہ کوئی آواز۔ اس رات سونے سے پہلے وہ اپنے گمشدہ بیٹے کو ہی یاد کرتی رہی۔ یہ تو خیر اس کا روز کا معمول تھا۔ اس لیے میں نے کوئی توجہ نہیں دی لیکن نماز فجر کا بھی وقت گزر گیا تو پھر مجھے تشویش ہوئی اور جب اس نیک بخت کو ہلایا جلایا تو پتا چلا کہ بستر پر تو مٹی کا ڈھیر تھا۔ قفسِ عنصری سے کب روح پرواز کرگئی مجھے......"

ربیعہ نے درمیان میں ہی فقرہ اچک لیا اور مشکوک لہجے میں بولی۔ "بابا ایسا لگتا ہے اماں طبعی موت نہیں مریں۔ ضرور دودھ میں کوئی گڑبڑ ہوگی۔"

ارمغان نے بیوی کی بات کی نفی کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "تم فضول شکوک وشبہات کی فضا قائم کررہی ہو۔ اماں سب کو اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔ بھلا یہاں کون ان کا دشمن ہوگا اور پھر دودھ بابا نے بھی پیا تھا۔ تم تو بس یونہی......"

ربیعہ نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹے کو خاموش کرواتے ہوئے ربیعہ کو نظر بھر کر دیکھا اور بولے۔ "میری بچی تمہاری بات خالی از امکان نہیں کیونکہ جو ملازم ہم دونوں کے لیے دودھ لے کر آیا تھا وہ میت کے فوراً بعد یوں اڑن چھو ہوا جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ مجھے تو بیٹے کے غم نے ادھ موا کردیا تھا اور پھر مرے پر سو درے اچانک شریکِ زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ مجھ پر تو غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ میں تو اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔ گھر کا کرتا دھرتا شرافت ہی تھا۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ وہ ملازم لڑکا کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟"

ربیعہ نے سخت لہجے میں سسر کی اس بات کی مخالفت کی اور کہا۔ "آپ شرافت بھائی سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کریں گے ورنہ وہ چوکنا ہوجائیں گے۔ کیونکہ مجھے وہم اور شک نہیں بلکہ یقین ہوگیا ہے کہ یہ شخص روزِ اوّل سے ہی آپ کے گھر کی جڑیں کھوکھلی کررہا ہے اور اماں نے یقیناً سب کچھ بھانپ لیا تھا اور جب اس نے اماں سے خطرہ محسوس کیا تو نہایت چالاکی سے انہیں راستے سے ہی ہٹا دیا۔"

ربیعہ کی اس قیاس آرائی پر ہم باپ بیٹے کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ہم اپنی اپنی جگہ دم بخود بیٹھے تھے۔ چہرے پژمردہ اور ستے ہوئے تھے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ہمیں یقین نہیں آرہا تھا۔ چند ثانیوں کے لیے ماحول میں پُرسوچ سناٹا طاری ہوگیا۔ ربیعہ نے مدھم اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "فی الحال آپ دونوں کو کوئی ایکشن لینے کی ضرورت نہیں میں ذرا صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کررہی ہوں۔ ہمیں صبر و برداشت سے کام لینا ہوگا بلکہ محتاط ہو کر کام کرنا ہوگا کہ اس شاطر اور مکار انسان کو کوئی شک نہ ہوجائے۔ جب اس کے خلاف مضبوط اور پکے ثبوت ہمارے ہاتھ آجائیں گے تب ہم پولیس سے رجوع کریں گے۔"

ربیعہ کی بات میں وزن تھا۔ اس لیے دونوں نے اس کی بات کی نفی نہیں کی۔ ربیعہ نے ابو کو استفسارانہ انداز میں دیکھا اور بولی۔ "بابا آپ اس شخص کے بارے میں ذرا تفصیل سے بتایے۔"

"ہنہ۔" ابو نے ایک پُرزور ہنکارا بھرا اور اپنی بھاری بھرکم آواز میں گویا ہوئے۔ "میں اور ارمغان کی والدہ آپس میں کزن بھی تھے۔ اس لیے شرافت ہم دونوں کی رشتے داری میں آتا تھا۔ اس کی ماں نے اس کے باپ کے مرنے کے بعد دوسرا نکاح کرلیا تھا۔ اس کا سوتیلا باپ طبیعتاً نہایت شریف اور سلجھی ہوئی طبیعت کا انسان تھا لیکن اس کی ماں شوہر کی جانب سے اس بدگمانی میں مبتلا تھی کہ اس کا شوہر اس کے بیٹے کو غلام ہی نہ بنالے۔ اس لیے اس نے ہم دونوں میاں بیوی سے درخواست کی کہ شرافت کی پرورش کی ذمہ داری ہم لوگ قبول کرلیں بس ہم دونوں میاں بیوی نے بغیر کسی اعتراض کے یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ کیونکہ بفضلِ ربی ہمارے گھر میں کسی بات کی کمی نہیں تھی۔ اس کی ماں نے اسے ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ پیدائشی بینائی سے محروم ہے۔ اسے پرچھائیاں سی تو نظر آتی ہیں لیکن صاف طور پر یہ نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے اور ارمغان کی ماں کو اس بات کا نہایت قلق تھا۔ صغرسنی میں ہی یہ بچہ معذوری کا شکار ہوگیا۔ اس لیے میں نے بہت چاہا کہ کسی

آئی سرجن کو دکھایا جائے تاکہ اس کا نقص دور ہو سکے لیکن
شرافت نے ہمیشہ یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس نے اندھیروں
سے سمجھوتا کر لیا وہ اپنی تاریک دنیا سے مانوس ہو گیا ہے۔
میری مرحومہ بیوی نے بھی اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی
لیکن وہ کسی ڈاکٹر سے معائنے یا علاج کے لیے تیار نہیں ہوا۔
تھک ہار کر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ پھر ہم لوگوں نے یہ
دیکھا کہ وہ نابینا ضرور تھا لیکن ہر کام بخوبی انجام دیتا۔
ارمغان سے اس کی بہت دوستی تھی۔ حالانکہ وہ عمر میں اس
سے کافی بڑا تھا اور اب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ ارمغان کو
غلط راہ دکھانے میں شرافت پیش پیش تھا۔ ارمغان کو یہاں
سے چلتا کرنے کے بعد بظاہر تو ہمارے ساتھ ہمارے غم میں
شریک رہا لیکن درپردہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ بند کمرے
میں گھنٹوں گزارتا۔ اس کی ان پُراسرار سرگرمیوں کی سن گن
مرحومہ کو مل گئی تھی اور اس نے مجھ سے تقاضا شروع کر دیا تھا
کہ اسے اس کی ماں کے پاس واپس بھجوا دیں۔ ارمغان کے
جانے کے بعد گھر میں اداسی، ویرانی اور سناٹے کا دور دورہ
تھا۔ اس لیے میں نے اپنے ایک مزارع کی بیٹی سے اس کا
نکاح کروا دیا۔ لڑکی قبول صورت، نیک سیرت اور سگھڑ تھی۔
ہمارے گھر آ کر بہت خوش تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی کی
خدمت یوں کرتی جیسے ہم اس کے ماں باپ ہیں۔ اللہ نے
بہت جلد اس کی گود بھی ہری کر دی۔ بچہ بھی بڑا پیارا تھا۔
تقریباً پونے دو سال کا ہو گا کہ اچانک ماں اور بچہ دونوں
غائب ہو گئے۔ شرافت کی تاریک دنیا اور تاریک ہو گئی۔ وہ
سر پٹخ پٹخ کر جب اپنے جگر کے ٹکڑے کو پکارتا تو سننے والوں
کے دل لرز جاتے۔ ہم دونوں میاں بیوی کے زخموں کے
ٹانکے بھی پھر سے کھل گئے۔ شرافت اپنی بیوی اور بچے کے
لیے روتا اور ہم دونوں ارمغان کے لیے آنسو بہاتے۔ ہمارا
گھر غم کدہ بن گیا تھا جس میں خوشیوں کا گزر نہیں تھا۔ ایک
دن مجھے مرحومہ بیوی نے یہ بتایا کہ شرافت رات گئے۔ عقبی
دروازے سے اپنے دوست احباب کو بلانے لگا ہے کیونکہ
میرے حکم پر دربان گیارہ بجے گیٹ لاک کر دیتا تھا۔ میں نے
شرافت سے اس سلسلے میں باز پرس کی تو وہ فوراً مکر گیا۔ ایک
بار میرے ایک دوست نے مجھے آ کر بتایا کہ انہوں نے
ارمغان کو لاہور میں دیکھا ہے لیکن وہ صرف جھلک دیکھ سکے
کیونکہ وہ بس میں سوار تھا۔ شرافت ان پر چڑھ دوڑا اور انہیں
خبط الحواس تک کہہ دیا اور کہا کہ آپ لوگ آ کر گڑے مردے
اکھاڑتے ہیں اور اماں کے غم تازہ کر دیتے ہیں۔ ارمغان کی
ہاں اس روز سے ہی میرے سر ہو گئی کہ میں کسی قابل بھروسا
شخص کو لاہور روانہ کروں۔ میں نے اپنے اسی دوست کے
بیٹے کو لاہور روانہ کیا لیکن نہ وہ پلٹ کر آیا نہ کوئی خیر خبر۔ میری
بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں تھا کہ دوڑ بھاگ کرتا۔ بقول
اپنی بیوی کے آپ وقت سے پہلے ہی بیٹھ گئے اور ہر کام کے
لیے شرافت کے محتاج ہو گئے اور شرافت ہمیں بے وقوف بنا
رہا ہے۔ اور پھر ایک دن وہ مجھے سمجھاتے سمجھاتے اس دنیا
سے سدھار گئیں۔ وہ تو مجھ پر میرے رب کو رحم آ گیا جو اس
نے زندگی میں ہی ارمغان کی صورت دکھا دی۔ پھر سے
داستان یوسف دوہرا دی۔" بولتے بولتے ابو کی آواز اشکوں
اور آہوں میں ڈوب گئی۔ ربیعہ اور میں نے بدقت تمام انہیں
سنبھالا۔ ربیعہ ان سے مزید سوالات کرنا چاہ رہی تھی لیکن
ارمغان نے اشارے سے اسے منع کیا کہ وہ اب کسی قسم کا
کوئی استفسار نہ کرے لیکن اس کے باوجود وہاں سے اٹھتے
ہوئے ربیعہ نے سفیان مرزا سے التجائیہ لہجے میں کہا۔ "بابا
آپ کسی طرح اس شخص کو پورے ایک دن کے لیے کہیں بھجوا
دیں کیونکہ میں اس کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتی ہوں۔"
ابو نے بلا کسی حیل وحجت کے بہو کی بات مان لی اور
دوسرے ہی دن انہوں نے شرافت کو اپنی زمینوں پر روانہ
کر دیا۔

☆......☆

ربیعہ نے گھر کے سارے ملازمین کو بھی کسی نہ کسی
بہانے سے گھر سے دور کر دیا تھا۔ اس وقت اس لمبی چوڑی
حویلی میں ہم دونوں کے علاوہ ابو تھے۔ جو پوتے کو گود میں
لیے محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ربیعہ ٹٹولتی
اور عقابی نگاہوں سے شرافت کے کمرے کا جائزہ لے رہی
تھی۔ اچانک ربیعہ ایک جگہ ٹھٹک گئی۔ اس کی آنکھوں میں
غیر معمولی چمک تھی۔ میں اس کے اس انداز پر چونکے بغیر نہ
رہ سکا۔ میں نے فوراً سوال داغ دیا۔ "کیوں کیا ہوا۔ تم اس
طرح کیوں کھڑی ہو گئیں۔"
ربیعہ نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی۔
"ارمغان اِدھر دیکھو، ایک اندھے کے کمرے میں بک
شیلف اور وہ بھی ٹھسا ٹھس کتابوں سے بھرا ہوا۔"
ارمغان نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیگم صاحبہ
بڑا تیر مار لیا آپ نے ارے بھئی میرے بابا مطالعے کے
شوقین ہیں لیکن اب پیری ضعیفی میں آنکھیں ساتھ نہیں دے
رہی ہیں۔ اس لیے یہ شیلف اپنے کمرے کی بجائے شرافت

بھائی کے کمرے میں پھینک مارا۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

ربیعہ نے سرد اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "آپ کب تک اس شخص کی وکالت کرتے رہیں گے۔ یہ دیکھیے بیڈ پر سرہانے کی جانب ایک کتاب رکھی ہے۔ صاف لگ رہا ہے کوئی پڑھتے پڑھتے گیا ہے اور بعض بدسلیقہ لوگوں کی عادت ہوتی ہے پڑھتے ہوئے بطور نشان صفحات کا کارنر فولڈ کر دیتے ہیں۔ انہوں نے بھی یہی کام کیا ہے۔ ذوق بھی انتہائی گرا ہوا اور تھرڈ کلاس ہے۔ مجھے یقین ہے اس قسم کا لٹریچر بابا تو ہرگز نہیں پڑھتے ہوں گے۔"

میں نے کتابوں کو دیکھتے ہوئے اپنے سر کو جنبش دی۔ وہ پوری طرح ربیعہ کی بات سے متفق ہو گیا تھا۔ ربیعہ نے میرا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ "کچھ سمجھ رہے ہو۔"

میں نے پُرتشویش آواز میں جواب دیا۔ "میں ہمیشہ تمہاری باتوں کی نفی کرتا رہا لیکن تم بالکل صحیح سمت جا رہی ہو جو شخص کتابیں پڑھ رہا ہو وہ بھلا اندھا کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس نے تو ہم آنکھوں والوں کو اندھا کر رکھا تھا۔ مجھ سے کہا کرتا تھا میں آواز اور ڈائیلاگ سے فلم کی کہانی سمجھ لیتا ہوں۔ مکار دھوکے باز......" میں شرافت کو مزید مغلظات سے نوازتا لیکن ربیعہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ارمغان وقت کم ہے اور ابھی سارے کمرے کی تلاشی باقی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ بکھری ہوئی کتابیں شیلف میں رکھنے لگی کہ اچانک ایک ضخیم کتاب شیلف سے گری اور ایک لفافہ ربیعہ کے قدموں میں آگرا۔ اس نے جھک کر لفافہ اٹھایا۔ اس پر شرافت کا نام لکھا ہوا تھا۔ لفافہ کافی بوسیدہ اور پرانا تھا۔ اندر جو تحریر تھی اس کا کاغذ بھی پیلا اور زرد ہو رہا تھا۔ لکھنے والے کی ہینڈ رائٹنگ انتہائی ناقص اور بدنما تھی۔ ایسا لگ رہا تھا لکھنے والے نے بڑی مشکل سے یہ خط تحریر کیا ہو۔ ربیعہ اور میں نے ایک ساتھ وہ تحریر پڑھنا شروع کی۔ خط کسی صفیہ نامی عورت کا تھا جس نے لکھا تھا کہ اس کا گزارہ اب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ اپنے بچے سمیت یہاں سے رخصت ہو رہی ہے اماں اور بابا کو ختم کرنے کی سازش جو تم نے بنائی ہے وہ تمہیں ہی مبارک۔ وہ دونوں میرے محسن ہیں۔ مجھ پر میرے باپ پر بلکہ میرے خاندان پر ان کے بہت احسانات ہیں اس لیے میں تمہاری آلۂ کار نہیں بن سکتی۔ طمع اور لالچ نے تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے لیکن میں اس گناہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ میں محنت مزدوری کر کے اپنے بچے کو حق حلال کی کمائی کھلاؤں گی اور اسے ایک اچھا انسان بناؤں گی۔ جہاں حقدار ترستے ہیں وہاں انگارے برستے ہیں۔ میں تمہاری گھناؤنی سازشیں بابا کے اور اماں کے سامنے بے نقاب کرنا چاہتی تھی لیکن وہ دونوں تمہیں اس قدر چاہتے ہیں کہ تمہاری چالوں کو آج تک سمجھ نہیں سکے اور تمہیں ذرا سی بھی بھنک مل گئی کہ میں نے اماں کو سب کچھ بتا دیا ہے تو تم مجھے اور میرے باپ کو زندہ نہیں چھوڑو گے۔ اس لیے میں اپنے باپ کے ساتھ اپنے بچے کو لے کر ایسی جگہ جا رہی ہوں جہاں پہنچنا تمہارے لیے بہت مشکل ہے۔ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے کہیں نہ کہیں ہمیں ٹھکانا مل جائے گا۔ اس کے بعد صفیہ کے دستخط تھے۔ اس سنسنی خیز تحریر کو پڑھ کر میں اور ربیعہ ایسے ساکت ہوئے جیسے روح قبض کر لی گئی ہو۔ ہم بالکل بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ بالآخر ربیعہ نے جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "ارمغان ہوش میں آؤ۔ بابا کو یہ خط دکھانا چاہیے یا نہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

میری آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ شرافت اس حد تک گر سکتا ہے۔ اس کی ماں کا قاتل اس کی چھت کے نیچے سانس لے رہا ہے۔ میں جوشِ غیظ سے تپ اٹھا تھا۔ ربیعہ نے بڑی مشکلوں سے میرا غصہ ٹھنڈا کیا اور حاصل شدہ خط ابو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ عینک لگانے کے باوجود انہوں نے خط آنکھوں سے قریب لا کر آہستہ آہستہ پڑھا۔ خط پڑھ کر ان کی کیفیت بھی مجھ سے جدا نہیں تھی۔ ان کا پورا وجود لرز رہا تھا لیکن زبان بالکل خاموش تھی۔ ربیعہ اور میں نے بدقت تمام انہیں بولنے پر آمادہ کیا وہ اٹک اٹک کر لکنت زدہ آواز میں بولے۔ "تمہاری ماں نے مجھے بہت پہلے خبردار کر دیا تھا لیکن میں اس کے ہتھکنڈوں کو سمجھ ہی نہیں سکا۔ اس گھر میں آنے کے بعد رب نے اسے اوقات سے زیادہ نواز دیا تھا جسے وہ ہضم نہیں کر سکا۔ بہرحال بیٹا صفیہ کا یہ خط ہمارے پاس ایک مضبوط ثبوت ہے جس کے ذریعے سے ہم اس گھٹیا اور بدقماش، احسان فراموش کو سزا دلوا سکتے ہیں۔"

ربیعہ کے دل و دماغ آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ وہ چند لمحوں تک مجھے اور ابو کو دیکھتی رہی پھر ہمت کر کے سوال کر ڈالا۔ "بابا شرافت کی بیوی کو تلاش کر کے کیا ہم اسے عدالت میں نہیں پیش کر سکتے؟"

ابو نے ایک سرد آہ بھری اور روہانسی آواز میں کہا۔ "میری بچی پتا نہیں وہ غریب کہاں ہو گی۔ کدھر ہو گی میں اس کا بھی گناہ گار ہوں۔ وہ غریب مزارع اس شادی کے لیے

راضی نہیں تھا لیکن میں نے ہی اس پر زور ڈالا تھا کہ شرافت صرف آنکھوں سے معذور ہے ورنہ ہر خوبی ہر صلاحیت سے مالا مال ہے۔ اف میرے خدا میں نے اسے کیا سمجھا اور یہ کیا نکلا۔" ابو بری طرح کپکپا رہے تھے۔ میں نے ابو کو سہارا دے کر بیڈ پر لٹایا اور ربیعہ کو نظروں ہی نظروں میں منع کیا کہ وہ اب اس موضوع پر کوئی بات نہ کرے۔ فی الفور اس نے بھی چپ سادھ لی۔ جب ابو کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو ہم ان کے کمرے سے نکل گئے۔

دونوں ابھی بھی اسی ادھیڑ بُن میں مبتلا تھے کہ کس طرح اس شیطان صفت شخص سے نمٹا جائے۔ کافی غور و خوض کے بعد میں نے اپنے ایک دوست کو لاہور فون کیا۔ وہ محکمہ پولیس کے ایک بڑے عہدے پر تھا۔ ساری کہانی سننے کے بعد اس نے حیدر آباد کے ایک پولیس افسر کا نمبر دے کر رابطے کا مشورہ دیا۔ میں اس سے رابطہ کرتا کہ وہ خود آ گیا۔ دوست نے ایسے ہی فون کر دیا تھا۔ میں نے شرافت کا سارا کچا چٹھا مع صفیہ کے خط کے اس پولیس انسپکٹر کے سامنے پیش کر دیا۔ انسپکٹر کی آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیاں تھیں۔ صفیہ کا خط بغور پڑھنے کے بعد وہ بولا۔" مسٹر ارمغان اس خط کی تو عدالت میں کوئی حیثیت نہیں۔ یہ فقط ایک کاغذی پرزہ ہے جسے شرافت جیسا کائیاں اور مکار آدمی بڑی آسانی سے جھٹلا سکتا ہے۔ ہاں اگر اس کی بیوی کی نشاندہی ہو جائے اور وہ عدالت میں اس کے خلاف بیان دے دے تو پھر سمجھئے کہ یہ چاروں ہاتھ پیر سے شکنجے میں پھنس جائے گا۔ بقول آپ کے کہ وہ اندھا نہیں ہے اگر ہم اس کا میڈیکل چیک اپ کروا کر عدالت میں پیش کرتے ہیں تو قانونی نکتہ نظر سے یہ اس کا اپنا فعل ہے۔ کوئی جرم نہیں۔ بہت سے لوگ دوسروں کو بے وقوف بنانے کی خاطر اپنے آپ کو کچھ اور بنا کر پیش کرتے ہیں حالانکہ حقیقتاً وہ ہوتے کچھ اور ہیں۔ اسے کوئی جرم ماننے کو تیار نہیں ہوگا۔ اس کے گروہ کا بھی کچھ اتا پتا نہیں کہ اس کے کسی آدمی کو وعدہ معاف گواہ بنا کر پیش کریں۔"

میں نے اداس اور مایوس نظروں سے انسپکٹر کو دیکھا اور روہانسی آواز میں بولا۔" تو انسپکٹر صاحب یہ اسی طرح ہمارے سینوں پر مونگ دلتا رہے گا۔ جب تک کسی بات کا علم نہیں تھا۔ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل تھا تو صبر کا یارا تھا لیکن اب...... اب......" اس سے آگے میری زبان لڑکھڑا گئی۔

انسپکٹر نے کہا۔" ارے آپ تو فوراً ہی حوصلہ ہار بیٹھے۔ اس ہتکِ انسانیت کو ہم یوں ہی نہیں چھوڑیں گے۔ ہمیشہ یاد رکھیے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ اس کے...... داؤ پیچ ہم اس پر ہی آزمائیں گے۔ کمبخت اپنی ہی زبان سے کھڑے کھڑے اقبالِ جرم کرے گا۔ جس طرح وہ ساری زندگی جھوٹ بولتا رہا۔ ہم بھی دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے اسے سچ بولنے پر مجبور کریں گے اور اسے کٹہرے میں لا کر کھڑا کریں گے۔ صرف آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔" ایسا کون سا حربہ یا ہتھیار ہے آپ کے پاس کہ یہ ہمارے جال میں پھنس جائے گا۔ آپ ذرا کھل کر بتایئے۔"

انسپکٹر سرگوشیانہ انداز میں آہستہ آہستہ مجھے سمجھانے لگا۔ اس کی آواز اتنی ہلکی تھی کہ قریب بیٹھی ربیعہ بھی نہ سن سکی کہ انسپکٹر مجھے کیا پٹی پڑھا رہا ہے۔ انسپکٹر نے رخصت ہوتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور سخت لہجے میں تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔" آپ کو ہر حال میں میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔" میں نے سر کی جنبش سے "ہاں" کا اشارہ کیا اور بولا۔" میں اپنی جگہ بالکل مستعد رہوں گا۔ آپ بے فکر رہیے۔"

انسپکٹر کے جانے کے بعد بھی ربیعہ گہری سوچوں میں غلطاں تھی۔ اس نے مجھ سے مدھم آواز میں کہا۔" ارمغان یہ پولیس انسپکٹر کے سارے اندھے تیر ہیں، صحیح نشانے پر لگتے بھی ہیں یا خطا ہو جاتے ہیں یہ دیکھنا ہے۔"

میں نے پرسوچ انداز میں گردن ہلائی اور آہستہ سے کہا۔" اللہ پر بھروسا رکھو۔ وہ کارساز ہے۔"

☆......☆

دوسری صبح ناشتے کی میز پر ابو، میں اور ربیعہ بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ صورتوں سے لگ رہا تھا کہ ابو اور ربیعہ اس وقت سخت الجھن کا شکار ہیں۔ اسی دوران بھاری بھرکم قدموں کی آہٹ ہوئی اور شرافت تیوریوں پر بل ڈالے داخل ہوا۔ ہمیشہ کی طرح آنکھوں پر سیاہ عینک تھی۔ وہ نفیس شلوار سوٹ میں ملبوس تھا۔ میز کے قریب آ کر کرسی ٹٹولی اور ایک طویل سانس لے کر اس پر براجمان ہو گیا۔ ناشتے کو خود بخود بریک لگ گیا تھا۔

شرافت نے ملازم کو پکار کر اپنے لیے ناشتے کا آرڈر دیا اور پھر ابو کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔" بابا آپ نے بہت سے ہاریوں، کسانوں اور مزدوروں کا پیسا روک رکھا ہے۔ وہ سب مجھ سے شکایت کر رہے تھے۔ آپ کل پہلی فرصت میں بینک سے پیسا نکلوائیں تاکہ میں جا کر سب کا حساب بے باق کردوں۔ ورنہ وہ سب آپ کے سر ہو جائیں گے۔"

ابو کے ہونٹوں پر قفل پڑ گیا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے گھورے جا رہے تھے۔ جسم پر ہلکا ہلکا ارتعاش شروع ہو گیا تھا۔ ہونٹ بھی کپکپا رہے تھے۔ چہرہ غصے کی زیادتی سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ ہاتھ کی لرزش سے تھاما ہوا چائے کا کپ فرش پر گر گیا اور دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ قریب کھڑا ملازم فوراً دوڑ کر فرش صاف کرنے لگا۔

شرافت نے اپنے جوتے کی نوک سے ملازم کو دھکا دیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”تجھے ناشتا لانے کے لیے کہا تھا تو فرش صاف کرنے بیٹھ گیا۔“

ہم سب کچھ دیکھ رہے تھے لیکن جب شرافت نے نوکر کو ٹھوکر ماری تو میرا... صبر و ضبط جواب دے گیا۔ میں تنتنا کر کھڑا ہوا اور مشتعل لہجے میں بولا۔ ”ناشتا میں کراؤں گا تجھے، بینک سے پیسا بھی میں نکال کر دوں گا۔ تیرا سارا حساب میں چکتا کروں گا، گھبراتا کیوں ہے۔“ ربیعہ ابو کو سنبھال رہی تھی جو ابھی بھی اپنی نشست پر بیٹھے تھرتھرا رہے تھے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

شرافت ہکا بکا یوں منہ پھاڑے بیٹھا تھا جیسے یہ سب اس کے لیے انہونی ہو کیونکہ میں نے ہمیشہ اس سے دائرۂ تہذیب میں رہ کر گفتگو کی تھی۔ جب کہ آج اس سے تڑاک سے بات کر رہا تھا۔ اس پر ایسا سکوت اور سناٹا چھایا ہوا تھا جیسے اس کی قوت گویائی اور سماعت دونوں سلب کر لی گئی ہوں۔

میں نے سانس لینے کے لیے ایک لمحاتی وقفہ کیا اور پھر میری زبان چل پڑی۔ انتہائی زہر خند لہجے میں دانت کچکچا کر بولا۔ ”ساری عمر میرے بابا کی دولت کو دیمک کی طرح چاٹتا رہا۔ پھر بھی تیرا پیٹ نہیں بھرا۔ میری ماں کے خون سے ہاتھ رنگے اور ان کے پیسے پر عیاشیاں کرتا رہا۔ اپنے اندھے پن کا ڈھونگ رچا کر ہر ایک سے ہمدردیاں بٹورتا رہا تو انسان کے روپ میں بھیڑیا ہے اگر تیری بیوی صفیہ ہمیں حقیقتِ حال سے باخبر نہیں کرتی تو ہم آج بھی تجھ جیسے فریبی کے جال سے نہیں نکل پاتے۔ صفیہ کے علاوہ بابا کے دوست کا بیٹا کاشان نہ ملا ہوتا تو ہم ابھی بھی تجھے اپنا خیر خواہ ہی سمجھتے اور تو مزید ہمارے خاندان کی جڑیں کھوکھلی کرتا رہتا۔ بابا کے آگے ہمیشہ بھکاری بن کر کھڑا رہتا اور بابا تیری جھولی بھرتے رہتے۔“

شرافت سانپ کی طرح پھنکارا اور غراتے ہوئے بولا۔ ”اب میں سمجھا یہ سب آگ اس ذلیل عورت نے لگائی ہے اور کاشان کمبخت کا حلق تک منہ بھرا تھا مگر ایک بات چیٹ

میں نہ بچا سکا۔ دیکھ لوں گا دونوں کو۔ چھوڑوں گا نہیں کسی قیمت پر۔“

میں نے ایک طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا۔ ”شرافت اب تیرے دن پورے ہو چکے ہیں۔ پولیس سائرن کی آواز سن رہا ہے...... تو میری ماں کا قاتل بھی ہے۔ پھانسی کا تختہ تیرا منتظر ہے۔“

شرافت سمجھ چکا تھا۔ حقیقت سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ اس کی ساری تلملاہٹ رفو چکر ہو گئی تھی۔ سائرن کی آواز سن کر اس پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ معاً اس نے اپنے کمرے کی طرف دوڑ لگائی۔ رفتار اتنی تیز تھی کہ سب پلکیں ہی جھپکاتے رہ گئے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ہوش اس وقت آیا جب حویلی میں فائر کی آواز گونجی۔ اسی لمحے پولیس بھی حویلی میں داخل ہو چکی تھی۔ سب شرافت کی خون آلود لاش کو گھیرے کھڑے تھے۔ میں نے نہایت مدھم اور اداس لہجے میں الم ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انسپکٹر آپ کا منصوبہ جامع اور مکمل تھا۔ اس نے بغیر کسی پس و پیش کے اپنا ہر جرم قبول کر لیا۔“

انسپکٹر نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواباً کہا۔ ”یہ گیم نہ کھیلتے تو یہ بلف ماسٹر کوئی اور چال چل جاتا۔“

ابو کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

ربیعہ باقاعدہ ابو کے سینے سے لگی زار و قطار رو رہی تھی۔ شرافت کا سرخ سرخ خون دیکھ کر وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

ابو نے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”کاش میں اسے اپنے گھر لانے کی غلطی نہ کرتا یا کبھی اپنی بیوی کے مشورے پر کان دھرتا تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔ ربیعہ میری بچی لمحے خطا کرتے ہیں اور صدیاں سزا پاتی ہیں۔ محض اس شخص کی وجہ سے میری دکھ سکھ کی ساتھی وقت سے پہلے چلی گئی۔ محض اس کی وجہ سے میرا بیٹا مجھ سے برسوں جدا رہا۔ اس کا خود کا انجام بھی اتنا دردناک ہوا کہ کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔“

انسپکٹر نے ایک اہلکار کو اشارے سے کہا کہ لاش پر چادر ڈال دی جائے اور پھر باہر نکلتے ہوئے اس نے ابو سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”مرزا صاحب اگر اس کا یہ انجام نہ ہوتا تو یہ کبھی بھی دندناتا پھرتا بلکہ آپ کی آنے والی نسلوں سے بھی اس حویلی میں جینے کا حق چھین لیتا۔ ماحول انتہائی سوگوار اور غمزدہ تھا۔“

تصویر

محترم مدیر سرگزشت

السلام علیکم

میں ایک مصور ہوں۔ شوقیہ مصور جس طرح مصنف الفاظ سے کہانی ابھارتا ہے۔ اسی طرح میں بھی رنگوں سے خیالات ابھارتا ہوں۔ ہر مصور کا ایک مخصوص اندازِ فکر ہوتا ہے خود میری بھی اپنی فکری اڑان ہے لیکن میرے رابطے میں ایک ایسا مصور بھی آیا تھا جو ذہنی کج روی کا شکار تھا۔ اسی کی وجہ سے آج میں خوشیوں بھری زندگی گزار رہا ہوں۔ اگر میری سرگزشت پسند آجائے تو پلیز اس پر میرا نام نہیں ڈالیں گے۔

سلیم خورشید

(کراچی)

بہت اچھی لڑکی تھی۔ بہت خوب صورت۔ دمکتا ہوا رنگ، لمبے بال، خوب صورت تراشے ہوئے ہونٹ لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی اداسی تھی۔ ایک خوف تھا۔ وہ اس طرح سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی جیسے شیشے کے جار میں بند ہو اور اسے یہ خدشہ ہو کہ اس کی کسی حرکت سے وہ جار ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

میں اس دفتر میں کسی کنٹریکٹ کے سلسلے میں گیا تھا۔ وہ دفتر کسی زمانے میں شپنگ کمپنی کا تھا لیکن ایک

لاجسٹک سروس کے لیے رہ گیا تھا۔ بیرونِ ملک سے آنے والے کارگو کو اندرون ملک پہنچانے کا کام ہوتا تھا۔

ہاکس بے کی اس پرانی خستہ عمارت پر آسیب زدہ ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ لکڑی کی بوسیدہ سیڑھیاں تھیں جن سے ہوتے ہوئے پہلی منزل پھر دوسری منزل پر جایا جاسکتا تھا۔ صرف دو ہی منزلیں تھیں۔ میں جس دفتر میں گیا تھا۔ وہ دوسری منزل پر تھا۔ زیادہ تر دفاتر بند پڑے ہوئے تھے۔ اس جگہ کی ویرانی ہی ایک خاص تاثر دے رہی تھی۔

اس دفتر میں داخل ہوتے ہی دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں نے مجھے باندھ کر رکھ دیا۔ یہ کسی باکمال مصور کے ہاتھ کی بنائی ہوئی پینٹنگز تھیں۔ میں چونکہ خود بھی ایک آرٹسٹ ہوں اس لیے اندازہ ہوسکتا تھا کہ ان تصویروں کو بنانے والا اپنے فن کا ماہر ہوگا لیکن ان تصویروں کا تاثر بہت عجیب تھا۔

یہ تصویریں اُمید اور خوشی دلاتی ہوئی نہیں تھیں بلکہ مایوس اور خوفزدہ کرتی ہوئی تصویریں تھیں۔ ایک تصویر ایسی تھی جس میں ایک خوب صورت لڑکی کسی چیز کو دیکھ کر بری طرح ڈر گئی تھی۔ خوف کے تاثرات اس کے چہرے پر جم گئے تھے۔

ایک دوسری تصویر ایک خوب صورت تتلی کی تھی۔ اس تتلی کو باریک سوئی میں پرو دیا گیا تھا۔ وہ پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس کی پھڑپھڑاہٹ کو اس تصویر میں واضح کردیا گیا تھا۔

ایک تصویر ایک کوے کی تھی جس کی گردن کاٹ دی گئی تھی۔ اس کے بے جان دھڑ کے پاس اس کی کٹی ہوئی گردن بھی پڑی ہوئی تھی۔

خدا کی پناہ وہ ساری تصویریں خوفزدہ کرنے والی اور کراہیت کا احساس دلاتی ہوئی تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان تصویروں کو بنانے والے نے کمال کر دکھایا تھا۔

رنگوں کا امتزاج، برش کی موومنٹ یہ سب کمال کی تھیں۔ نہ جانے کون تھا جس نے ایسے شاہکار تخلیق کر کے اس گمنام مقام پر رکھ دیے تھے۔

اس دفتر میں اس وقت صرف تین آدمی تھے۔ دو تو اس دفتر ہی کی طرح بوڑھے تھے جو اس دفتر سے ہم آہنگ دکھائی دے رہے تھے۔ البتہ تیسری ایک جوان اور خوب صورت لڑکی تھی۔

میں ایک بوڑھے کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”جی فرمایئے۔“

میں نے فائل اس کی طرف بڑھا دی۔ ”میں اسٹار برادرز کی طرف سے آیا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”کارگو ہینڈلنگ کا معاملہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”وہ سامنے مس رخشندہ بیٹھی ہیں ان کے پاس چلے جائیں۔“ اس نے ایک کونے کی میز پر بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

میں اس میز کی طرف آگیا اور قریب آکر اندازہ ہوا کہ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی لیکن اس کا حسن خوفزدہ سا تھا۔ جس طرح سہمی ہوئی ہرنی ہوا کرتی ہے۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں اداسیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ یہ سب کچھ معلوم ہونے کے لیے کسی طویل عرصے کی ضرورت نہیں تھی۔ بس پہلی نظر میں ان باتوں کا اندازہ ہوگیا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے فائل اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے فائل دیکھ کر ایک کاغذ پر نوٹ لکھ کر میری طرف بڑھا دیے۔

بظاہر تو میرا کام وہاں زیادہ دیر کا نہیں تھا لیکن میں بہت زیادہ دیر تک اس کو دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ بہرحال اس دن میں اپنا کام کروا کے واپس آگیا۔

اس کے بعد اگرچہ میں اپنے کاموں میں الجھا رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ لڑکی میرے ذہن سے محو نہیں ہوسکی تھی۔ خاص طور پر اس کی اداس اور خوفزدہ آنکھیں مجھے یاد آتی رہی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد ایک شام میں یوں ہی بغیر کسی کام کے اس دفتر میں پہنچ گیا۔ وہ لڑکی اپنی سیٹ پر موجود تھی۔ کسی اور کے پاس جانے کی بجائے میں سیدھا اس کے پاس گیا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ چونک گئی۔ ”جناب! پھر کوئی پرابلم ہو گئی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس پرابلم کا تعلق کسی دفتری معاملے سے کم نہیں ہے۔“

”تو پھر؟“

”اگر آپ کی اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔“

”ہاں ہاں ضرور۔“

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جی فرمائیں کیا پرابلم ہے؟“

"بس پرابلم یہ ہے کہ میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اتنی اداس اور خوف زدہ آنکھیں نہیں دیکھیں۔" میں نے کہا۔ "جیسی آپ کی ہیں۔ بس یہ میری پرابلم ہے۔"

میں اتنا کہہ کر کرسی سے کھڑا ہوا اور اس کے ردِعمل کا انتظار کیے بغیر اس دفتر سے باہر آگیا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے اسے ہیجان میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ سوچ رہی ہوگی، الجھ رہی ہوگی، میرے رویے پر غور کر رہی ہوگی۔ بے چین ہوگی کہ آخر ایک شخص اسے ایسا بول کر کیوں چلا گیا۔

میں نے یہ پتھر اس جھیل میں اس لیے پھینکا تھا کہ وہ الجھن میں مبتلا ہو جائے۔ کھٹکنے والے ہی یاد رہتے ہیں ورنہ عام رویہ تو فراموش کر دیا جاتا ہے۔

اور میں جانتا تھا کہ میرا یہ رویہ اس کے لیے فراموش کرنے والا نہیں تھا۔ وہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتی۔

دو دنوں کے بعد میں پھر وہاں پہنچ گیا لیکن اس بار میں اس دفتر میں نہیں گیا تھا بلکہ اپنی گاڑی میں نے دفتر سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی تھی۔

مجھے یہ اندازہ تھا کہ شام کو پانچ بجے کے بعد وہ دفتر سے نکلتی ہوگی اور میں اس کا تعاقب کروں گا۔ دیکھوں کہ وہ کہاں رہتی ہے۔

یہ ایک نامناسب سی بات تھی۔ میرا اس سے تعلق کیا تھا، کچھ بھی نہیں۔ خود میں ایک اچھا خاصا مہذب انسان تھا۔ معاشرے میں میری عزت بھی تھی۔ اس کے باوجود میں اس قسم کی حرکت کر رہا تھا۔

اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس لڑکی کی آنکھوں کی غیر فطری اداسی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ آخر کیوں! ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے اس کی آنکھوں کی اداسی کوئی خاص معنی نہ رکھتی ہو۔ اداسی تو اداسی ہوتی ہے لیکن یہ غیر فطری اداسی کا احساس بہت کم لوگ کر سکتے ہیں اور میں ان میں سے ایک تھا۔

ٹھیک سوا پانچ بجے وہ اس خستہ حال بلڈنگ کے گیٹ سے باہر نکل آئی۔ وہ اکیلی ہی تھی۔ اس نے ایک طرف چلنا شروع کیا۔ میں کچھ مناسب فاصلے سے اس کا تعاقب کرنے لگا۔

پہلے تو میرا ارادہ یہ تھا کہ میں صرف اس کا تعاقب کر کے اس کا گھر معلوم کرلوں گا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اس سے مراسم بڑھاتا رہوں گا۔

لیکن پھر یہ خیال بھی تھا کہ اس نے اگر کوئی سواری لی اور میں اس کا تعاقب نہ کر پایا تو ایک دن ضائع ہو جائے گا۔

اس لیے میں نے اپنی گاڑی کی رفتار تیز کی اور اس کے برابر سے گزرتا ہوا کچھ آگے جا کر اس طرح بریک لگایا جیسے اتفاقاً اس پر نظر پڑ گئی ہو۔ پھر گاڑی کو ریورس کرتا ہوا اس کے پاس لے آیا۔

وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے گاڑی سے بیچ کو نکل جانا چاہا لیکن میں گاڑی سے اتر آیا تھا۔ ''معاف کیجیے۔ آپ وہی ہیں نا جو لاجسٹک کے دفتر میں کام کرتی ہیں؟''

''جی ہاں، میں وہی ہوں۔''

''نام بھی یاد آ گیا آپ کا شاید رخشندہ نام ہے۔''

''جی ہاں لیکن آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''معاف کیجیے گا۔ میں اس دن آپ سے نہ جانے کیا بول کر آ گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''آج میں معذرت کرنے کے لیے اس طرف آیا تھا لیکن دیر ہو گئی۔ آپ کو مخالف سمت میں جاتا ہوا دیکھا تو سمجھ گیا کہ آپ دفتر سے واپس جا رہی ہیں لہٰذا گاڑی ریورس کر کے آپ کے پاس آ گیا ہوں۔''

''آپ نے واقعی مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ بیٹھ جائیں۔'' میں نے آفر کردی۔ ''کہاں رہتی ہیں آپ؟ میں آپ کو ڈراپ کردوں گا۔''

''میں گلبرگ میں رہتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

گلبرگ کراچی کا ایک متوسط طبقے کی آبادی والا علاقہ ہے۔ ہاکس بے سے اس کا بہت زیادہ فاصلہ ہے۔ وہاں تک آنا جانا کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔

''کوئی بات نہیں۔ میں گلشن میں رہتا ہوں۔ وہی راستہ ہے۔ میں آپ کو وہاں چھوڑتا ہوا آگے چلا جاؤں گا۔''

وہ جھجکتی رہی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے لیکن آپ کو زحمت ہو گی۔''

''جی نہیں۔ مجھے کوئی زحمت نہیں ہو گی۔'' میں نے کہا۔

وہ اگلی سیٹ پر ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ بہت فاصلہ تھا ہاکس بے سے گلبرگ تک کا۔ راستے میں اس کے بارے میں معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔

''آپ اتنی دور کس طرح آتی جاتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بسوں کے ذریعے۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک بس کے ذریعے ٹاور اور دوسری بس سے گلبرگ۔ پھر اسی طرح گلبرگ سے یہاں تک آتی ہوں۔''

''واقعی بہت طویل سفر کرتی ہیں آپ۔'' میں نے اس کے حوصلے کی داد دی۔

''جی ہاں، زندگی میں سفر کرنا کبھی کبھی واقعی بہت طویل ہو جاتا ہے۔''

ہم چلتے رہے۔ پھر میں نے اس کی اجازت کے بغیر ایک ریسٹوران کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہ چونک اٹھی۔ ''یہ کیا آپ کہاں رک گئے؟'' اس نے پوچھا۔

''جہاں آپ نے مجھ پر اتنا بھروسا کرلیا ہے وہاں کچھ اور سہی۔'' میں نے کہا۔ ''ہم بس یہاں سے چائے پی کر آگے چل دیں گے۔ آجائیں۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ ہم اس ریسٹوران کے ایک پُرسکون گوشے میں آ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے چائے اور سینڈوچز کا آرڈر دے دیا تھا۔

''اب میں آپ سے ایک بات کہوں؟''

''جی فرمائیں۔'' اس نے کہا۔

''جب میں آپ کے دفتر میں داخل ہوا تو دو ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے مجھے باندھ کر رکھ دیا تھا۔''

''کون سی دو چیزیں۔''

''ایک تو دفتر کی دیواروں پر لگی ہوئی حیرت انگیز پینٹنگز۔'' میں نے بتایا۔ ''دوسرا آپ کی آنکھوں کی اَن نیچرل اداسی۔ ان دونوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں آپ سے اس کا راز جان سکوں۔ ظاہر ہے کہ پینٹنگز کا راز تو شاید آپ نہ بتا سکیں لیکن اپنی اداسی کا راز سوائے آپ کے اور کون بتا سکتا ہے۔''

بہت دیر تک سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ''معاف کیجیے گا میں نے اس دن آپ کا نام نہیں معلوم کیا تھا۔''

''میرا نام فیصل حیات ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اور آپ رخشندہ ہیں۔ آپ کا نام مجھے آپ کے دفتر ہی سے معلوم ہوا ہے۔''

''جی ہاں۔'' اس کے ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ''فیصل صاحب! اب میں آپ سے اگر یہ

کہوں کہ مجھے ان پینٹنگز کا بھی راز معلوم ہے تو پھر؟‘‘
’’کیا!‘‘ میں چونک اٹھا تھا۔ ’’آپ جانتی ہیں؟‘‘
’’ہاں میں جانتی ہوں۔ مصور کو بھی اور ان تصویروں کے پس منظر کو بھی۔‘‘ اس نے کہا۔
’’خدا کے لیے بتایئے مجھے کیونکہ ان تصویروں کی نوعیت میرے لیے بالکل فنی ہے۔‘‘
’’وہ تصویریں میرے دفتر کے باس سہام صاحب نے بنائی ہیں۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’سہام صاحب ایسی ہی تصویریں بناتے ہیں اور اس کے علاوہ اور کچھ بنا بھی نہیں سکتے۔‘‘
’’میرے خدا۔ کیسا آدمی ہے وہ۔‘‘
’’وہ۔‘‘ رخشندہ پھٹ پڑی تھی۔ ’’میں بتاؤں وہ کیسا آدمی ہے کیسا آدمی ہے وہ۔‘‘
☆......☆
رخشندہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔
’’بہت پرانی داستان ہے۔ خوف سے گندھی ہوئی۔ اعصاب کو شکستہ کر دینے والی۔ سہام میرے ابو کا بھی باس تھا۔ ابو اس کے دفتر میں کام کرتے تھے۔ پہلے سہام کا دفتر صدر میں تھا اور اس کا شعبہ بھی کچھ اور تھا۔ لاجسٹک کا کام اس نے بعد میں شروع کیا ہے۔‘‘
ابو اس کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ’’بیٹا ہمارا باس سہام بہت عجیب آدمی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اس سے ڈر لگنے لگتا ہے۔‘‘
’’وہ کیوں ابو؟‘‘
’’وہ ایک آرٹسٹ ہے۔ تصویریں بناتا ہے۔‘‘
’’ارے یہ تو بہت زبردست بات ہے۔ تصویریں بنانے والے تو بہت کمال کے لوگ ہوتے ہیں۔‘‘
’’لیکن وہ بہت بھیانک تصویریں بناتا ہے۔‘‘ ابو بتایا کرتے۔ ’’لٹکتی ہوئی لاشوں کی۔ دم توڑتے جانوروں اور انسانوں کی۔ درد سے کراہتی عورتوں کی۔ اس کی تصویریں دیکھ دیکھ کر ابکائی آنے لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے اندر کوئی شیطان اتر آیا ہو۔ ہم لوگوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی ہے۔ بہت بے رحمانہ۔ انتہائی سخت۔ پتا نہیں کیا بات ہے اسے انسانوں کو تکلیف میں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔‘‘
’’ایسا کیسے ہوسکتا ہے ابو۔ انسان کسی کو اذیت میں دیکھ کر خوش کیسے ہوسکتا ہے۔‘‘
’’لیکن سہام ایسا ہی ہے بیٹا۔ میری تو خدا سے دعا ہے کہ مجھے کوئی دوسری اچھی نوکری مل جائے تو میں یہ نوکری چھوڑ دوں لیکن کیا کروں نوکریاں ملتی کہاں ہیں۔‘‘
ابو چاہتے تھے کہ وہ سہام کی نوکری چھوڑ دیں لیکن قسمت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابو بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ ان کی چہیتی بیٹی ہی سہام کے چکر میں پھنس جائے گی۔
ایک بار ہوا یہ کہ مجھے کسی کام سے ابو کے دفتر جانا پڑ گیا۔ حالانکہ میں وہاں کبھی نہیں گئی تھی لیکن ایمرجنسی ایسی تھی کہ مجھے ان کے پاس جانا پڑ گیا اور اس دن سے میری بدقسمتی کا آغاز ہوگیا۔
میں ابو کی میز کے پاس کرسی پر بیٹھی تھی۔ ابو شاید کوئی فائل دیکھ رہے تھے کہ کسی کو دیکھ کر اچانک کھڑے ہوگئے۔
وہ سہام تھا، ان کا باس۔ جو کسی کام سے اپنے کمرے سے نکل کر بڑے کمرے میں آیا تھا اور مجھے دیکھ کر ابو کی میز کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تھا۔
سچ یہ ہے کہ میں اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی تھی۔ کیا شکل تھی اس کی طوطے کی طرح ناک، چھوٹی چھوٹی انتہائی چمکدار بدن میں اتر جانے والی آنکھیں، گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں۔ آپ بھی اسے دیکھ کر خوفزدہ ہو جائیں اور آواز...... سرسراتی ہوئی آواز۔
’’مسٹر حکیم۔‘‘ سہام نے ابو کو مخاطب کیا۔ ’’کون ہے یہ لڑکی؟‘‘
’’میری بیٹی ہے سر۔‘‘ ابو نے بتایا۔ ’’ایک کام سے میرے پاس آئی ہے۔‘‘
’’ہوں۔‘‘ اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر میری طرف دیکھا۔ ’’نام کیا ہے تمہارا؟‘‘
’’رخشندہ۔‘‘ میں نے بتایا۔
’’دیکھو اگر تم بھی یہاں جاب کرنا چاہتی ہو تو آجانا۔ اس دفتر کے دروازے تمہارے لیے کھلے ہوئے ہیں۔‘‘
اتنا کہہ کر وہ اندر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ابو کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔
’’بیٹا! اب تم دوبارہ یہاں نہیں آنا۔‘‘ ابو نے اس کے جانے کے بعد کہا۔
’’ابو یہ تو بالکل شیطان جیسا ہے۔‘‘
’’ہاں بیٹا یہ ایسا ہی ہے۔ بس اب تم جاؤ۔‘‘
میں ابو سے کچھ پیسے لینے گئی تھی۔ انہوں نے مجھے پیسے دیئے اور میں وہاں سے چلی آئی۔

رخشندہ کی یہ ساری کہانی ایک نشست کی نہیں تھی۔ بلکہ اس نے کئی ملاقاتوں میں سنائی تھی اور ہر ملاقات کے بعد ہم ایک دوسرے سے قریب آتے چلے گئے۔

وہ ہر لحاظ سے ایک اچھی لڑکی تھی۔ یعنی ایسی کہ اس کے ساتھ زندگی آرام سے گزاری جاسکتی تھی۔ اس لیے اس نے بھی مجھے اپنے بارے میں بتانا شروع کردیا تھا۔

اس نے کہا۔ میں ابو کے باس سے خوفزدہ ہوگئی تھی۔ اس کی صورت خواب میں آکر پریشان کیا کرتی۔ بہرحال اس دن کے بعد سے میں پھر اس کے دفتر نہیں گئی۔

''اور اب تم اس کے دفتر میں کام کرنے لگی ہو۔''

''ہاں یہ بھی قسمت کا تماشا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کون جانے وقت کہاں اور کس انداز سے گھیر کر کس کو کہاں لے جاتا ہے۔''

''کیا تمہارے گھر میں تمہارے اور تمہارے ابو کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کوئی نہیں، سوائے ماں کے۔ یعنی ہم کل تین افراد تھے۔ میں، ابو اور امی۔ پھر یہ ہوا کہ ابو کا انتقال ہوگیا۔ بیمار تو وہ تھے لیکن اب ان کی بیماری زور پکڑنے لگی تھی۔ اس عالم میں انہوں نے اپنے دفتر سے دو تین لاکھ روپے اپنے علاج کے لیے قرض لیے تھے۔ وہ سب ان کے علاج پر خرچ ہوگئے اور حاصل بھی کچھ نہیں ہوا، ان کا انتقال ہوگیا اور ہمارے لیے زندگی دشوار ہوتی چلی گئی۔ امی نے سلائی کڑھائی کا کام شروع کردیا تھا لیکن اس سے کیا بنتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔''

''پھر ایک دن وہ منحوس شخص ہمارے یہاں آگیا۔''

''تمہارے گھر آگیا؟''

''ہاں گھر ہی سمجھ لیں۔ اس کے ڈرائیور نے آکر بتایا کہ صاحب گلی کے کونے پر اپنی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ ہم ماں بیٹی پریشان ہوگئیں۔ ہمیں یہ معلوم تھا کہ ابو نے دفتر سے قرض لے رکھا تھا۔ بہرحال میں اور امی دونوں ہی ڈرائیور کے ساتھ اس کی گاڑی تک آگئے۔''

وہ گاڑی سے اتر کر بہت تپاک کے ساتھ ہم سے ملا اور اس بات کی معذرت کی کہ وہ میرے ابو کی وفات پر تعزیت کے لیے نہیں آسکا تھا کیونکہ وہ کہیں اور تھا۔

پھر اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ میرے دفتر کے دروازے کھلے ہوئے ہیں تم جاب کرنا چاہتی ہو تو آجاؤ۔ اس کے علاوہ تم لوگ ان پیسوں کی بھی فکر مت کرو جو تمہارے ابو نے دفتر سے قرض کے طور پر لیے تھے۔ بھول جاؤ ان کو۔ اور دفتر آجاؤ۔''

وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا۔ اس کے بعد امی اس کے گن گانے لگیں۔ ''بیٹا! اس بے چارے کی صورت ایسی ہے تو وہ کیا کرے۔ کتنا مہربان آدمی ہے۔ اس نے دو تین لاکھ روپے معاف کردیے اور تمہیں کام کے لیے بلا رہا ہے۔''

''لیکن امی مجھے اس آدمی سے ڈر لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ارے بیٹا اس میں ڈر کی کیا بات ہے۔ وہ انسان ہی ہے، تمہارے ابو نے اس کے یہاں برسوں کام کیا ہے۔ وہ ضرور تمہارا خیال رکھے گا۔''

بہرحال ہوا یہ کہ میں نے اس دفتر میں جاب شروع کردی۔

''کیا تمہیں معلوم تھا کہ وہ ایک مصور ہے اور اس قسم کی تصویریں بنایا کرتا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں میں نہیں جانتی تھی۔ کیونکہ ابو کے زمانے تک اس کی پینٹنگز دفتر میں نہیں لگی تھیں۔ یہ پینٹنگز تو موجودہ دفتر میں لگی ہیں۔ ہاں میں نے جب اس کا دفتر جوائن کیا تو اس کے ایک مہینے بعد ہی وہ ہاکس بے شفٹ ہوگیا تھا۔''

''یعنی موجودہ دفتر میں؟''

''ہاں اور یہ پینٹنگز تب لگائی گئی تھیں۔'' رخشندہ نے بتایا۔ ''میں ان تصویروں کو دیکھ دیکھ کر خوف زدہ رہا کرتی۔ خدا کی پناہ کیسی اذیت ناک تصویریں ہیں۔ اس وقت تک مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ایسی تصویریں بنانے والا کون ہے۔ اس دوران سہام کا رویہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔ بہت نرم لہجے میں گفتگو کیا کرتا۔ آہستہ آہستہ اس کی شخصیت کا خوفناک تاثر ختم ہونے لگا تھا۔ میں یہ سوچنے لگی تھی کہ جب اس بے چارے کی صورت ہی ایسی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔''

ایک دن اس نے اپنے کمرے میں بلا کر مجھ سے کہا۔

''رخشندہ کیا تم میرا ایک کام کردو گی؟''

''یس سر، فرمائیں۔''

''کیا تم میری ماڈل بننا پسند کرو گی۔''

''آپ کی ماڈل؟''

''ہاں...... اوہ شاید تم کو یہ نہیں معلوم کہ میں ایک آرٹسٹ ہوں۔ تم نے دفتر میں جتنی تصویریں دیکھی ہیں وہ سب میری بنائی ہوئی ہیں۔''

"آپ کی؟" اس انکشاف نے مجھے چکرا دیا تھا۔

"ہاں سب میری ہیں۔" وہ فخریہ طور پر بولا۔ "یہ کوئی عام پینٹنگز نہیں ہیں۔ ان کو بنانے کے لیے مجھے بہت محنت کرنی پڑی ہے۔ کیا تم اس بات کا اعتراف نہیں کرو گی کہ میری تصویریں فن کا شاہکار ہیں۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں ہے سر۔ لیکن یہ کیسی تصویریں ہیں۔ دکھ دیتی ہوئی۔" میں نے کہا۔

"یہی تو میرا سبجیکٹ ہے۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "کرب، اذیت، دکھ، درد، تڑپتے اور سسکتے ہوئے لوگ۔ لٹکتی ہوئی لاشیں ایسی جن کو دیکھ کر غشی آجائے۔ یہی میرا کمال ہے۔"

"بہت ہی عجیب ہے سر۔"

"اپنی اپنی فیلڈ کی بات ہوتی ہے۔ میری فیلڈ ہی یہی ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن اب میں اپنے پیٹرن کو بدلنا چاہتا ہوں۔ کسی اور سبجیکٹ پر کام کرنا چاہتا ہوں۔"

"اور وہ کون سا ہے؟"

"اب میں خوب صورتی کو پینٹ کرنے کا سوچ رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "خوش رنگ پھول، رنگ برنگے پرندے اور خوب صورت انسانوں کے خوب صورت چہرے، اس لیے میں نے تمہیں آفر کی ہے کیونکہ تمہارا چہرہ بہت خوب صورت ہے۔"

میں اس کی بات سن کر شرما گئی تھی۔ اس نے کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دی تھی۔

"کیا میری بات بری لگی؟" اس نے پوچھا۔ "یاد رکھو میرا تعلق تمہاری خوب صورتی سے صرف اس قدر ہے کہ میں تمہارے چہرے کو پینٹ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک مصور ہوں اور مصور کی نگاہ سے تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ اب بتاؤ کیا تم میرے لیے ماڈل بنو گی ۔ جب تک میں کام کرتا رہوں گا تمہیں ہزار روپے روز ملیں گے۔"

مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ میرا چہرہ خوب صورت ہے یا وہ مجھے پینٹ کرے گا۔ میری تصویریں بنائے گا۔ بلکہ اب تو اس بات سے دلچسپی ہو گئی تھی کہ ہزار روپے روز کی آمدنی ہو رہی تھی۔ ہمیں تو ہر وقت پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔ اماں کو بیسی ڈالنی تھی۔ انہوں نے کسی سے قرض لے رکھا تھا۔ وہ بھی واپس کرنا تھا۔

غرض یہ کہ اگر دس بارہ دنوں کا بھی کام ہوتا تو دس بارہ ہزار مل جاتے اور ہمارے بہت سے کام نکل آتے۔

لیکن اماں۔

یہ مشکل بھی اس نے خود ہی حل کر دی۔ جیسے میرے ذہن کو پڑھ لیا ہو۔ "رخشندہ میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈال رہا۔ تم اپنی امی سے بات کر لو اگر وہ ہاں کر دیتی ہیں تو پھر تم پر کام شروع کر دوں گا۔"

میں نے امی سے بات کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ میرا اس کے یہاں اس طرح کا کام کرنے کو دل نہیں چاہ رہا لیکن معاملہ ایک ہزار روز کا تھا۔ اپنی پریشانیوں کا تھا۔ بجلی اور گیس کے بلوں کا تھا۔ راشن کا تھا۔ ہزاروں مسائل تھے۔ پھر امی کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ ان کی دوائیں بھی آیا کرتیں۔ لہٰذا نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس کے پاس جانا پڑا۔

اس کے گھر میں بھی ایسی تصویریں بھری ہوئی تھیں۔ اذیت ناک تصویریں۔ کراہیت دلاتی ہوئی، خوف دلاتی ہوئیں۔

شروع شروع میں تو کچھ نہیں ہوا۔ وہ مجھے اسٹول پر بٹھا کر میری تصویریں بناتا رہا۔ پھر ایک دن یہ ہوا کہ شیشے کے ایک ٹکڑے سے میرا انگوٹھا زخمی ہو گیا۔ لگتا ہے کہ شیشے کا وہ ٹکڑا اس خبیث نے جان بوجھ کر ایسی جگہ رکھا تھا کہ میں اس سے زخمی ہو جاؤں۔

"کیا تم دفتر نہیں جایا کرتی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"دفتر بھی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ گاڑی میں اپنے گھر لے آتا۔ پھر خود ہی میرے گھر پہنچا دیتا۔ خیر جب انگوٹھا زخمی ہوا اور میں درد سے چلّانے لگی تو اس وقت اس کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے بجائے مرہم پٹی کا بندوبست کرنے کے اپنے کیمرے سے دھڑا دھڑ میرے چہرے کی تصویریں لے لیں۔ اس کے بعد پھر مرہم پٹی کا سامان لا کر دیا۔"

"وہ کیوں؟"

"تاکہ وہ میرے چہرے کے کرب کو پینٹ کر سکے۔" رخشندہ نے بتایا۔ "وہ دوسروں کو اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے اور ان کی تصویریں بناتا ہے۔ دکھ اور درد کی تصویریں۔ کراہتے ہوئے لوگوں کی تصویریں۔ چھپکلی کو پکڑ کر اس کے ٹکڑے کر کے تڑپنے کا تماشا دیکھتا اور تصویریں بناتا ہے۔"

"خدا کی پناہ، تم کو تو اس موذی کے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے تھا۔"

''میں تو بھی چاہتی تھی لیکن مجبور ہو کر رہ گئی تھی۔ اس دوران اس نے مختلف بہانوں سے امی کو اپنی طرف سے ایک لاکھ روپے دیے تھے کہ وہ اپنا علاج کروائیں۔ ہم سب اس کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے اور آج بھی ہیں۔ حالانکہ وہ شیطان ہے۔''

''میں اس کا نیچر سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ایسے لوگوں کو اذیت پسند کہتے ہیں Sadist، ایسے لوگ دوسروں کو دکھ پہنچا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لذت ملتی ہے ان کو اور یہ شخص اتفاق سے مصور بھی ہے اس لیے وہ ایسی لذتوں کی تصویریں بنا لیتا ہے۔''

''ایک بار تو اس نے انتہا کر دی۔ میرا سر پھاڑ دیا تھا۔'' رخشندہ نے بتایا۔ اس وقت وہ لاشعوری طور پر اپنے سر کو اس طرح ٹٹول رہی تھی جیسے درد محسوس ہو رہا ہو۔

''سر پھاڑ دیا تھا؟''

''ہاں اور وہ بھی پیچھے سے حملہ کر کے۔'' اس نے بتایا۔ ''خدایا کیسی تکلیف تھی۔ کیسا درد تھا اور وہ میری تصویریں لے رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے خود ہی میری مرہم پٹی کی اور مجھ سے معافی مانگ رہا تھا ہاتھ جوڑتا کر، خدا کے لیے مجھے معاف کر دو میں پاگل ہوں۔ نفسیاتی مریض ہوں۔ میرا علاج چل رہا ہے۔ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی پانچ ہزار روپے بھی دیے۔''

''اور تم نے اسے معاف کر دیا؟''

''میں نے نہیں میری مجبوری نے معاف کیا ہے اس کو۔'' اس نے کہا۔ ''میں اور کیا کر سکتی ہوں۔''

''تم اسے چھوڑ بھی تو سکتی ہو۔''

''کیسے چھوڑ دوں۔ ایک تو دوسری نوکری ملنی مشکل ہے پھر اس نے جتنے پیسے دیے ہیں وہ کیسے ادا ہوں گے۔''

''وہ بھی ہو جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''میں دے دوں گا اور نوکری بھی دلا دوں گا۔''

''لیکن کیوں آپ میرے لیے یہ سب کیوں کریں گے۔''

''یہ سب میں تمہارے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''دیکھو رخشندہ شاید تم نے اب تک کی ملاقاتوں میں یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ میں کتنا سیریس ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ تمہارے لیے۔ تم میرے لیے ناگزیر ہو گئی ہو۔ میں

شیر خاں کیپٹن کرنل، شہید

(1980-1999)

نشان حیدر کے اعزاز یافتہ۔ انہیں سندھ رجمنٹ کی ایک بٹالین میں کمیشن ملا اور وہ لائن آف کنٹرول پر اپنے عسکری فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے اس دوران دشمن کی صفوں کے اندر جا کر کئی حملے کیے، نیز دشمن کے کئی حملوں کو پسپا بھی کیا۔ 1999ء میں کارگل میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے شہید ہوگئے۔ حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں پاکستان کا سب سے بڑا جنگی اعزاز نشان حیدر عطا کیا۔ وہ تو اکلی صوابی کے باشندے تھے۔ شہادت کے بعد ان کے آبائی گاؤں میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مرسلہ: زاہد گل، صوابی

تمہارے بغیر ہو سکتا ہے زندگی گزارے جاؤں لیکن میری زندگی بہت اداس اور ادھوری گزرے گی۔''

اور پہلی بار بالکل پہلی بار میں نے اس کی اداس آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھی۔ وہ ہونٹ جو مسکراہٹ سے آشنا نہیں تھے شاید پہلی بار مسکرا دیے تھے۔

میں نے نرمی سے اس کا ہاتھ چھو لیا۔ ''اب یہ بتاؤ کیا میں تمہیں قبول ہوں؟''

اس نے میری طرف دیکھا اور گردن جھکا لی۔ ''اگر قبول نہیں ہوتے تو میں کیوں آپ سے ملا کرتی۔''

''بس اب تو بات کنفرم ہو گئی۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم مجھے اپنے باس سے ملواؤ۔''

''وہ کیوں؟''

''تم ملواؤ تو سہی۔ میں اس سے تمہارے کرب اور تمہاری اذیت کا حساب لینا چاہتا ہوں۔''

وہ اس پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے راضی کر ہی لیا تھا۔

دوسرے ہی دن میں اس کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ اس وقت اپنی سیٹ پر تھی۔ میں کسی اور کی طرف توجہ دیے بغیر اس کے پاس پہنچ گیا۔

"باس کمرے میں اکیلا ہی ہے۔" اس نے بتایا۔

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔" میں نے کہا۔

"لیکن......میرا خیال ہے کہ......"

"اوہو جھجکنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تم میرے ساتھ آؤ۔"

میں اس کے باس کو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

وہ واقعی ایک شیطان صورت انسان تھا۔ اس کے دل کی شقاوت اور سختی اس کے چہرے سے نمایاں تھی۔ ایسے مکروہ چہرے بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

اس نے ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر حیرت ظاہر کی تھی۔

"سہام صاحب! میں رخشندہ کا منگیتر ہوں۔" میں نے بتایا۔ "بہت جلد ہم دونوں کی شادی ہونے والی ہے۔"

"کیا!" اس کو جیسے جھٹکا لگا تھا۔ "رخشندہ میں یہ کیا سن رہا ہوں؟"

"جی سر! یہ میرے منگیتر ہیں اور اگلے مہینے ہم دونوں شادی کر رہے ہیں۔"

"سہام صاحب! میں ذاتی طور پر آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "انکل کی موت کے بعد جس طرح آپ نے اس کا خیال رکھا، اپنے دفتر میں جگہ دی اس کا شکریہ اور آپ نے اب تک نقد رقم سے جو مدد کی ہے وہ میں ہزار شکریوں کے ساتھ واپس کرنے آیا ہوں۔ رخشندہ یہ بتا رہی تھی کہ اب تک آپ تین لاکھ روپوں تک کی مدد کر چکے ہیں۔ تو میں تین لاکھ کا چیک لیتا آیا ہوں۔ رخشندہ کو اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کریں۔ کیونکہ اب یہ نئی زندگی شروع کرنے جا رہی ہے۔"

میں نے چیک نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے قابل تھے۔ انتہائی شدید نفرت، غصہ، بے بسی اور نہ جانے کیا کیا تھا اس چہرے پر۔

ایک تو ویسے ہی اس کا چہرہ مسخ شدہ تھا اب اور بھی زیادہ تھا۔ یہی موقع تھا جب مجھے اپنا آخری تیر اس کی طرف پھینکنا تھا۔ میں نے پھرتی سے اپنی جیب سے اپنا موبائل نکال کر جلدی جلدی اس کی تصویریں لے لیں۔

وہ کچھ دیر تک ہکا بکا سا رہا۔ پھر دہاڑنے لگا۔ "کیا بکواس ہے؟ کیا بدتمیزی ہے یہ۔ تم نے میری تصویریں کیوں لیں۔"

"جناب میں بھی ایک مصور ہوں۔ اب میں آپ کے چہرے پر جو نفرت اور غصے کے تاثرات آ گئے ہیں ان کو پینٹ کروں گا۔ میں بھی آپ ہی کی برادری سے تعلق رکھتا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ آپ درد اور اذیت کو پینٹ کرتے ہیں، میں نفرت اور غصے کو پینٹ کرتا ہوں۔ بہت بہت شکریہ آپ کا کہ آپ نے مجھے اتنا اچھا موقع دے دیا۔ آؤ رخشندہ تمہارا حساب کسی حد تک برابر ہو گیا ہے۔"

وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کی حیرت کا یہ عالم تھا کہ وہ آواز دے کر اپنے اسٹاف کو بھی نہیں بلا سکا تھا تاکہ مجھ سے میرا موبائل لے سکے۔

ہم باہر آ گئے۔ رخشندہ بہت خوش تھی۔ اتنی اداس لڑکی کو اچانک اتنی خوشی اور اتنی قیمت مل گئی تھی۔ وہ ہنس رہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھ سے لپٹ جاتی۔

رخشندہ اب میری بیوی ہے۔ اس کی ماں نے بھی بہت پیار اور کھلے دل سے مجھے قبول کر لیا ہے۔ ہاں شادی کے کچھ دنوں کے بعد جب میں نے اپنے بند اسٹوڈیو سے اپنا ایزل، برش اور رنگ وغیرہ باہر نکالے تو وہ بری طرح کانپ گئی۔

"یہ......یہ کیا۔" وہ پریشان ہو کر بولی۔

"میری پینٹنگز کا سامان۔" میں نے کہا۔ "میں نے شاید تمہیں نہیں بتایا تھا کہ میں بھی ایک آرٹسٹ ہوں۔ اس لیے میں نے تمہاری آنکھوں کی اداسی بھانپ لی تھی۔ اب تم سامنے بیٹھ جاؤ۔"

"نہیں خدا کے لیے یہ سب نہ کرو۔" وہ دہشت زدہ ہو گئی تھی۔

"بے وقوف لڑکی میں دہشت، خوف اور دکھوں کو پینٹ نہیں کرتا۔ خوب صورتی اور معصومیت کو پینٹ کرتا ہوں اور اس شہر میں تم سے زیادہ خوب صورت و معصوم اور کون ہو گا۔"

خدا کا شکر ہے کہ میں رخشندہ کو سہام جیسے **Sadist** کی گرفت سے نکال کر لے آیا ہوں اور ہم ایک خوب صورت زندگی گزار رہے ہیں۔

میں فرصت کے اوقات میں صرف اس کو پینٹ کرتا رہتا ہوں۔

سینہ زوری

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
یہ واقعہ جو میں سنانے جارہا ہوں کافی پرانا ہے لیکن اس واقعے کا اثر آج تک مجھ پر قائم ہے۔ پہلے میں خانہ بدوشوں کے بارے میں خاصا تجسس رکھتا تھا، ان پر کچھ لکھنے کی دھن سوار تھی اس جستجو نے کیا گل کھلائے، الفاظ کو موتیوں سے سجا کر پیش خدمت ہے۔

ناظم بخاری
(لودھراں)

ان دنوں مجھے نیا نیا لکھنے کا شوق ہوا تھا۔ میری کوشش و آرزو تھی کہ میں کچھ ایسا لکھوں، جو منفرد سا ہو۔ جسے لکھنے کے بعد میری ایک پہچان بن جائے۔ ایک زمانہ میرے قلم کا معترف ہو جائے۔ کچھ ہٹ کر اور منفرد لکھنے کے لیے اسی طرح کے موضوعات درکار تھے۔ سو میں نے اس حوالے سے ان خانہ بدوش بھکاریوں کو اپنی کہانی کا موضوع بنانے کا سوچا، جو سدا ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتے۔ ویسے میں ان پر لکھی گئی کہانیاں پڑھ کر ان کے بارے میں تھوڑا بہت جان گیا

تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی حقیقت کیا ہے اور اگر میں چاہتا تو اپنے تخیل کے زور پر کوئی خیالی کہانی گھڑ سکتا تھا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ اس لیے کہ دوسروں کی طرح صرف مشاہدے کے زور پر کہانی تخلیق کرنا مجھے گوارا نہ تھا۔ سو میں نے سوچا کہ مجھے ان خانہ بدوش لوگوں سے روبرو مل کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہیے یا پھر ان کے کسی مرد یا عورت سے مل کر اس کی زبانی خود اس کی کہانی سنی جائے۔ اور پھر اس کہانی میں تخیل کی آمیزش کر کے ایک نئی اور زبردست سی کہانی کو تراش لیا جائے۔ یہ سوچ کر میں نے خانہ بدوشوں کی تلاش شروع کر دی اور جلد ہی مجھے کامیابی نصیب ہوئی۔ ان دنوں ایک خانہ بدوش قبیلہ نیا نیا ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر آ کر ٹھہرا تھا۔ وہ وسیع و عریض زمین کافی عرصے سے خالی پڑی تھی، جہاں وہ آ کر آباد ہوئے تھے۔ جونہی مجھے ان کی آمد کا پتا چلا، میں دوسرے دن ہی ان کی بستی میں پہنچ گیا۔ ان کی بستی کیا تھی، چند ایک شکستہ کپڑوں سے وجود میں آئی ہوئی گندی، میلی جھونپڑیاں تھیں جنہوں نے بمشکل زمین کے سینے پر پاؤں گاڑ رکھے تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ ایک طرف ..... تین چار گدھے اور گدھیاں گھاس چرنے میں مصروف تھیں۔ چند آوارہ مگر پالتو کتے ایک طرف بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ کچھ عورتیں گندے برتن دھونے میں مصروف تھیں۔ کچھ مٹی کے چولہے پر روٹیاں بنا رہی تھیں۔ ان کے پاس ناشتے کے منتظر بچے بیٹھے ہوئے تھے، جن میں اکثر کی ناک بہہ رہی تھی اور منہ نہ دھونے کے سبب چہرے پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ روٹیاں پکاتے پکاتے کوئی عورت ان کے رونے اور چیخنے چلانے سے تنگ آتی تو روٹیاں الٹنے پلٹنے والا وہی چمٹہ ان میں سے کسی ایک کو جڑ دیتی اور مضروب ایک ٹانگ اٹھا کر دوسری ٹانگ پر گول گول گھومتے ہوئے زور زور رونے لگ جاتا۔ چند مرد ایک طرف، ایک بڑی سی مگر ٹوٹی پھوٹی سی چارپائی پر بیٹھے تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ ان کے ساتھ کچھ مرد حقہ بھی گڑگڑا رہے تھے۔ میں صبح ہی صبح ان کی بستی کی طرف نکل گیا تھا۔ صرف یہ سوچ کر کہ کہیں وہ صبح سویرے ہی کام پر نہ نکل جائیں اور مجھے اپنے مقصد میں ناکامی ہو۔ میں ابھی آس پاس کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک حقہ پیتے ہوئے ایک شخص کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا اور پھر حقہ ایک طرف کھسکا کر میری طرف آنے لگا۔

وہ میری مشکل خود ہی حل کرنے آ رہا تھا۔ میرے قریب پہنچ کر اس نے سر سے پاؤں تک گھور کر میرا جائزہ لیا اور پھر کرختگی سے کہا۔ ”ہاں بابو، کے بات ہے، کیوں ہماری جوراں کی طرف تا کا جھانکی کرے ہے؟“

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”میرا نام عقیل جان ہے۔“

”تو میں کے کروں؟“

”مجھے آپ سے ایک کام ہے۔“

”کے کام ہے؟“

اس کے لہجے کی سختی برقرار تھی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ یوں بات نہیں بنے گی۔ ہر جگہ پیسے کو سلام ہے۔ اگر میں چند سو روپوں کا نقصان برداشت کر لوں تو وہ شخص نہ صرف رام ہو سکتا ہے، بلکہ مجھے میری معلومات دینے میں بھی مدد کر سکتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے پوچھا۔ ”اچھا یہ بتاؤ، تم کرتے کیا ہو؟“

اس سے بے تکلف ہونے کی غرض سے میں آپ سے تم پر اتر آیا۔

”دھندا......“ اس نے ساتھ ہی دانتوں کی نمائش بھی ضروری سمجھی۔

”روز کا کتنا کما لیتے ہو؟“ میں نے اس خیال سے پوچھا کہ وہ روز کے جتنے کماتا ہوگا، میں اس سے سو دو سو زیادہ دوں گا تو وہ خوشی خوشی میرے کام آنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ یوں مجھے آسانی سے میری مطلوبہ معلومات مل جائیں گی۔ مگر میرا سوال سنتے ہی اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”تو انکوائری اپھسرا ہے، جو یوں پوچھ پاچھ کرے ہے؟ جانی بتا تا، تیرے باپ کے ملاجم نی ایں۔“

”دیکھو، اگر تم روز کے تین سو کما لیتے ہو تو میں تمہیں چار سو دوں گا مگر اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ ایک دن گزارنا ہوگا۔ مجھے تمہارے قبیلے کے بارے میں کچھ معلومات چاہئیں۔“

”ارے جا رے جا، بڑا آیا چار سو دینے والا۔ اس سے دگنا تو میری جورو ہر روج کما لاوے ہے۔ اور ہم وہ لوگ نہیں، جو تیرے ملاجم بن کے سارا سارا دن تیرے ساتھ گھوما پھریں...... ارے ہم تو اپنے من کے بادسا ہیں بادسا...... اور تم کوئی پلس میں ہے جو مالومات لیوے ہے؟ چلے اب پھٹا کھا سالے، نہیں تو وہ حال کروں گا کہ یاد کرے گا۔ بڑا آیا اپھسر کا پتر......“ یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ گیا۔ اس کے اس لہجے اور لفظوں پر میرا خون کھول اٹھا۔ میں بمشکل اسے زیر لب گالی

دینے سے باز رہا۔ میں ان کی بستی سے ذرا دور ہٹ آیا۔ سوچا، یہاں تقریباً سارے مرد ہی ایسے ہوں گے۔ سو اس بار مجھے کسی عورت سے مل کر اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ میں اس بستی سے ذرا دور آ کر، آنے جانے والوں پر نگاہ رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہ یوں کہ وہ رستہ اور وہ بستی تو مجھے نظر آ رہی تھی، مگر میں کسی کو دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں ایک درخت کی اوٹ میں تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ابھی اس بستی سے پیشہ ور بھکاری عورتیں نکلیں گی اور اپنے اپنے کام پر چل دیں گی۔ ان میں سے کسی عورت کو روک اور چند روپے خرچ کر کے اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کرنا مجھے مشکل نہیں لگ رہا تھا۔ بشرطیکہ وہ اس مرد کی طرح بدمزاج اور خردماغ نہ ہو۔ کچھ دیر بعد اس بستی سے ایک عورت نکل کر میرے پاس آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے قریب آ گئی۔ جانے کیوں، مجھے شک گزرا کہ یہ کہیں اس بددماغ شخص کی بیوی نہ ہو اور بعد میں میرا قیاس یہ درست نکلا۔ وہ قریب پہنچی تو میں درخت سے نکل کر اس کے روبرو آ گیا۔ وہ سانولی سی رنگت کی ایک غیر دلکش عورت تھی۔ اس نے میری پروقار شخصیت اور لباس کو دیکھا تو اس کے لبوں پر ایک پیشہ ورانہ صدا ابھری۔

”اے بابو، اللہ کے نام پر کچھ دیتا جا رے۔ اللہ تیری ہر آرزو پوری کرے رے بچی......“

میں نے ارد گرد دیکھا، آس پاس کوئی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بات بڑھانے کی غرض سے پوچھا۔ ”کتنے پیسے دوں؟“

”جو تیرا دل کرے۔“

”تو کہے تو میں تمہیں پانچ سو دے سکتا ہوں مگر اس کے لیے تمہیں میرا ایک کام کرنا پڑے گا......“ پانچ سو روپے اور کام کی بات سن کر کوئی بھی عورت بھڑک سکتی تھی مگر اس کا شریف ہونا شرط تھا اور ان عورتوں کا تو پیشہ ہی یہی تھا۔ مانگنا اور جسم فروشی کرنا۔ اور پھر میں نے یہ بات کہی بھی اتنے دھیمے اور معنی خیز لہجے میں تھی کہ وہ بات کی گہرائی تک پہنچ سکے اور پہنچ گئی تھی۔

”تمہارے لہجے اور باتوں سے یوں لگ رہا ہے، تم وہ کام کرانا چاہتے ہو، جو اکثر رات کی تاریکی میں ہوتا ہے...... پر اس کے لیے یا تو تمہیں ہماری کسی جھونپڑی میں آنا پڑے گا یا پھر اپنے ساتھ کہیں لے جانا پڑے گا۔“ اس کی اصلیت کافی حد تک کھل کر میرے سامنے آ گئی تھی مگر میرا مقصد اسے حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ کچھ اور تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میرا ہرگز وہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ مجھے تم سے کچھ اور کام ہے۔ مجھے تمہارے اور تمہارے قبیلے کے بارے میں کچھ معلومات چاہئیں، جو مجھے صرف تم دے سکتی ہو۔ دراصل میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ اس بار میں نے سوچا کہ مجھے تم لوگوں پر کوئی کہانی لکھنی چاہیے مگر مجھے تم لوگوں کے بارے میں کچھ خاص پتا نہیں ہے کہ تمہاری اصل زندگی کیا ہے۔ تم لوگ کس طرح شب و روز گزارتے ہو اور تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟ بس مجھے اتنی سی معلومات چاہئیں۔ اگر اس کے علاوہ تم مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بھی بتا دو وہ بونس میں ہو جائے گا۔“

میری بات سن کر وہ زور سے ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی پہلی بار مجھے اس کے وجود میں کسی خوبصورت چیز کا پتا چلا۔ ہنسی تھمی تو اس نے کہا۔ ”بابو، تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ کہانی لکھو گے اور وہ بھی ہماری؟“ وہ ایک بار پھر ہنسنے لگی۔ ”اگر کہانی لکھنی ہی ہے تو کسی امیر کبیر قبیلے کی لکھو۔ ہم ایسے لوگوں کی کہانی لکھ کر تمہیں کیا ملے گا؟“ پھر جیسے اسے محسوس ہوا کہ وہ اب تک مجھ سے باتیں کر کے فضول میں وقت برباد کر رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”اپنے پیسے فضول میں برباد مت کرو۔ ہم ایسے فقیروں کی کہانی سے تمہیں ایک پائی بھی نہیں ملے گی۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ نہ اپنا وقت برباد کرو اور نہ میرا۔“ وہ آگے بڑھی تو میں اس کے ساتھ ہو لیا۔

”دیکھو، تمہیں صرف آم کھانے سے غرض ہونی چاہیے، پیڑ گننے سے نہیں۔ تم میرے پیسوں کی فکر مت کرو اور نہ ہی اس بات کی کہ مجھے تمہاری کہانی سے کچھ ملے گا یا نہیں۔ بس میں نے تم سے جو پوچھا ہے، وہ مجھے بتا دو اور مجھ سے پانچ سو لے لو۔“

وہ رک گئی۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور بے نیازی سے کہا۔ ”لگتا ہے تمہیں اپنے پیسے پیارے نہیں ہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے، مجھے کیا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے، میں تمہیں بتا دوں گی مگر اس کے بدلے میں کم سے کم ایک ہزار لوں گی۔ کیوں کہ مجھے پتا ہے کہ اگر آج میں وقت پر اپنے ٹھیے پر نہ پہنچی تو میری آج کی روزی مر جائے گی۔ اور میری کم سے کم بھی آٹھ نو سو سے کم نہیں ہوتی۔ اتنے پیسے دے سکتے ہو تو ٹھیک ہے۔“

"مجھے منظور ہے۔" گو اس نے پیسے کچھ زیادہ مانگ لیے تھے مگر اس وقت مجھ پر جو اشتیاق طاری تھا، اس کے سامنے مجھے یہ روپے کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوئے۔

میں اسے ساتھ لے کر اسی گزرگاہ سے ذرا دور ایک کیکر کی چھاؤں میں آ بیٹھا۔ اتنے میں اس سے لپٹا ہوا بچہ رونے لگا تو وہ مجھ سے حیا کیے بغیر اسے دودھ پلانے لگی۔ جیسے یہ اس کے نزدیک کوئی عام سی بات ہو۔ میں نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ اگر مجھے اس سے معلومات لینے کی غرض نہ ہوتی تو میں اسی وقت ہی وہاں سے چلا آتا مگر میں نے کچھ دیر کے لیے خود کو اس بات کے لیے قائل کر لیا کہ جیسا دیس ہو ویسے بھیس بھرنا پڑتا ہے۔ دودھ پلانے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ "ہاں بابو، اب پوچھو کیا پوچھنا ہے۔"

میں نے پہلا سوال کیا۔ "کچھ اپنے قبیلے کے بارے میں بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں بابو ہماری بستی تو تم نے دیکھی ہوگی۔ اس میں کچھ خاص بات نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہاں عورتیں کماتی ہیں اور مرد بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ بس یوں سمجھو کہ قبیلے کے تمام مرد کام چور اور نکھٹو ہیں۔ وہ ایسے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتے، جس سے چار پیسے آنے کی اُمید ہو۔ ہر کوئی اپنی جورو کی کمائی پر پل رہا ہے۔ پر ہمارے قبیلے میں یہ کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی۔ بس ایک سلسلہ ہے جو شروع سے چلا آ رہا ہے اور شاید یونہی آگے چلتا رہے گا۔ ہم سارے دن میں جو کما کر لاتی ہیں، اس میں سے پانچواں حصہ بستی کے مکھیا کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتی ہیں۔ کچھ رقم خود پر خرچ کرتی ہیں اور باقی اپنے گھر والوں کو تھما دیتی ہیں۔ مکھیا کو دی جانے والی رقم سے ہمیں بہت سے تحفظات حاصل ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں بہت سی پریشانیوں سے بچاتا ہے۔ وہ ہماری دی ہوئی رقم سے مخصوص لوگوں کو حصہ دیتا ہے۔ جس کی بدولت پولیس نے یا کسی اور نے ہمیں کبھی تنگ نہیں کیا۔ مکھیا ہمارے اڈوں کا، جہاں جہاں ہم بھیک مانگتی ہیں، باقاعدگی سے کرایہ دیتا ہے اور اس کے علاوہ اگر کوئی اور مسئلہ ہو جائے تو اسے بھی فوراً حل کرتا ہے۔ بس یوں سمجھو، روزانہ کی کمائی سے یہ پانچواں حصہ دے کر ہم گھاٹے میں نہیں، فائدے میں رہتی ہیں۔" وہ اچانک چپ ہو گئی۔ جیسے اس کے پاس بتانے کو کچھ اور نہ ہو۔

میں نے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ، صبح سے لے کر شام تک تم لوگ کیا کرتے ہو۔"

"کچھ خاص نہیں، بس یہی روزمرہ کے عام سے کام کرتے ہیں۔ مرغ کی پہلی بانگ ہی ہمیں بیدار کر دیتی ہے۔ ہم اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوتی ہیں۔ اگر غسل کی حاجت ہو تو وہ بھی کرتی ہیں۔ پھر آ کر ناشتا بنانے میں لگ جاتی ہیں۔ اتنے میں صبح کا اجالا پھیل جاتا ہے۔ ہم ناشتا بنا کر اپنے گھر والوں کو دیتی ہیں۔ بچے بھی ناشتا کرتے ہیں۔ پھر ہم گھر گھر والوں کے حوالے کر کے دھندے پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم سب عورتوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی بچہ ضرور ہوتا ہے۔ بچہ اگر سمجھدار ہو تو ہم اسے بھیک کا سلیقہ اور جھوٹ موٹ رونے کا سبق پڑھا دیتے ہیں۔ اگر نہ سمجھ ہو اسے رلانا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ ذرا سی سوئی چبھونے سے بھی کام چل جاتا ہے۔ سارا دن ہم اپنے مخصوص اڈوں پر بھیک مانگتی ہیں اور اس دوران اگر کسی گاہک سے بات چیت ہو جائے تو اس کے ساتھ چلی بھی جاتی ہیں، مگر کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ ہمیں اکثر راتوں کو اس کام کے لیے جانا پڑتا ہے۔ شام تک ہم چار پیسے کما کر لوٹ آتی ہیں۔ مخصوص رقم مکھیا کی ہتھیلی پر رکھ کر ہم کھانا بنانے میں جت جاتی ہیں مگر اس بار ہمارے گھر والے ہمارا بڑا ساتھ دیتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سارا کھانا وہی بناتے ہیں، ہم صرف برائے نام ان کا ساتھ دیتی ہیں تاکہ ان کی انا کی ناک پر مکھی نہ بیٹھے۔ کھانے کے بعد ہمیں رات کے بارے میں بھی گھر والوں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ ہمیں کہیں جانا تو نہیں۔ اگر کسی کو ہمارے ساتھ رات گزارنی ہو تو وہ ہمارے گھر والوں سے آ کر بات چیت کر جاتا ہے۔ جن میں اکثر صاحب حیثیت لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی گاڑی رات کو اپنے مخصوص وقت پر آتی ہے اور ہم اس میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ صبح سے کچھ دیر پہلے وہ ہمیں واپس چھوڑ جاتے ہیں۔ کبھی کبھار کوئی ایسا گاہک بھی ادھر آ بھٹکتا ہے، جس کے پاس اپنا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ وہ ہمارے ساتھ ہماری ہی کسی جھونپڑی میں وقت گزار لیتا ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنی راہ لیتا ہے۔ جب ہماری کوئی رات کسی ضرورت مند کے ساتھ گزرتی ہے، اس سے اگلی صبح کا کھانا بھی ہمارے گھر والے بناتے ہیں۔ ہم دیر تک سوتی ہیں۔ اسی لیے دھندے پر بھی ہمیں دیر سے جانا پڑتا ہے۔ جس رات ہمارا کوئی ضرورت مند نہیں ہوتا، وہ رات بھی ہماری بیکار نہیں جاتی۔ وہ رات ہمیں گھر والوں کے ساتھ گزارنا پڑتی ہے۔ دھندے کے حوالے سے ہماری کئی ٹولیاں ہوتی ہیں۔ کچھ عورتیں ایسی ہوتی ہیں، جو بازاروں اور سڑکوں پر جا کر بھیک مانگتی ہیں اور کچھ ایسی ہوتی ہیں، جنہیں گھر گھر جا کر دروازے کھٹکھٹانا پڑتے ہیں۔ ہر دو ہفتے

بعد ہم ایک دوسرے کی جگہ تبدیل کر لیتی ہیں۔"

وہ چپ ہوگئی اور میں نے ایک اور سوال پوچھ لیا کہ معلومات جتنی زیادہ ہوں گی، کہانی اتنی ہی اچھی لکھی جائے گی۔ "اچھا یہ بتاؤ تمہارا قبیلہ ایک جگہ پر کب تک اور کتنے دنوں تک رہتا ہے؟"

"اگر قسمت ساتھ دے اور کام چلتا رہے تو دو سے تین ماہ بھی ایک جگہ پر گزر جاتے ہیں۔ ورنہ کبھی ایک ہفتے بعد ہی وہاں سے جانا پڑ جاتا ہے۔"

"وہاں سے آگے تمہارا کہاں ٹھکانا ہوتا ہے؟"

"چار پانچ جگہ ہوتی ہیں، جن کے بارے میں کھیا ہم سے زیادہ جانتا ہے۔" بس ان میں سے کہیں جا کر ڈیرا ڈال لیتے ہیں۔ مگر پڑاؤ ڈالنے سے پہلے ہم اس بات کو ضرور مدنظر رکھتے ہیں کہ وہ علاقہ ہمارے دونوں دھندوں کے لیے مفید اور موزوں ہو۔ اس کے ساتھ ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہم کسی ایسی جگہ پڑاؤ ڈالیں جو شہر یا گاؤں کی آبادی سے ذرا ہٹ کر ہو تاکہ ہمارے وہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہ کر سکے اور ہم زیادہ عرصے تک وہاں سکون سے رہ سکیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ، تم ایک رات اور ایک دن کے دھندے میں کتنے کما لیتی ہو؟"

وہ کچھ دیر تک انگلیوں پر حساب کرتی رہی اور پھر بولی۔ "کھیا کا اور اپنے گھر کا خرچہ نکال کر ہزار بارہ سو بچ جاتے ہیں۔"

"ہزار بارہ سو؟"

"میں حیران ہوا۔

"ہاں...... اگر کبھی دھندا اچھا چل نکلے تو دو ہزار بھی بچ جاتے ہیں۔" اس کا لہجہ عام سا تھا۔ مجھے مزید حیرت ہوئی۔

"تم ان روپوں کا کیا کرتی ہو؟" میرا مطلب ہے، اتنی رقم کی حفاظت کرنا۔"

"کرنا کیا...... سارا خرچہ نکال کر ہم باقی رقم اپنے گھر والوں کے ہاتھ پر جا کے رکھ دیتی ہیں۔ وہ دو چار دن بعد جا کر اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا آتے ہیں۔"

"اس حساب سے تو اب تک بہت رقم جمع ہو چکی ہو گی؟"

"ہاں...... کچھ روز پہلے میرا گھر والا کہہ رہا تھا کہ پچاس لاکھ سے اوپر رقم ہو چکی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی، جیسے یہ معمولی سی رقم ہو۔ "تم لوگ نصف کروڑ کے مالک ہو اس کے باوجود تم بھیک مانگنے اور جسم بیچنے کا دھندا کرتی ہو؟"

"اس میں برا کیا ہے؟ بہت سے لوگوں کا اپنا اپنا پیشہ ہوتا ہے، یہ ہم لوگوں کا پیشہ ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ، تم لوگ اس رقم کا کیا کرو گے؟"

"ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔ بڑھاپے میں شاید کوئی اچھا سا مکان خرید لیں۔ گاڑی بھی لے سکتے اور دل چاہا تو نوکر چاکر بھی رکھ سکتے ہیں مگر فی الحال اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔"

"تم اور تمہارا گھر والا اس رقم سے کوئی کاروبار کیوں نہیں کرتے؟ اس طرح تم لاکھوں سے کروڑوں بنا سکتے ہو۔"

وہ دھیرے سے ہنسی۔ "ہم دوسروں کی طرح بیوقوف نہیں ہیں کہ زیادہ کے لالچ میں اصل سے بھی جائیں یہ کاروبار کرنا بے وقوفوں کا کام ہے۔"

میں نے اس سے بحث مناسب نہیں سمجھی۔

"کبھی تم نے اپنے شوہر پر شک نہیں کیا کہ وہ ساری رقم لے کر بھاگ بھی سکتا ہے؟"

"دیکھو بابو...... ہمارے گھر والوں میں ہر برائی ہو سکتی ہے مگر یہ نہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں مگر ہمیں دھوکا نہیں دے سکتے اور اگر انہوں نے دھوکا دیا بھی تو وہ جائیں گے کہاں؟ کب تک اس رقم کو کھائیں گے؟ وہ یہ بات اچھی طرح... جانتے ہیں کہ ہم دولت کی تجوریاں ہیں۔ ہماری بدولت ان کے بینک اکاؤنٹ میں دن رات اضافہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تو کہیں کے نہیں رہیں گے۔ ویسے بھی ہمارا کھیا کوئی عام سا شخص نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی ایسی حرکت کر کے پاتال کی تہہ میں بھی جا چھپا تو وہاں سے بھی اسے نکال لائے گا۔ ویسے آج تک ایسا ہوا نہیں ہے۔"

اچانک اس کا بچہ بلکنے لگا۔ وہ میرا لحاظ کیے بغیر اسے دودھ پلانے لگی۔

میں نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ اس کی اس "صاف ستھری" گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ پڑھی لکھی بھی ہے۔ ورنہ یہ الفاظ اور یہ باتیں فقیرنیوں کے منہ سے کب نکلتی ہیں؟ مجھے یہ خیال آیا تو میں نے پوچھا۔ "اچھا یہ بتاؤ، تم پڑھی لکھی بھی ہو؟"

"ہاں نا...... پورے پانچ جماعتیں پڑھی ہیں میں نے۔ میں خط لکھ بھی لیتی ہوں اور پڑھ بھی لیتی ہوں۔ اس کے علاوہ اردو کی ہر کتاب پڑھنی آتی ہے۔ مجھے۔" میں اس نے یوں کہا جیسے وہ پانچ جماعتیں نہ پڑھی ہوں بلکہ گریجویٹ ہو۔

اچانک میرے ذہن میں ایک اور سوال آیا اور میں نے فوراً پوچھ لیا۔ ”اچھا یہ بتاؤ، تم نے آج تک کسی سے محبت کی ہے؟“

اچانک وہ کہیں کھو سی گئی۔ اسی کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ہاں کی تھی، اپنے راجو سے۔“

”یہ راجو کون ہے“ وہ جو کہیں کھونے لگی تھی چونک کر حقیقت کی دنیا میں آ گئی۔

”تھا کوئی۔“

”تھا۔ یعنی اب نہیں ہے؟“

”ہاں...... وہ میری زندگی میں کسی خوشبو کے جھونکے کی طرح آیا تھا اور میرے ذہن و دل کو اپنی محبت کی خوشبو سے مہکا کر رخصت ہو گیا۔“

”مجھے شروع سے سناؤ یہ کہانی۔“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ اچانک اس کی میلی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر اس کے رخسار پر بہہ گئے۔ اس کے لبوں پر ایک اداس سا تبسم در آیا۔ وہ اپنے ایک رخسار کو پونچھتے ہوئے بولی۔

”کیا بتاؤں بابو، اب تو دل میں کچھ مٹی مٹی یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“

”ان یادوں کو ہی صاف کر کے سامنے لے آؤ۔“

”رہنے دو بابو۔“ اس نے ہولے سے کہا۔ ”کوئی اور بات پوچھو۔ اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں ان یادوں کو تازہ کر سکوں۔ ویسے بھی میری یہ کہانی کوئی ایسی خاص نہیں کہ جس میں دلچسپی لی جائے۔ یہ ایک عام سی اور بے وزن کہانی ہے، جسے میں سنا بھی دوں تو تم سن کر ہنس پڑو گے۔“ جانے کب کیکر کی چھاؤں ہم سے ہٹ کر دور چلی گئی تھی۔ دھوپ کی چبھن محسوس ہوئی تو ہم دونوں وہاں سے چھاؤں میں چلے آئے۔ میں نے جیب سے بٹوا نکالا اور اس میں سے ہزار کی بجائے پندرہ سو نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیے۔ ”دیکھو، تم مجھے اپنی زندگی کی ہر بات بتاؤ، چاہے وہ دلچسپ ہو یا نہ ہو اسے دلچسپ بنانا میرا کام ہے۔ تم مجھے اپنے بچپن، لڑکپن اور جوانی کی ہر قابل ذکر بات بتاؤ۔ خاص کر راجو کے بارے میں۔ مجھ سے کچھ بھی مت چھپاؤ۔“

اس نے اس طرح ان نوٹوں کی طرف دیکھا، جیسے اس کی باتوں کے عوض ان کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ اس کے باوجود اس نے مجھ سے نوٹ لے لیے۔

”میں نے آج تک بھول کر بھی یاد نہیں کیا کہ میرا ماضی کہاں گزرا اور کیسے...... اب تم مجھے مجبور کر رہے ہو تو میں اپنی سابقہ زندگی پر نظر ڈالوں گی اور بہت دور تک ڈالوں گی مگر آج نہیں، کل۔ آج مجھے گزری ہوئی ہر بات سوچنے دو اور تازہ کرنے دو۔ کل میں اسی جگہ آ کر تمہیں ہر بات بتا دوں گی۔ مجھے ایک دن کی مہلت دو۔“

”ٹھیک ہے، تمہیں ایک دن کی مہلت ہے۔ تم جاؤ مگر کل صبح یاد سے یہیں آ جانا، میں انتظار کروں گا۔“

”میں آ جاؤں گی۔“

”اچھا یہ تو بتاتی جاؤ، ان جھونپڑیوں میں تمہاری جھونپڑی کون سی ہے۔ اگر کل تم کسی وجہ سے نہ آ سکی تو میں خود آ جاؤں گا۔“

”تم بے فکر ہو جاؤ، میں کل ضرور آؤں گی۔ ویسے بستی میں جو سب سے پہلی جھونپڑی ہے، وہ میری ہے۔“

وہ اپنی راہ ہو لی۔ میں گھر چلا آیا اور اس سے سنی ہوئی ہر بات کاغذ پر منتقل کرنے لگا۔ اگلے دن میں صبح سویرے ہی وہاں پہنچ کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ صبح سے شام ہو گئی اور وہ نہیں آئی۔ جب شام بھی ڈھلنے لگی تو میں نے اپنے قدم اس بستی کی طرف بڑھا دیے۔ وہاں پہنچتے ہی میری نظر اس شخص پر پڑی، جو مجھے کل ملا تھا۔ وہ آج بھی کل کی طرح حقہ گڑگڑانے میں مصروف تھا۔ اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ حقہ ایک طرف رکھ کر تیزی سے میرے قریب آیا۔

”اے باؤ، تیری عقل میں کل بات نی آئی تھی کہ تیں یا مت آئیو۔ تیں جو معلوم کرنا چاوے ہے، وہ تنے کوئی نی بتاوے گا۔“ مجھے مناسب نہیں لگا کہ میں اسے بتاؤں، میں آدمی سے زیادہ معلومات حاصل کر چکا ہوں اور اب تو بس...... اسی سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ میں نے اس بار اس سے بات بنانے کے لیے کہا۔ ”میں اب اس کام کے لیے نہیں، کسی اور کام کے لیے آیا ہوں۔“

”کس کام کے لیے؟“

”میں...... میں دراصل یہاں کسی عورت کے ساتھ رات کو کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔“ اچانک اس کا لہجہ نرم مگر دلالوں سا ہو گیا۔

”رقم ہے تمہارے پاس؟“

”ہاں ہے۔“

”کتنی؟“

”تم کتنی لو گے؟“

”ایک ہجار۔“

”نہیں پانچ سو۔“

"پانچ سو میں تو کام نی ہووے گا بابو۔ تیں آٹھ سو دے دیو۔ اس سے کم نی ہوں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔"

"تو نکالو پیسے۔"

پیسوں کا سنتے ہی میں پریشان ہوگیا۔ میں نے تو اسے باتوں میں لگانے کے لیے یہ باتیں کی تھیں کہ اتنے میں مجھے وہ عورت دکھائی دے جائے گی اور میں اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر دوں گا۔ مگر سودا طے ہوتے ہی اس نے مجھ سے روپوں کا مطالبہ شروع کر دیا۔ میں نے تھوڑی پس و پیش کی تو اس کے تیور جارحانہ ہوگئے۔

"دیکھ بابو، جو بات ہوگئی سو ہوگئی۔ تیں اب اس سودے سے نا پھر سکے ہے۔ اور یہ ہمارا یہاں کا اصول ہے کہ ہم اس کام کی پیشگی ہی پیسے لیویں ہیں۔ اگر تیں اس بات سے پھرا تو اچھا نی ہووے گا۔" اس کی بات اور لہجے سے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر میں اپنی بات سے پھر ایا اور پس و پیش کی تو وہ مجھ سے لڑ پڑے گا۔ اس کی اونچی آواز نے وہاں کے اور مردوں کو بھی ہماری جانب متوجہ کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہماری طرف آتے، اس شخص نے ہاتھ اٹھا کر انہیں وہیں رکنے کا کہا۔ میرے پاس اس کی بات ماننے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے چپ چاپ بٹوا نکالا اور رقم نکال کر اسے تھما دی۔ اس نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

"رات دس بجے اس جھونپڑی میں آجاؤ۔" اس نے سب سے پہلی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "اور جب دل بھر جاوے، تب جائیو۔"

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپس لوٹ آیا۔ میں جس مقصد سے اس بستی میں گیا تھا، وہ مقصد بھی پورا نہیں ہوا تھا اور میرے ہزار بھی چلے گئے تھے۔

وہاں سے لوٹتے وقت میرا وہاں جانے کا ہرگز ارادہ نہیں تھا مگر جونہی رات کے نو بجے میرا دل وہاں جانے کے لیے بے قرار ہونے لگا۔ اس لیے نہیں کہ وہاں جا کر میں جھوٹی مسرتوں کے لمحات حاصل کرتا۔ بلکہ اس لیے کہ مجھے اس فقیرنی سے راجو اور اس کی لو اسٹوری سننی تھی۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا کہ اس کا راجو سے زوردار عشق لڑا ہوگا۔ تبھی تو اس کے ذکر پر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اور میرا وہاں جانا کوئی نئی یا خاص بات بھی نہ ہوتی۔ مجھے اس فقیرنی نے بتایا تھا کہ اکثر ضرورت مند رات کو ان کے ہاں آتے رہتے ہیں۔ میں تو ویسے بھی رات کی قیمت ادا کر چکا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اگر کل مجھے وہ

کسی بھی کمپیوٹرائزڈ نظام میں داخل ہو کر قیمتی معلومات ہی نہیں چراتے بلکہ ان میں تبدیلی بھی کر سکتے ہیں۔ اب ایک خطرناک بات سامنے آئی ہے کہ ہیکرز طبی آلات میں بھی مداخلت کر سکتے ہیں۔ ذیابیطس میں مبتلا ایک سائنس دان نے یہ ثابت کیا کہ انسولین پمپس کو دور سے کنٹرول کر کے بلڈ شوگر کی ریڈنگ تبدیل کی جاسکتی ہے۔ اس کا خطرناک نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ مریض اس غلط ریڈنگ کی بنیاد پر بہت زیادہ یا بہت کم انسولین لے سکتے ہیں۔ جے ریڈکلف نے ہیکرز کی اس صلاحیت کو ثابت کرنے کے لیے ننھی سی ریڈیو ڈیوائس بنائی جو کسی انسولین پمپ پر حملہ کر سکتی ہے۔ یوں انسولین پمپ کو دور سے وائرلیس کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ لاس ویگاس میں منعقدہ بلیک ہیٹ کمپیوٹر سیکیورٹی کانفرنس میں اس نے یہ آلہ پیش کیا۔

مرسلہ: نذر محمد، لاڑکانہ

کیکر کی چھاؤں میں ملی تو پھر مزید روپوں کا مطالبہ نہ شروع کر دے۔ گو روپے پیسے میرے لیے اہمیت نہیں رکھتے تھے اور میری جیب میں ہر وقت دس بارہ ہزار پڑے رہتے تھے مگر یوں بے دریغ پیسے لٹانا بھی مجھے پسند نہیں تھا۔ ان باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں گھر سے نکلا اور ان کی بستی میں جا پہنچا۔ اس وقت قریباً دس کا ٹائم تھا۔ مجھے اس جھونپڑی کے باہر ہی اس فقیرنی کا شوہر مل گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔ اگلے پل ہی میں اس کی جھونپڑی میں تھا۔ اندر لالٹین کی روشنی میں خیمہ کسی حد تک روشن تھا۔ وہاں صرف ایک چارپائی تھی، جس پر ایک صاف ستھری رلی بچھی ہوئی تھی۔ پائینتی کی طرف کھیس رکھا ہوا تھا اور سرہانے کی طرف تکیہ۔ اس پر وہی فقیرنی صاف ستھری حالت میں نیم دراز تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اسے حیرت ہوئی۔ "ارے...... بابو تم؟"

"ہاں میں...... تم صبح کیوں نہیں آئی؟ میں شام تک وہاں تمہارا انتظار کرتا رہا اور......"

"اور پھر یہاں آگئے اور میرے گھر والے سے رات کے لیے بات کرلی؟"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔

"دراصل میں کل ایک ضرورت مند کے ساتھ رہی۔ صبح دیر سے اٹھنا پڑا۔ اٹھ کر غسل کیا تو ایک اور گاہک میرا منتظر تھا۔ میں اس کے ساتھ چلی گئی اور وہاں سے میری واپسی مغرب کے وقت ہوئی......" اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "سچ سچ بتاؤ، تم مجھے حاصل کرنے آئے ہو یا میری کہانی سننے؟ ویسے تم چاہو تو مجھے حاصل بھی کرسکتے ہو اور میری کہانی بھی سن سکتے ہو۔ کیا خیال ہے؟" میں نے اس کی پیشکش رد کردی۔ "میرے گھر میں ایک حسین بیوی اور دو بچے موجود ہیں۔ مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ بس تم مجھے اپنی اور راجو کی محبت بھری کہانی سنادو۔ تاکہ مجھے لکھنے کے لیے کچھ نیا اور منفرد سا مواد مل جائے۔ اس کے بعد تم اپنی راہ اور میں اپنی راہ۔"

"ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے کاندھے اچکائے۔ اس کے بعد اس نے مجھے اپنے بچپن کے واقعات سنانے شروع کردیے اور پھر لڑکپن کے۔ اس کے بعد بات جوانی تک آئی تو اس نے راجو کا ذکر چھیڑ دیا۔ راجو کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی۔ اس کی یہ کہانی بہت دلچسپ تھی اور پھر وہ سنا بھی اس طرح رہی تھی کہ میری ایک توجہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں ہورہی تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہوکر اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اپنی کہانی سناتے سناتے اس نے کہا۔ "میری ایک بات مانو گے؟"

"کہو......"

"مجھے سو روپے کی ضرورت ہے، دو گے؟" مجھے حیرت ہوئی۔ "سو روپے، مگر اس وقت......"

اس نے میری بات کاٹی۔ "دینے ہیں تو دو، نہیں دینے تو انکار کردو......" اس کی محبت کی کہانی بڑے دلچسپ دوراہے پر پہنچ چکی تھی۔ میں آگے سننے کو بے چین تھا۔ اس کی یہ کہانی سنتے ہوئے میں نے اس پر ایک زبردست قسم کا ناول لکھنے کا سوچ لیا تھا۔ میں نے بحث کرنے کی بجائے سو کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ نوٹ لے کر اس نے بستر کے نیچے رکھ دیا۔ اگلے ہی پل اس نے اپنے ایک ہاتھ میں میری کلائی تھامی اور دوسرا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال کر ناف تک قمیص ادھیڑ ڈالی۔ میں نے فوراً اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ میری سمجھ میں اس کی یہ حرکت نہیں آئی تھی۔ اس کی اس حرکت سے میں کچھ گھبرا سا گیا تھا۔ ابھی میرا ذہن یہ سب سمجھنے کے لیے متحرک تھا کہ اچانک وہ زور زور سے چیخنے لگی۔

"بچاؤ...... بچاؤ مجھے......" دوسرے ہی پل خیمے میں بہت سے لوگ لالٹینیں اور ڈنڈے لے کر اندر آگئے، جیسے وہ باہر اس کے چیخنے کے ہی منتظر تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ سب مجھ پر ٹوٹ پڑتے یا میں اپنی صفائی میں کچھ کہتا، اچانک ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا۔ وہ یقیناً ان کا مکھیا تھا۔ میرے قریب آتے ہی اس نے ان سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سارے لوگ وہاں سے باہر چلے گئے۔ ان کے ساتھ وہ فقیرنی بھی باہر نکل گئی، جس کی محبت بھری داستان سننے کے شوق نے مجھے اس حال کو پہنچایا تھا۔ ان کے جاتے ہی وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "دیکھ بابو، اگر تم خود کو اور اپنی عزت کو محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو چپ چاپ اپنا بٹوا، انگوٹھی، گھڑی اور گلے میں پڑی ہوئی سونے کی چین اتار کر یہاں رکھ دو۔ اسی میں تمہاری بھلائی اور فائدہ ہے۔ یہ سب دے کر تم یہاں سے خیریت سے جاسکتے ہو۔ ورنہ...... آگے تم خود سمجھ دار ہو۔"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ بازی واقعی ان کے ہاتھ میں ہے۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور ان کی مطلوبہ چیزیں ان کے حوالے کرکے گھر لوٹ آیا۔ بس وہ دن ہے اور آج کا دن کہ نہ تو مجھے ان کے بارے میں جاننے کا شوق رہا اور نہ ہی ان کے کسی قبیلے کے بارے میں۔ اگر کوئی مجھ سے ان کے بارے میں جاننا چاہے تو میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لیتا ہوں...... اور اگر کوئی مجھے ان کے بارے میں بتانا چاہے تو میں ان کے سامنے بھی یہی عمل دہراتا ہوں کہ مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں سننا...... میرے اکثر دوست حیران ہیں کہ میں جو اکثر خانہ بدوش لوگوں کے بارے میں طرح طرح کے سوال کیا کرتا تھا، اب کیوں نہیں کرتا؟ کیا میرے شوق میں کمی آگئی ہے یا اس کی کوئی اور وجہ ہے؟ میرے وہ دوست بھی حیران ہیں جو مجھے کہانیاں لکھنے کے جنون میں مبتلا پاتے تھے کہ میں نے کہانیاں لکھنا کیوں چھوڑ دی ہیں؟ اب میں انہیں کیسے بتاتا کہ میں نے یہ سب کیوں چھوڑا ہے۔ اتنی بڑی ٹھوکر کھا کر بھی اگر کوئی نہ سنبھلے تو اس سے بڑا کوئی چغد نہیں۔ میرے دوست مجھے چھیڑنے کے لیے یا کسی اور وجہ سے اب بھی وہی سوال پوچھتے ہیں مگر اب نہ تو میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں اور نہ ہی میری پیشانی پر شکنیں پڑتی ہیں بلکہ اب میں ان کے تمام سوالوں کے جواب میں صرف مسکرا کر رہ جاتا ہوں اور میری یہ مسکراہٹ میرے لیے بہت سے پردوں کا کام دیتی ہے۔

بھول

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

کچھ لوگوں کی زندگی فلمی انداز کی سچویشن والی ہوتی ہے یا یوں سمجھ لیں ایسی ہی آپ بیتیوں پر فلمیں بنتی ہیں۔ یاسر کی آپ بیتی بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

نواز خان

(کراچی)

ڈاکٹر صومی کا چیک اپ کر کے باہر نکلا تو یاسر اور شہلا دونوں نے اسے پُرامید نظروں سے دیکھا۔ شہلا نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب، صومی کی حالت میں کوئی پروگریس؟''

ڈاکٹر نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔''ہمیں صومی کے لیے گردے کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔''

''ڈاکٹر صاحب، کہیں گردے کے انتظار میں بہت دیر نہ ہو جائے۔''

''ہمیشہ اچھی امید رکھنا چاہیے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ڈونر تو دو تین موجود ہیں لیکن صومی کا بلڈ گروپ ان سے میچ نہیں ہو رہا ہے۔''

''لیکن کیوں ڈاکٹر صاحب؟'' شہلا جھنجلا کر بولی۔

''اس کیوں کا جواب تو میرے پاس نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ دونوں کی تو وہ بیٹی ہے۔ آپ کا بلڈ گروپ بھی اس سے میچ نہیں ہو رہا ہے۔ مسز یاسر، آپ خود پر کنٹرول کریں اور بچی کو بالکل احساس نہ ہونے دیں کہ اس کی بیماری کی وجہ سے آپ پریشان ہیں۔ ویسے اس وقت اس کی حالت نارمل ہے۔ آپ اسے گھر لے جا سکتے ہیں۔ بس کھانے پینے میں احتیاط کریں۔''

''او کے ڈاکٹر۔'' یاسر نے کہا۔ ''ہم خیال رکھیں گے۔''

وہ لوگ صومی کے ساتھ وہاں سے باہر نکلے تو دونوں کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ صومی البتہ بہت چہک رہی تھی۔

''شہلا، تم آج چھٹی کر لو۔'' یاسر نے کہا۔ ''اور صومی کو گھر لے جاؤ۔ میری بہت اہم میٹنگ ہے ورنہ آج میں بھی چھٹی کر لیتا اور ہم صومی کے ساتھ پکنک پر چلتے۔''

پھر یاسر نے صومی اور شہلا کو ایک جگہ اتارا اور خود دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ یاسر ملک کی معروف ایڈورٹائزنگ ایجنسی موننیچ میں سینئر کونسپٹ ڈائریکٹر تھا اور اپنی فیلڈ کا جینئس تھا۔ اس کے کریڈٹ پر بے شمار مقبول اور کامیاب اشتہارات تھے۔

وہ دفتر پہنچا تو اس وقت ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے اپنا بریف کیس اپنے کمرے میں پھینکا اور لیپ ٹاپ لے کر بورڈ روم کی طرف لپکا۔ بورڈ روم میں ایجنسی کے مالک حسان بیگ کے ساتھ ڈائریکٹر مارکیٹنگ، ڈائریکٹر سیلز پروموشن اور انرجی فوڈ کا مالک چودھری بشیر بھی موجود تھا۔ یاسر کو اس جگی شخص کی شکل سے بھی چڑ تھی لیکن وہ ایجنسی کا کلائنٹ تھا اس لیے اسے برداشت کرنا ہی تھا۔ وہ مسکرا کر چودھری بشیر سے بولا۔ ''السلام علیکم چودھری صاحب، میں نے اس مرتبہ آپ کے لیے بہت زبردست ایڈ بنایا ہے۔ میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں۔''

''چودھری صاحب، وہ ایڈ دیکھ چکے ہیں یار۔'' بیگ صاحب نے کہا۔

''ویری گڈ۔'' یاسر نے زبردستی ہنس کر کہا۔ ''پھر آپ کا کیا خیال ہے چودھری صاحب؟''

''خیال!'' چودھری بھڑک کر بولا۔ ''میں نے انرجی فوڈ کا اشتہار بنوایا تھا اس کے خریدار زیادہ تر نوجوان ہوں گے۔ یہ ایڈ تو ان کے سر سے گزر جائے گا۔ آپ نے یہ ایڈ نوجوانوں کے لیے بنایا ہے یا فلاسفرز اور دانش وروں کے لیے، آپ شاید میری ڈیمانڈ نہیں سمجھے ہیں یا پھر آپ کنفیوز ہیں۔''

یاسر کو اچانک غصہ آ گیا۔ ''کنفیوز تو آپ ہیں چودھری صاحب۔'' یاسر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''آپ کو معلوم ہی نہیں ہے کہ آپ کیسا ایڈ بنوانا چاہتے ہیں۔ اب تک میں آپ کے لیے چار اشتہارات بنوا چکا ہوں لیکن آپ کو کوئی پسند ہی نہیں آیا۔ اب میں اور کتنا اپنے معیار سے نیچے آؤں؟''

''یاسر!'' بیگ صاحب نے بلند آواز میں کہا۔

''سوری سر۔'' یاسر نے چودھری کو گھورتے ہوئے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

''چودھری صاحب! یاسر صاحب کی طرف سے میں معذرت چاہتا ہوں۔ وہ اپنی بیٹی کی بیماری سے خاصا ڈسٹرب ہیں۔ میں آپ کی مرضی کا ایڈ بنوا دوں گا۔'' پھر انہوں نے یاسر کے اسسٹنٹ توفیق سے کہا۔ ''توفیق صاحب! آپ چودھری صاحب کے ساتھ بیٹھ جائیں اور ان کی مرضی کے مطابق ایڈ بنائیں۔''

چودھری کو سمجھا بجھا کر بیگ صاحب وہاں سے سیدھے یاسر کے کمرے میں آئے تو یاسر اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔

''یاسر، میں جانتا ہوں کہ تم اپنی بیٹی کی وجہ سے بہت ڈسٹرب ہو لیکن چودھری ہمارا کلائنٹ ہے۔''

''سوری سر۔'' یاسر نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں ایک دم مشتعل ہو گیا۔ آیندہ آپ کو مجھ سے شکایت نہیں ہو گی۔''

''گڈ بوائے۔'' بیگ صاحب مسکرا کر بولے اور اس کا شانہ تھپک کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

بیگ صاحب! اصولوں کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ ان کی نظر میں سب سے اہم کلائنٹ ہوتا۔ یاسر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اب تک اسے ملازمت سے فارغ کر چکے ہوتے لیکن وہ یاسر کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد یاسر ایک دن بھی بے

روزگار نہیں رہے گا۔ کوئی بھی ایڈورٹائزنگ ایجنسی اسے منہ مانگے معاوضے پر ہاتھوں ہاتھ لے لے گی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یاسر کے ساتھ ہی ان کے بہت سے بڑے بڑے کلائنٹ بھی چلے جائیں گے۔

یاسر رات گئے گھر پہنچا تو صومی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

''تم ابھی تک سوئی نہیں گڑیا؟'' یاسر نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''پاپا! میں آپ کا ویٹ کررہی تھی۔'' صومی نے جواب دیا۔

''ارے میرا بیٹا، میرا انتظار کررہا تھا۔ اچھا یہ بتاؤ، تم نے کھانا کھایا؟''

''کھانا تو مما نے کھلا دیا۔'' صومی نے کہا۔

''اچھا اب چلو سوجائیں، صبح آپ کو اسکول بھی تو جانا ہے نا۔'' شہلا نے کہا۔

صومی کو اس کے بستر پر لٹانے کے بعد یاسر پھر اپنے بیڈروم میں آگیا۔

''آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے، پلیز تھوڑا سا کھالیں۔'' شہلا نے کہا۔

''شہلا! مجھے پریشان مت کرو۔ میں نے کہا نا کہ مجھے بھوک نہیں ہے۔'' پھر وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ''اب تم بھی سوجاؤ۔ تمہیں بھی صبح آفس جانا ہے۔'' یاسر نے لائٹ آف کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

صبح ناشتے کی میز پر صومی نے کہا۔ ''پاپا! آج ہمارے اسکول میں پیرنٹس ڈے ہے، آپ کو یاد ہے نا؟''

''ہاں بیٹا، مجھے یاد ہے۔'' یاسر نے چونک کر کہا۔

''چلو بیٹا، تمہاری اسکول وین آگئی۔'' شہلا نے وین کی آواز سن کر کہا۔ وہ صومی کو وین تک چھوڑ کر آئی، پھر یاسر سے بولی۔ ''میں آپ کے والٹ میں سے پیسے نکال رہی ہوں، آپ اے ٹی ایم سے نکال لیجیے گا۔'' شہلا نے اس کے والٹ سے رقم نکالی اور یاسر کو خدا حافظ کہہ کر وہ بھی چلی گئی۔

شہلا ایک ملٹی نیشنل فرم میں مارکیٹنگ ایگزیکٹو تھی۔ ان دونوں کی آمدنی خاصی معقول تھی لیکن انہوں نے کبھی کچھ پس انداز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ گھر یاسر کا اپنا تھا، کار اسے کمپنی نے دی تھی۔ اس نے بھی کچھ پس انداز کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں ہمیشہ کھلے ہاتھ سے خرچ کیا تھا لیکن صومی کی بیماری کے بارے میں جان کر یاسر اور شہلا دونوں پیسے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ ڈاکٹر نے انہیں بتایا تھا کہ کڈنی ٹرانسپلانٹ میں کم سے کم بارہ سے پندرہ لاکھ روپے کے اخراجات ہوں گے۔ ان دونوں نے مل کر ایک سال میں تقریباً اتنی ہی رقم جمع کرلی تھی۔ مزید رقم کی ضرورت پڑتی تو وہ اپنے دفتروں سے کچھ رقم قرض بھی لے سکتے تھے۔

یاسر گھر سے نکلا تو گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی اس کی نظر فیول گیج پر پڑی۔ سی این جی تو کل ہی ختم ہوچکی تھی، اب پیٹرول بھی ختم ہونے والا تھا۔

اس نے قریبی پیٹرول پمپ سے گاڑی میں پیٹرول بھروایا اور سی این جی کا سلنڈر بھی فل کرالیا۔ پیٹرول پمپ کے ملازم کو اس نے کریڈٹ کارڈ دیا اور گاڑی کو وہاں سے نکال کر ایک سائڈ پر روک لیا تاکہ دوسری گاڑیوں کا راستہ نہ رکے۔ اس وقت اسے سگریٹ کی طلب ہورہی تھی لیکن وہ پیٹرول پمپ پر کبھی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔

اسی وقت پیٹرول پمپ کا کیشیئر آگیا اور بولا۔ ''صاحب، آپ کے اکاؤنٹ میں اتنی رقم نہیں ہے۔''

''وہاٹ؟'' یاسر نے حیرت سے کہا، پھر بولا۔ ''اوکے، میری گاڑی یہیں کھڑی ہے، میں کیش لے کر آتا ہوں۔ میں جلدی میں اے ٹی ایم کارڈ بھی رکھنا بھول گیا۔ اب مجھے واپس گھر جانا ہوگا۔''

''سر! آپ تو ہمارے مستقل کسٹمر ہیں۔ آپ منیجر صاحب سے بات کرلیں۔ پیسے کل دے دیجیے گا۔'' ملازم لڑکے نے کہا۔

''نہیں ٹھیک ہے۔'' یاسر نے کہا۔ ''میں ابھی کیش لے کر آتا ہوں۔''

اس نے گاڑی لاک کی اور جانے کے ارادے سے مڑا تو عقب سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''ایکسکیوزمی، کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتی ہوں؟''

یاسر نے غور سے اس حسین لڑکی کا جائزہ لیا۔ پہلی نظر میں وہ کوئی غیرملکی لگی تھی۔ اس کے بھورے بالوں اور سرخ رنگت سے کوئی بھی دھوکا کھا سکتا تھا۔ اس نے اسکن ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے خوب صورت اور پرکشش چہرے پر بہت دلآویز مسکراہٹ تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں پے منٹ کردیتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' یاسر نے ہنس کر کہا۔ ''میرا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ میں ابھی دس منٹ میں پے

منٹ کردوں گا۔''

''آپ تو تکلف کر رہے ہیں مسٹر......''

''یاسر!'' یاسر نے جلدی سے کہا۔ ''یاسر علی۔''

''آئی ایم زینی!'' لڑکی مسکرا کر بولی۔ ''میرا نام تو زینب ہے لیکن میرے دوست مجھے زینی کہتے ہیں۔''

''آپ کا بہت شکریہ مس زینی لیکن میں......''

''مسز زینت فراز۔'' زینی نے مسکرا کر کہا۔ پھر اس نے پیٹرول پمپ کے ملازم سے کہا۔ ''میری کریڈٹ کارڈ میں سے یاسر صاحب کی پے منٹ بھی کردو۔''

''لیکن مسز زینی، میں......''

''کوئی بات نہیں، آپ یہ رقم مجھے بعد میں لوٹا دیجیے گا۔''

''اے ٹی ایم کارڈ تو مجھے اس کے باوجود لانا پڑے گا۔ آپ ایسا کریں، میرا ویٹ کرلیں میں ابھی آتا ہوں۔''

''ایسی کوئی جلدی نہیں ہے یاسر صاحب۔'' زینی نے کہا۔ ''میری رقم آپ بعد میں ادا کردیجیے گا۔ میں اس وقت جلدی میں ہوں۔'' وہ پیٹرول پمپ کے ملازم لڑکے سے اپنا کریڈٹ کارڈ لے کر گاڑی میں بیٹھی اور اس سے پہلے کہ یاسر اس سے مزید کچھ کہتا، اس نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کردی اور ہاتھ ہلا کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔

یاسر بھی اپنی گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو شاہد اس کی سیٹ پر بیٹھا ٹیلی فون پر کسی سے زور شور سے بحث کر رہا تھا۔ ''یار، تم سری لنکا پر دس ہزار روپے لگا دو...... نو آسٹریلیا، نو ساؤتھ افریقا اور نو پاکستان...... ارے یار کہا نا کہ سری لنکا......''

اچانک اس کی نظر یاسر پر پڑی جو اس کو گھور رہا تھا۔

''میں بعد میں بات کرتا ہوں۔'' شاہد نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''تم پھر یہاں بیٹھ کر سٹہ کھیل رہے ہو؟'' یاسر نے آنکھیں نکالیں۔ ''آخر تم میرے ہی کمرے میں یہ نحوست کیوں پھیلاتے ہو؟''

''سوری سر...... میں...... آئندہ......''

''دیکھو شاہد!'' یاسر نے کہا۔ ''تم ہمیشہ ہارتے ہو اور مقروض رہتے ہو، آخر تم یہ جوئے اور سٹے کی لعنت چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''سر! بس یہ لاسٹ ٹائم ہے۔ اس ورلڈ کپ کے بعد میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ میرے کمرے میں تو اتنا رش ہوتا ہے کہ سکون سے بات بھی نہیں ہوسکتی اس لیے میں......''

''آئندہ اس نحوست کے لیے میرا کمرا استعمال مت کرنا ورنہ مجھے بیگ صاحب سے شکایت کرنا پڑے گی۔''

''سر! میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے نا کہ اس ورلڈ کپ کے بعد یہ سب چھوڑ دوں گا۔ آپ پلیز باس سے میری شکایت مت کیجیے گا۔''

اسی وقت انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ یاسر نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔ ''یس باس، میں ابھی آیا ہوں...... جی آتا ہوں۔''

شاہد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''سر! آپ باس کے پاس جارہے ہیں۔ پلیز انہیں کچھ مت بتائیے گا۔''

''نہیں بتاؤں گا لیکن صرف اس ورلڈ کپ تک۔''

''سر...... وہ...... ایک بات اور ہے۔'' شاہد جھجکتے ہوئے بولا۔

''اب کیا ہے؟'' یاسر نے اسے گھورا۔

''میں نے باس کو لون کی درخواست دی تھی۔ آپ سفارش کردیں تو......''

''میں اسی لیے کہتا ہوں کہ یہ جوا اور سٹہ ایک دن تمہیں فٹ پاتھ پر لے آئے گا۔ میں دیکھتا ہوں۔''

''تھینک یو سر۔'' شاہد نے خوشامد سے دانت نکال دیے۔

شاہد موشیج ایڈورٹائزنگ میں کمرشل فلم ڈائریکٹر تھا۔ وہ جوئے اور سٹے کا رسیا تھا۔ کمرشل فلم ڈائریکٹر ہونے کی وجہ سے بے شمار ماڈل گرلز اس کے آگے پیچھے گھومتی تھیں اور ہر دو چار دن بعد اس کے ساتھ کوئی نئی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی اس لیے اپنی کمائی لڑکیوں، جوئے اور شراب پر لٹاتا تھا لیکن وہ صف اول کا ڈائریکٹر تھا۔ اس کی بنائی ہوئی کئی کمرشل فلمز ایوارڈ جیت چکی تھیں اس لیے وہ ایجنسی کی مجبوری تھا ورنہ بیگ صاحب بھی اس کی حرکتوں سے واقف تھے۔

یاسر کے جاتے ہی وہ پھر زور شور سے ٹیلی فون پر مصروف ہوگیا۔

یاسر دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ پُرجوش انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''کیا...... سری لنکا جیت گیا...... وری گڈ، آج کا دن واقعی میرے لیے لکی ہے...... اب ایسا کرو کہ......''

''شاہد!'' یاسر نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم ابھی تک یہیں ہو؟''

''سر میں آج جیت گیا ہوں۔ اس جیت میں آپ کا بھی حصہ ہے۔''

''میرے حصے کو چھوڑو۔'' یاسر نے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ اب تمہیں لون کی ضرورت تو نہیں ہے نا؟''

''نو سر، اب تو میں بیگ صاحب کو لون دے سکتا ہوں۔''

''ویسے تمہارا لون منظور ہو چکا ہے۔ اکاؤنٹنٹ سے لے لینا۔ میں جانتا ہوں کہ شام تک پھر تمہیں لون کی ضرورت پڑے گی اور اب ذرا کام بھی کر لو۔ سن ٹیک انٹرپرائزز کا بزنس منیجر ویٹنگ روم میں تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

دوسرے دن یاسر آفس جانے کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا کہ اسے فٹ پاتھ پر زینی نظر آئی۔ یاسر نے اسے دیکھ کر گاڑی روک لی اور شیشہ کھول کر بولا۔ ''ہیلو۔''

زینی نے چونک کر اسے دیکھا اور تیزی سے اس کے نزدیک آ کر بولی۔ ''ہائے، کیسے ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں لیکن آج آپ کی گاڑی کہاں ہے؟''

''میری گاڑی!'' زینی کھلکھلا کر ہنس دی۔ ''وہ میری ایک فرینڈ کی گاڑی تھی۔ وہ کچھ دن کے لیے اسلام آباد گئی تھی تو میں نے گاڑی اس سے لے لی تھی۔ اب پھر وہی رکشا، ٹیکسی کی خواری۔''

''آئیے، میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔''

''زحمت نہ کریں، میں چلی جاؤں گی۔'' زینی نے کہا۔

''پلیز مسز زینی۔'' یاسر نے کہا۔ ''پھر مجھے آپ کا قرض بھی تو چکانا ہے۔''

''آپ نے کر دی نا غیروں والی بات۔'' زینی مسکرا کر بولی۔

''لیکن مسز زینی، میں......''

''آپ مجھے صرف زینی نہیں کہہ سکتے؟'' زینی نے کہا۔ ''میرے تمام بے تکلف دوست مجھے زینی ہی کہتے ہیں۔''

''تو میں آپ کا بے تکلف دوست ہوں۔'' یاسر مسکرایا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، تمہارے ہسبینڈ کہاں جاب کرتے ہیں؟''

''کیا نہیں ہیں مسٹر یاسر؟'' زینی نے کہا۔

''مسٹر یاسر بھی کہہ رہی ہو اور بے تکلف دوست......''

''سوری یاسر۔'' زینی جلدی سے بولی۔ ''اصل میں کچھ لوگ ایسی مقناطیسی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں کہ وہ خود بخود دوسروں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔''

یاسر کو اندازہ تھا کہ اس کی شخصیت لڑکیوں کے لیے خاصی پرکشش ہے۔

''میرے ہسبینڈ دبئی میں ہیں۔ میری چھ سال کی ایک بیٹی ہے۔ وہی میرے لیے سب کچھ ہے۔'' پھر وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بس یاسر، مجھے یہیں اتار دو۔''

''یہاں کہاں زینی؟'' یاسر نے پوچھا۔

''میرا آفس اس سامنے والی بلڈنگ میں ہے۔''

''تم جاب کرتی ہو؟'' یاسر نے کہا۔ ''میں آفس سے واپسی پر یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''اور اگر میں نہ آئی تو؟'' زینی شوخی سے بولی۔

''تو پھر میں تمہارے آفس لینے پہنچ جاؤں گا؟''

''ایسا غضب مت کرنا۔'' زینی کچھ گھبرا گئی۔ ''میرا شوہر فراز بہت شکی مزاج ہے۔ اسے بھنک بھی مل گئی تو وہ میری زندگی جہنم بنا دے گا۔''

''لیکن فراز تو دبئی میں ہے۔'' یاسر نے کہا۔

''ہاں، لیکن آفس میں اس کے کئی دوست ہیں۔ وہ دبئی جانے سے پہلے اسی آفس میں جاب کرتا تھا۔ اسے کوئی نہ کوئی بتا دے گا۔''

''اوہ۔'' یاسر نے تشویش سے کہا۔ ''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ یہاں میرا انتظار کرنا۔''

''جانے دو گے تو آؤں گی نا۔'' زینی نے کہا۔

یاسر نے ہنستے ہوئے زینی کی سائڈ کا دروازہ کھول دیا۔

وہ آفس سے نکلا تو زینی روڈ عبور کر کے تیزی سے اس کی طرف آ رہی تھی۔ وہ بے تکلفی سے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

یاسر اسے ایک صاف ستھرے ریستوران میں لے گیا۔ وہاں اس نے ہال میں بیٹھنے کے بجائے فیملی کیبن کو ترجیح دی۔

"یاسر!" زینی نے باتوں کے درمیان کہا۔ "میں شروع ہی سے ایک بات نوٹ کررہی ہوں کہ تم کچھ پریشان ہو؟"

"ہاں، مجھے اپنی بیٹی صومی کی طرف سے پریشانی ہے۔ وہ پیدائشی طور پر ڈائی بیٹک ہے۔ اس معصوم کے دونوں گردے ناکارہ ہوگئے ہیں۔"

"او مائی گاڈ!" زینی نے افسردگی سے کہا۔ "ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟"

"ڈاکٹر تو کڈنی ٹرانسپلانٹ کرنا چاہتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی پرفیکٹ میچ ملا، اس کا آپریشن کردیا جائے گا۔"

"اس میں تو بہت زیادہ اخراجات بھی ہوں گے۔" زینی نے کہا۔

"ہاں پندرہ، بیس لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔"

"یاسر! میری بھی کچھ سیونگ ہے۔" زینی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں، پرابلم پیسے کا نہیں ہے، اتنی رقم تو میں نے جمع کرلی ہے بس ڈاکٹر کی طرف سے گرین سگنل کا انتظار ہے۔ آپریشن اور دیگر اخراجات کی رقم تو میرے اکاؤنٹ میں ہے۔"

یاسر محسوس کررہا تھا کہ زینی آہستہ آہستہ اس کے حواس پر چھارہی ہے۔ اب وہ شام کے بجائے اس کے ساتھ پورا دن گزارنے کا خواہش مند تھا۔ وہ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ یہ سب کچھ غلط ہے۔ وہ شہلا کے اعتماد کا خون کررہا ہے۔ شادی سے پہلے اس نے بہت سے فلرٹ کیے تھے لیکن شادی کے بعد وہ سیدھی سادی زندگی گزار رہا تھا۔ وہ اب یونیورسٹی کا لاابالی لڑکا نہیں تھا بلکہ معاشرے کا ایک معزز فرد تھا۔ ایک پیار کرنے والی بیوی کا شوہر اور ایک خوب صورت اور حساس بچی کا باپ تھا۔ اس کی اس حرکت کا علم شہلا کو ہو جاتا تو وہ ٹوٹ کر رہ جاتی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کی بچی بیمار تھی۔ ایک طرح سے وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر شہلا کا نام تھا۔ اس نے بٹن دبا کر کال ریسیو کرلی۔

"ہاں، شہلا؟" اس نے پوچھا۔

"یاسر!" شہلا نے سراسیمگی کے عالم میں کہا۔ "صومی کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ میں اسے اسپتال لے جارہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں بھی اسپتال پہنچتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کردیا اور کرسی کی پشت پر پڑا ہوا کوٹ پہننے لگا۔

وہ دفتر سے نکلنے ہی والا تھا کہ ایک مرتبہ پھر سیل فون بج اٹھا۔ اس مرتبہ زینی کی کال تھی۔

"ہاں، زینی، کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں یاسر۔" زینی نے کہا۔ "میں آج تم سے نہیں مل سکوں گی۔" اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

یاسر خود بھی یہی چاہتا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے زینی سے پوچھا۔ "کیوں، خیریت تو ہے؟"

"ہاں خیریت ہے...... وہ فراز کچھ دن کی چھٹی پر پاکستان آگیا ہے۔"

یاسر نے طویل سانس لیا اور بولا۔ "اوکے، کوئی بات نہیں۔"

"میں تمہیں رات میں کال کروں گی۔" یہ کہہ کر زینی نے عجلت میں سلسلہ منقطع کردیا۔

یاسر نے ٹیبل سے لیپ ٹاپ اور گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور دفتر سے نکل گیا۔

☆☆☆

"اتنے پریشان کیوں ہو یاسر؟" شہلا نے کہا۔ "صومی ٹھیک ہے۔ ہم اس کا ڈائی لیسز کرانا بھول گئے تھے نا۔ اب اس کا ڈائی لیسز ہورہا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

اسی وقت ڈاکٹر فضل بھی وہاں آگیا۔ ڈاکٹر فضل گنتی کے چند بہترین کڈنی اسپیشلسٹ میں سے ایک تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ یاسر کو دیکھ کر مسکرایا۔

"ہیلو ڈاکٹر!" یاسر نے کہا۔ "صومی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ پریشان مت ہو...." پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "مسٹر یاسر! آپ ایک ڈائی لیسز مشین خرید لیں۔ میرے خیال میں آپ وہ مشین خرید سکتے ہیں۔"

"مشین تو خرید سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" یاسر نے کہا۔ "لیکن کوئی ایمرجنسی تو نہیں ہے؟"

"نہیں بھئی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ڈائی لیسز مشین گھر میں ہوگی تو آپ کو یوں ایمرجنسی میں اسپتال کی طرف نہیں دوڑنا پڑے گا۔ مشین کو آپریٹ کرنا بہت آسان ہے۔ میں آپ دونوں کو ابھی سکھا دیتا

ہوں کہ اسے کیسے آپریٹ کیا جائے گا۔"
صومی اس وقت آرام سے لیٹی ہوئی آئی فون پر کوئی گیم کھیل رہی تھی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر یاسر نے شہلا سے کہا۔ "تم صومی کو لے کر گھر آجانا۔ میں آج ہی ڈائی لیسز مشین خرید لیتا ہوں۔"
ڈاکٹر نے یاسر کو اس شاپ کا ایڈریس بتایا اور اپنا کارڈ بھی دے دیا۔
شام تک اس نے ڈائی لیسز مشین صومی کے کمرے میں انسٹال کروی۔
"پاپا! یہ کیا ہے؟"
"بیٹا، یہ ڈائی لیسز مشین ہے۔" یاسر نے اسے بتایا۔ "ابھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا، اس لیے آپ کو اس مشین کی ضرورت پڑے گی پھر جب آپ ٹھیک ہو جائیں گی تو ہم اسے ہٹا دیں گے۔"
"پاپا، میری طبیعت کب ٹھیک ہو گی؟" صومی نے معصومیت سے پوچھا۔
"بیٹا! ڈاکٹر انکل کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت بہت جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔"
ڈائی لیسز مشین آنے کے بعد یاسر کو صومی کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے پھر اپنے کام پر توجہ دی۔ کئی بڑے بڑے پروجیکٹ التوا میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ دن رات ان پر کام کرنے لگا۔ اس دوران میں اسے ایک آدھ دفعہ زینی کا خیال بھی آیا تھا لیکن اس کے انداز میں ایسی شدت نہیں تھی۔
ان ہی دنوں یاسر کے بنائے ہوئے ایک اشتہار نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی۔ اشتہار کے آئیڈیا کے ساتھ ساتھ اس اشتہار کی پس منظر موسیقی، جنگل اور خاص طور پر ماڈل گرل کا بہت شہرہ تھا۔ اس اشتہار کی موسیقی کے لیے ملک کے ایک بہترین موسیقار کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس کا جنگل یاسر نے خود لکھا تھا۔
کمپنی کے کام سے متاثر ہو کر کلائنٹ نے پوری کمپنی کو ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر دیا۔ اس تقریب کا خصوصی مہمان یاسر تھا۔ شہلا اپنی مصروفیات اور صومی کی وجہ سے اس ڈنر میں شریک نہیں تھی۔
یاسر، بیگ صاحب اور اشتہار کے کلائنٹ سرور صاحب کے ساتھ کھڑا بات چیت کر رہا تھا کہ اشتہار کی ماڈل ریشماں، یاسر کی طرف بڑھی اور بہت گرم جوشی سے بولی۔ "ہیلو مسٹر یاسر! کیسے ہیں آپ؟"
"میں ٹھیک ہوں۔" یاسر نے کہا۔
اس دوران میں بیگ صاحب اور سرور صاحب وہاں سے ہٹ چکے تھے۔
"ہمارے شہر میں آپ جیسے باصلاحیت اور جینئس لوگ موجود ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں ہے۔" ریشماں نے کہا۔
یاسر نے پہلی مرتبہ غور سے اسے دیکھا۔ اس لڑکی کے چہرے پر اگر میک اپ کی بھاری تہ نہ ہوتی تو خاصی خوب صورت نظر آتی۔ پھر اس کے بولنے کا انداز۔ یاسر کو اس قسم کے مصنوعی لوگوں سے چڑ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔
"کیا بات ہے مسٹر یاسر!" ریشماں نے کہا۔ "آپ کچھ ڈسٹرب ہیں؟"
یاسر کا دل تو چاہا کہ اس سے کہہ دے، آپ کی وجہ سے ڈسٹرب ہوا ہوں لیکن صرف مسکرا کر رہ گیا اور بولا۔ "بس، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں اصل میں اپنی وائف کا ویٹ کر رہا ہوں۔ وہ ابھی تک آئی نہیں۔"
"آپ ڈرنک کرتے ہیں؟"
"نہیں مس ریشماں، میں اس "نعمت" سے اب تک محروم ہوں۔"
"حیرت ہے، آپ کری ایٹو آدمی ہو کر بغیر ڈرنک کے کام کیسے کرتے ہیں؟"
"اگر ڈرنک ہی سے کام ہو جاتا تو اس شہر میں جتنے شرابی ہیں، سب کری ایٹو ہوتے۔" یاسر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
اچانک اس کی نظر ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی زینی پر پڑی۔ اسے دیکھ کر یاسر کو حیرت ہوئی۔ وہ اس پارٹی میں کیسے موجود تھی۔
وہ ریشماں سے بولا۔ "ایکسکیوز می۔" اور تیزی سے زینی کی طرف بڑھا۔
اس سے پہلے کہ وہ زینی تک پہنچتا، کرخت چہرے والا ایک شخص وہاں پہنچ گیا اور بلند آواز میں زینی سے بولا۔ "ہائے ڈارلنگ، تمہیں زیادہ دیر ویٹ تو نہیں کرنا پڑا؟"
"نہیں میں بھی ابھی آئی ہوں۔" اس نے اجنبی نظروں سے یاسر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس کرخت چہرے والے سے بولی۔ "فراز کہیں کھلی فضا میں چلو، یہاں میرا دم

گھٹ رہا ہے۔"

"میں نے ڈنر آرڈر کر دیا ہے ہنی۔" فراز نے اکھڑپن سے کہا۔ "اب ہم یہاں سے ڈنر کر کے ہی نکلیں گے۔"

"اچھا تو یہ فراز ہے؟" یاسر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "زینی جیسی نفاست پسند لڑکی اگر اس اجڈ کے ساتھ خوش نہیں ہے تو اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔"

"یاسر صاحب!" ریشماں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "آپ یہاں کھڑے ہیں اور بیگ صاحب آپ کو وہاں تلاش کر رہے ہیں۔"

یاسر نے مسکرا کر ریشماں کو دیکھا اور بیگ صاحب کی طرف چل دیا۔ سامنے سے آتے ہوئے شاہد سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "یار، شاہد! اس مصیبت سے تو میرا پیچھا چھڑا جو میرے پیچھے آرہی ہے۔"

شاہد نے اس کی عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "سر! آپ ریشماں کی بات کر رہے ہیں۔ وہ تو کسی آدمی کو لفٹ ہی نہیں کراتی اور آپ اسے مصیبت کہہ رہے ہیں۔"

"لیکن اس وقت اس سے میرا پیچھا چھڑاؤ۔" یاسر نے جھنجلا کر کہا۔

"اوکے باس۔" شاہد نے سر جھکا کر کہا اور ریشماں کی طرف بڑھ گیا۔

یاسر کو رہ رہ کر زینی کے اکھڑے اکھڑے رویے کا خیال آرہا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے متعارف نہ کراتی لیکن یوں اجنبی انداز میں تو اس کی طرف نہ دیکھتی۔ یاسر اپنی مردانہ وجاہت اور خوش لباسی کے باعث لڑکیوں میں ہمیشہ مقبول رہا تھا۔ زینی کا اجنبی رویہ اس کی انا پر گویا تازیانہ تھا۔

کھانے میں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ وہ کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ شاہد اس کے پاس آگیا اور آہستہ سے بولا۔ "سر! آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔"

اس کا رازدارانہ انداز دیکھ کر یاسر اس کے ساتھ باہر لابی میں نکل آیا اور بولا۔ "ہاں، بولو کیا بات ہے؟"

"ریشماں ایئر سائن ایڈورٹائزرز کی مستقل ملازم ہے اور وہ ایک مقصد کے لیے آپ کے پیچھے لگائی گئی ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ ایئر سائن والے گزشتہ کئی مہینے سے مجھے مختلف قسم کی آفرز دے رہے ہیں کہ میں موشیج چھوڑ کر ایئر سائن جوائن کرلوں۔ انہوں نے مجھے ڈبل سیلری کی آفر دی ہے، اس کے ساتھ ساتھ سال میں دو بونس، نیے ماڈل کی کار اور تفریحی الاؤنس۔"

"سر، تو پھر اس موقع سے فائدہ اٹھالیں...... یہاں کیا رکھا ہے؟"

"تمہاری عقل شاید گھاس چرنے چلی گئی ہے۔" یاسر نے کہا۔ "ایئر سائن کو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں مارکیٹ میں، موشیج کے پیچھے پچاس سال کا تجربہ اور بیگ صاحب کی محنت ہے۔ ایئر سائن کا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا۔ اس کے پاس ایک آدھ کے علاوہ سب چھوٹے کلائنٹ ہیں میں موشیج کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ہاں یوروٹنگ ایڈورٹائزرز کی طرف سے کوئی آفر آئے تو میں سوچوں گا۔" پھر یاسر چونک کر بولا۔ "ریشماں کے ذریعے بھلا وہ کون سا فائدہ حاصل کرنا چاہ رہے ہیں اور ہاں، آج کے بعد ریشماں کو کسی کمرشل فلم میں بک مت کرنا۔" یہ کہہ کر وہ دوسرے مہمانوں کی طرف بڑھ گیا۔

پھر پورا ہفتہ یاسر اپنے کام میں معروف رہا۔ وہ جب کام کرتا تھا تو جنونیوں کی طرح کام کرتا تھا۔ وہ گزشتہ دو دن سے آفس ہی میں تھا گھر جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس دن اس نے کام جلدی ختم کرلیا تھا اور گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

آفس سے باہر نکلتے ہی اس کی نظر زینی پر پڑی۔ وہ یاسر کو رکنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی یاسر نے گاڑی روک دی۔ زینی بے تکلفی سے پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی پھر بولی۔ "یاسر! میں جانتی ہوں تم مجھ سے ناراض ہو۔"

"مجھے ناراض ہونے کا کیا حق پہنچتا ہے؟" یاسر نے رکھائی سے کہا۔

"یاسر پلیز، اس وقت میں بہت مجبور تھی۔ میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ فراز کتنا اجڈ اور اکھڑ آدمی ہے۔ اسے اگر شبہ بھی ہو جاتا تو وہ بھرے مجمع میں میری تذلیل کر دیتا اور لوگوں کے سامنے تشدد سے بھی باز نہ آتا۔"

"وہ اتنا جنگلی ہے تو تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

"کیسے چھوڑ دوں؟" زینی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو وہ میری بچی کو مجھ سے چھین لے گا اور میں شاید اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں۔ مجھے اس جنگلی کے ساتھ گزارہ کرنا ہی ہوگا۔ تم خود بھی تو ایک بچی کے باپ ہو، تم میری کیفیت اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔"

"تو اب تم کیسے آگئیں۔"

''وہ واپس دبئی جا چکا ہے۔'' پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ''آج کی رات ہماری ہے۔ میں تم سے دل بھر کے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

یاسر اسے ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ وہیں زینی نے یہ تجویز رکھی کہ کچھ دیر کے لیے تم میرے ساتھ چلو میری ایک سہیلی کا بنگلا ہے وہ پنڈی گئی ہوئی ہے وہیں میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی دکھ بھری پوری کہانی سنانا چاہتی ہوں۔'' وہ زینی کا دکھ سمجھ رہا تھا۔ وہ بے چاری اپنے حالات کی ماری ہوئی تھی۔ اور یاسر سے بات کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔

''تو پھر چلیں؟'' زینی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''ایک منٹ۔'' یاسر نے کہا۔ ''میں ایک فون کر لوں۔'' اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور زینی سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ سلسلہ ملنے پر وہ بولا۔ ''ہیلو شہلا! مجھے آج بھی دیر ہوگئی۔''

''تم آفس سے بات کر رہے ہو؟'' شہلا نے پوچھا۔

''نہیں، میں اس وقت ایک کلائنٹ کے ساتھ باہر ہوں۔ مجھے فوری طور پر ایک ایڈورٹائزنگ کمپین بنانا ہے۔ ہاں، صومی کیسی ہے؟''

''صومی ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہے، بس آپ کو یاد کر رہی ہے۔''

''میں گھر پہنچ کر سارا وقت صومی کے ساتھ گزاروں گا، او کے خدا حافظ۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور زینی کے نزدیک پہنچ گیا۔

ایک مرتبہ پھر وہ زینی کے ساتھ گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ زینی بتا رہی تھی اور وہ اس کے کہنے پر دائیں بائیں مڑ رہا تھا۔ بالآخر وہ گلستان جوہر کے آخری حصے میں پہنچ گئے۔ وہاں بڑے بڑے بنگلے بنے ہوئے تھے مگر دور دور تھے۔ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ زینی نے جس بنگلے کا بتایا وہاں اتر کر اس نے ناقدانہ نظروں سے بنگلے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''واقعی بہت خوب صورت بنگلا ہے۔'' پھر وہ زینی کی طرف متوجہ ہوا۔ ''لیکن تم سے زیادہ خوب صورت نہیں ہے۔''

زینی صرف مسکرا کر رہ گئی۔ اس نے پرس سے چابی نکالی اور گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئی بنگلا اندر سے فرنشڈ تھا۔ زینی نے بتایا کہ اس کی سہیلی اپنے بچوں کے ساتھ ایک ماہ کے لیے بھائی اور بہن کی شادی میں گئی ہوئی ہے۔ یہاں کے حالات کو مدنظر رکھ کر اس نے چابی مجھے دے کر کہا تھا کہ ایک دو دن بعد چکر لگا لیا کرنا۔ ابھی ابھی مجھے خیال آیا کہ تم سے کھل کر باتیں کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔''

یاسر نے بیڈ روم میں داخل ہو کر کہا۔ ''تم ایسا کرو، پہلے فریش ہو جاؤ۔ مجھے کچھ تھکی تھکی سی لگ رہی ہو۔''

زینی خاموشی سے اٹھی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

زینی واش روم سے نکلی تو خاصی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس نے نہ صرف منہ دھو لیا تھا بلکہ ہلکا سا میک اپ بھی کر لیا تھا اور بال بھی سنوار لیے تھے۔ پھر اس نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ''اب تم بھی فریش ہو جاؤ، بہت سکون ملے گا۔''

یاسر اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

وہ فریش ہو کر باہر نکلا تو زینی چائے بنانے میں مصروف تھی۔

یاسر جوتے اتار کے بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

''پہلے چائے پی لو۔'' زینی نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' اکیلا پن اور اتنی قربت، وہ تو گھڑی بھر کے لیے باتیں کرنے آیا تھا مگر اس لمحے نے دوران خون بڑھا دیا۔ اس نے ذہن کو قابو میں کرنے کے لیے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور چائے کے گھونٹ لینے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں زینی کا نرم و نازک ہاتھ تھا۔

اس کا ذہن بوجھل ہو کر گویا ہوا میں اڑنے لگا۔ یہ زینی کے قربت کا نشہ تھا یا پھر یاسر کے جذبات کی شدت یا پھر اس شیریں تر چائے کی لذت وہ خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا تھا اس نے جذبات بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم اگر مجھے نہ ملی ہوتیں زینی تو میں......''

''میں بھی تمہارے بغیر خود کو ادھورا سمجھنے لگی ہوں یاسر۔'' زینی نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا اور ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔

کمرے میں اچانک گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اندھیرے میں زینی کی مترنم ہنسی کی آواز گونج رہی تھی۔

اچانک کمرا تیز روشنی میں نہا گیا اور کسی نے بال پکڑ کے زینی کو بیڈ سے گھسیٹ لیا۔

کمرے میں دراز قد اور کسرتی جسم کا ایک نوجوان

کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر تضحیک کے آثار تھے۔ سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ نوجوان کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔
اس نے زینی کو بال پکڑ کر کھڑا کیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔
''د......دیکھو......اسے کچھ مت کہنا۔'' یاسر اس افتاد سے بوکھلا گیا تھا۔ ''ک ک......کون ہو تم؟''
''تجھے اپنی بیوی کا بہت خیال ہے تو مال نکال۔''
نوجوان نے درشت لہجے میں کہا۔
''ہاں ہاں، سب کچھ لے لو۔ جو کچھ میرے پاس ہے سب کچھ لے لو لیکن ہماری جان چھوڑ دو۔'' یہ کہہ کر یاسر نے اپنا پرس، سیل فون اور گھڑی اتار کر اس کی طرف بڑھا دی۔
نوجوان نے وہ سب چیزیں اس سے جھپٹ لیں اور ہاتھ بڑھا کر زینی کا ہینڈ بیگ بھی اٹھا لیا پھر اس نے یاسر کا پرس اور زینی کا ہینڈ بیگ فرش پر الٹ دیا۔ وہ پرس سے نکلنے والے قومی شناختی کارڈ دیکھ کر بولا۔ ''یاسر حمید......اور...... یہ زینت فراز...... یہ کیا چکر ہے۔ یہ تمہاری بیوی تو نہیں ہے پھر اس کے پرس میں جو تصویر ہے، وہ کسی دوسرے مرد کی ہے اور تمہارے پرس سے کسی دوسری عورت کی تصویر نکلی ہے۔'' پھر وہ منہ بنا کر بولا۔ ''اوہو، اب میں سمجھا۔ تم لوگ یہاں عیاشی کرنے آئے ہو۔ یہ بنگلا ایک ہفتے سے میری نظر میں تھا۔ میں اس کا صفایا کرنا چاہتا تھا اسی نیت سے داخل ہوا تھا۔''
''دیکھو۔'' یاسر نے کہا۔ ''میرے پاس جتنی رقم تھی وہ میں نے تمہیں دے دی۔ اب تم پلیز یہاں سے جاؤ۔''
''ابے تیرے پاس تھا ہی کیا؟'' نوجوان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''بارہ ہزار سات سو روپے اور اس چھمک چھلو کے پاس تو مشکل سے ہزار روپے ہی تھے۔''
''میرے پاس اب کچھ نہیں ہے۔'' یاسر نے کہا۔
''تو پھر تجھے عیاشی کرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ اب تیری جگہ میں عیاشی کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے ریوالور کے دستے سے یاسر کے چہرے اور سر پر دو تین وار کیے۔ یاسر فوراً ہی بے ہوش ہوگیا۔
یاسر کو دوبارہ ہوش آیا تو اس کے سر میں درد کی وجہ سے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ چہرے کی جلد دو تین جگہ سے ادھڑ گئی تھی اور چہرے پر خون کے دھبے تھے۔
اس نے سر گھما کر صوفے کی طرف دیکھا تو اسے زینی دکھائی دی۔ اس کی حالت ابتر تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے، لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے۔
یاسر کو شدید شرمندگی ہو رہی تھی۔ وہ بمشکل تمام بیڈ سے اٹھا اور زینی کے نزدیک پہنچ کر بولا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ......''
''تمہارے افسوس کرنے سے کیا ہوگا یاسر؟'' زینی نے زخمی لہجے میں کہا۔ ''وہ لٹیرا تمہارے تو صرف چند ہزار روپے لوٹ کر لے گیا لیکن......میں......میں تو بالکل تہی دست ہوگئی۔'' زینی بری طرح سسکنے لگی۔ ''میں تو آج خود اپنی ہی نظروں میں گر گئی ہوں یاسر، قصور میرا ہی تھا مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''
''دیکھو زینی جو کچھ ہوا مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ میں تم سے معافی مانگنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ میں تو......''
''میں تمہیں کوئی الزام نہیں دے رہی ہوں جب خواہشیں بے لگام اور جذبے اندھے ہو جاتے ہیں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔ ہمارے درمیان صرف دوستی اور اپنائیت کا رشتہ ہے لیکن کون یقین کرے گا۔''
''میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔'' یاسر نے ریسیور کریڈل سے اٹھاتے ہوئے کہا۔
''یاسر پلیز، اب مجھے مزید تماشا مت بناؤ۔ ہم پولیس کو کیا بتائیں گے کہ اس خالی بنگلے میں ہم کیا کر رہے تھے؟ اور تم کیا سمجھتے ہو، یہ بات میرے شوہر سے چھپی رہے گی؟ تمہاری بیوی کو اس کا علم نہیں ہوگا؟ مجھے تمہاری بیوی کے ردعمل کا تو اندازہ نہیں ہے لیکن میرا شوہر مجھے ذبح کر دے گا۔ اگر وہ جان سے نہ بھی مارے تو کھڑے کھڑے طلاق دے دے گا اور بچی کو مجھ سے اتنی دور لے جائے گا کہ میں اس کی پرچھائیں کو بھی ترسوں گی۔''
''پھر کیا کیا جائے؟'' یاسر نے کہا۔
''بس اب مجھ پر ایک احسان کرو۔'' زینی نے کہا۔ ''آیندہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔''
''تم پہلے اپنی حالت درست کرو۔ ابھی تم شاک میں ہو، ہم بعد میں بات کریں گے۔''
زینی لڑکھڑاتی ہوئی واش روم کی طرف چلی گئی۔ یاسر اسے دیکھ کر افسردہ ہوگیا۔
☆☆☆
یاسر گھر میں داخل ہوا تو شہلا اس کی حالت دیکھ کر

پریشان ہوگئی اور گھبرا کر بولی۔ ”یاسر، یہ کیا ہوا۔ تم زخمی کیسے ہوگئے؟“

”پریشان مت ہو شہلا، معمولی سی خراشیں ہیں۔ مجھے کچھ غنڈوں نے گھیر لیا تھا۔ میرا والٹ اور سیل فون لے گئے۔“

”یہ وارداتیں تو روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہیں۔“ شہلا نے کہا۔ ”تم نے ضرور ہیرو بننے کی کوشش کی ہوگی۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ یاسر نے کہا۔ ”میں اپنی خون پسینے کی کمائی انہیں آرام سے تھما دیتا؟“

”پیسے تمہاری زندگی سے زیادہ تو نہیں ہیں۔ یہ لٹیرے تو ایک ہزار کے لیے بھی گولی مار دیتے ہیں۔“

”ویسے میں نے اپنی سم اور کریڈٹ کارڈز بلاک کرا دیے ہیں۔“ یاسر نے کہا۔

”شکر ادا کرو کہ تمہاری جان بچ گئی۔“

”صومی کیسی ہے؟“ یاسر کو اچانک صومی کا خیال آگیا۔

”میں ٹھیک ہوں پاپا۔“ اچانک صومی کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کب اپنے کمرے سے اٹھ کر وہاں آگئی تھی۔

”ارے میرا بیٹا، وہاں کیوں کھڑا ہے؟“ یاسر نے کہا۔ ”ادھر آؤ۔“

”پاپا، یہ آپ کے منہ پر کیا ہوا؟“

”بیٹا، میں سیڑھیوں سے پھسل گیا تھا۔“

”صومی بیٹا!“ شہلا نے کہا۔ ”میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ ناک کیے بغیر کسی کے روم میں نہیں جاتے۔“

”پاپا کے روم میں بھی نہیں؟“ صومی نے معصومیت سے پوچھا۔

”ہاں بیٹا، پاپا کے روم میں بھی نہیں۔“

”اوکے مما۔“ صومی نے کہا۔ ”میں آئندہ ناک کیے بغیر نہیں آؤں گی، سوری۔“

”چلو بیٹا۔“ یاسر نے کہا۔ ”ہم آپ کے روم میں چلتے ہیں۔“ اس نے صومی کو گود میں اٹھالیا۔

”یاسر، تم فریش ہو جاؤ تو میں تمہارے زخموں کی صفائی کردوں، کھانے کے بعد کوئی پین کلر بھی لے لینا۔“

دوسرے دن یاسر دفتر پہنچا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت آفس کا پیون اس کے لیے چائے اور ایک ڈبا لے آیا۔ اس نے ڈبا یاسر کے حوالے کردیا اور خاموشی سے چلا گیا۔

اس ڈبے میں سیل فون تھا۔ یاسر کا سیل فون تو رات وہ لٹیرا لے گیا تھا۔ اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے ڈبا کھول کر سیل فون نکالا اور اس میں ڈپلی کیٹ سم کارڈ جو آتے وقت نکلوالایا تھا اسے لگا کر آن کردیا۔

اس نے چائے ختم کر کے لیپ ٹاپ پر کام شروع کیا ہی تھا کہ سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یاسر نے سیل فون کے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہاں صرف ایک نمبر بلنک کررہا تھا۔ یاسر نے کچھ سوچ کر فون ریسیو کرلیا۔ ”یس۔“

”او ہیرو، تو کچھ زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش نہیں کررہا ہے؟“ دوسری طرف سے کوئی تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔

”کون بول رہا ہے؟“ یاسر نے پوچھا۔ اسے وہ آواز کچھ مانوس سی لگ رہی تھی۔

”میں پنٹو بول رہا ہوں تیرا باپ۔“ دوسری طرف سے بولنے والے نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اتنی جلدی اپنے باپ کو بھول گیا؟“

اچانک یاسر کو یاد آگیا کہ وہ آواز اسی بدمعاش کی تھی جس نے اسے زینی کے ساتھ ہوٹل میں پکڑا تھا۔

”اچھا تم ہو، بولو اب کیا چاہتے ہو؟“ یاسر بوکھلا کر بولا۔

”تو نے اپنے کریڈٹ کارڈ کیوں بلاک کرائے؟“ پنٹو غرا کر بولا۔

”جتنا کیش میرے پاس تھا، میں نے سب تمہیں دے دیا تھا، اب کریڈٹ کارڈ......“

”زیادہ بک بک مت کر۔“ پنٹو پھر غرایا۔ ”اب تیری سزا یہ ہے کہ تو مجھے پچاس ہزار روپے دے گا، آج ہی۔“

”تم مجھے بلیک میل کرو گے؟“ یاسر نے کہا۔

”بلیک میل۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”اسے تو بلیک میل کہتا ہے؟ یہ تو پنالٹی ہے۔ ورنہ تیری بیوی سے رابطہ کروں گا۔ فون میں اس کا نمبر موجود ہے۔“

”میں تمہیں پچاس ہزار دے دوں گا لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم آئندہ مجھے فون نہیں کرو گے؟“

”کوئی گارنٹی نہیں ہے۔“ پنٹو نے درشت لہجے میں کہا۔ ”جلدی جواب دے یا پھر میں تیری بیوی سے بات کروں؟“

”رقم کہاں چاہیے؟“ یاسر نے دانت بھینچ کر کہا۔

”لیاقت آباد میں جہاں فردوس سینما تھا، چار بجے

وہیں آجاؤ۔'' پنچو نے کہا۔ ''رقم ساتھ لے کر آنا اور کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

یاسر نے سیل فون رکھا ہی تھا کہ بیل پھر بجنے لگی۔ اس نے جھنجلا کر فون اٹھایا۔ اسکرین پر شہلا کا نام دیکھ کر اس کی جھنجلاہٹ کم ہوگئی۔ ''ہاں شہلا؟'' یاسر نے پوچھا۔

''میں کب سے تمہیں کال کر رہی ہوں لیکن تمہارا فون مصروف تھا۔ تم بھول گئے، آج صومی کو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے۔''

''مجھے یاد ہے شہلا۔'' یاسر نے کہا۔ حالانکہ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ آج صومی کو چیک اپ کے لیے لے جانا تھا۔ ''ٹھیک ہے، میں پانچ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔'' یاسر نے کہا۔

وہ اپنے کمرے سے باہر نکلا اور کار پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت سڑکوں پر ٹریفک کا اژدحام تھا۔ یاسر کو اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت بھی اتنا ٹریفک جام ہوگا۔ وہ بمشکل تمام فردوس سینما کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت چار بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔

اچانک اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف پنچو تھا۔ وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''ابے کیا میں یہاں رات بھر تیرا انتظار کرتا رہوں؟''

''میں فردوس سینما کے پاس پہنچ چکا ہوں۔ اصل میں اس وقت ٹریفک بہت ہے اس لیے دیر ہوگئی۔''

اچانک اس کی گاڑی کے شیشے پر کسی نے انگلی سے دستک دی۔ اس نے چونک کر دیکھا، وہاں کوئی اجنبی نوجوان کھڑا تھا۔

یاسر نے شیشہ تھوڑا سا اتار کے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''دروازہ کھولو۔ مجھے پنچو نے بھیجا ہے۔''

یاسر نے دروازہ کھول دیا۔ وہ پھرتی سے پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''میں کیسے یقین کرلوں کہ تمہیں پنچو نے بھیجا ہے؟'' یاسر نے غور سے اس کا جائزہ لے کر کہا۔

وہ سال خوردہ سی ایک جینز اور ٹائٹ ٹی شرٹ میں تھا۔ اس کا جسم خوب پلا ہوا تھا۔ لگتا تھا، وہ پابندی سے جم جاتا ہے۔

''تمہاری مرضی ہے۔'' اس نوجوان نے کہا۔ ''مت دو پیسے، میں پنچو بھائی کو بول دوں گا کہ اس ہیرو نے پیسے دینے سے انکار کر دیا۔''

''ایک منٹ۔'' یاسر نے اسے گاڑی سے اترتا دیکھ کر کہا۔ ''میں ذرا پنچو سے بات کرلوں۔

اس سے پہلے ہی پنچو کی کال آگئی۔ ''ہاں ہیرو، تو نے پیسے دے دیے؟''

''کسے پیسے دوں؟'' یاسر نے کہا۔

''تو کیا حمید تیرے پاس نہیں پہنچا؟''

''ایک منٹ۔'' یاسر نے کہا۔ ''ذرا ہولڈ کرنا۔'' پھر وہ آنے والے نوجوان سے مخاطب ہوا۔ ''نام کیا ہے تمہارا؟''

''میرا نام حمید ہے۔''

''ٹھیک ہے پنچو۔'' یاسر نے سیل فون میں کہا۔ ''میں تمہارے آدمی کو پیسے دے رہا ہوں۔'' اس نے خاکی رنگ کا ایک لفافہ کوٹ کی اندرونی جیب سے نکالا اور حمید کی طرف بڑھا دیا۔ ''گن لو، پورے پچاس ہزار ہیں۔''

''پورے ہی ہوں گے۔'' حمید نے بے نیازی سے کہا۔ ''پنچو بھائی کو دھوکا دینا بہت مشکل ہے۔'' یہ کہہ کر لفافہ اس نے اپنی جینز میں ٹھونسا اور گاڑی سے اتر گیا۔

یاسر کے پاس کئی اہم پروجیکٹ تھے۔ وہ پنچو کی طرف سے مطمئن ہو کر ان پروجیکٹ میں مصروف ہو گیا اس کا خیال تھا کہ پنچو اب اسے پریشان نہیں کرے گا۔ ایک ہفتے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا کہ اچانک اس دن سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

یاسر نے سیل فون کا اسکرین دیکھے بغیر سیل فون کان سے لگا لیا اور بولا۔ ''ہیلو۔''

''ہیلو ہیرو، کیا حال ہے؟'' دوسری طرف پنچو تھا۔

یاسر بری طرح جھنجلا گیا اور بولا۔ ''اب کیا پرابلم ہے؟'' اس کا درشت لہجہ تھا۔

''او ہیرو۔'' پنچو نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ''مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرنا، میں تیرا ماتحت نہیں ہوں۔''

''میں نے پوچھا ہے کہ اب کیا پرابلم ہے؟'' یاسر نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''یار پرابلم ہے، اسی لیے تو فون کر رہا ہوں۔'' پنچو نے کہا۔ ''مجھے فوری طور پر ایک لاکھ کی ضرورت ہے۔''

''کیا؟'' یاسر نے بھنا کر کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو، میں

ne نوٹ چھاپنے کی کوئی مشین لگا رکھی ہے؟"
"تم اس ایجنسی میں نوٹ ہی چھاپ رہے ہو۔ مجھے آج ہر حال میں ایک لاکھ روپے کی ضرورت ہے ورنہ میرے پاس تمہاری محبوبہ کے شوہر کا ٹیلی فون نمبر بھی ہے اور تمہاری بیوی کا بھی۔ جلدی بولو، پیسے دے رہے ہو یا میں دوسرے لوگوں سے رابطہ کروں؟"
یاسر تلملا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ رقم نہ ملنے کی صورت میں پچو فراز سے بھی رابطہ کر سکتا ہے اور شہلا سے بھی۔ شہلا، یاسر پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ اسے جب یہ معلوم ہوگا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی، دوسری طرف زینی تھی۔ فراز کو معلوم ہو جاتا تو وہ تباہ ہو جاتی۔
"او کے۔" یاسر نے کہا۔ "میں تمہیں رقم دے دوں گا۔"
"گڈ بوائے۔" پچو چہک کر بولا۔ "آج پانچ بجے کینٹ اسٹیشن کے سامنے ملو اور پہلے کی طرح دیر مت کرنا۔ مجھے انتظار کرنا پسند نہیں ہے۔" یہ کہہ کر پچو نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
یاسر نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ ڈیڑھ بجے تو یاسر آفس پہنچا تھا پھر اسے پروجیکٹ بھی مکمل کرنا تھا جو آج تو کسی بھی صورت میں مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔
کچھ سوچ کر یاسر نے ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکایا اور آپریٹر سے کہا۔ "ذرا رحمان صاحب سے بات کراؤ۔" اس نے یہ کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔
فوراً ہی فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر نے کہا۔ "سر! رحمان صاحب لائن پر ہیں۔"
"السلام علیکم سر!" یاسر نے زبردستی کی گرم جوشی دکھاتے ہوئے کہا۔
"وعلیکم السلام۔" رحمان صاحب کی آواز آئی۔ "لگتا ہے، تم نے کوئی بہت زبردست آئیڈیا تیار کر لیا ہے میری پروڈکٹ کے لیے؟" وہ ہنس کر بولے۔
"نہیں سر۔" یاسر نے کہا۔ "میں نے آپ کو یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ آپ کا کام آج مکمل نہیں ہو سکے گا۔ آپ یہ میٹنگ کل رکھ لیں سیکنڈ ہاف میں۔"
"وہاٹ؟" رحمان صاحب بھتے سے اکھڑ گئے۔ "آپ کب سے مجھے ٹالتے رہے ہیں مسٹر یاسر۔"
"سر! آپ میری بات تو سنیں، میں کل......"
"سوری مسٹر یاسر۔" رحمان صاحب نے کہا۔ "مجھے آپ سے کام نہیں کرانا ہے۔"
"او کے سر۔" یاسر تلخی سے بولا۔ "کام کرانا یا نہ کرانا آپ کی مرضی پر ہے۔" یہ کہہ کر یاسر نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔
مشکل سے دو منٹ بعد بیگ صاحب اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یاسر انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سر! آپ نے کیوں زحمت کی، آپ مجھے بلا لیتے۔" یاسر نے جلدی سے کہا۔
"بیٹھ جاؤ یاسر۔" بیگ صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ "تم آج کل کن چکروں میں ہو، کام پر دھیان ہی نہیں دے رہے ہو تم نے ابھی رحمان صاحب سے کیا کہا ہے؟"
"وہ مجھ سے کام نہیں کرانا چاہتے ہیں تو میں کیوں ان کی خوشامد کروں؟"
"یاسر، تم جانتے ہو کہ رحمان صاحب کی کمپنی کا ایڈورٹائزنگ بجٹ کتنا ہے؟"
"سر! یہ تو آپ جانتے ہوں گے یا پھر کلائنٹ سروس منیجر۔" یاسر نے کہا۔ "یہ بجٹ وغیرہ میرا شعبہ نہیں ہے۔"
"ان کا سالانہ بجٹ دس کروڑ ہے۔" بیگ صاحب جھنجلا کر بولے۔ "تم چاہتے ہو کہ اتنا بڑا کلائنٹ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے؟" پھر وہ نرم لہجے میں بولے۔ "میں نے ان سے کل تک کا ٹائم لے لیا ہے۔ کل تک ان کا پروجیکٹ مکمل کر لو۔" یہ کہہ کر بیگ صاحب وہاں سے چلے گئے۔
یاسر، ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ بیگ صاحب کے جانے کے بعد اس نے ٹھنڈے دل سے اس صورتِ حال پر غور کیا تو اسے ندامت محسوس ہوئی۔ رحمانی صاحب ایجنسی کے بڑے کلائنٹس میں سے تھے۔ ان کا بزنس اگر کسی دوسری ایجنسی کی طرف چلا جاتا تو بیگ صاحب کو، مونیجمنٹ کو خاصا دھچکا لگتا اور ایک رحمان صاحب ہی کیا یاسر نے تو کئی دوسرے بڑے کلائنٹس سے بھی تعلقات خراب کر لیے تھے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوتا کہ یاسر کو ایجنسی سے نکال دیا جاتا۔ فوری طور پر اسے اتنی اچھی ملازمت کہیں بھی نہیں ملتی۔
وہ یہی سب سوچ رہا تھا کہ نورین اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔
"کیسی ہو نورین؟" یاسر نے پھیکی سی مسکراہٹ

چہرے پر جا کر پوچھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں یاسر، لیکن تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم آج کل نہ جانے کن چکروں میں ہو؟ میں جانتی ہوں کہ تم صومی کی وجہ سے پریشان ہو لیکن ایسی بھی کیا پریشانی، اگر تم اپنی پریشانی مجھ سے شیئر کرو گے تو ممکن ہے میں تمہیں کوئی مناسب مشورہ ہی دے سکوں۔"

"اگر واقعی کوئی پریشانی ہوئی تو میں تم سے ضرور شیئر کروں گا۔" یاسر پھر زبردستی مسکرایا۔

"مجھے بہت افسوس ہے کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ کل ملاقات ہوگی، آل دا بیسٹ۔" نورین نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

یاسر نے اپنا سامان سمیٹا اور روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

اس وقت یاسر کی گھڑی میں پونے چار بجے تھے۔ کینٹ اسٹیشن کا راستہ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کا تھا لیکن پہلے کی طرح یاسر کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ سوا چار بجے ہی کینٹ اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہ پارکنگ میں داخل ہی ہو رہا تھا کہ ایک نوجوان اس کے سامنے آگیا اور اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

یاسر نے گاڑی کا شیشہ ہٹا کر اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"آپ یاسر صاحب ہیں؟" نوجوان نے پوچھا۔

"ہاں، میں یاسر ہوں لیکن میں تمہیں نہیں پہچانا۔" یاسر نے کہا۔

"میں اقبال ہوں۔" اس نوجوان نے جواب دیا۔ "پنجو بھائی نے بھیجا ہے۔"

یاسر نے طویل سانس لیا اور پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ اقبال پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یاسر نے اقبال کا جائزہ لیا۔ وہ خاصا معقول نوجوان تھا، اس کے کپڑے بھی معقول تھے اور حلیہ بھی بدمعاشوں والا نہیں تھا۔ اپنی گفتگو سے بھی وہ تعلیم یافتہ اور مہذب لگ رہا تھا۔

اس نے یاسر سے کوئی بات کیے بغیر جیب سے سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا پھر وہ آہستہ سے بولا۔

"پنجو بھائی، یاسر صاحب آگئے ہیں۔ میں ان ہی کے ساتھ ہوں...... اچھا۔" یہ کہہ کر اس نے سیل فون یاسر کی طرف بڑھا دیا۔ "پنجو بھائی آپ سے بات کریں گے۔"

"ہیلو۔" یاسر نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے ہیرو، تو تو وقت کا بہت پابند ہو گیا ہے بلکہ وقت سے بھی پہلے پہنچ گیا۔ اب تو ایسا کر، اقبال کے ساتھ میرے پاس آجا۔" یہ کہہ کر پنجو نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر اقبال اسے راستہ بتاتا رہا اور وہ چلتا رہا۔ شاہراہ فیصل پر آ کے یاسر نے پوچھا۔ "تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"شاہ فیصل کالونی۔" اقبال نے جواب دیا۔ "پنجو بھائی کا ٹھکانا آج کل وہیں ہے۔"

شاہراہ فیصل سے اوور ہیڈ برج چڑھنے کے بعد وہ شاہ فیصل کالونی میں داخل ہو گئے۔ اقبال اسے لے کر شاہ فیصل کالونی کی پیچیدہ گلیوں میں پہنچا اور ایک جگہ گاڑی روکنے کو کہا پھر وہ لوگ وہاں سے کچھ دور تک پیدل چلے اور ایک مکان کے سامنے پہنچ کر اقبال نے دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ یاسر اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں پنجو کے علاوہ کوئی موجود نہ ہو۔ ایک کمرے میں دو تین پرانی سی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں رکھی تھیں۔ پنجو نے یاسر کو بیٹھنے کو کہا اور اقبال سے بولا۔ "پیسے لایا ہے؟"

"ہاں لایا ہوں۔" یاسر نے کہا۔ "لیکن ایک شرط پر دوں گا۔"

"اچھا۔" پنجو نے "اچھا" کو کھینچ کر کہا۔ "تیری کوئی شرط بھی ہے؟"

"ہاں، میری یہ شرط ہے کہ تم آئندہ مجھے فون نہیں کرو گے۔"

"تو میرے سامنے اپنی شرطیں رکھے گا؟" پنجو ایک دم آپے سے باہر ہو گیا۔ "یہ ضروری نہیں ہے کہ تو کیا چاہتا ہے، ضروری یہ ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"

"پھر میں تمہیں ایک پیسا بھی نہیں دوں گا۔" یاسر نے تلخ لہجے میں کہا۔

پنجو نے اچانک یاسر کے منہ پر الٹے ہاتھ کا زبردست تھپڑ رسید کر دیا۔ یاسر الٹ کر پیچھے کی طرف گرا اور کرسی میں الجھ کر رہ گیا۔

پنجو نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔ "سیدھی طرح پیسے نکال۔"

"میں حرام نہیں کماتا ہوں۔" یاسر نے کہا۔ "خون پسینا ایک کر کے کماتا ہوں، تمہیں جتنا دے دیا، وہی بہت

ہے۔"

پنو نے پھر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ مارا اور بولا۔ "تو اتنا ہی خوددار ہے تو دوسروں کی بیویوں کے ساتھ عیاشی کیوں کرتا ہے، اس وقت تیری شرافت کہاں چلی گئی تھی، تو مجھے حلال اور حرام کا سبق پڑھا رہا ہے؟" اس نے یاسر کے بال پکڑے اور اس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم کا لفافہ نکال لیا۔ اس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر لفافہ تھوڑا سا کھول کر دیکھا، پھر یاسر کی کمر پر لات مارتے ہوئے بولا۔ "اب دفع ہو جا یہاں سے۔ مجھے عزت کا سبق پڑھا رہا تھا۔"

یاسر بے بسی سے اپنا ہونٹ کاٹتا ہوا وہاں سے نکلا اور لنگڑاتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ پنو کے مطالبوں سے بری طرح عاجز آ گیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے اپنی سم بلاک کرا کے کمپنی سے دوسری سم لی، پھر اپنا لینڈ لائن نمبر بھی بدل لیا۔ ٹیلی فون کمپنی کا ایکسی این اس کا جاننے والا تھا اس لیے نمبر دو گھنٹے کے اندر اندر تبدیل ہو گیا۔

☆☆☆

"یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو یاسر؟" شہلا نے کہا۔ "تم نے اپنا سیل نمبر اور لینڈ لائن نمبر کیوں تبدیل کیا ہے؟"

"ہر وقت جرح مت کیا کرو۔" یاسر جھنجلا گیا۔ "میں پاگل نہیں ہوا کہ فضول میں اپنے فون نمبرز تبدیل کراؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، پھر خود ہی سب کو نیا نمبر دینا۔" شہلا جھلا کر بولی۔ "میرے پاس اتنا فالتو ٹائم نہیں ہے۔" وہ غصے میں کمرے سے نکل گئی۔

یاسر کا خیال تھا کہ اوّل تو پنو کو اس کا نیا نمبر ملے گا ہی نہیں اور اگر ملا بھی تو وہ اسے پہچاننے سے انکار کر دے گا۔

وہ دوسرے دن صبح ہی دفتر چلا گیا اور دو گھنٹے کی عرق ریزی کے بعد رحمان صاحب کا پروجیکٹ مکمل کر لیا۔ اسے ذہنی طور پر کچھ سکون ملا تھا تو اس نے بہترین کام کیا تھا۔

لنچ پر رحمان صاحب خود آفس آ گئے۔ بیگ صاحب نے انہیں بورڈ روم میں لے جا کر ان کا ایڈ دکھایا تو وہ بہت متاثر ہوئے اور یاسر سے بولے۔ "یاسر صاحب! میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں، کل میں نے آپ کو......"

"مجھے شرمندہ نہ کریں سر۔" یاسر جلدی سے بولا۔ "غلطی میری ہی تھی، مجھے آپ سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔"

"غلطی کسی کی بھی تھی۔" رحمان صاحب بولے۔ "آپ نے میرا دل خوش کر دیا ہے، آج میں آپ سب کو ڈنر دے رہا ہوں۔ بتائیے ڈنر کہاں کرنا پسند کریں گے؟"

"آپ جہاں کرائیں گے، ہم کرلیں گے۔" بیگ صاحب نے کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر شام کو تیار رہیے گا۔"

ایک عرصے بعد یاسر کو ذہنی سکون میسر آیا تھا۔ وہ اس دن بہت خوش تھا۔

"شکر ہے، تمہارے چہرے پر شگفتگی تو آئی۔" ڈنر کے دوران نورین نے یاسر سے کہا۔

اچانک یاسر کی نظر ہال کے ایک گوشے میں پڑی تو وہ سناٹے میں رہ گیا۔ وہاں ایک میز پر زینی بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت تنہا نظر آ رہی تھی۔ ممکن ہے اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ ہو۔ وہ اب کن انکھیوں سے زینی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یاسر واش روم جانے کے لیے اٹھا اور زینی کے نزدیک سے گزرا۔ اس نے سوچا تھا کہ زینی اگر تنہا ہوئی تو اسے مخاطب کرے گی ورنہ وہ بھی انجان بن کے اس کے نزدیک سے گزر جائے گا لیکن جب وہ زینی کے نزدیک سے گزرا تو اس نے آہستہ سے آواز دی۔ "یاسر!"

یاسر چونک کر رک گیا۔ زینی اسے اشارے سے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی یاسر اس کی طرف بڑھ گیا۔

"کیسے ہو یاسر؟" زینی نے پوچھا۔

"زندہ ہوں۔" یاسر نے جواب دیا پھر سرد لہجے میں بولا۔ "زینی! آخری بار جب ہماری ملاقات ہوئی تھی تو یہ طے ہوا تھا کہ اب ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔"

"ہاں۔" زینی نے سر جھکا کر کہا۔ "لیکن میں اب تک تمہیں نہیں بھلا سکی یاسر۔" زینی نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "پھر تم نے شاید اپنا فون نمبر بھی چینج کر لیا ہے۔ میں نے کئی مرتبہ کال کرنے کی کوشش کی لیکن......"

"ہاں، میں نے فون نمبر تبدیل کر لیا ہے۔ اس حرام زادے کی ڈیمانڈز اب بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں مزید کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے۔" پھر یاسر کو احساس ہوا کہ جس لڑکی کی وجہ سے وہ ایک اچکے کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہا ہے، اسے اس لڑکی سے نہیں ملنا چاہیے۔ وہ

اچانک زینی سے بولا۔ ”اوکے زینی، میں چلتا ہوں۔ اصل میں آج میں اپنے باس کے ساتھ آیا ہوں۔ وہ میرا انتظار کررہے ہوں گے۔“

”اوکے یاسر۔“ زینی نے افسردگی سے کہا۔

یاسر رکا نہیں اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اس نے یہ عہد کرلیا تھا کہ اب زینی سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا لیکن وہ سامنے آئی تو اس کا عہد ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گیا۔ ایک دفعہ تو اسے خیال آیا تھا کہ وہ زینی کو اپنا سیل نمبر دے دے لیکن پھر اس نے بہت مشکل سے خود کو روکا۔ زینی کی ایک ہی ملاقات اس کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ وہ اس سے مزید ملاقاتوں کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن یاسر دیر تک سوتا رہا، شہلا اور صوی دونوں جاچکی تھیں۔ اس نے خود ہی اپنا ناشتا تیار کیا اور ناشتا کرنے کے بعد کافی کا مگ لے کر لاؤنج میں آگیا۔

اچانک اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون کے اسکرین پر نظر ڈالی۔ دفتر سے فون تھا۔ اس نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگالیا۔ ”ہاں نورین!“ اس نے پیکٹ سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔

”آج ذرا جلدی آجانا یاسر!“ نورین نے کہا۔ ”آج عمارہ فیبر کس والے ذکی صاحب سے میٹنگ ہے۔“

”وہ تو سیکنڈ ہاف ہی میں آئیں گے نا؟“ یاسر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، وہ فرسٹ ہاف میں آرہے ہیں۔ میٹنگ کے فوراً بعد وہ دبئی جارہے ہیں۔ بیگ صاحب بھی آچکے ہیں۔“

”اوکے، میں پہنچ جاؤں گا۔“ یاسر نے کہا اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اٹھ گیا۔ پھر آدھے گھنٹے کے اندر اندر دفتر پہنچ گیا۔

وہ ایک بجے تک میٹنگ میں مصروف رہا۔ ذکی صاحب پہلی دفعہ ان کے ساتھ بزنس کررہے تھے اس لیے نورین بہت فعال تھی۔

میٹنگ سے فارغ ہوکر یاسر اپنے روم میں آیا کہ کافی منگائی اور سگریٹ سلگا کر اپنے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اچانک اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی، وہاں صرف نمبر نظر آرہا تھا۔ اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر کال ریسیو کرلی اور بولا۔ ”ہیلو!“

”او ہیرو، تو کیا سمجھتا ہے کہ نمبر بدل دے گا تو مجھ سے چھپ جائے گا۔“

پنچو کی آواز سن کر وہ سناٹے میں رہ گیا اور بولا۔ ”تمہیں میرا نمبر کہاں سے ملا اور......“

”تو بھی کس دور میں زندہ ہے ہیرو، نمبر معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہے اور تو کیا اپنے گھر کا نمبر بھی بھول گیا؟“

یاسر نے چونک کر آنے والی کال کا نمبر دیکھا، پھر اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ”تم......تم میرے گھر کیسے پہنچے؟“

”کیسے پہنچے کیا مطلب؟“ پنچو نے کہا۔ ”جیسے سب پہنچتے ہیں۔ اب تو فوراً یہاں نہیں آیا تو تیری بیوی اور بیٹی......“

”نہیں، انہیں کچھ مت کہنا۔“ یاسر نے وحشت زدہ لہجے میں کہا ”میں آرہا ہوں۔“

اس نے کرسی سے اپنا کوٹ اٹھایا اور گاڑی کی چابی لے کر وحشت کے عالم میں اپنے کمرے سے باہر نکلا۔

اسی وقت پیون کافی لے کر اس کے کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ میں پیون سے ٹکرا گیا۔ کافی چھلک کر اس کے کپڑوں پر گری اور ٹرے پیون کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

”سوری سر......وہ آپ......“

اس کی بات سنے بغیر یاسر بہت عجلت میں دفتر سے باہر نکل گیا۔ گھر پہنچنے کے لیے اس نے گاڑی جیٹ فائٹر کی طرح چلانا شروع کردی۔ دو تین موقعوں پر وہ خوفناک تصادم سے بچا اور جیسے تیسے وہ گھر پہنچ ہی گیا۔

وہ دروازہ کھول کر دیوانہ وار گھر میں داخل ہوا تو ڈرائنگ روم میں صوی کو صحیح سلامت دیکھ کر اسے خاصا سکون ملا پھر اس کی نظر پنچو پر پڑی۔ وہ بہت بے تکلفی سے صوی کے ساتھ کوئی گیم کھیل رہا تھا۔ پنچو اس وقت خاصے معقول حلیے میں تھا۔ اس نے بہت بہترین تراش کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے ٹائی بھی لگا رکھی تھی اور کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈال دیا تھا۔

صوی کی نظر یاسر پر پڑی تو وہ چہکتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”پاپا، دیکھیے انکل میرے لیے کتنے ٹوائز لے کر آئے ہیں۔“ پھر وہ پنچو سے بولی۔ ”انکل آپ بہت اچھے ہیں،

بس کیسل میں ذرا چیٹنگ کرتے ہیں۔"
"صومی گڑیا، یہ سب کھلونے تو میں تمہارے پاپا کے پیسوں سے لایا ہوں اور بیٹا، مجھ سے بڑے چیٹر تو تمہارے پاپا ہیں۔" پھر وہ یاسر کی طرف گھوما۔ "کیوں یاسر، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"
"صومی بیٹا، آپ اپنے کمرے میں جائیے۔" یاسر نے بہت کوشش سے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"ارے یاسر۔" شہلا کی آواز آئی۔ "تم کب آئے۔ ویسے تمہارے یہ دوست فہد تو بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ میں یاسر کو ٹیلی فون کر دیتی ہوں لیکن یہ تو تمہیں سرپرائز دینے کے چکر میں تھے۔"
"سرپرائز، کا اپنا ہی مزہ ہے بھابی!" پچو نے ہنس کر کہا۔ "اب دیکھیے، مجھے اچانک دیکھ کر کیسا حیران ہو رہا ہے۔ ارے یار، اتنے عرصے بعد ملا ہے کیا یونہی دور کھڑا حیران ہوتا رہے گا؟" یہ کہہ کر وہ یاسر کی طرف بڑھا اور بہت والہانہ انداز میں اس سے بغل گیر ہو گیا۔
صومی اس دوران میں اپنے کھلونے لے کر وہاں سے جا چکی تھی۔
"شہلا، تم نے......"
"ہاں یار۔" پچو نے اس کی بات کاٹ دی۔ "بھابی نے تو مجھے بہت اچھی کمپنی دی ہے۔"
"ویسے اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔" شہلا ہنس کر بولی۔ "فہد بھائی، آپ کی باتیں ہی اتنی دلچسپ ہیں۔"
"بھابی، یہ تو میری تعریف سن کر جل رہا ہو گا۔" پچو نے یاسر کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کی شروع ہی سے یہ عادت ہے۔ کالج میں بھی اگر کوئی لڑکی میری تعریف کر دیتی تھی تو یہ جل جاتا تھا۔"
"کیوں بکواس کیے جا رہا ہے؟" یاسر بھڑک کر بولا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ پچو کا گلا دبا دے۔
"دیکھا آپ نے۔" پچو ہنس کر شہلا سے مخاطب ہوا۔ "جل گیا نا۔"
اس کے اس جملے پر شہلا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ "آپ لوگ بیٹھیے، میں آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔"
"بھابی!" پیچھے سے پچو نے ہانک لگائی۔ "زیادہ تکلف مت کیجیے گا۔"
شہلا کے جاتے ہی یاسر دانت پیس کر بولا۔ "تمہاری اتنی جرأت ہو گئی کہ تو میرے گھر تک آ گیا؟"
"میرا گریبان چھوڑ دے ہیرو۔" پچو غرا کر بولا۔
یاسر نے گریبان چھوڑ دیا۔ "تو کیا سمجھتا تھا، تو نمبر تبدیل کر لے گا تو میں تجھے چھوڑ دوں گا۔ اب تیری سزا یہ ہے کہ تو مجھے آج شام تک پانچ لاکھ روپے پہنچا دے۔"
"تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟" یاسر چیخ کر بولا۔ "اب میں تجھے ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔"
"آرام سے بیٹھ جا ہیرو۔" پچو نے کہا اور ایک نظر ان تصویروں کو دیکھ لے۔" اس نے ایک بند لفافہ نکال کر یاسر کے آگے پھینک دیا۔
کچھ تصویریں پھسل کر لفافے سے باہر آ گئیں۔ وہ انتہائی قابلِ اعتراض تصویریں تھیں۔ شاید پچو نے اپنی موبائل کیمرے سے پہلے وہ تصویریں بنائی تھیں، پھر یاسر کو گن پوائنٹ پر لیا تھا۔
یاسر نے بقیہ تصویریں دیکھے بغیر ہی لفافہ اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ وہ جانتا تھا کہ بقیہ تصویریں بھی اسی قسم کی ہوں گی۔
"کیا خیال ہے ہیرو؟" پچو نے کہا۔ "اگر میں ان تصویروں کے بڑے بڑے پوسٹرز چھپوا کر شہر کے مختلف مقامات پر لگا دوں، کچھ پوسٹر تیرے گھر بھیج دوں اور کچھ تیرے آفس کے پتے پر روانہ کر دوں، پھر کہاں ہو گا ہمارا یہ معزز اور باعزت دوست؟"
"یو باسٹرڈ!" میں......!
اس وقت شہلا چائے اور دیگر لوازمات کی ٹرالی لے کر آ گئی۔
"ارے بھابی...... آپ نے تو کچھ زیادہ ہی تکلف کر لیا۔" پھر وہ مسکرا کر یاسر سے مخاطب ہوا۔ "ویسے آئیڈیا کیسا ہے ان پوسٹرز کے بارے میں؟"
یاسر نے اسے گھور کر دیکھا اور چائے یوں پینے لگا جیسے پچو کا خون پی رہا ہو۔
"یار تجھے آئیڈیا پسند نہیں آیا تو کوئی بات نہیں۔ کلائنٹ کو اس کی رقم واپس کر دے۔"
ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو شہلا فون سننے کے لیے لاؤنج میں چلی گئی۔
"آج رات نو بجے۔" پچو نے کہا۔ "اسی جگہ جہاں پہلے آیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا کوٹ اٹھایا اور شہلا کو آتے دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ "او کے یاسر، اب

میں چلتا ہوں۔"

"فہد بھائی، آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔ آپ اتنی جلدی کیوں جارہے ہیں۔ کھانا تیار ہے۔"

"کھانا پھر کبھی کھالوں گا بھابی۔" پٹو نے مسکرا کر کہا۔ "اب تو میں نے گھر دیکھ لیا ہے تو آنا جانا لگا رہے گا۔ یوں بھی یاسر سے کوئی تکلف نہیں ہے۔ اس سے تو میں چھین کر کھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

یاسر اس کے پیچھے پیچھے گھر کے مین گیٹ تک گیا اور بولا۔ "میں یہ رقم آخری دفعہ دے رہا ہوں۔ اس کے بعد مجھ سے کوئی امید مت رکھنا۔"

"یار ہیرو، مجھے حیرت ہوئی ہے۔ اتنی خوب صورت بیوی کو چھوڑ کر تو اس لڑکی کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔ ویسے تیرے بیوی بہت خوب صورت ہے۔"

"شٹ اپ۔" یاسر چیخ کر بولا۔ "اب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"رات نو بجے۔" یہ کہہ کر پٹو وہاں سے چلا گیا۔ یاسر واپس ڈرائنگ روم میں آگیا۔

"آپ کے لیے کھانا لاؤں؟" شہلا نے پوچھا۔

"تم جانتی نہیں ہو کہ میں لنچ نہیں کرتا۔" یاسر چیخ کر بولا۔ "میں ایک ضروری ڈی وی ڈی گھر بھول گیا تھا وہی لینے آیا تھا۔"

"تو اتنا غصہ کیوں کر رہے ہیں؟" شہلا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

یاسر کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "سوری شہلا، میں کچھ زیادہ ہی غصہ کر بیٹھا۔"

"اپنے آفس کے پرابلم آفس ہی میں چھوڑ کر آیا کرو۔ میں بھی جاب کرتی ہوں، مجھے بھی آفس میں کئی پرابلمز ہیں لیکن میں تو کبھی تمہیں پریشان نہیں کرتی۔"

"سوری یار!" یاسر نے کہا۔ "ایک کلائنٹ نے اتنا زچ کر دیا ہے کہ...... سوری۔" یاسر نے کہا اور اپنے بیڈ روم میں جا کر یوں ہی ایک ڈی وی ڈی اٹھائی اور وہ لے کر باہر نکل آیا۔

"کیا تم پھر آفس جارہے ہو؟"

"ہاں، واپس تو جانا ہی پڑے گا۔ آج کل کام کچھ زیادہ ہی ہے۔"

یاسر گھر سے نکل گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ پٹو سے دب کر بات نہیں کرے گا۔ وہ آفس جانے کی بجائے ایک اسلحہ ڈیلر کی دکان پر پہنچا۔ اسلحے کی اس دکان میں دکاندار کا کرخت سا وجود اسے عجیب سا لگا۔ وہ مسکرا کر یاسر کی طرف بڑھا اور بولا۔ "جی فرمایئے؟"

"مجھے کوئی بہترین قسم کا پسٹل یا ماؤزر دکھایئے۔" یاسر نے کہا۔

"امپورٹڈ یا......"

"جرمنی کا ہو تو زیادہ اچھا ہے۔" یاسر نے کہا۔ اس نے کسی سے سن لیا تھا کہ جرمنی کے بنے ہوئے پسٹل اور ریوالورز بہترین ہوتے ہیں۔

دکاندار نے ایک الماری سے سیاہ رنگ کا ایک پسٹل نکالا اور بولا۔ "یہ بہت بہترین چیز ہے۔ اس کا وزن بھی......" پھر وہ چونک کر بولا۔ "سر! آپ پلیز مجھے اپنا لائسنس دکھائیں گے؟"

"لائسنس؟" یاسر نے پوچھا۔ "لائسنس تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے؟"

"نو پرابلم!" اس نے ہنس کر کہا۔ "آپ لائسنس لے آئیں۔ مجھے اپنے ریکارڈ میں اس کی انٹری کرنا پڑے گی۔"

"انٹری تو ہوتی رہے گی۔" یاسر نے سرسری انداز میں کہا۔ "آپ مجھے گن تو دے دیں۔"

"سوری سر۔" دکاندار نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم غیر قانونی کام نہیں کرتے۔"

یاسر وہاں سے مایوس ہو کر باہر نکلا تو اس سوچ میں تھا کہ کراچی میں غیر قانونی اسلحہ کہاں ملتا ہے؟ وہ سنتا ہی رہتا تھا کہ شہر میں غیر قانونی اسلحے کے انبار ہیں لیکن ضرورت تھی تو ایک پسٹل نہیں مل رہا تھا۔ یاسر نے بہت غور کیا کہ شاید میرا کوئی شناسا یا دوست میری مدد کر سکے لیکن اس کی دوستی جن لوگوں سے تھی، ان کا بھی اسلحے سے دور دور تک واسطہ نہیں تھا۔

یاسر وہاں سے سیدھا آفس پہنچا۔ اس نے احتیاطاً پیون کو بینک بھیج کر پانچ لاکھ روپے منگوا لیے کیونکہ پھر بینک بند ہو جاتا۔

اس نے رقم ایک لفافے میں رکھی اور وہ لفافہ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

دوسرے دن باس کے ساتھ سر کھپانے کے بعد یاسر اپنے کمرے میں آیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

رخمانوف، امام علی

تاجکستان کے سیاسی رہنما اور پہلے صدر۔ 20 فیصد ووٹ حاصل کرکے تاجکستان کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ 6 نومبر 1999ء کو پھر صدارتی انتخاب کا انعقاد عمل میں آیا تو وہ 92 فیصد ووٹ لے کر تیسری مرتبہ سات سال کے لیے صدر بن گئے۔ ان کے عہد کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ملک میں چار سالہ خانہ جنگی کا خاتمہ کردیا اور اس ضمن میں مسلمان گوریلا لیڈر سید عبداللہ نوری کے ساتھ 1997ء میں ماسکو میں معاہدہ طے کیا۔ انہوں نے 1999ء میں ریفرنڈم منعقد کرکے اسلام پسند سیاسی جماعتوں کو قانونی طور پر کام کرنے کی اجازت دے دی۔ پاکستان نے تاجکستان کا 13 ملین ڈالر کا قرضہ بھی ری شیڈول کرنے کا اعلان کیا۔

مرسلہ: شاہد علی ترمذی، ملتان

یاسر پہلے اپنے بینک پہنچا اور پندرہ لاکھ روپے کا چیک کاؤنٹر پر دے دیا۔ پھر وہ خود بینک منیجر کے کیبن میں جا کر بیٹھ گیا۔ منیجر سے بھی اس کے خصوصی تعلقات تھے۔

تھوڑی دیر میں بینک کا کیشیئر اس کی مطلوبہ رقم لے کر آگیا۔ اور بولا۔ "مسٹر یاسر! گزشتہ دو ہفتے میں آپ نے بینک سے خاصا بڑا اماؤنٹ نکالا ہے۔ یہ چیک لینے کے بعد آپ کے اکاؤنٹ میں صرف بائیس ہزار روپے رہ گئے ہیں۔"

"بائیس ہزار!" یاسر کا دل ڈوبنے لگا۔ گویا ایک طرح سے وہ بالکل قلاش ہوگیا تھا۔ اس نے رقم اپنے بیگ میں منتقل کی اور منیجر سے ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔ اس کے پاس اب صرف پچیس منٹ تھے۔

وہ تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف بھاگا اور گاڑی دوڑاتے ہوئے بیس منٹ کے اندر اندر بنگلے پر پہنچ گیا۔

دستک کے جواب میں کسی نے دروازہ کھول دیا لیکن خود سامنے نہیں آیا۔

"اندر آجاؤ۔" کوئی درشت لہجے میں بولا۔ لیکن وہ

اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو اس نے برا سا منہ بنا کر سیل فون اٹھایا اور کان سے لگالیا۔

"او ہیرو سن!" دوسری طرف سے پنو کی آواز سن کر اس کے اعصاب کشیدہ ہوگئے۔ "اس وقت تیری محبوبہ میرے قبضے میں ہے۔ اگر تو ایک گھنٹے کے اندر اندر گلستان جوہر کے اسی بنگلے پر نہ پہنچا تو میں اسے ذبح کردوں گا۔"

پھر اسے فون پر زینی کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ "یاسر! مجھے بچالو، یہ لوگ مجھے ماردیں گے۔ یہ مجھ سے جس رقم کا مطالبہ کررہے ہیں، اتنی رقم تو میرے پاس ہے بھی نہیں۔"

"سن لیا ہیرو؟" پنو نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ "تو آتا ہے یا میں اس کے گلے پر چھری پھیردوں۔"

"زینی کو کچھ مت کہنا، میں آرہا ہوں۔"

"اور سن، خالی ہاتھ مت آنا۔ مجھے تیرا تھوبڑا دیکھنے کا شوق نہیں ہے۔" اچانک پیچھے سے زینی کی وحشت زدہ چیخ سنائی دی، پھر وہ مسلسل چیخنے لگی۔

"دیکھو، زینی کو چھوڑ دو، مجھے بتاؤ تمہیں کیا چاہیے؟"

"تیری اس حسین محبوبہ کی قیمت ہے صرف پندرہ لاکھ" پنو نے یوں اطمینان سے کہا جیسے صرف پندرہ روپے کا مطالبہ کیا ہو۔

"پندرہ لاکھ!" یاسر نے حیرت سے دہرایا۔

"حیران بعد میں ہوتے رہنا۔" پنو نے کہا۔ "میرے خیال میں اپنی محبوبہ کی خوب صورت گردن بچانے کے لیے یہ رقم کچھ زیادہ نہیں ہے۔ جلدی بول آرہا ہے یا نہیں؟"

"میں آرہا ہوں۔" یاسر نے کہا۔

"اب تیرے پاس صرف پچاس منٹ ہیں۔ ہاں، یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب آیندہ تجھے کبھی ٹیلی فون نہیں کروں گا، ہری اپ!"

یاسر نے بریف کیس سے اپنی چیک بک نکالی، پھر آفس کی الماری سے کینوس کا خوب صورت سفری بیگ نکالا اس پر موتیج کے مونوگرام اور نام کے ساتھ یاسر، کونسیٹ ڈائریکٹر کے الفاظ بھی جگمگا رہے تھے۔ یہ آئیڈیا یاسر ہی کا تھا۔ اس کے کمپنی کے لوگ اور وہ خود اکثر کاروباری دوروں پر بیرون ملک جاتے رہتے تھے۔ یاسر کا خیال تھا کہ ان بیگز سے موتیج کی پہچان دوسرے ملکوں میں بھی ہوجائے گی۔ اس نے اب تک وہ بیگ استعمال نہیں کیا تھا اس لیے آفس ہی میں رکھا تھا۔ اس وقت تو وہ بیگ یاسر نے نوٹ رکھنے کے لیے لیا تھا۔ پندرہ لاکھ کی رقم بریف کیس میں تو نہیں آسکتی تھی۔

آواز پچھو کی نہیں تھی۔

یاسر آہستہ آہستہ اندر داخل ہو گیا۔ اس کے اندر آتے ہی دروازہ دوبارہ مقفل کر دیا گیا۔

اچانک بیڈ روم کی طرف سے زینی کی چیخیں سنائی دیں۔ یاسر دیوانہ وار اس طرف دوڑا۔ زینی کی حالت ابتر تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر تشدد کے نشان تھے۔ پچھو نے اس کے ہاتھ پیر باندھ رکھے تھے اور اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پسٹل تھا اور دوسرے ہاتھ میں چوڑے پھل کا تیز دھار کمانی والا چاقو۔

یاسر بے اختیار زینی کی طرف بڑھا لیکن پچھو نے اسے روک دیا اور بولا۔ ”اتنی پھرتی مت دکھا ہیرو، رقم لایا ہے؟“

یاسر نے رقم کا بیگ پچھو کی طرف اچھال دیا۔ ”گن لو، پورے پندرہ لاکھ ہیں۔“ یاسر نے غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

پچھو نے بیگ اٹھا کر اس کی زپ کھولی، ایک نظر نوٹوں پر ڈالی اور بولا۔ ”تو کہہ رہا ہے تو پورے ہی ہوں گے۔“ پھر اس نے زینی کے بال پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور اس کے چہرے پر تھپڑ مارتے ہوئے بولا۔ ”تیرے عاشق نے تیری جان بچا دی۔ عاشق ہو تو ایسا ہو، اب تم لوگ کھل کر عیاشی کرو۔ میں چلتا ہوں۔“ اس نے بیگ اٹھا کر اپنے شانے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

”ایک بات اور سن لو۔“ یاسر نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اب کبھی مجھے کال کرنے کی یا میرے گھر کی طرف آنے کی کوشش مت کرنا۔“

”یہ وعدہ تو میں تجھ سے پہلے ہی کر چکا ہوں ہیرو۔“ پچھو نے خباثت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پچھو زبان دے کر کبھی اس سے نہیں پھرتا، یقین کرو۔“ اس نے زینی کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور ڈھٹائی سے مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی یاسر نے زینی کے ہاتھ پیر کھولے اور اسے پانی کا گلاس بھر کے دیا۔

زینی ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئی اور یاسر سے بولی۔ ”تھینک یو یاسر، تھینک یو ویری مچ۔“

”تم ذرا اپنا حلیہ بھی درست کر لو۔“ یاسر نے اس کے پھٹے ہوئے لباس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

زینی تیزی سے واش روم میں گھس گئی۔

وہ وہاں سے باہر نکلی تو خاصی نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔

”تم..... چائے پیو گے؟“ زینی نے یاسر سے پوچھا۔

”میں یہاں چائے پینے نہیں آیا تھا۔“ یاسر نے کہا۔ ”اس وقت تو میں اپنے ہی خون کے گھونٹ پی رہا ہوں۔“

”تمہیں کیا ضرورت تھی مجھ پر احسان کرنے کی؟“ زینی نے کہا۔ ”تم نے کس رشتے کے تحت اتنی بڑی رقم اس لٹیرے کے حوالے کر دی؟“

انسانیت سے بڑا کوئی رشتہ نہیں ہوتا زینی، میں ایک کمزور لمحے سے مغلوب ہو کر تمہاری طرف بڑھا تھا۔ نہ میں تمہیں اس کمرے میں لاتا، نہ بات اتنی بڑھتی۔ میری تو صرف رقم ہی گئی ہے، تم نے تو میری اس بھول کی وجہ سے اپنی عزت گنوائی ہے۔“ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اپنا گناہ ہمیشہ یاد رہے گا، شاید ایسے ہی گناہ کو گناہ بے لذت کہا جاتا ہے۔ میں چلتا ہوں، اپنا خیال رکھنا۔“ یہ کہہ کر یاسر بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔

اسے رہ رہ کر پچھتاوا ہو رہا تھا کہ وہ زینی کی طرف بڑھا ہی کیوں تھا۔ وہ شہلا سے زیادہ خوب صورت تو نہیں ہے پھر مجھ پر شیطان کیوں سوار ہو گیا تھا۔ اس کے اندر سے آواز ابھری۔ ”تم نے اپنی اس چند گھنٹوں کی بھول میں اپنی جمع پونجی لٹا دی ہے۔“

وہ یہی سب سوچتا ہوا گھر پہنچ گیا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو صومی نے دوڑ کر اس کا استقبال کیا۔ شہلا بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

”بات کیا ہے شہلا؟“ یاسر نے خود کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تمہارا پروموشن ہو گیا ہے یا پھر تمہارے بھائی لاہور سے آ رہے ہیں؟“ شہلا کا صرف ایک ہی بھائی تھا، وہ اپنے بھائی سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔

”بات اس سے بھی زیادہ خوشی کی ہے۔“ شہلا نے کہا۔ ”ڈاکٹر کو کڈنی کا ڈونر مل گیا ہے اور اگلے ہفتے تک صومی کا آپریشن ہو جائے گا۔“

”تم واقعی سچ کہہ رہی ہو؟“ یاسر خوشی سے اچھل پڑا، پھر اس نے صومی کو گود میں اٹھا لیا اور اسے چومتا ہوا بولا۔ ”میری گڑیا اب بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

دوسرے ہی لمحے شہلا کی بات نے گویا اس کے سر پر لٹھ رسید کر دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”یاسر! تین دن بعد صومی کو اسپتال میں ایڈمٹ کر دیا جائے گا۔ وہاں ڈاکٹرز اس کے مختلف لیبارٹری ٹیسٹ لیں گے۔ اسی وقت ہمیں رقم بھی وہاں ڈپازٹ کرنا پڑے گی۔“

شہلا کی بات سن کر یاسر کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ ایسا

لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر ہلدی مل دی ہو۔ اس سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بھی مشکل ہو گیا۔ وہ گھبرا کر لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"یاسر!" شہلا گھبرا کر بولی۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"بس کھڑے کھڑے کچھ چکر سا آ گیا تھا۔" یاسر نے کہا۔ "مجھے ذرا پانی پلا دو۔"

شہلا نے پانی کا گلاس بھر کے اسے دیا اور بولی۔ "تمہیں اپنی صحت کا تو کچھ خیال ہی نہیں ہے۔ بس کام، کام ہر وقت کام۔ رات رات بھر جاگ کر کام کرتے ہو اور دن میں بھی نہیں سوتے۔"

"ارے، میں ٹھیک ہوں۔" یاسر نے کہا۔ "تم ذرا مجھے اچھی سی چائے پلا دو۔"

یاسر کو اپنی جمع پونجی لٹ جانے کا افسوس نہیں تھا۔ پیسا تو وہ دوبارہ کما لیتا۔ اسے پریشانی تھی صومی کے آپریشن کی۔ ان دونوں نے کتنی شدت سے اس وقت کا انتظار کیا تھا۔ جب وہ وقت آیا تو یاسر کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ڈاکٹر زیادہ دن تک انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ دوبارہ جانے ایسا کڈنی کا ڈونر کب ملتا۔ ڈاکٹر بتا چکے تھے کہ صومی کو ابھی ہفتے میں ایک دفعہ ڈائی لائسز کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر یہ دورانیہ کم ہوتا جائے گا۔ اس کے گردے کسی بھی وقت مکمل طور پر ناکارہ ہو سکتے تھے۔ یہ سوچ کر ہی یاسر کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اسے یہ بھی فکر تھی کہ جب شہلا کو علم ہو گا کہ یاسر نے اپنی جمع پونجی لٹا دی ہے تو وہ تو صدمے سے مر ہی جائے گی۔ شہلا کو بتانا بھی ضروری تھا۔ ممکن ہے، اس نے کچھ بچت کر رکھی ہو۔ تھوڑا بہت قرض اسے دوستوں سے اور بیگ صاحب سے مل سکتا تھا۔

رات کو کھانے کے بعد جب صومی سو گئی تو شہلا نے پھر صومی کے آپریشن کا ذکر چھیڑ دیا۔

یاسر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "شہلا، تمہیں ایک بری خبر سنانا ہے۔"

"بری خبر؟" شہلا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "کیا ڈاکٹر نے آپریشن سے انکار کر دیا ہے یا صومی کی حالت ابھی ایسی نہیں ہے کہ اس کا آپریشن کیا جائے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" یاسر نے کہا۔ "اصل میں ہمارے پاس صومی کے آپریشن کے لیے پیسے نہیں ہیں۔"

"پیسے نہیں ہیں؟" شہلا نے حیرت سے کہا۔ "کیا اس کے آپریشن میں پچاس ساٹھ لاکھ روپیا خرچ ہو گا؟"

"نہیں شہلا...... اصل میں میرا اکاؤنٹ بالکل خالی ہو گیا ہے۔"

شہلا چند لمحوں تک پلکیں جھپکائے بغیر یاسر کو دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "کیا شاہد کی طرح تم نے بھی جوا اور سٹہ کھیلنا شروع کر دیا ہے؟"

"میں تمہیں ابتدا سے ہر بات بتاتا ہوں۔" یاسر نے کہا اور اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

شہلا یوں گم صم ہو گئی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ پھر وہ چیخ کر بولی۔ "ایک عورت کے لیے تم نے اپنی بچی کی زندگی داؤ پر لگا دی۔ مجھے اس بات کا صدمہ تو ہے کہ تم نے مجھ سے بے وفائی کی لیکن اس سے کہیں زیادہ مجھے یہ صدمہ ہے کہ اب صومی کا علاج نہیں ہو سکے گا۔ میری بچی سسک سسک کر مر جائے گی۔ تم...... تم باپ نہیں ہو، درندے ہو۔ اس غیر عورت کی عزت صومی کی زندگی سے بھی زیادہ تھی؟"

"لیکن صومی کا آپریشن ضرور ہو گا۔" یاسر نے کہا۔ "میں دو تین دن میں پندرہ لاکھ کا بندوبست کر لوں گا۔"

"یہ بیس لاکھ تو تم نے ایک سال میں جمع کیے تھے اور پندرہ لاکھ تم تین دن میں جمع کر لو گے؟ مجھے جھوٹی تسلیاں مت دو یاسر۔" شہلا بلک بلک کر رونے لگی۔ "ہمارے پاس تو کوئی ایسی قیمتی چیز بھی نہیں ہے جسے بیچ کر ہم اپنی بیٹی کی زندگی بچا سکیں۔"

"شہلا پلیز، رونا بند کرو اور مجھے سوچنے دو۔" یاسر نے کہا۔

"تم میں سوچنے کی صلاحیت ہی تو نہیں ہے۔" شہلا نے کہا۔ "اگر تم سوچ سکتے تو اس عورت سے پہلے اپنی بیٹی کے بارے میں سوچتے۔" شہلا پھر بری طرح رونے لگی۔

یاسر بستر سے اٹھ گیا اور چیخ کر بولا۔ "بے وقوف عورت، یہ رونا دھونا بند کر۔"

"تم کیسے باپ ہو یاسر؟" شہلا اب بھی سسکیاں لے رہی تھی۔

یاسر نے واش روم میں جا کر کپڑے بدلے اور نیند کی گولی کھائی اور سو گیا۔ صبح اٹھا اور بغیر ناشتا کیے نکلنے لگا۔

"تم اس وقت جا کہاں رہے ہو؟" شہلا نے جھنجلا کر کہا۔

"گھر میں بیٹھے بیٹھے تو رقم کا بندوبست ہونے سے رہا۔" یاسر نے کہا اور باہر نکل گیا۔

اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ اسے سب سے پہلے

طارق کا خیال آیا۔ طارق ایک ٹیکسٹائل مل اور ہوزری کا مالک تھا۔ وہ موویشیج ایڈورٹائزنگ کا بہت پرانا کلائنٹ تھا۔ یاسر سے اس کے بہت اچھے تعلقات تھے بلکہ طارق، یاسر سے بہت مرعوب تھا۔ یاسر نے اس کے لیے بہت اچھے اشتہارات بنائے تھے۔

یاسر سیدھا اس کے بنگلے پر پہنچا۔ اس نے بہت گرم جوشی سے یاسر کا استقبال کیا۔

جب یاسر نے پیسوں کی بات کی تو اس نے طویل سانس لے کر کہا۔ "ہارڈ لک پارٹنر، میں نے جاپان سے کچھ مشینیں ایکسپورٹ کی تھیں۔ کل ہی ساڑھے چار کروڑ کی ادائیگی کی ہے۔"

"میں کروڑوں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے صرف دس لاکھ کی ضرورت ہے۔"

"یار، تم مجھے کیوں ذلیل کرنے پر تلے ہوئے ہو؟" طارق نے کہا۔ "تم اگر ایک دن پہلے مجھ سے مانگتے تو دس لاکھ کیا، میں پچاس لاکھ بھی دے دیتا لیکن اس وقت تو رامیٹریل کے لیے مجھے خود پیسوں کی ضرورت ہے۔ مجھے غلط مت سمجھنا سوئی مجھے بھی بہت پیاری ہے لیکن......"

"کوئی بات نہیں۔" یاسر نے کہا۔ "میں کہیں اور سے بندوبست کرلوں گا۔" یہ کہہ کر وہ باہر آگیا۔ یکے بعد دیگرے اپنے کئی دوستوں سے رجوع کیا، ہر شخص نے معذرت کرلی۔ صرف ایک آدمی نے اسے ایک لاکھ روپے قرض دینے کی بات کی جسے یاسر نے قبول نہیں کیا۔

وہ لوگوں کی خوشامدیں کرکر کے خود اپنی ہی نظروں میں گر گیا تھا، ڈرائیونگ کرتے کرتے بھی وہ بیزار ہو گیا تھا۔

اسی مایوسی کے عالم میں حیدری کی مارکیٹ سے گزرتے ہوئے اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔ اس نے اپنی گاڑی روکی اور پانی کی بوتل کے لیے ایک اسٹور کا رخ کیا۔

اچانک اس کی نظر زینی پر پڑی۔ وہ مسکراتی ہوئی سڑک عبور کر رہی تھی۔ زینی کو دیکھ کر یاسر کے ذہن میں اپنی بے بسی اور ناکامی کی یادیں تازہ ہوگئیں۔ زینی کے انداز سے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی زینی ہے جو پجو کے ہاتھوں تشدد سہہ رہی تھی اور چیخ چیخ کر یاسر کو مدد کے لیے بلا رہی تھی۔

محض اس کا حال معلوم کرنے کے لیے یاسر اس کی طرف لپکا لیکن اتنی دیر میں وہ سڑک عبور کر چکی تھی۔ اس نے یاسر کو نہیں دیکھا تھا۔ یاسر نے بھی سڑک عبور کرنا چاہی لیکن مخالف سمت سے آنے والی ایک گاڑی کی وجہ سے رک گیا۔

اتنی دیر میں زینی سڑک عبور کر کے ایک ہیوی بائیک والے نوجوان کے پاس پہنچ چکی تھی۔ پھر وہ مسکراتی ہوئی بہت ادا کے ساتھ بائیک کی عقبی نشست پر بیٹھ گئی۔

اس نوجوان کو دیکھ کر یاسر حیران رہ گیا، پھر غصے کی وجہ سے اس کا پورا جسم لرزنے لگا۔ وہ پجو تھا۔

یاسر نے پھر سڑک عبور کرنا چاہی لیکن ایک بڑی وین اس کے راستے میں حائل ہوگئی۔ وین گزرنے کے بعد یاسر نے ان دونوں کو وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے دیکھا۔

انہیں دیکھ کر اس کا دماغ سنسنا رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ زینی بھی پجو کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ ان دونوں نے مل کر اسے بے وقوف بنایا تھا اور لوٹا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید یاسر ان دونوں کو معاف بھی کر دیتا لیکن اس وقت سوال اس کی بیٹی صوبی کا تھا۔ یاسر انہیں کسی بھی قیمت پر معاف کرنے کو تیار نہیں تھا۔

اسے زینی کے آفس کا علم تھا۔ ایک مرتبہ زینی نے بتایا تھا کہ افروز انٹر پرائز میں کام کرتی ہے۔ یاسر جنون کے عالم میں گاڑی دوڑاتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ خیال آیا کہ وہ تو پجو کے ساتھ ہوگی۔ یاسر نے اس معاملے کو اگلے دن کے لیے ملتوی کر دیا اور وہاں سے اپنے آفس چلا گیا۔ وہ پیسے کا بندوبست کیے بغیر شہلا کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

یاسر اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور پجو اور زینی کو گھیرنے کے منصوبے بناتا رہا۔

اس دوران میں کئی مرتبہ شہلا اسے سیل فون پر کال کر چکی تھی لیکن یاسر نے اس کا فون ریسیو نہیں کیا۔

وہ زینی کے آفس پہنچا تو استقبالیہ کاؤنٹر پر ایک سلونی سی لڑکی بیٹھی تھی۔ اس نے یاسر کی طرف نظریں اٹھائیں اور مسکرا کر بولی۔ "یس سر۔"

"مجھے زینی...... سوری مسز زینت فراز سے ملنا ہے۔" یاسر نے کہا۔

"آپ نے اپائنٹمنٹ لیا تھا ان سے؟" لڑکی نے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں، میں نے اپائنٹمنٹ تو نہیں لیا تھا لیکن وہ مجھے نام سے پہچان جائیں گی۔ آپ صرف انہیں اتنا بتا دیں کہ یاسر ان سے ملنا چاہتا ہے۔"

"اوکے سر۔" آپریٹر نے کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور انٹر کام پر کوئی نمبر دبایا پھر بولی۔ "میڈم!

کوئی یاسر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" اس نے ریسیور یاسر کی طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو زینی!" یاسر نے کہا۔

"کون ہیں آپ؟" اس کے کانوں میں ایک کرخت آواز آئی۔ "میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"میں موشیج ایڈورٹائزنگ کا کونسیپٹ ڈائریکٹر یاسر ہوں۔" یاسر نے اپنے خیال میں اس پر طنز کیا تھا۔

"اوکے، مسٹر یاسر، میں آپ کو صرف دس منٹ دے سکتی ہوں۔"

یاسر، زینی کے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی کھوپڑی ناچ کے رہ گئی۔ وہاں جس عورت نے زینت فراز کے نام سے اپنا تعارف کرایا وہ خاصی فربہ اور سانولی تھی۔

"یس مسٹر یاسر!" اس نے شاید مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ "میں نے آپ کا اور آپ کی ایجنسی کا نام سنا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر آپ کو بلا لیا کہ ممکن ہے کہ فیوچر میں مجھے بھی آپ کی ضرورت پڑے۔"

یاسر اس وقت شدید الجھن میں تھا۔ اس کے سیل فون میں زینی کی ایک تصویر تھی جو یاسر نے اس کی بے خبری میں اتار لی تھی۔ یاسر نے سیل فون جیب سے نکالا اور بولا۔ "تکلیف دینے کی معذرت چاہتا ہوں میڈم! مجھے اصل میں ایک لڑکی کی تلاش ہے جو آپ کے ادارے میں کام کرتی ہے اور خود کو آپ کی ہم نام بتاتی ہے۔" یہ کہہ کر یاسر نے سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

تصویر دیکھ کر زینت چونکی اور بولی۔ "ارے یہ تو شازیہ ہے۔ اسے میں نے آفس سے نکال دیا ہے۔"

"اب یہ کہاں ہوگی؟" یاسر نے پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔" زینت نے کہا۔

یاسر اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے نکل آیا۔ اب اس کا رخ اس اپارٹمنٹ کی طرف تھا جہاں زینی یا شازیہ سے اس کی آخری ملاقات ہوئی تھی۔ وہ خاصا لگژری اپارٹمنٹ تھا۔

یاسر نے بیل بجائی تو باوقار سی ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔

"یہاں مسز زینی فراز رہتی ہیں؟" یاسر نے پوچھا۔

"یہاں تو میں رہتی ہوں۔" اس خاتون نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اصل میں گزشتہ دو مہینے سے میں ملک سے باہر تھی اور اپنا اپارٹمنٹ ایک جوڑے کو کرائے پر دے دیا تھا۔"

"وہ کرائے دار یہ تو نہیں تھی؟" یاسر نے اپنا سیل فون خاتون کی طرف بڑھا دیا۔

"خاتون نے سیل فون پر نظر ڈالی اور بولیں۔ "یہ تو مسز سمیرا جلیل ہیں۔"

"تھینک یو۔" یاسر نے کہا۔ اسے ہر جگہ سے ایک نئے نام کا کردار مل رہا تھا۔ گویا زینی یا وہ لڑکی پروفیشنل مجرمہ تھی اور اپنے شوہر یا بوائے فرینڈ کے ساتھ مل کر لوگوں کو لوٹتی تھی۔

"خاتون میں ایک ضروری بات معلوم کرنا بھول گیا تھا مسز سمیرا کی کوئی بیٹی بھی تھی؟"

"بیٹی؟" خاتون نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں، پانچ چھ سال کی ایک خوب صورت سی بچی۔" یاسر نے کہا۔

"نہیں، ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ابھی حال ہی میں تو ان کی شادی ہوئی تھی پھر چھ سال کی بیٹی کیسے ہو سکتی ہے؟" پھر وہ چونک کر بولی۔ "لیکن یہ سلسلہ کیا ہے، آپ مسز سمیرا کو کیوں تلاش کر رہے ہیں؟"

"یہ ایک خطرناک مجرمہ ہے۔ اب تک کئی بچوں کو اغوا کر چکی ہے۔ اس کا تعلق بردہ فروشوں کے ایک گروہ سے ہے۔ ایک واردات میں اس نے آپ کا اپارٹمنٹ بھی استعمال کیا ہے۔ اگر پولیس کو یہ معلوم ہو گیا کہ آپ کا اپارٹمنٹ استعمال کیا گیا ہے تو آپ بھی اس کے ساتھ انوالو ہو سکتی ہیں۔"

خاتون کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ یاسر انہیں حیران پریشان چھوڑ کر وہاں سے نکل آیا۔

اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس زینی یا سمیرا کو کہاں تلاش کرے۔ پھر اسے اس ہوٹل کا خیال آیا۔ ممکن ہے کاؤنٹر کلرک اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔

بھاگ دوڑ میں اسے شام ہو چکی تھی۔ یاسر کو احساس ہوا کہ اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ وہ گاڑی روک کر اوسط درجے کے ایک ریسٹورنٹ میں چلا گیا اور وہاں خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا، کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے وہ اس بنگلے کی طرف جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

وہ دس بجے کے قریب اس بنگلے پر پہنچ گیا۔ وہ گاڑی سے اترنے ہی والا تھا کہ اسے زینی دکھائی دی۔ وہ اسمارٹ اور خوش لباس سے ایک نوجوان کے ساتھ تھی۔ وہ دونوں مسکراتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ پھر اسے پنٹو دکھائی دیا۔ وہ اسی حلیے میں تھا جس میں وہ اس دن تھا۔ جب زینی اسے یہاں لائی تھی۔ پنٹو نے جینز اور چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہاتھ میں سیاہ رنگ کی ایک اونی ٹوپی تھی جو اس نے ہوٹل میں داخل ہونے سے پہلے پہن لی۔ اس کی پیشانی، سر اور کان اس ٹوپی میں چھپ گئے اور حلیے سے بھی وہ خطرناک نظر آنے لگا۔

وہ بھی دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔

ان کے جانے کے بعد یاسر داخل ہوا۔

پچو آہستہ آہستہ محتاط قدموں سے اسی کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جس میں اس پر افتاد ٹوٹی تھی۔

یاسر نے کسی چیز کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، پھر اس نے برآمدے میں رکھی لوہے کی راڈ اٹھالی۔

وہ راڈ لے کر دروازے تک آیا تو پچو اپنی جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھول رہا تھا۔ یاسر اپنے کمرے سے باہر نکلا اور راڈ سے پچو کے سر پر زبردست ضرب لگائی۔ پچو اوندھے منہ گر پڑا۔ یاسر نے جھپٹ کر پچو کے ہاتھ سے پسٹل نکال لیا۔ اور کمرے میں داخل ہوگیا۔

بالکل وہی منظر تھا۔ یاسر کی طرح وہ نوجوان بھی بستر پر دراز تھا اور زینی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔

یاسر کمرے میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر وہ نوجوان گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور یاسر سے بولا۔ ”تمہیں جو کچھ چاہیے سب لے لو لیکن پلیز اس گن کو جیب میں رکھ لو۔“

”تم خاموش رہو۔“ یاسر نے اسے جھڑک دیا۔

”مجھے اس لڑکی سے کچھ پرانا حساب بے باق کرنا ہے۔“

پھر وہ زینی کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ”آج تمہارا کیا نام ہے؟“

یاسر کے برعکس اس نوجوان نے ہیرو بننے کی کوشش کی اور جھپٹ کر یاسر کو پکڑ لیا۔ پھر اس نے یاسر کے گن والے ہاتھ کو دبوچ لیا اور دونوں میں کشمکش ہونے لگی۔ اس دوران میں پسٹل کا ٹریگر دب گیا اور گولی زینی کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ تبھی اچانک دروازے کی طرف سے فائرنگ ہوئی اور نوجوان کے جسم میں دو گولیاں پیوست ہوگئیں۔

ان کا نشانہ تو یقیناً یاسر تھا لیکن یاسر عین وقت پر سامنے سے ہٹ گیا تھا۔ نوجوان فرش پر گر پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دم توڑ دیا۔

دروازے پر پچو کھڑا تھا۔ پچو کو نہ جانے کب ہوش آچکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈوری تھی۔

وہ یاسر کی طرف بڑھا اور اچانک اس کے گلے میں ڈوری کا پھندا ڈال دیا پھر اس کا دوسرا سرا پکڑ لیا۔ انہوں نے ڈوری کو جھٹکا دیا تو اس کا حلقہ یاسر کے گلے پر تنگ ہوگیا اور وہ فرش پر گر پڑا۔ وہ دونوں مسلسل ڈوری پر دباؤ بڑھا رہے تھے۔ یاسر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا دم گھٹ جائے گا۔ اور وہ تھوڑی دیر بعد مر جائے گا۔

اس نے بے بسی سے فرش پر ادھر ادھر ہاتھ مارے تو وہ گن اس کے ہاتھ میں آگئی جو اس نے پچو کے ہاتھ سے لی تھی۔ اس نے گن کا رخ اس کی طرف کر کے ایک فائر کیا۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر گر گیا۔

یاسر بھاگ کر زینی کے پاس پہنچا۔ گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی لیکن وہ زندہ تھی۔

”سوری زینی یا سمیرا یا شازیہ۔“ یاسر نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ......“

”باتوں میں وقت ضائع مت کرو یاسر!“ زینی نے کہا۔

”تمہاری رقم اسی کمرے کی الماری میں موجود ہے۔ ہم لوگ کل دبئی جانے والے تھے۔ اچانک یہ نوجوان نظر آگیا...... پچو نے کہا...... کہ...... اس نوجوان کے پاس......“

زینی اپنی بات پوری نہ کر سکی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

یاسر نے کمرے کی الماری کو کھول کر دیکھا اور وہاں رکھا وہی بیگ نکال لیا جو یاسر نے پچو کے حوالے کیا تھا اور جس پر یاسر کا نام اور ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا نام نمایاں حروف میں لکھا ہوا تھا۔

گولی کی آواز پر ہوٹل میں ہلچل مچ گئی تھی۔ وہ عقبی دروازے سے باہر آگیا۔

☆☆☆

صومی کا آپریشن ہو چکا تھا اور بہت کامیاب رہا تھا۔ ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ آپریشن کامیاب رہا ہے اور اگلے چند گھنٹوں میں صومی کو ہوش آجائے گا۔

شہلا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے وہ یاسر کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ یاسر کی آنکھیں بھی نم ناک تھیں۔ اس آپریشن کے لیے اسے کئی مراحل سے گزرنا پڑا تھا یہ وہی جانتا تھا۔ اس نے مسکرا کر شہلا کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔ ”دوسری عورت کتنی ہی خوب صورت ہو لیکن اپنی بیوی پھر اپنی ہوتی ہے۔“

اس پر دونوں مسکرا دیے۔